READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

جنت کے پتے

(یکجا)

نمرہ احمد

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

پبلشرز

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

جنّت کے پتّے

نمرہ احمد

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور۔
فون: 37352332‘37232336 فیکس: 37223584
www.ilmoirfanpublishers.com
E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

Downloaded From
Paksociety.com

انتساب!

اس ناول کی تخلیق سے تکمیل تک کے سفر میں

ہر قدم پہ میرے ساتھ رہنے

اور میرا ساتھ دینے والی

میری بیس قرآن ساتھی اسٹوڈنٹس کے نام!

جو بہت پیار اور فخر سے کہہ سکتی ہیں

کہ

''جنت کے پتے'' ان کا بھی ناول ہے!

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

Downloaded From
Paksociety.com

پیش لفظ

''جنت کے پتے'' ایک حساس موضوع پہ بہت دل سے لکھی جانے والی ایسی تحریر جو میرے دل سے بھ
بہت قریب ہے!

یہ کہانی ہے اذیت سہنے والوں کی، درد اٹھا کر صبر کرنے والوں کی، جہد کرنے والوں کی، کانٹوں پہ چل کر مو
بننے والوں کی۔

یہ کہانی ہے اپنے مسئلے خود حل کرنے والوں کی، ہر مشکل میں عزم و ہمت سے راستہ نکالنے والوں کی، دوسرو
کے سامنے اپنی تکالیف کا اشتہار نہ لگانے والوں کی۔

اور یہ کہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو بہت سے اچھے کام صرف اس لیے نہیں کر پاتے کہ یوں کرتے ہوئے
اچھے نہیں لگیں گے۔ جو اللہ تعالیٰ کے کچھ احکامات پہ عمل تو کرنا چاہتے ہیں مگر آج کے دور کے لحاظ سے وہ ان کو پریکٹیکل
نہیں لگتے۔ جو سیدھے راستے پہ چلنا تو چاہتے ہیں مگر انہیں اپنے اردگرد کوئی حوصلہ افزا تحریک نہیں مل پاتی جو ان کی ہمت
بندھائے۔

جنت کے پتے آپ کی اسی حوصلہ افزائی کے لیے لکھا گیا ہے۔ اگر آپ اس کہانی کو پڑھ کر، اس میں بتا
گئے شریعت کے ان احکامات کو، جن پہ عمل کرنے کے لیے مرکزی کرداروں کو مشکل کا سامنا ہے، نہیں بھی لے پاتے، تب
بھی ٹھیک ہے۔ یہ داستان کسی کو زبردستی کسی طرف رخ کرنے پہ کبھی مجبور نہیں کرے گی۔ مگر یہ آپ سے صرف اتنا ضرو
کہے گی، کہ آپ خود بھلے یہ کام کریں یا نہ کریں، مگر جنت کے پتے تھامنے والوں کے لیے کبھی اذیت و رسوائی کا سامان
بنیں۔ احزاب کی جنگ لڑنے والوں کے لیے بنو قریظہ نہ بنیں۔ جو لوگ ان احکامات پہ عمل کرتے ہیں، ان کی ہمت
بندھائیں، توڑیں نہیں۔ ان کو اکیلا مت کریں۔ ان کو اللہ کا حکم جیسے ہے اور جب ہے کی بنیاد پہ ماننے کی سزا نہ دیں۔ اگ
کوئی اللہ تعالیٰ کا حکم پورے کا پورا ماننا چاہتا ہے، تو آپ خود بھلے وہ حکم نہ مانتے ہوں، مگر ایسے لوگوں کو تنہا نہ کریں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

آخر میں، میں اس ناول کی تکمیل کے لیے بے حد شکر گزار ہوں ''شعاع'' کی ایڈیٹر امت الصبور کی جن کا بے لوث تعاون ان پورے پندرہ ماہ میرے ساتھ رہا جب تک یہ ناول شعاع میں چھپتا رہا۔ اور اس کتاب کی اشاعت کے لیے میں علم و عرفان پبلیشرز کے محترم گل فراز صاحب کی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اس کی طباعت سے اشاعت تک، ہر مرحلے پہ میری رائے کو اہم جانا، ہر ممکن طور پہ انہوں نے مجھے اس کے لیے بہت کچھ طے کرنے دیا، اور اس کے لیے میں ان کا جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے!

''جنت کے پتے'' کو میں کبھی بھی لکھ نہ پاتی اگر اس کے ریسرچ اور دوسرے مراحل میں کچھ لوگ میرے ساتھ نہ ہوتے۔ میں شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں نفیسہ حبیب، مہرین خان اور خدیجہ منظور کا جن کا ہر ممکن تعاون میرے ساتھ رہا۔ بالخصوص خدیجہ اگر نہ ہوتیں، تو یہ ناول ایسے نہ لکھا جا سکتا۔ میں آپ سب کی بہت، بہت شکر گزار ہوں! اس کے علاوہ ازکیٰ جاوید کی اہم تکنیکی امور پہ مشوروں اور آراء کے لیے میں ان کی بے حد مشکور ہوں۔ ان سب نے ہی مل کر اس ناول کو ممکن بنایا ہے۔ اور میرے ساتھ آپ ان سب کو بھی دعاء میں یاد رکھیے گا۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ اس ناول میں ترکی کے مذکورہ مقامات کی تصاویر بھی شائع کی جائیں، تاکہ پڑھنے کا مزہ دوبالا ہو سکے۔ ایسا عموماً سفرناموں میں ہوتا ہے، اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ اردو پاپولر فکشن ناولز میں یہ ٹرینڈ ایک اچھی روایت قائم کرے گا، کہ تبدیلی ہمیشہ خیر لاتی ہے۔

والسلام
نمرہ احمد

Downloaded From
Paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From http://paksociety.com

باب 1

لیپ ٹاپ تکیے پہ رکھا تھا اور وہ اس کے سامنے کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی تھی۔ اسکرین کی روشنی اس کے چہرے کو چمکا رہی تھی۔ وہ ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھے دوسرے ہاتھ کی ایک اُنگلی لیپ ٹاپ کے ٹچ پیڈ پر پھیر رہی تھی۔

لمبے، سیدھے، سیاہ بال پیچھے کمر پہ پڑے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی ویسی ہی تھیں۔ سیاہ، بڑی بڑی مغلئی آنکھیں، جن میں چاندنی کی سی چمک تھی اور چہرہ تو ملائی کا بنا لگتا تھا۔ سفید، ملائم اور چمکدار۔

وہ اسی مگن انداز میں اسکرین پر نگاہیں مرکوز کیے، ٹچ پیڈ پہ اُنگلی پھیر رہی تھی۔ ایک کلک کے بعد اگلا صفحہ کھلا تو ایک دم اس کی متحرک اُنگلی ٹھہر گئی۔ اسکرین پہ جمی آنکھوں میں ذرا سا تفکر اُبھرا اور پھر بے چینی۔ اس نے جلدی جلدی دو، تین بٹن دبائے۔

لوڈنگ.....

اگلے صفحے کے لوڈ ہونے کا انتظار کرتے ہوئے اسی مضطرب انداز میں اس نے اُنگلی سے چہرے کے دائیں طرف پھسلتی لٹیں پیچھے کیں۔

چند سیکنڈ بعد صفحہ لوڈ ہو گیا تھا۔ وہ بے چینی سے چہرہ اسکرین کے قریب لائی تو سلکی بالوں کی چند لٹیں پھر سے شانے پہ پھسل کر آگے کو گریں۔

جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی، اس کی سیاہ آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں۔ لب ذرا سے کھل گئے اور پورا وجود بے یقینی میں ڈوب گیا۔

ڈھیرے سارے لمحے لگے تھے، اسے خود کو یقین دلانے میں کہ جو وہ پڑھ رہی ہے، بالکل سچ ہے اور جیسے ہی اس کے ذہن نے یقین کی دھرتی کو چھوا، وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔

اس کا سیل فون سائیڈ ٹیبل پہ رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سیل اُٹھایا اور جلدی جلدی کوئی نمبر ملانے لگی۔ رات کی مقدس خاموشی میں بٹنوں کی آواز نے ذرا سا ارتعاش پیدا کیا تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا۔ دوسری جانب گھنٹی جا رہی تھی۔

''ہیلو زارا؟'' شاید رابطہ مل گیا تھا، تب ہی وہ دبے دبے جوش سے چہکی۔ ''کیسی ہو؟ سو تو نہیں گئی تھیں؟ حیا بول رہی ہوں''۔

دوسری طرف اس کی دوست کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ لمحے بھر کو سننے کے لیے رُکی، پھر دھیرے سے ہنس دی۔

''ساری باتیں چھوڑو زارا! میرے پاس جو بڑی خبر ہے، وہ سنو!'' اب وہ عادتاً سیاہ بالوں کی ایک موٹی لٹ اُنگلی پہ لپیٹتی کہہ رہی تھی۔ ''اور تم یقین نہیں کرو گی، میں جانتی ہوں''۔

''ارے نہیں، داور بھائی کی شادی کے متعلق نہیں ہے''۔ دوسری جانب زارا نے کچھ کہا تو اس نے فوراً تردید کی۔ ''بلکہ یوں کرو، تم گیس کرو کہ میں تمہیں کیا بتانے والی ہوں''۔

اس نے ایک ہاتھ سے لیپ ٹاپ پرے کیا اور تکیہ نکال کر بیڈ کراؤن کے ساتھ سیدھا لگایا، پھر اس سے ٹیک لگا کر پاؤں سیدھے کر لیے۔ ساتھ ساتھ وہ نفی میں سر ہلاتی زارا کے کہے اندازوں کی تردید بھی کرتی جا رہی تھی۔

''نہیں، بالکل نہیں''۔

''ایسا تو ہے ہی نہیں''۔

''ارے میری شادی وغیرہ نہیں ہو رہی''۔

''جی نہیں، ارم کی بھی نہیں ہو رہی''۔

Downloaded From http://paksociety.com

''سیریسلی زارا! تمہاری سوچ بس یہیں تک ہے۔ اب کان کھول کر سنو! تمہیں وہ ارسمس منڈس ایکسچینج پروگرام (Erasmus Mundus Exchange Programme) یاد ہے، جس کے لیے ہم نے اپلائی کیا تھا؟ کین یو بلیوات زارا! کہ مجھے یورپی یونین نے اسکالرشپ کے لیے سلیکٹ کرلیا ہے؟''

دوسری جانب زارا اتنی زور سے چیخی کہ موبائل کا اسپیکر آف ہونے کے باوجود اس کی چیخ سارے کمرے میں سنائی دی۔

''بالکل سچ کہہ رہی ہوں زارا! ابھی پندرہ منٹ پہلے مجھے یونیورسٹی کی طرف سے میل ملی ہے''۔

اس نے ساتھ ہی ایک ہاتھ سے پرے پڑے لیپ ٹاپ کا رُخ اپنی جانب موڑا اور سر آگے کر کے غور سے دوبارہ دیکھا۔

''ہاں، پندرہ منٹ پہلے، ٹھیک ساڑھے نو بجے سلیکشن کی میل آئی ہے۔ تم بھی فوراً چیک کرو، تم نے بھی اپلائی کیا تھا، تمہیں بھی میل آئی ہوگی''۔

وہ فون ایک ہاتھ سے پکڑے دوسرے سے بٹن دبا کر لیپ ٹاپ آف کرنے لگی۔

''نہیں، اسپین کی Deusto نے نہیں بلکہ ترکی کی سبانجی یونیورسٹی نے ہمیں سلیکٹ کیا ہے اور اب ہم ایک سمسٹر پڑھنے پانچ ماہ کے لیے استنبول جا رہے ہیں''۔

لیپ ٹاپ کی اسکرین اندھیر ہوئی تو اس نے اسے ہاتھ سے دبا کر بند کیا، پھر تار نکال کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔

''ہاں، میں نے سبانجی کو نیٹ پہ دیکھا ہے۔ بہت خوب صورت یونیورسٹی ہے، مگر.....''

وہ لمحے بھر کو خاموش ہوگئی۔ دوسری جانب سے غالباً استفسار کیا گیا تو وہ گویا ہوئی۔

''بس، ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے لیکن ہم اس کے بارے میں اپنی فیملیز کو آگاہ نہیں کریں گے''۔

دھیمی آواز میں بولتے ہوئے، اس نے گردن موڑ کر بند دروازے کو دیکھا۔ ''دراصل سبانجی میں لڑکیوں کے ہیڈ اسکارف پہ پابندی ہے۔ اُدھر سر ڈھکنا منع ہے۔ گھر والوں کو بتا کر متنفر کرنے کی بجائے اس بات کو گول کر جانا۔ ویسے بھی ہم دونوں میں سے کوئی اسکارف نہیں لیتا''۔

اسی پل کھڑکی کے اس پار کچھ کھڑکا تھا۔ وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ قدِ آدم کھڑکیوں کے آگے بھاری پردے گرے تھے، البتہ پیچھے جالیاں کھلی تھیں۔ شاید اس کا وہم تھا۔ وہ سر جھٹک کر فون کی جانب متوجہ ہوگئی۔

''ابا نے مجھے کبھی اسکارف لینے یا ڈھکنے پر مجبور نہیں کیا، تھینک گاڈ..... ہاں ارم گھر سے باہر اسکارف لیتی ہے، اس کے ابو، تایا فرقان، ذرا سخت ہیں نا''۔ وہ پھر سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے، نیم دراز مگن سی بتانے لگی۔

''پرمیشن تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ابا اسپین جانے کی اجازت نہ دیتے مگر ترکی میں سین پھوپھو رہتی ہیں نا، سو وہ مان گئے تھے۔ ویسے بھی انہیں اپنی بیٹی پہ پورا بھروسا ہے''۔

پھر وہ چند لمحے ایئر پیس سے اُبھرتی اپنی دوست کی بات سنتی رہی۔ زارا خاموش ہوئی تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''کل نہیں، داور بھائی کی مہندی پرسوں ہے، تم آ رہی ہو نا؟''

''اور ہاں، میں اور ارم لہنگا پہن رہے ہیں''۔

''سارے کزنز بہت ایکسائیٹڈ ہیں، خاندان کی پہلی شادی ہے نا''۔

''او کے تم اب جا کر میل چیک کرو، میں بھی سوتی ہوں، رات بہت ہوگئی ہے''۔ الوداعی کلمات کہہ کر اس نے موبائل کان سے ہٹایا اور تکیے پہ اُچھال دیا۔ پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر لاؤنج خاموشی میں ڈوبا تھا۔ حیا نے آہستہ سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور ننگے پاؤں چلتی لاؤنج سے کچن کی طرف آئی۔ سیاہ لمبی قمیص اور سیاہ کھلے ٹراؤزر میں اس کا قد مزید دراز لگ رہا تھا۔

کچن میں اندھیرا پھیلا تھا۔ وہ دروازے کے قریب رُکی اور ہاتھ سے دیوار پہ سوئچ بورڈ ٹٹولا۔ بٹن دبنے کی آواز آئی اور ساری

Downloaded From http://paksociety.com

بتیاں جل اٹھیں۔

اس نے آگے بڑھ کر فریج کا دروازہ کھولا اور پانی کی بوتل نکالنے کو جھکی۔ جھکنے سے ریشمی بال کندھوں سے پھسل کر سامنے کو آ گرے۔ حیا نے نزاکت سے اُنگلی سے ان کو پیچھے ہٹایا اور بوتل نکال کر سیدھی ہوئی، پھر کاؤنٹر پہ رکھے ریک سے شیشے کا گلاس اُٹھایا اور بوتل اس میں انڈیلی۔ پانی کی ندی سی گلاس میں گرنے لگی۔ تب ہی اس کی نگاہ کاؤنٹر پہ رکھی کسی سفید چیز پہ پڑی۔ وہ جیسے چونک اٹھی، بوتل وہیں سلیب پہ رکھ کر اس طرف آئی۔

وہ سفید گلاب کے پھولوں کا بکے تھا، جس میں کہیں کہیں سبز پتے جھلک رہے تھے۔ ساتھ ہی ایک بند سفید لفافہ رکھا تھا۔

حیا نے گلدستہ اُٹھایا اور چہرے کے قریب لا کر آنکھیں موندے سونگھا۔ دل فریب تازگی بھری مہک اس کے اندر تک اُتر گئی۔

پھول بالکل تازہ تھے، جیسے ابھی ابھی توڑے گئے ہوں۔ جانے کون رکھ گیا ادھر؟

اس نے بند لفافہ اُٹھایا اور پلٹ کر دیکھا۔ اس پہ گھر کے پتے کے اوپر نمایاں سا ''دیا سلیمان'' لکھا تھا۔ بھیجنے والے کا پتہ نہ تھا، بس کورئیر سروس کی مہر اور اسٹیکر لگے تھے۔ مہر پہ ایک روز قبل کی تاریخ تھی۔

اس کو بھی کسی نے یوں پھول نہیں بھیجے تھے۔ کیا معاملہ تھا یہ بھلا؟

اُلجھتے ہوئے حیا نے لفافہ چاک کیا۔ اندر ایک موٹا کاغذ تھا۔ اس نے دو اُنگلیاں لفافے میں ڈال کر کاغذ پکڑا اور باہر نکالا۔

سفید کاغذ بالکل صاف تھا۔ نہ لکیر، نہ کوئی ڈیزائن۔ بس اس کے وسط میں انگریزی میں تین لفظ لکھے تھے۔

"Welcome to Sabanci"

وہ سناٹے میں رہ گئی۔

یہ کیا مذاق تھا؟ بھلا خط بھیجنے والے کو کیسے پتا کہ وہ سبانجی جا رہی ہے؟ خط پہ تو ایک روز قبل کی تاریخ تھی، جبکہ قبولیت کی وہ ای میل اسے ابھی پندرہ منٹ پہلے موصول ہوئی تھی۔ جو بات اسے آفیشلی بتائی ہی پندرہ منٹ قبل گئی تھی، وہ اس شخص کو ایک روز پیشتر کیسے معلوم ہوئی؟

اگر زارا کو اس نے خود ابھی نہ بتایا ہوتا تو وہ سمجھتی کہ یہ اس کی حرکت ہے اور یہ خط سبانجی یونیورسٹی کی طرف سے بھی نہیں آ سکتا تھا کیونکہ اس پہ ایک قومی سطح کی کورئیر کمپنی کی مہر لگی تھی، پھر کس نے بھیجا اسے یہ؟

پانی سے بھرا گلاس وہیں سلیب پہ چھوڑ کر، بکے اور لفافہ اُٹھائے وہ اُلجھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

سہ پہر کی ٹھنڈی سی چھایا ہر سو چھائی تھی۔ وہ پرس کندھے سے لٹکائے، باریک ہیل سے چلتی پورچ میں کھڑی اپنی کار کی طرف آئی، جو تھی تو اس کے بھائی روحیل کی، مگر اس کے پڑھائی کی غرض سے امریکہ چلے جانے کے بعد حیا کی ملکیت تھی۔

اس نے چابی لاک میں گھمائی ہی تھی کہ گیٹ کے اس پار سے زارا آتی دکھائی دی۔ وہ دروازہ کھول کر مسکراتی ہوئی سیدھی ہوئی۔

''حیا! مجھے تو کوئی میل نہیں آئی''۔ زارا نے ادھ کھلے گیٹ کو دھکیل کر اندر قدم رکھا۔ اس کے چہرے پہ اُداسی تھی۔ وہ درمیانی شکل وصورت کی اسٹائلش سی لڑکی اور حیا کی ہم عمر تھی۔

''کوئی بات نہیں، ایک دو دن میں آ جائے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم نے ساتھ ہی اپلائی کیا تھا، میرا سلیکشن ہو گیا ہے تو تمہارا بھی ہو جائے گا''۔ حیا ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ آدھا کھولے، کھڑے کھڑے بتانے لگی۔

''مگر اسکالرشپ پروگرام کو آرڈیننس کے آفس کے باہر آج جو لسٹ لگی ہے، اس میں بھی میرا نام نہیں ہے''۔

''اور میرا؟''

''صرف تمہارا ہے، ڈیپارٹمنٹ سے اور انوائرمینٹل سائنسز کی ایک لڑکی خدیجہ رانا کا ہے۔ میرا خیال ہے میرا سلیکشن ہی نہیں ہوا''۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اوہ''۔اسے واقعتاً افسوس ہوا۔رات فون کال کے بعد اس کی زارا سے اب بات ہو رہی تھی۔

''خیر،تم کہیں جا رہی تھیں؟''زارا چہرے پہ دوبارہ بشاشت لاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ہاں،مارکیٹ جا رہی تھی ارم کے ساتھ۔داور بھائی کی مہندی کا فنکشن ہے اور میرے لہنگے کے ساتھ کی ہائی ہیلز گم ہو گئی ہے۔شاید کام والی اُٹھا کر لے گئی ہے۔اب نئے جوتے لینے پڑیں گے۔تم چلو گی؟''وہ گاڑی سے کہنی ٹکائے تفصیلاً بتانے لگی۔اس وقت وہ ہلکی آسمانی لمبی قمیص اور تنگ چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھی۔قمیص کا دامن ٹخنوں سے ذرا اوپر تک تھا۔ہم رنگ دوپٹہ گردن کے گرد لپٹا تھا،بال کمر پہ گر رہے تھے اور عادتاً آنکھوں میں گہرا کاجل ڈلا تھا۔

''ہاں۔چلو پھر جلدی نکلتے ہیں''۔زارا فوراً تیار ہو گئی اور فرنٹ سیٹ کی طرف بڑھی۔

''ارم کو بھی لینا ہے''۔حیا نے اندر بیٹھ کر دروازہ بند کیا اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔

''ویسے تمہارے سخت سے تایا ارم کو یوں تمہارے ساتھ شاپنگ پہ جانے کی اجازت دے دیتے ہیں؟''

ارم ان دونوں سے جونیئر تھی اور اس کا ڈیپارٹمنٹ بھی دوسرا تھا،سو زارا کی اس سے زیادہ ملاقات نہ تھی۔

''ان کی سختی صرف اسکارف تک ہے۔ویسے بہت اچھے ہیں وہ''۔

وہ کار باہر گیٹ پہ لے آئی۔ارم کا گھر حیا کے ہمسائے میں تھا۔دونوں گھروں کی درمیانی دیوار میں آنے جانے کا راستہ بھی موجود تھا لیکن اسے جب بھی ارم کو پک کرنا ہوتا وہ اس کے گیٹ پہ ہارن دیا کرتی تھی۔اب بھی زور کا ہارن دیا تو چند ہی لمحے بعد ارم باہر نکل آئی۔

کاسنی لمبی قمیص اور ٹراؤزر میں ملبوس،ہم رنگ دوپٹہ پھیلا کر سامنے لیے،چہرے کے گرد میچنگ کاسنی اسکارف لپیٹے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پچھلی سیٹ کے دروازے تک آئی تھی۔

''ہیلو حیا!ہیلو زارا!''بے تکلفی سے چہکتے ہوئے اس نے اندر بیٹھ کر دروازہ بند کیا۔حیا کے ساتھ آؤٹنگ کے پروگرام اسے یونہی خوش کیا کرتے تھے۔

''کیسی ہو ارم!تم سے تو ملاقات ہی نہیں ہو پاتی''۔زارا نے ترچھی ہو کر رُخ پیچھے کو کیا۔

''آپ کا ڈیپارٹمنٹ دور پڑتا ہے نا،تب ہی،اور ہاں،حیا بتا رہی تھی آپ لوگوں کا ترکی کا سلیکشن آ گیا ہے؟''

''میں سلیکٹ نہیں ہوئی،حیا ہو گئی ہے۔خیر،اس میں کوئی بہتری ہو گی۔تم نے نہیں اپلائی کیا تھا؟''

''ابا اجازت دیتے تب نا!''وہ اُداس ہو گئی۔

''ویسے پیرنٹس کو اتنا سخت نہیں ہونا چاہیے''۔زارا نے کہا۔

حیا نے تادیبی نظروں سے اسے گھورا کہ کہیں پہلے سے احساسِ کمتری میں مبتلا ارم مزید اُداس نہ ہو جائے مگر زارا گردن موڑے پیچھے دیکھ رہی تھی اور ارم.....ارم حسب توقع اُداس ہو گئی تھی۔

''ابا بھی پتا نہیں کس پہ چلے گئے۔اتنی گرمی میں اسکارف لینا آسان ہوتا ہے کیا؟اور پھر کل مہندی کے لہنگے کی بھی آدھی آستین نہیں بنانے دی مجھے۔حیا کی بھی تو آدھی آستین ہیں۔اتنی اچھی لگتی ہیں،مگر ابا ذرا بھی سلیمان چچا کی طرح نہیں ہیں''۔

''ارم!تمہیں آج کیا لینا ہے؟میں نے تو جوتے لینے ہیں''۔اس نے کوفت چھپاتے ہوئے بات کا رُخ بدلا۔ارم کا ہر وقت کا شکایتی رویہ اسے بے حد برا لگتا تھا۔

''چوڑیاں لینی ہیں،مگر لہنگے کے بلاؤز کی فل سلیوز کے ساتھ چوڑیاں اچھی بھی نہیں لگیں گی''۔وہ منہ بسورے پھر سے شروع ہو گئی تو حیا نے سر جھٹک کر سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔

عاطف اسلم کا گیت بلند آواز سے گونجنے لگا تو ارم کو خاموش ہونا پڑا۔

جناح سپر مارکیٹ پہنچ کر ارم تو چوڑیاں ڈھونڈنے نکل گئی،جبکہ وہ دونوں میٹر و شوز پہ آ گئیں۔

''یہ گولڈن والا جوتا تیسرے نمبر پہ رکھا ہے،یہ دکھائیں''۔بہت دیر بعد ایک اونچی ہیل اس کی نظر میں جچی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''یہ والا میم؟'' سیلز مین نے پورا جوڑا نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ وہ زمین پہ پنجوں کے بل بیٹھا تھا جبکہ حیا اور زارا سامنے کاؤچ پہ بیٹھی تھیں۔

''پہنا دوں میم؟'' بہت مؤدب اور شائستہ انداز میں پوچھتے ہوئے سیلز مین نے ہاتھوں میں پکڑا جوتا اس کے پاؤں کے قریب کیا، جو خوب صورت ہیلز میں مقید تھے۔

''میرے ہاتھ نہیں ٹوٹے ہوئے، میں خود پہن سکتی ہوں۔''

''جی شیور، یہ لیجیے''۔ سیلز مین نے مسکرا کر جوتا اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اسے یوں پکڑ رکھا تھا کہ اسے تھامتے ہوئے حیا کی اُنگلیاں لازماً اس کے ہاتھ سے مس ہوتیں۔

''سامنے رکھ دو، میں اُٹھا لوں گی''۔ اس کے روکھے لہجے پہ سیلز مین نے زیرِ لب کچھ گنگناتے ہوئے جوتا سامنے رکھ دیا۔

پھر بل کی ادائیگی کے بعد کاؤنٹر پہ کھڑے لڑکے نے بقیہ رقم اس کی طرف بڑھائی تو حیا نے دیکھا، چند نوٹوں کے اوپر پانچ کا سکہ رکھا تھا اور لڑکے نے سکے کو یوں پکڑ رکھا تھا جیسے سیلز مین نے جوتے کو..... تاکہ اسے تھامتے وقت لازماً اس کا ہاتھ ٹکرائے۔

''شکریہ''۔ حیا نے نوٹ کنارے سے پکڑ کر کھینچے، سکہ لڑکے کے ہاتھ میں رہ گیا۔

''میم! آپ کا سکہ!'' لڑکے نے فاتحانہ انداز میں سکہ اس کی جانب بڑھایا کہ اب تو لازمی پکڑے گی اور.....

''یہ سامنے رکھے صدقے کے باکس میں ڈال دو''۔ وہ بے نیازی سے شاپر تھامے پلٹ گئی۔ زارا نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

''اس لڑکے کی شکل دیکھنے والی تھی حیا!''

''دل تو کر رہا تھا اس کی اسی شکل پہ شاپ کے سارے جوتے دے ماروں، معلوم نہیں ہمارے مردوں کی ذہنیت کب بدلے گی۔ یوں گھورتے ہیں جیسے کبھی لڑکی دیکھی نہ ہو''۔

وہ تنفر سے ناک سکوڑتی، غصے میں بولتی زارا کے ساتھ سیڑھیاں اُتر رہی تھی جب قریب سے آواز آئی۔

''تو اتنا بن سنور کر باہر نہ نکلا کرو بی بی!'' وہ چونک کر آخری سیڑھی پہ ٹھہر گئی۔ وہ ایک معمر خاتون تھیں، بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی، ناگواری بھری نگاہ اس پہ ڈال کر آہستہ آہستہ اوپر زینے چڑھ رہی تھیں۔

''ایک تو لوگوں کو راہ چلتے تبلیغ کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے''۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہتی مگر زارا اس کو کہنی سے تھامے وہاں سے لے آئی۔ تب ہی ارم سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اس کا سینے پہ پھیلا دوپٹہ اب سمٹ کر گردن تک آ گیا تھا۔ اس نے کچھ خاص شاپنگ نہیں کی تھی۔ شاید وہ صرف ان کے ساتھ آؤٹنگ پہ آئی تھی۔

میٹرو سے وہ ''اسکوپ'' چلی آئیں کہ کچھ ہلکا پھلکا کھا لیں۔ رات کی دعوت تو تایا فرقان کی طرف تھی، جو وہ بیٹے کی شادی کے لیے جمع ہوئے خاندان والوں کے لیے دے رہے تھے۔

''میرے لیے پائن ایپل سلش slush منگوا لینا، میں ذرا بیکری سے کچھ لے لوں''۔ ارم جھٹ باہر کو لپکی۔ حیا نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنی جانب کا شیشہ نیچے کیا۔ سرد ہوا کا تھپیڑا تیزی سے اندر آیا تھا مگر اتنی سردی میں سلش پینے کا اپنا مزا تھا۔

وہ پارکنگ لاٹ میں موجود تھیں اور ٹھنڈی ہوا نے ساری جگہ کو گھیر رکھا تھا۔ مغرب گہری ہو چکی تھی اور ہر طرف اندھیرا سا تھا۔

''ارم خاصی کمپلیکسڈ لگتی ہے، نہیں؟'' ارم دور ہو گئی تو زارا اس کی طرف گھومی۔

''اور تم اس کے انہی کمپلیکسز کو ہوا دے رہی تھیں''۔ وہ اُلٹا اسی پہ خفا ہوئی۔

''تایا فرقان صرف اسکارف کی سختی کرتے ہیں۔ وہ بس اسی بات پہ خود ترسی کا شکار ہے اور تم بھی اس کا ساتھ دے رہی تھیں''۔

''میں نے سوچا کہ بے چاری.....''

''نہیں ہے وہ بے چاری، اب اس کو بھی یہی سمجھانا کہ خواہ مخواہ کی خود ترسی سے نکل آئے''۔

ویٹر ہاتھ میں کارڈ پکڑے حیا کی طرف کھلے شیشے کے باہر آ چکا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''تمہیں یاد ہے زارا! پچھلے سال جب یونیورسٹی والوں نے ہمیں ترکی کے ٹرپ کی آس دلائی تھی اور آخر میں پہنچ کر سارا پروگرام ہی کینسل کر دیا تھا''۔

آرڈر لکھوا کر وہ شیشہ اوپر چڑھاتے ہوئے یاد کر کے کہنے لگی۔

''میں تو اتنی مایوس ہوگئی تھی کہ سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی ترکی جا سکوں گی''۔ اس کی آواز میں آس جڑنے کی خوشی در آئی تھی۔

زارا اور وہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں ایل ایل بی آنرز (شریعہ اینڈ لاء) کے پانچویں سال میں تھیں۔ ان کا ساتواں سمسٹر درمیان میں تھا، جب یورپی یونین کی اسپانسرڈ اسکالرشپ کا اعلان ہوا۔ جس کے تحت یورپ اور ایشیاء کی یونیورسٹیز کے مابین طلباء کا تبادلہ ہونا تھا۔ یوں چند ماہ کے لیے یہاں سے کچھ طلباء یورپ کی یونیورسٹیز جائیں گے اور ایک سمسٹر پڑھ کر واپس آ جائیں گے۔ جب یورپین یونیورسٹیز میں درخواست دینے کی باری آئی تو اسے ترکی کی سبانجی یونیورسٹی کا فارم سب سے آسان لگا، مگر پھر ایک ہسپانوی یونیورسٹی میں بھی ساتھ ہی اپلائی کر دیا اور اب بالآخر سبانجی نے اسے منتخب کر لیا تھا۔

اِدھر ساتواں سمسٹر پورا کر کے اسے فروری میں پانچ ماہ کے لیے ترکی جانا تھا (ابھی دسمبر چل رہا تھا)، جہاں اس کے اپنے مضامین (شریعہ اینڈ لاء) تو نہ تھے کہ ترکی کا قانون پاکستان کے قانون سے مختلف تھا، سو پانچ ماہ کے لیے وہ اپنی مرضی سے کوئی بھی مضمون پڑھ سکتی تھی۔ پھر واپس پاکستان آ کر اسے ایل ایل بی کا آٹھواں سمسٹر شروع کرنا تھا۔

''کتنا مزا آئے حیا! اگر کوئی رومانٹک سا، ہینڈسم سا، ہم سفر تمہیں مل جائے تو تمہارا سفر کتنا خوب صورت ہو جائے گا''۔

''ہم سفر کوئی نہیں ملنے والا، کیونکہ پاکستان سے سبانجی صرف ہم دو لڑکیاں ہی جا رہی ہیں اور پھر ہم ٹھہرے آل ویمن یونیورسٹی میں پڑھنے والے''۔

''وہ خدیجہ رانا جو تمہارے ساتھ جا رہی ہے، اس سے کوئی بات ہوئی؟''

ویٹر نے شیشہ بجایا تو حیا چونکی، پھر شیشہ نیچے کرنے لگی۔

''نہیں۔ خدیجہ رانا کو تو میں جانتی بھی نہیں ہوں۔ معلوم نہیں کون ہے''۔ اس نے سلش کے گلاس پکڑے۔ زارا کا اسے تھمایا اور ارم کا ڈیش بورڈ پہ رکھا، پھر اپنا گلاس لبوں سے لگایا۔ ٹھنڈا سا سلش اندر تک اترتا گیا۔ بے دھیانی میں وہ شیشہ بند کرنا کب بھولی، اسے علم نہ ہو سکا۔

دفعتاً زارا کا موبائل بجا۔ زارا نے سپ لیتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔

''ہیلو اماں! جی؟ کیا؟ آواز خراب ہے، ایک منٹ.....'' زارا کے فون پہ غالباً سگنل ٹھیک نہیں آ رہے تھے۔ وہ سلش کا گلاس ہاتھ میں پکڑے دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

حیا اپنے گلاس سے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے زارا کو ونڈ اسکرین کے پار سے دیکھتی رہی۔ اب وہ دور ایک درخت کے ساتھ کھڑی فون پہ بات کر رہی تھی۔

''ہیلو مائی لیڈی''۔ کوئی ایک دم سے اس کے بہت قریب آ کر بولا۔ وہ ڈر کر اُچھلی۔ ذرا سا جوس کپڑوں پہ چھلک گیا۔

کھلی کھڑکی پہ ایک عورت مسکراتے ہوئے جھکی ہوئی تھی۔ میک اپ سے اٹا چہرہ، چمکتا ہوا آئی شیڈو، بھڑکتی ہوئی سرخی، بالوں کا جوڑا، چم چم کرتے کپڑے..... وہ عورت نہیں تھی مگر وہ مرد بھی نہیں تھا۔

''کیسے ہو جی!'' وہ اس کی کھڑکی پہ پورا جھکا کھڑا تھا۔ گلاس اس کے ہاتھ میں کانپا، بے اختیار اس نے شیشہ اوپر چڑھانا چاہا مگر اس کے ہاتھ درمیان میں تھے۔

''ڈرو نہیں باجی جی! میں آپکی دوست ہوں، ڈولی کہتے ہیں مجھے''۔

''ہٹو، ہٹو، جاؤ'' وہ گھبرا گئی۔ خواجہ سرا کے وجود سے سستے پرفیوم کی تیز خوشبو اُٹھ رہی تھی، اسے کراہیت سی آئی۔

''ذرا بات تو سنو''۔ اس نے اپنا چہرہ مزید جھکایا اور اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا، حیا نے سلش کا بھرا ہوا گلاس اس کے منہ پہ

Downloaded From http://paksociety.com

اُلٹ دیا۔ ٹھنڈی ٹھار برف چہرے پہ پڑی تو وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ اس نے پھرتی سے شیشہ اوپر چڑھالیا۔

''سنو جی.....'' وہ مسکرا کر چہرہ صاف کرتا، شیشہ بجانے لگا۔ بند شیشے کے باعث اس کی آواز ہلکی ہوگئی تھی اور اب وہ کوئی گیت گنگنانے لگا تھا۔

کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور گاڑی وہاں سے نکال لائی۔ بیکری کے داخلی دروازے کے سامنے کار لاکر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

وہاں درختوں کے ساتھ وہ ڈولی نامی خواجہ سرا ابھی تک کھڑا تھا۔ وہ اس کے پیچھے نہیں آیا تھا اور اب گا بھی نہیں رہا تھا۔ بس خاموش، گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے بے اختیار جھرجھری سی آئی۔

''کہاں رہ گئیں یہ دونوں؟'' اس نے جھنجھلا کر ہارن پہ ہاتھ رکھ دیا، پھر گردن موڑ کر دوبارہ دیکھا۔ وہ ابھی تک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ارم اور زارا کو ڈراپ کر کے وہ سیدھی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ ڈنر کا وقت ہونے والا تھا۔ اس نے یہ کپڑے ڈنر کی مناسبت سے ہی پہنے تھے۔ مگر جوس چھلکنے سے ذرا سا داغ پڑ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے دوپٹے کا وہ حصہ دھو کر اسے استری کیا۔ اسے رہ رہ کر وہ خواجہ سرا یاد آرہا تھا۔

اس برادری کے لوگ اکثر آ کر پیسے مانگتے تھے مگر ایسی حرکت تو کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ اس خواجہ سرا کی عجیب نگاہیں اور انداز.....اسے پھر سے جھرجھری آئی۔

پھر جب اپنی تیاری سے مطمئن ہو کر وہ باہر آئی اور لابی کا دروازہ کھولا تو پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا، وہ چونک گئی۔

دروازے کے ساتھ فرش پہ سفید ادھ کھلے گلابوں کا بکے پڑا تھا۔ وہ جھکی اور بکے اُٹھایا۔ ساتھ میں ایک بند لفافہ بھی تھا۔ وہ دونوں چیزیں اُٹھا کر سیدھی ہوئی اور لفافہ کھولا، جس پہ ''حیا سلیمان'' لکھا تھا۔

اندر وہی سفید، بے سطر، چوکور کاغذ تھا۔ اس کے وسط میں اردو میں لکھا تھا۔

''اُمید کرتا ہوں کہ آپ کا آج کا ڈنر اچھا گزرے گا''۔

اس نے لفافہ پلٹ کر دیکھا۔ کہیں بھی کچھ اور نہیں لکھا تھا، بس لفافے پہ گزشتہ روز کی مہر لگی تھی۔ یہ کون تھا اور کیوں اسے پھول بھیج رہا تھا؟ وہ بکے اور خط کمرے میں رکھ کر سارے معاملے پہ اُلجھتی باہر آئی۔

تایا فرقان کے گھر خوب چہل پہل لگی تھی۔ لاؤنج میں سب کزنز بیٹھے تھے۔ ایک طرف خواتین کا گروہ خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ مرد حضرات یقیناً ڈرائنگ روم میں تھے۔ ان کے خاندان میں کزنز کی بے تکلفی کو بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

تایا فرقان چاروں بہن بھائیوں میں سب سے سخت تھے اور ان کی سختی ارم کے اسکارف لینے اور گھر سے باہر لڑکوں سے بات کرنے پہ تھی۔ ارم اور باقی کزنز بھی عموماً اپنے کزنز کے سوا باہر کے کسی لڑکے سے بات نہیں کرتی تھیں۔ حیا اور ارم تو پڑھتی بھی آل ویمن یونیورسٹی میں تھیں۔ ہاں دوسرے چچا اور خود سلیمان صاحب مستقبل میں اپنے بچوں کی شادیاں یقیناً مکسڈ گیدرنگ میں رکھیں گے، یہ سب کو معلوم تھا۔

ان کا خاندان زیادہ بڑا نہ تھا۔ وہ لوگ تین بھائی اور ایک بہن تھے۔ تایا فرقان سب سے بڑے تھے۔ داور، فرخ، اور ارم ان کے بچے تھے۔ فرخ میڈیکل کر چکا تھا اور آج کل پولی کلینک سے ہاؤس جاب کر رہا تھا، وہ حیا سے تین سال بڑا تھا۔ سمیع، فرخ سے سال بھر چھوٹا تھا اور ایم بی اے کے بعد جاب کر رہا تھا۔ ارم حیا سے سال بھر چھوٹی تھی۔ آج کل سب سے بڑے داور کی شادی تیار تھی۔

تایا فرقان کے بعد سلیمان صاحب تھے۔ حیا ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور روحیل اکلوتا بیٹا۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکہ میں ہوتا تھا۔ اب ان کے گھر میں سلیمان صاحب، فاطمہ بیگم اور حیا، بس یہی تینوں تھے۔

پھر زاہدہ چاچی تھے۔ ان کی بڑی دو جڑواں بیٹیاں مہوش اور سحرش تھیں، پھر بیٹا رضا انجینئر تھا۔ سب سے چھوٹی بیٹی ثنا او لیول کر رہی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

اس وقت سوائے روحیل کے جو امریکہ میں تھا اور داور بھائی کے جو غالباً ڈرائنگ روم میں تھے، باقی تمام لڑکے لڑکیاں لاؤنج میں موجود تھے۔ لڑکیاں کارپٹ پہ دائرہ بنا کر بیٹھی تھیں۔ ارم کے ہاتھ میں ڈھولک تھی۔ اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کر کندھے پہ آ گیا تھا۔ (اگر ابھی تایا فرقان آ جاتے تو وہ فوراً اس کو سر پہ لے لیتی) اور وہ مہوش، سحرش اور ثنا کے ہمراہ سُر ملا رہی تھی جبکہ رضا، فرخ اور سمیع اوپر کرسیوں پہ بیٹھے مذاقاً لڑکیوں کی طرف فقرے اُچھال کر رہے تھے۔

''ہیلو ایوری ون!''

وہ سینے پہ ہاتھ باندھے چلتی ہوئی ان کے قریب آ کر رُکی تو سب کی نگاہیں اس کی جانب اُٹھیں۔ سپید چہرے کے دونوں اطراف میں گرتے سیدھے سیاہ بادل اور بڑی بڑی کاجل سے لبریز آنکھیں..... وہ تھی ہی اتنی حسین کہ ہر اُٹھی نگاہ میں ستائش اُمڈ آئی۔

''حیا! کیسی ہو؟''

''آؤ چلو، ان لڑکوں کو ہراتے ہیں''۔

''آؤ بیٹھو نا!''

بہت سی آوازیں اس سے ٹکرائیں مگر اس نے بے نیازی بھری مسکراہٹ سے شانے اُچکائے۔

''پہلے میں صائمہ تائی کی کچن میں ہیلپ کروادوں''۔ اس نے ارم کی امی کا نام لیا، جن کو اس نے آتے ہوئے اُٹھ کر کچن کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ صائمہ تائی نے یقیناً اس کو آتے نہیں دیکھا تھا ورنہ اسے بلوا لیتیں۔ ارم سے زیادہ سمجھ دار تو بقول ان کے حیا تھی۔ صائمہ تائی کے پیچھے زاہد چچا کی بیگم عابدہ چچی بھی چلی گئی تھیں۔ اب صوفے پہ حیا کی امی فاطمہ بیگم تنہا بیٹھی تھیں۔

''اماں! میں ذرا صائمہ تائی کے ساتھ ہیلپ کروادوں''۔ ان کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے اپنی بات دُہرائی تو انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔

وہ مطمئن سی آگے بڑھ گئی۔ راہ داری پار کر کے کچن کے دروازے کی سمت بڑھی ہی تھی کہ صائمہ تائی کی تیز آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''جیسے میں جانتی ہی نہیں ہوں کہ یہ سارے رنگ ڈھنگ کس لیے ہوتے ہیں، ایک میرے ہی بیٹے ملے ہیں اس کو پاگل بنانے کے لیے''۔

وہ بے اختیار دو قدم پیچھے دیوار سے جا لگی۔ یہ صائمہ تائی کس کی بات کر رہی تھیں؟

''تبھی میں کہوں بھابھی! کہ رضا کیوں ہر وقت حیا، حیا کرتا ہے''۔ وہ عابدہ چچی تھیں۔ اپنے نام پہ وہ چونک سی گئی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

''پچھلی دفعہ جب ہم سلیمان بھائی کے گھر کھانے پہ آئے تھے تو کیسے نک سک سے تیار پھر رہی تھی، تب سے رضا میرے پیچھے پڑا ہے کہ حیا کا رشتہ مانگیں''۔

''اس لڑکی کو لڑکوں کو متوجہ کرنے کا فن آتا ہے عابدہ! کتنی مشکل سے داور کے دل سے اس کا خیال نکالا تھا، میں نے اور فرقان نے۔ وہ تو اَڑ ہی گیا تھا کہ شادی کرے گا تو صرف حیا سے، مگر جب فرقان نے سختی کی کہ بھلا ایسی بے پردہ اور آزاد خیال لڑکی کو اپنی بہو بنا کر ہم نے اپنی آخرت بگاڑنی ہے کیا، تب کہیں جا کر وہ مانا، مگر اب فرخ..... کیا کروں اس لڑکے کا۔ یہ ابھی بھی اس طرح کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آ جائے گی اور فرخ پھر اس کے جانے کے بعد ضد پکڑ لے گا۔ اب میری ارم بھی تو ہے، مجال ہے کہ سر پہ دوپٹہ لیے بغیر گھر سے نکلے''۔

صائمہ تائی فخر سے کہہ رہی تھیں اور وہ دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ بمشکل دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اسے لگا اگر اس نے مزید کچھ سنا تو اس کے اعصاب جواب دے جائیں گے۔ بدقت اپنے وجود کو سنبھالتے وہ واپس پلٹ آئی۔

کسی بات پہ ہنستے ہوئے فرخ کی نگاہ اس پہ پڑی، جو راہ داری سے چلی آ رہی تھی تو اس کی ہنسی تھم گئی، وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ قبول صورت سا فرخ جس کی رنگت ٹف روٹین کے باعث مزید سنولا گئی تھی مگر مسئلہ اس کی واجبی شخصیت یا حیا کی بے پردگی کا نہ تھا، اصل بات تو وہ سب جانتے تھے۔ پھر بھلا اس کے بارے میں رضا یا فرخ نے سوچا بھی کیسے؟

وہ ایک سپاٹ نگاہ فرخ پہ ڈال کر چپ چاپ فاطمہ بیگم کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''تمہیں کیا ہوا؟'' انہوں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں اماں!'' وہ بدقت خود کو نارمل کر پائی۔ فاطمہ مطمئن ہو گئیں اور وہ صائمہ تائی کے بارے میں سوچنے لگی، جن کا ''حیا میری جان'' کہتے منہ نہ تھکتا تھا اور تایا فرقان کے لیے تو وہی بڑی بیٹی تھی، لیکن اندر سے ان لوگوں کے ایسے خیالات ہوں گے، وہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اور وہ پھول؟ وہ بھی رضا یا فرخ میں سے ہی کسی نے بھیجے ہوں گے، مگر کل رات جب پہلی دفعہ پھول آئے تھے، تب تو فرخ نائٹ ڈیوٹی پہ تھا اور رضا تو اسلام آباد میں ہی، مگر ان دونوں میں سے کسی کو اس کے سالگرہ کے سلیکشن کے بارے میں کیسے علم ہوا؟ شاید جب وہ زارا کو فون پہ بتا رہی تھی، تب کھڑکی کے باہر کچھ کھڑکا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، یقیناً اس نے کھڑکی کے باہر سے ساری بات سن لی ہوگی اور سن کر ہی وہ خط لکھ کر پھولوں کے ساتھ ادھر رکھا ہوگا، مگر..... اس پہ تو کوریئر کی ایک روز قبل کی مہر تھی۔ شاید اس نے کوئی جعلی مہر استعمال کی ہو۔ مگر اتنے جھمیلوں میں فرخ اور رضا جیسے جاب والے مصروف بندے کیوں پڑیں گے بھلا؟

اس کا دل کہتا تھا، یہ نہ فرخ ہے، نہ رضا بلکہ کوئی اور ہے۔ خیر، جہنم میں جائے وہ جو بھی ہے، ان دونوں کا دماغ تو ابھی ٹھیک کرتی ہوں۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر لڑکے لڑکیوں کے گروپ کے پاس چلی آئی۔

''ارم!'' سامنے کھڑے کھڑے اس نے مخصوص بے نیازی سے سینے پہ ہاتھ باندھے ارم کو پکارا تو سب رُک کر اسے دیکھنے لگے۔

''کیا؟''

''تم لوگوں نے سبین پھپھو کو شادی کا کارڈ بھیجا تھا تر کی؟'' کنکھیوں سے اس نے فرخ اور رضا کے چہروں کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں چونکے تھے۔ اور دونوں کو ہی اس کی بات پسند نہیں آئی تھی جیسے۔

''پھپھو کا کارڈ سلیمان چچا کو دیا تھا، انہوں نے بھجوا دیا ہوگا اور ہاں، پھپھو کو ابا نے فون کر دیا تھا، کیا وہ آئیں گی؟''

''آنا تو چاہیے، آخر قریبی رشتہ ہے، تم سے نہ سہی، ہم سے تو ہے''۔ اس نے قریبی رشتہ پہ زور دے کر ایک جتاتی نظر فرخ اور رضا پہ ڈالی۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

پھر کھانے کے وقت صائمہ تائی نے سب سے پہلے اسے بلایا۔

''حیا، میری جان! یہ ارم کسی کام کی نہیں ہے، تم سمجھ دار ہو، ٹیبل پہ تم نے خیال رکھنا ہے کہ جیسے کوئی ڈش آدھی ہو، فوراً ظفر (کک) کو اشارہ کرنا، ٹھیک؟''

''شیور تائی! میں خیال کروں گی''۔ وہ بدقت مسکراتی ہوئی سر و کرنے لگی۔

چند منٹ بعد سب ڈائننگ ہال میں کھڑے اپنی اپنی پلیٹوں میں کھانا نکال رہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل کے اطراف سے کرسیاں ہٹا کر ایک دیوار کے ساتھ لگا دی گئی تھیں، تاکہ سب اپنی مرضی سے کھانا نکال کر اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے کھاتے رہیں۔

''تایا جان! آپ نے سلاد نہیں لیا''۔ وہ رشین سلاد سے بھرا شیشے کا بڑا پیالا اُٹھائے تایا فرقان اور سلیمان صاحب کے پاس آئی، جو اپنے دھیان میں محوِ گفتگو تھے، اس کے پکارے پر چونکے۔

''تھینک یو بیٹا!'' تایا فرقان مسکرا کر چمچے سے سلاد اپنی پلیٹ میں نکالنے لگے۔ وہ شلوار کرتے میں ملبوس تھے۔ کندھوں پہ شال تھی اور بارعب چہرے پہ مونچھیں۔

سلیمان صاحب ان کے برعکس کلین شیو، ڈنر سوٹ میں ملبوس، خاصے اسمارٹ اور ہینڈسم لگ رہے تھے۔ دونوں کی سوچ بھی اپنے حلیوں کی مانند تھی۔

''ابا! آپ بھی لیں نا''۔

''سلیمان! تم نے سبین کو کارڈ پوسٹ کر دیا تھا؟'' تایا کو اچانک، شاید اس کی شکل دیکھ کر یاد آیا۔

سلیمان صاحب کا چمچے میں سلاد بھرتا ہاتھ ذرا سست ہوا اور چہرے پہ کڑواہٹ پھیل گئی۔ بہت آہستہ آہستہ سے انہوں نے سلاد

Downloaded From http://paksociety.com

سے بھرا چمچا اپنی پلیٹ میں پلٹا۔

''کر دیا تھا''۔ ان کے لہجے میں عجب کاٹ تھی جو حیا کے لیے نئی تھی۔

''ابا! سبین پھوپھو شادی پہ آئیں گی؟'' وہ پوچھے بنا رہ نہ سکی۔

''کل مہندی ہے، آنا ہوتا تو اب تک آ گئی ہوتی۔ تیس سالوں میں جو عورت صرف چند دفعہ ملنے آئی ہو، وہ اب بھی نہ آئے تو بہتر ہے''۔

حیا تو کیا، فرقان تایا بھی دنگ رہ گئے۔

''سلیمان! کیا ہوا ہے؟''

''تھینک یو بیٹا!'' جواب دینے کی بجائے سلیمان صاحب نے اسے مخاطب کیا تو وہ ''اب تم جاؤ'' کا اشارہ سمجھ کر سر جھکائے وہاں سے چلی آئی۔ بہت آہستہ سے سلاد کا پیالا میز پہ رکھا اور اپنی آدھی بھری پلیٹ اُٹھائی، مگر اب کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

یہ ابا کو کیا ہو گیا تھا؟ وہ پھپھو کے بارے میں ایسے گفتگو کیوں کر رہے تھے؟ پھر وہ رہ نہیں سکی۔ اپنی پلیٹ لیے اس ستون کے پیچھے آ کھڑی ہوئی جس کی دوسری جانب تایا اور ابا کھڑے تھے۔ بظاہر اپنی پلیٹ پہ سر جھکائے، اس کے کان ان ہی کی طرف لگے تھے۔

''حیا کے لیے عمیر لغاری نے اپنے بیٹے کا پروپوزل دیا ہے''۔ سلیمان صاحب اپنے دوست اور اپنی کمپنی کے شیئر ہولڈر کا نام لے کر کہہ رہے تھے اور اس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ لرز گئی، دل سہم اُٹھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' تایا فرقان ششدر رہ گئے تھے۔

''بھائی! اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ ولید اچھا لڑکا ہے، کل مہندی پہ آئے گا تو آپ کو ملواؤں گا۔ سوچ رہا ہوں، حیا سے پوچھ کر ہاں کر دوں''۔

''مگر..... مگر سلیمان! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا بھائی!''

''تم حیا کی شادی یوں کیسے کر سکتے ہو؟''

''باپ ہوں اس کا، کر سکتا ہوں، فاطمہ بھی راضی ہے اور مجھے یقین ہے کہ حیا کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''اور جہان..... جہان کا کیا ہوگا؟''

''کون جہان؟'' سلیمان صاحب یکسر انجان بن گئے۔

''تمہارا بھانجا، سبین کا بیٹا جہان، جس سے تم نے حیا کا نکاح کیا تھا، تم کیسے بھول سکتے ہو؟''

جواباً سلیمان صاحب نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

''وہ اکیس سال پرانی بات ہے اور حیا اب بائیس سال کی ہو چکی ہے۔ بے وقوفی کی تھی میں نے کہ سبین پر اعتبار کر کے اپنی بچی کا نکاح اس کے بیٹے سے کر دیا تھا۔ کیا ان اکیس برسوں میں کبھی سبین نے مڑ کر پوچھا کہ اس نکاح کا کیا بنا؟ یا کیا بنے گا؟ زیادہ سے زیادہ وہ چھ ماہ میں ایک فون کر لیتی ہے اور تین منٹ بات کر کے رکھ دیتی ہے۔ آپ کو واقعی لگتا ہے کہ وہ لوگ اس رشتے کو قائم رکھنا چاہتے ہیں؟''

''مگر سبین تو سکندر کی وجہ سے، تم جانتے ہو وہ اُلٹے دماغ کا شخص.....''

''میں کیسے مان لوں کہ صرف اپنے مغرور اور بد دماغ شوہر کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کا نکاح بھول سکتی ہے؟ اتنے برس بیت گئے، اس نے پھر کبھی رشتے یا شادی کی بات منہ سے نہیں نکالی۔ میں اس سے کیا اُمید رکھوں؟''

''مگر جہان تو اچھا لڑکا ہے، تم اس سے ملے تو تھے پچھلے سال جب تم استنبول گئے تھے''۔

''جی..... جہان سکندر..... اچھا لڑکا..... مائی فٹ!'' انہوں نے تلخی سے سر جھٹکا۔

''اس کے تو مزاج ہی نہیں ملتے۔ وہ ترکی میں پیدا ہوا ہے، اس نے کبھی پاکستان کی شکل نہیں دیکھی۔ نہ اسے اُردو آتی ہے، نہ پنجابی۔ کبھی ان تمام برسوں میں اس نے اپنے کسی ماموں کا حال پوچھا؟ کبھی فون کیا؟ میں یہ سب بھول جاتا مگر جب میں پچھلے سال استنبول

Downloaded From http://paksociety.com

گیا تو کیا آپ یقین کریں گے بھائی کہ میں اٹھارہ روز وہاں رہا۔ میں روز سبین کے گھر جاتا تھا، سکندر تو ملا ہی نہیں اور جہان..... جہان آخری روز مجھ سے ملا اور وہ بھی پندرہ منٹ کے لیے بس۔ وہ بھی جب اس کی ماں نے میرا نام بتایا تو کافی دیر بعد اسے یاد آیا کہ میں اس کا کوئی دور پار کا ماموں ہوتا ہوں۔ پھر جانتے ہیں وہ مجھ سے کیا پوچھنے لگا.....؟ کیا پاکستان میں روز بم دھماکے ہوتے ہیں اور کیا وہاں انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہے؟ پھر اس کا فون آیا اور وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ میں کبھی حیا کے لیے کورٹ سے خلع لینے کے متعلق نہ سوچتا، اگر میں اس روز ایک ترک لڑکی کو جہان کو گھر ڈراپ کرتے نہ دیکھ لیتا، جب میں فلائٹ پکڑنے سے قبل سبین کو خدا حافظ کہنے گیا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ اس کی بے تکلفی ..... الامان۔ وہ سکندر شاہ کا بیٹا ہے اور وہ اپنے باپ کا ہی پرتو ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر احمد شاہ جیسے عظیم انسان کا بیٹا ہو کر سکندر اس کے برعکس نکلا تو ویسے ہی جہان بھی اپنے باپ کے برعکس نکلے گا اور ایک اچھا انسان ہوگا مگر نہیں۔ وہ اسی مغرور آدمی کا مغرور بیٹا ہے۔ حیا کون ہے، اس کا ان سے کیا تعلق ہے، یہ بات نہ جہان کو یاد تھی، نہ سبین کو۔ سبین تو یہ ذکر ہی نہیں کرتی، اب میں اپنی بیٹی کو زبردستی ان کے گھر بھیج دوں کیا؟ خیر! کل ولید سے ملواؤں گا آپ کو، اب جو رشتہ بھی اچھا لگا، میں حیا کی ادھر شادی کر دوں گا اور.....''

اب اس میں مزید سننے کی تاب نہیں تھی۔ وہ سفید چہرہ لیے بوجھل قدموں سے چلتی ان سے دور ہٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

جہان سکندر کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بس بچپن سے اپنے اور اس کے رشتے کے متعلق سنا تھا۔ وہ سال بھر کی تھی، جب سبین پھپھو پاکستان آئیں اور فرطِ جذبات میں اپنے آٹھ سالہ بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ جذباتی سی کارروائی ہوئی اور دونوں بہن، بھائیوں نے بچوں کا نکاح کر دیا۔ تب آٹھ سالہ جہان ان کے ساتھ تھا۔ پھر وہ ترکی چلا گیا۔

اکیس سال گزر گئے، وہ ترکی میں ہی رہا، کبھی پاکستان نہیں آیا اور اس وزٹ کے بعد تو سبین پھپھو بھی نہیں آئیں۔ نہ کبھی انہوں نے کوئی تصویر بھیجی، نہ خط لکھا۔

اگر کبھی کوئی ترکی چلا جاتا تو ان سے مل آتا، ورنہ ان سے رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ انٹرنیٹ وہ استعمال نہیں کرتی تھیں۔ اگر جہان کرتا تھا تو بھی اس کا کوئی ای میل، فیس بک، ٹوئٹر، کسی کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ارم وغیرہ اسے فیس بک پہ سرچ کر کر کے تھک گئے تھے مگر ترکی کا کوئی Jihan Sikander انہیں نہیں ملتا تھا۔

شروع کے چند برس پھپھو بہت فون کرتی تھیں، پھر آہستہ آہستہ یہ رابطے زندگی کی مصروفیات میں کھو گئے۔ تین ماہ میں ایک فون ان کا آجاتا اور تین ماہ بعد ایک فون ادھر سے چلا جاتا۔ یوں چھ ماہ میں دو ہی دفعہ بات ہو پاتی۔ رسمی علیک سلیک، موسم کا حال، سیاست پہ تبادلہ خیال اور پھر اللہ حافظ۔

ان تمام باتوں کے باوجود وہ خود کو ذہنی اور جذباتی طور پر جہان سے وابستہ کر چکی تھی۔ نکاح کے وقت کی تصاویر آج بھی اس کے پاس محفوظ تھیں۔ آٹھ سالہ بھورے بالوں اور سنہری رنگت والا خوب صورت سا لڑکا، جس کو اس نے اپنے روبرو کبھی نہیں دیکھا تھا اور شاید ترکی جانے کی ساری خوشی کی وجہ بھی یہی تھی، جس پر ابا نے پانی پھیر دیا تھا۔ اس روز اسے رہ، رہ کر پھپھو اور جہان پہ غصہ آرہا تھا جن کی بے رُخی کے باعث اب یہ رشتہ ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔

مگر خیر، داور بھائی کی شادی ہو جائے، اور سمسٹر ختم ہو جائے، پھر وہ ترکی جائے گی اور ان لوگوں کو ضرور ڈھونڈے گی۔

☆ ☆ ☆

''حیا..... حیا! کدھر ہو؟''

وہ لابی میں آویزاں آئینے کے سامنے کھڑی ماتھے پہ ٹیکا درست کر رہی تھی، جب فاطمہ بیگم اسے پکارتی آئیں۔

ہر طرف گہما گہمی تھی۔ ایک ناقابلِ فہم شور سا مچا تھا۔ مہندی کا فنکشن باہر شروع ہو چکا تھا۔ سب باہر جانے کی جلدی مچائے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھیں۔

''کیا ہوا اماں؟'' وہ ٹیکے کے ساتھ اُلجھی ہوئی تھی جو ماتھے پہ سیٹ ہو کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ سونے کا گول سکے کی شکل کا ٹیکا جس

Downloaded From http://paksociety.com

کے نیچے ایک سرخ روبی لٹک رہا تھا۔ بار بار اِدھر اُدھر جھول جاتا، ٹیکے کو ٹھیک کرتے ہوئے مسلسل اس کی کلائیوں میں بھری چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔

''جلدی آؤ، تمہارے ابا بلا رہے ہیں، کسی سے ملوانا ہے تمہیں''۔ ان کی آواز میں خوشی کی رمق محسوس کر کے وہ چونک کر ان کو دیکھنے لگی۔ نفیس سی سلک کی ساڑھی اور ڈائمنڈز پہنے، وہ خاصی باوقار اور خوش لگ رہی تھیں۔ اس کی اُنگلیوں نے ٹیکا چھوڑ دیا۔ دل زور سے دھڑکا۔ کیا پھوپھو آ گئیں تھیں اور ان کا مغرور بیٹا بھی۔۔۔؟

''کدھر ہیں ابا؟'' وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ان کے پیچھے باہر نکلی۔ گیٹ کے قریب سلیمان کھڑے دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے ساتھ ایک خوبرو سا لڑکا کھڑا تھا، جس کے شانے پہ ہاتھ رکھے وہ کچھ کہہ رہے تھے۔ سامنے خاصے باوقار سے سوٹ میں ملبوس ایک صاحب اور ایک ڈیسنٹ سی خاتون تھیں۔

وہ دونوں پہلوؤں سے لہنگا ذرا سا اُٹھائے ہوئے ان کے قریب آئی۔

''یہ حیا ہے..... میری بیٹی!'' سلیمان صاحب نے مسکرا کر اسے شانوں سے تھاما۔

''السلام علیکم''۔ اس نے سر کو جنبش دیتے ہوئے مدھم سا سلام کیا۔

''وعلیکم السلام بیٹا!'' وہ تینوں دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔

اس نے ڈل گولڈن لہنگا اور کام دار بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کی آستین آدھی سے بھی چھوٹی تھیں اور ان سے نکلتے اس کے دودھیا بازو سنہرے موتیوں کی شعاؤں میں سنہرے دکھ رہے تھے۔ بھاری کام دار دوپٹہ اس نے گردن میں ڈال رکھا تھا۔ بال ہمیشہ کی طرح سیدھے کر کے کمر پہ گرا رکھے تھے۔ ٹیکے کے ساتھ کے سنہرے جھمکے کانوں سے لٹک رہے تھے اور ملائی سے بنا چہرہ ہلکے سے سنگھار سے مزید دل کش لگ رہا تھا۔ اس نے کاجل سے لبریز پلکیں اُٹھائیں۔ وہ تینوں ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''اور حیا! یہ میرے دوست ہیں عمیر لغاری۔ یہ مہناز بھابھی ہیں اور یہ ان کے صاحبزادے ہیں ولید''۔

اس کے دل پہ ایک بوجھ سا آ گرا۔ آنکھوں میں بے اختیار نمکین پانی بھر آیا، جسے اس نے اندر اُتار لیا۔

''نائس ٹو میٹ یو، وہ..... وہ مہمان آنے لگے ہیں، میں پھول کی پتیاں ادھر رکھ آئی تھی، سب مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے، تو میں.....''

''ہاں، ہاں تم جاؤ، انجوائے کرو''۔ سلیمان صاحب نے آہستگی سے اس کے شانوں سے ہاتھ ہٹایا۔ وہ معذرت خواہانہ مسکراتی گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ باہر آ کر اس نے بے اختیار آنکھوں کے بھیگے گوشے صاف کیے اور ایک نظر پلٹ کر ان کو دیکھا، پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

ان کے گھر کے ساتھ خالی پلاٹ میں شامیانے لگا کر مہندی کا فنکشن ارینج کیا گیا تھا۔ مہندیاں دونوں گھرانوں کی الگ الگ تھیں۔

گیندے کے پھولوں اور موتیے کی لڑیوں سے ہر کونا سجا تھا۔ روشنیوں کی ایک بہار سی اُتری ہوئی تھی۔ تقریب سیگریگیٹڈ segregated تھی۔ مرد الگ، عورتیں الگ۔ ہاں عورتوں والی طرف خاندان کے مردوں کا آنا جانا لگا تھا۔ میوزک سسٹم کے ساتھ ڈی جے بیٹھا تھا اور موویی میکر کیمرا لیے پھر رہا تھا۔ ارم بھی سلور کام دار لہنگے میں ادھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ وہاں ڈی جے، موویی والے اور ریفریشمنٹ سرو کرتے ویٹرز، باہر کے مرد تھے مگر آج تو شادی کا ایک فنکشن تھا، پھر سر ڈھکنے کی پابندی کیسے ہوتی؟ شادیوں پہ تو خیر ہوتی ہے نا۔

''حیا! ڈانس شروع کریں؟'' ارم اپنا لہنگا سنبھالتی اس کے پاس آئی۔ داور بھائی پہ سارے ارمان نکال کر تمام رسمیں کر کے ان کو مردانے میں بھیج دیا گیا تھا۔

''ہاں! ٹھیک ہے، تم گانا لگواؤ اور..... یہ کون ہے؟'' وہ مصروف سے انداز میں ارم سے بولتی لحظہ بھر کو چونکی۔ سامنے والی کرسیوں کی قطار کے ساتھ ایک لڑکی کھڑی ایک کرسی پہ بیٹھی خاتون سے جھک کر مل رہی تھی۔ اس نے سیاہ عبایا اور اوپر اسٹول لے رکھی تھی۔ وہ عورتیں کا فنکشن تھا، پھر بھی عجیب بات تھی کہ اس لڑکی نے اُنگلیوں سے نقاب تھام رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں اور ماتھے کا کچھ حصہ نقاب سے جھلک رہا تھا، اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ وہ جیسے مسکراتے ہوئے ان خاتون سے کچھ کہہ رہی تھی۔

''کون؟'' ارم نے پلٹ کر دیکھا، پھر گہری سانس لے کر واپس مڑی۔ ''یہ ایلین alien ہیں''۔

Downloaded From http://paksociety.com

''کون؟'' حیا نے حیرت سے کہا۔

''ایلین، ارے بھائی شہلا بھی ہیں یہ۔ پوری دُنیا سے الگ ان کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہوتی ہے۔ بس توجہ کھینچنے کے لیے فنکشنز پر بھی عبایا، نقاب میں ملتی ہیں۔ اب پوچھو، بھلا عورتوں کے فنکشن میں کس سے پردہ کر رہی ہیں؟''

''ہاں، واقعی، عجیب ہیں یہ بھی!'' اس نے شانے اُچکائے۔ وہ ان کے ایک سیکنڈ کزن کی وائف تھیں اور سال بھر پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔

ڈی جے نے گانا سیٹ کر دیا تھا۔ خوب شور ہنگامہ شروع ہو گیا۔

انہوں نے مووی والے کو ڈانس کی مووی بنانے سے منع کر دیا اور پھر اپنا مہارت سے تیار کردہ رقص شروع کیا۔ ایک سنہری پری لگ رہی تھی تو دوسری چاندی کی۔ جب پاؤں دُکھ گئے اور خوب تالیاں بجیں تو وہ ہنستی ہوئی واپس کرسیوں کی طرف آئیں۔

''السلام علیکم شہلا بھابھی!'' وہ لڑکی بھی اسی میز پہ موجود تھی۔ مہوش، سحرش، اور ثناء بھی اپنی امی کے ساتھ وہیں تھیں۔ ارم نے فوراً سلام کیا، حیا نے بھی پیروی کی۔

''وعلیکم السلام، کیسی ہو تم دونوں؟'' وہ مسکرا کر خوش دلی سے ملی۔ ایک ہاتھ کی دو اُنگلیوں سے اس نے ابھی تک سیاہ نقاب تھام رکھا تھا۔

''بالکل ٹھیک، شہلا بھابھی! نقاب اُتار دیں، اِدھر کون ہے؟''

شہلا نے جواباً مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا، مگر نقاب اسی طرح پکڑے رکھا۔

''ماشاء اللہ تم دونوں بہت پیاری لگ رہی ہو''۔

وہ بات کرتے کرتے ذرا سی ترچھی ہو گئی۔ حیا نے حیرت سے دیکھا۔ شاید اس طرف مووی والا فلم بنا رہا تھا، اسی لیے۔

''عجیب عورت ہے، اتنی بھی کیا بے اعتباری، ہماری فیملی مووی ہے، ہم کون سا باہر کسی کو دکھائیں گے''۔ حیا بڑبڑائی۔

پھر وہ جلد ہی معذرت کر کے وہاں سے چلی آئی۔ اس میز پہ عابدہ چچی بھی تو بیٹھی تھیں، اور کل ان کی باتیں سن لینے کے بعد اتنی منافقت اس میں نہیں تھی کہ وہ عابدہ چچی اور صائمہ تائی سے ہنس ہنس کر باتیں کر سکتی۔ اماں جانے کدھر تھیں۔ کس سے پوچھے کہ سبین پھوپھو آئی ہیں یا نہیں۔ اور آئیں گی یا نہیں۔ کافی دیر شش و پنج میں مبتلا رہی، پھر گھر چلی آئی اور لاؤنج میں ٹیلی فون اسٹینڈ کے ساتھ رکھی ڈائری اُٹھائی۔ رقص کے باعث پاؤں درد کرنے لگے تھے۔ وہ صوفے پہ دھم سے گری، ایک ہاتھ سے گولڈن ہائی ہیلز کے اسٹریپس کھول کر انہیں اُتارا اور ننگے پاؤں ٹھنڈے ماربل کے فرش پہ رکھ دیے۔ ساتھ ہی وہ ڈائری کے صفحات پلٹتی سبین پھپھو کا نمبر تلاش کر رہی تھی۔ اس نے کبھی ان کو یوں فون نہیں کیا تھا، مگر آج وہ دل کے ہاتھوں ہار گئی تھی۔ تڑکا کا وہ نمبر مل ہی گیا۔ اس نے ریسیور اُٹھایا اور نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی جانے لگی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ پانچویں گھنٹی پہ فون اُٹھا لیا گیا۔

''ہیلو''۔ بھاری مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''السلام علیکم''۔ اس نے خشک لبوں پہ زبان پھیری۔

جواباً وہ کسی انجان زبان میں کچھ بولا۔

''میں پاکستان سے بات کر رہی ہوں''۔ وہ گڑبڑا کر انگریزی میں بتانے لگی۔

''پاکستان سے کون؟'' اب کے وہ انگریزی میں پوچھ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔

''میں سبین سکندر کی بھتیجی ہوں۔ پلیز ان کو فون دے دیں''۔

''وہ جواہر تک گئی ہیں، کوئی میسج ہے تو بتا دیں''۔ وہ مصروف سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اب یہ جواہر کیا تھا، اسے کچھ اندازہ نہ تھا۔

''وہ..... وہ سبین پھپھو نے پاکستان نہیں آنا کیا دلاور بھائی کی شادی پر؟''

''نہیں، وہ بزی ہیں''۔ شاید وہ فون رکھنے ہی لگا تھا کہ وہ کہہ اُٹھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''آپ.....آپ کون؟''

''ان کا بیٹا..... جہان!'' کھٹ سے فون رکھ دیا گیا۔

اس نے بھیگی آنکھوں سے ریسیور کو دیکھا اور پھر زور سے اسے کریڈل پہ پٹخا۔ بے اختیار اُمڈ آئے آنسو صاف کرتی وہ جھک کر سینڈل پہننے لگی۔ آنسوؤں نے آنکھوں کا میک اپ ذرا سا خراب کر دیا تھا۔ وہ اسے پھر سے ٹھیک کر کے کچھ دیر بعد باہر آئی تو گیٹ کی طرف سے ظفر چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سفید ادھ کھلے گلابوں کا بکے تھا۔

وہ بے اختیار ٹھٹک کر رُکی، پھر لہنگا سنبھالتی، برآمدے کے زینے میں اُتر آئی۔

''یہ کیا ہے ظفر؟''

''اوہ تسی اتھے ہو؟ یہ کوریئر والے نے دیا ہے تہاڈے لیے''۔ ظفر نے گلدستہ اور ایک بند لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ پچھلے سات سال سے تایا فرقان کا ملازم تھا۔ وہ گاؤں سے اسے لے کر آئے تھے، جب آیا تھا تو پنجابی بولتا تھا، پھر ان سات برسوں میں اُردو سیکھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اب وہ کوئی درمیانی زبان بولتا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ''۔ اس نے بوکے کو بازو اور سینے کے درمیان پکڑا اور دونوں ہاتھوں سے بند لفافہ کھولنے لگی۔

حسب معمول اس میں سفید سادہ کاغذ تھا، جس کے بالکل درمیان میں اردو میں ایک سطر لکھی تھی۔

''اس لڑکی کے نام..... جو کبھی کسی ان چاہے رشتے کے بننے کے خوف سے روتی ہے تو کبھی کسی بن چکے ان چاہے رشتے کے ٹوٹنے کے خوف سے''۔

وہ سُن رہ گئی پھر گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

گیٹ کھلا تھا۔ مہندی والی جگہ سے روشنیاں اور موسیقی کا بے ہنگم شور یہاں تک آ رہا تھا۔ درمیان میں بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ مہمان، نوکر چاکر وغیرہ۔ ایسے میں کیا کوئی ادھر تھا، جو اس کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا؟

اس نے لفافے کو پلٹا۔ کوریئر کی مہر ایک روز قبل کی تھی۔

ابھی دس منٹ قبل وہ جہان کے ساتھ پہلی دفعہ بات کر کے روئی تھی۔

''بن چکا، اَن چاہا رشتہ''۔

اور گھنٹہ بھر پہلے ولید اور اس کے والدین سے ملی تھی۔

''اَن چاہے رشتے کے بننے کے خوف.....''

یہ کون تھا جو اتنا باخبر تھا؟ ایک دن قبل ہی اسے کیسے علم ہوا کہ وہ آج دو دفعہ روئے گی؟

وہ خوف زدہ سی کھڑی، بار بار وہ تحریر پڑھے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''ابا نکل تو نہیں گئے؟''

وہ پرفیوم کی بوتل بند کر کے سنگھار میز پہ رکھتی، مخصوص ہارن اور گیٹ کھلنے کی آواز پہ موبائل اور پرس اُٹھا کر باہر کو بھاگی۔ کافی دیر سے وہ کمر ابند کر کے بارات میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ فاطمہ بیگم جلدی جلدی کا شور مچائے دس بار دروازہ بجا چکی تھیں۔ مقررہ وقت ہونے کو تھا، آج داور بھائی کی بارات تھی، سلیمان صاحب کو تو سب سے پہلے ہال پہنچنا تھا اور اس کی سست رو تیاریوں سے بھی وہ واقف تھے۔

پورچ خالی تھا۔ تایا فرقان کے پورشن سے البتہ شور سنائی دے رہا تھا، غالباً وہاں پر ابھی سب نہیں نکلے تھے۔ اب کیا کرے؟ ابا کو فون کرے یا تایا فرقان کے گھر جا کر کسی سے لفٹ مانگے؟

وہ انہی سوچوں میں اُلجھتی اندر جانے کو پلٹی ہی تھی کہ کھلے گیٹ پہ ہارن ہوا۔ اس نے رُک کر دیکھا۔

سیاہ چمکتی اکارڈ باہر کھڑی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس خاصی تیز تھی۔ حیا کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے بے اختیار ماتھے پہ ہاتھ کا

Downloaded From http://paksociety.com

سایہ بنا کر دیکھنا چاہا، تب ہی ہیڈ لائٹس دھیمی ہوئیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کا چہرہ واضح ہوا۔

وہ ولید لغاری تھا۔ ساتھ فرنٹ سیٹ پر اس کے والد تھے اور پیچھے والدہ۔

''السلام علیکم حیا!'' وہ دروازہ آدھا کھول کر باہر نکلا اور ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

وہ دھیمی ہوتی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔ گہرے سرخ کام دار بغیر آستینوں والا فراک جو پاؤں تک آتا تھا اور نیچے ہم رنگ تنگ پاجامہ۔ فراک بہت لمبا تھا، سو پاجامے کی چوڑیاں بمشکل بالشت بھر ہی دکھائی دیتی تھی۔ گولڈن دوپٹہ گردن میں تھا اور کانوں سے لٹکتے لمبے لمبے آویزے کندھوں کو چھو رہے تھے۔ کاجل سے لبریز سیاہ آنکھیں اور کمر پہ گرتے سیدھے بال۔

''ہمیں میرج ہال کا علم نہیں ہے، انکل ہیں؟'' وہ نگاہوں میں اسے جذب کرتے پوچھ رہا تھا۔

وہ متذبذب سی آگے آئی، پھر اسے نظر انداز کیے، لغاری صاحب کے دروازے کے ساتھ رُکی۔ ''انکل! پیراڈائز ہال جانا ہے اور ابا شاید نکل گئے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا''۔ وہ واقعتاً پریشان تھی۔

''اوہ..... تو آپ کے چچا وغیرہ؟''

''وہ تو ابا سے بھی پہلے چلے گئے تھے۔ ٹھہریں! ابا زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے، میں انہیں واپس.....''

''ارے وہ کیوں واپس آئیں؟ ان کا جلدی پہنچنا ضروری ہے، آپ ہمارے ساتھ آجاؤ بیٹا! ہم نے بھی تو وہیں جانا ہے''۔

''ہاں بیٹا، آؤ!'' مسز مہناز لغاری نے فوراً اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور دوسری طرف ہو گئیں۔

وہ چند لمحے تذبذب میں کھڑی رہی۔

اب اگر ابا کا انتظار کرتی تو آدھا فنکشن نکل جاتا اور اگر ان کے ساتھ جاتی تو..... ابا برا نہیں مانیں گے۔ یہ تو اسے یقین تھا۔

''چلیں ٹھیک ہے''۔ وہ ہچکچاتے ہوئے پچھلی سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

''تو ہماری بیٹی کیا کرتی ہیں؟'' راستے میں لغاری صاحب نے پوچھا تھا۔

(میں ان کی بیٹی کب سے ہو گئی؟)

''جی میں شریعہ اینڈ لاء میں ایل ایل بی آنرز کر رہی ہوں''۔

''یعنی کہ آپ اسلامی وکیل ہو؟''

''جی!'' وہ پھیکا سا مسکرائی۔ یہ لوگ اتنی اپنائیت کیوں دے رہے تھے اسے؟

''تو یہ شریعہ اینڈ لاء کیسا سبجیکٹ ہے؟'' عمیر لغاری نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ میں بنیادی طور پر ایک انجینئر ہوں اور انجینئرنگ شروع میں مجھے مشکل لگتی تھی، بعد میں آسان ہو گئی''۔

''مجھے شریعہ شروع میں مشکل لگتی تھی، بعد میں عادی ہو گئی''۔ وہ تینوں ہنس پڑے تو اسے احساس ہوا کہ اسے خوامخواہ ان کے ساتھ زیادہ بے تکلف نہیں ہونا چاہیے۔

''حیا بیٹا! آپ کا شادی کے بعد پریکٹس کا ارادہ ہے؟ کیونکہ میں اور آپ کے انکل تو کبھی اس معاملے میں زبردستی کے قائل نہیں رہے۔ ہم نے فیلڈ منتخب کرنے سے لے کر کریئر بنانے تک، ہر چیز میں اپنے بچوں کی مرضی کو مقدم رکھا ہے۔ خود ولید کو بھی شادی کے بعد بیوی کے جاب کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے''۔

مہناز کہہ رہی تھیں اور وہ ہکا بکا ان کو دیکھ رہی تھی۔ کیا معاملات اتنے آگے بڑھ چکے تھے یا وہ اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ ابا ان کو کبھی انکار نہیں کریں گے؟

بمشکل ہوں ہاں میں ان کے سوالات کے جوابات دیتی، وہ اس وقت پُرسکون ہوئی جب میرج ہال کی بتیاں نظر آنے لگیں۔

''لفٹ کا شکریہ انکل''۔ وہ انکل اور آنٹی کے ساتھ ہی باہر نکلی تھی۔ اسی پل لغاری انکل کا موبائل بجا تو معذرت کر کے ایک طرف چلے گئے، مہناز بھی ان کے پیچھے گئیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

''حیا سنیے!'' وہ جانے ہی لگی تھی کہ ولید نے پکارا۔ وہ ابھی تک اندر اسٹیرنگ وہیل تھامے بیٹھا تھا۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے''۔ وہ اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیے اس سے مخاطب تھا۔

''مگر یہ مناسب نہیں ہے''۔

''مگر مجھے اسی رشتے کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ اگر آپ دو منٹ اندر بیٹھ کر میری بات سن لیں تو''۔ ساتھ ہی اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

روشنی کا ایک کوندا اس کے ذہن میں لپکا۔ موقع اچھا تھا۔ وہ اس کو اپنے نکاح کے بارے میں بتا کر سارا معاملہ یہیں دبا سکتی تھی۔ لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی اور یہ چھے فٹ کا سانپ بھی راستے سے ہٹ جائے گا۔

''ٹھیک ہے، لیکن یہاں ہمارے رشتے دار ہیں اگر.....''

''ڈونٹ وری، میں کار بیک سائیڈ پر لے جاؤں گا، آپ بیٹھیے''۔

وہ متذبذب سی اندر بیٹھ گئی۔

زندگی میں پہلی دفعہ وہ یوں کسی لڑکے کے ساتھ تنہا بات کرنے بیٹھی تھی۔ ابا کو پتا چلتا تو ان کی ساری وسیع النظری بھک سے اُڑ جاتی۔ اسے لباس پہننے کی آزادی تھی، سر ڈھکنے کی پابندی بھی نہ تھی، مگر لڑکوں سے بے تکلفی یا دوستی کی اجازت ابا نے کبھی نہیں دی تھی۔

وہ بیٹھی تو ولید زن سے گاڑی بھگا لے گیا۔

''آپ کو جو بھی کہنا ہے، جلدی کہیے، پھر مجھے بھی کچھ کہنا ہے''۔ وہ سر جھکائے گود میں رکھے ہاتھوں کی اُنگلیاں مروڑ رہی تھی۔ عجیب مضطرب حالت ہو رہی تھی اس کی۔

''پہلے آپ کہیے''۔ ولید میرج ہال کی پچھلی طرف ایک نسبتاً سنسان گلی میں گاڑی لے آیا تھا۔

''او کے..... مجھے کچھ بتانا تھا''۔ وہ گردن جھکائے کہنے لگی۔ ''میرے ابا نے معلوم نہیں آپ کو بتایا ہے یا نہیں مگر میں بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔ میرا نکاح میری پھپھو کے بیٹے سے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ وہ لوگ ترکی میں ہوتے ہیں۔ کچھ خاندانی مسائل کے باعث میرے ابا ان سے ذرا بدظن ہیں اور اب مجھے ڈائیورس دلا کر میری شادی کہیں اور کرنا چاہتے ہیں مگر میں ایسا نہیں چاہتی''۔

اس نے سر نہیں اُٹھایا۔ ولید کی خاموشی سے اس نے یہی مراد لی کہ وہ سخت شاک کے عالم میں ہے۔

''میں اپنے شوہر کی وفادار ہوں، مسٹر ولید! میں نے اسی کے خواب دیکھے ہیں اور ذہنی طور پر خود کو اسی سے وابستہ پاتی ہوں۔ اب کسی اور سے شادی کرنے کے بارے میں مَیں سوچ بھی نہیں سکتی''۔

وہ اب بھی کچھ نہ بولا۔ حیا گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولتی جا رہی تھی۔

''پلیز آپ انکار کر دیں۔ میں کسی اور کی بیوی ہوں۔ نکاح پر نکاح نہیں ہو سکتا، پلیز! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں''۔

اس نے چہرہ اوپر اُٹھایا۔ وہ یک ٹک خاموش گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کا چہرہ تو نہ تھا، جو وہ سارا راستہ ڈرائیونگ کے دوران دیکھتی آئی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی شخص تھا۔

''پھر..... پھر آپ نے کیا سوچا؟'' اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔ ولید کی آنکھوں میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ اسے لگا وہ ایک سنگین غلطی کر چکی ہے۔ خطرے کا الارم زور، زور سے اس کے اندر بجنے لگا۔

''کس بارے میں؟'' وہ بوجھل آواز میں بولا تو وہ دروازے کی طرف سمٹی۔ نامحسوس انداز سے اس کا ہاتھ ہینڈل پر رینگ گیا۔

''آپ کے اس رشتے سے انکار کے بارے میں''۔

''ساری عمر پڑی ہے یہ باتیں کرنے کے لیے حیا! ابھی تو ان لمحوں سے فائدہ اُٹھاؤ جو میسر ہوں''۔ وہ ایک دم اس پر جھکا۔ حیا کے لبوں سے چیخ نکلی۔ ولید نے دونوں ہاتھ اس کی گردن پہ رکھنے چاہے، مگر اس نے زور سے ہینڈل کھینچ کر دروازہ دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے ولید کو دھکا دے کر باہر نکلی۔ اس کا دوپٹہ ولید کے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر بھاگی تو ولید نے دوپٹہ کھینچا۔ دوپٹہ

Downloaded From http://paksociety.com

اس کی گردن کے ساتھ رگڑتا ہوا پیچھے ولید کے ہاتھوں میں رہ گیا۔ وہ بنا پیچھے مڑ کے دیکھے، بھاگی جا رہی تھی۔

اسے ولید کے دروازہ کھول کر کوئی اونچی سی انگریزی گالی دینے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس کے بھاگتے قدموں میں تیزی آ گئی۔

گلیاں سنسان تھیں۔ جانے وہ کہاں لے آیا تھا۔ آج اتوار تھا اور دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر بدحواس سی دوڑتی ہوئی ایک گلی میں مڑ گئی۔

پیچھے کوئی دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی گلی کے دوسرے سرے تک پہنچی، مگر یہ کیا؟ گلی بند تھی۔ ڈیڈ اینڈ۔

وہ بے ساختہ پلٹی۔ بھاگتے قدموں کی آواز قریب آ رہی تھی۔

وہ دوڑ کر گلی کے بند سرے تک گئی اور دیوار کی اینٹوں کو چھو کر ٹٹولا۔ شاید اندر کوئی جادوئی دروازہ ہو۔ شاید ہیری پوٹر کی کہانیاں سچ ہوں مگر.....

''کیوں بھاگتی ہو؟'' مسرور سے انداز میں کسی نے پیچھے سے کہا تو وہ گھبرا کر پلٹی۔

ولید سامنے سے قدم قدم چلتا آ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ نڈھال سی دیوار سے لگ گئی۔ اس کا دوپٹہ تو وہیں رہ گیا تھا۔ اب بغیر آستینوں کے جھلکتے بازو اور گلے کا گہرا گھاٹ۔ اس نے بے اختیار سینے پہ بازو لپیٹے۔

''مجھے جانے دو!'' اس کی آواز بھرا گئی۔ پہلی دفعہ یہ غلطی کی تھی اور پہلی ہی دفعہ اتنی بڑی سزا؟

''کیسے جانے دوں، پھر تم نے ہاتھ تھوڑا ہی آنا ہے؟'' وہ چلتے چلتے اس سے چند قدم کے فاصلے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ دور لگے اسٹریٹ پول کا بلب اس کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

''پلیز، میں ایسی لڑکی نہیں ہوں''۔

''تو کیسی لڑکی ہو؟ مجھ سے لفٹ لے لی مگر شادی سے انکار ہے؟ تب ہی گاڑی میں اتنی بے رُخی دکھا رہی تھیں؟'' وہ اس کے بالکل سامنے آ رُکا۔

''پلیز.....'' وہ ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اب ولید کو دھکا دیتی۔

''شش!'' وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا۔ حیا نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔

تب ہی اس نے زور سے کسی ضرب لگنے کی آواز سنی اور پھر ولید کی کراہ۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

ولید چکرا کر نیچے گر رہا تھا اور اس کے پیچھے کوئی کھڑا نظر آ رہا تھا۔

شوخ نارنجی شلوار قمیص میں ملبوس، میک اَپ سے اٹا چہرہ لیے، وہی اس روز والا خواجہ سرا، ڈولی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فرائنگ پان تھا، جو اس نے شاید ولید کے سر پہ مارا تھا۔ وہ ساکت سی اس کو دیکھ رہی تھی۔

ڈولی نے پاؤں سے ایک ٹھوکر ولید کو ماری تو اس کا بے ہوش وجود ذرا پرے ہوا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور عین حیا کے سامنے رُکا۔

اس کی سلور چمکیلے آئی شیڈو سے اٹی آنکھوں میں ایسی کاٹ تھی کہ وہ سانس روکے اسے دیکھے گئی۔

تب ہی اس نے ہاتھ بڑھایا اور حیا کو گردن کے پیچھے دبوچا، یوں کہ گدی پہ گرے بال بھی اس کی گرفت میں آ گئے۔ ڈولی کے ہاتھ اور حیا کی گردن کے درمیان اس کے بال تھے، پھر بھی اس کے ہاتھ کا کھردرا پن وہ محسوس کر سکتی تھی، لیکن لبوں سے کراہ تک نہ نکلی۔

اس کی گردن کو یوں ہی پیچھے سے دبوچے، ڈولی نے ایک جھٹکے سے اسے آگے دھکیلا۔ وہ بے اختیار کھانسی مگر ڈولی کی بے رحم گرفت ڈھیلی نہ پڑی۔ وہ اسے اسی طرح پکڑے اپنے آگے آگے دھکیل کر چلا رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چل رہی تھی۔

گلی کے آغاز تک جہاں سے وہ آئی تھی، وہ اسے لے گیا، پھر مخالف سمت میں مڑ گیا۔ سامنے ہی میرج ہال کا پچھلا حصہ تھا۔ وہ اسے اپنے آگے دھکیلتا پچھلے گیٹ تک لے آیا اور ایک جھٹکے سے اسے چھوڑا۔ حیا کو لگا، اس کی گردن کے گرد سے ایک کھردرا طوق ہٹا ہے۔ اس نے پلٹ کر ڈبڈبائی آنکھوں سے ڈولی کو دیکھا۔

وہ ابھی تک لب بھینچے، تلخ کاٹ دار نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

حیا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اسے لگا، وہ اب کبھی بول نہیں پائے گی۔ دفعتاً ڈولی نے اپنی گردن سے لپٹا نارنجی دوپٹہ کھینچا اور اس پہ اُچھالا۔ دوپٹہ اس کے سر پہ آن ٹھہرا، پھر سلکی بالوں سے پھسلتا ہوا شانوں پہ ڈھلک گیا۔ ڈولی چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا، آہستہ سے بولا۔

''بے حیا!''

اس کے لہجے میں برچھی کی کاٹ تھی۔ پھر وہ پلٹ گیا۔ وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ نارنجی دوپٹہ اس کے کندھوں سے پھسل کر قدموں میں آ گرا تو وہ چونکی، پھر جھک کر دوپٹہ اُٹھایا۔

ریشمی بھڑکیلا نارنجی دوپٹہ جس پر سستا سا گولڈن ستاروں کا کام تھا، وہ کبھی اپنی مائی کو بھی ایسا دوپٹہ نہ دیتی، مگر آج.....

اس نے اچھے طریقے سے خود کو اس دوپٹے میں لپیٹا، تاکہ پہچانی نہ جائے اور پچھلے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

ہال میں جانے کی بجائے وہ باتھ رومز کی طرف آئی اور اپنا حلیہ درست کیا۔ رونے سے کاجل بہہ گیا تھا۔ بال بھی بکھرے تھے۔ موبائل اس چھوٹے سے کلچ میں تھا، جو اس نے اس سارے عرصے میں اپنے بائیں ہاتھ میں دبوچے رکھا تھا، شکر!

اندر فنکشن اپنے عروج پہ تھا۔

اسٹیج پہ دولہا، دُلہن، رشتے داروں، کزنز اور دوستوں کے جلو میں مسکرا رہے تھے۔ سونیا بھابھی بھی بہت اچھی لگ رہی تھیں اور داور بھائی بھی۔ ارم فیروزی فراک میں چہکتی ہوئی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ اصولاً اسے بھی وہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ ایسی ذہنی حالت میں نہ تھی کہ وہ دو قدم بھی چل پاتی، سو بے دم سی ایک آخری نشست پر گری ہوئی تھی۔

''بے حیا''۔

''بے حیا''۔

''بے حیا''۔

ڈولی کے الفاظ کی بازگشت ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر برس رہی تھی۔ وہ بے حیا تو نہیں تھی۔ وہ تو کبھی کسی لڑکے کی گاڑی میں نہیں بیٹھی تھی۔ اس سے تو یہ غلطی پہلی دفعہ ہوئی تھی، پھر.....؟ سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جاتا تھا۔

وہ آدھے فنکشن کے بعد ہی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے چلی آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ داور اور سونیا کی شادی کے چند روز بعد کا ذکر ہے۔

صبح سے سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ دسمبر ختم ہونے کو تھا اور ہوا ٹھٹھرا دینے والی بن چکی تھی۔ ایسے میں وہ کیمپس میں اسکالرشپ کو آرڈینیٹر کے آفس کے باہر دروازے پہ لگی لسٹ دیکھ رہی تھی۔ ''ارسمس منڈس ایکسچینج پروگرام'' کے تحت اسٹوڈنٹس میں سے صرف دو لڑکیاں سانجی یونیورسٹی جا رہی تھیں۔

حیا سلیمان اور خدیجہ رانا۔

''یہ خدیجہ رانا ہے کون بھلا؟'' وہ سوچتے ہوئے اپنے یخ ہوتے ہاتھ آپس میں رگڑ رہی تھی۔ سردی سے اس کی ناک سرخ پڑ رہی تھی۔ لانگ شرٹ اور ٹراؤزر پر اسٹائلیش سا لانگ سوئیٹر پہنے وہ دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ دفعتاً عقب سے کسی نے پکارا۔

''ایکسکیوزمی!''

وہ چونک کر پلٹی۔ پیچھے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ کندھے پہ بیگ، ہاتھ میں ڈائری اور پین اور آنکھوں پر بڑا سا چشمہ۔ وہ اس کو نام سے نہیں پہچانتی تھی مگر اس کو کئی دفعہ یونیورسٹی میں دیکھا ضرور تھا۔ وہ لڑکی اسے خوامخواہ ہی بہت بری لگی تھی۔

''یہ حیا سلیمان کون ہے بھلا؟'' وہ چشمے کے پیچھے سے آنکھیں سکیڑے سوچتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

حیا نے ایک طنزیہ نگاہ میں اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا، پھر ذرا روکھے انداز میں بولی۔ ''میں ہوں!''

Downloaded From http://paksociety.com

''اوہ!'' اس نے جیسے بمشکل اپنی ناگواری چھپائی۔

''میں آپ کے ساتھ نرکی جا رہی ہوں حیا! میں خدیجہ ہوں، میری فرینڈز مجھے 'ڈی جے' کہتی ہیں، مگر آپ میری فرینڈ نہیں ہیں، سو خدیجہ ہی کہیے گا''۔

''مجھے بھی حیا صرف میرے فرینڈز کہتے ہیں۔ آپ مجھے مس سلیمان کہہ سکتی ہیں''۔ وہ کہہ کر پلٹ گئی۔

عجیب بد دماغ لڑکی تھی وہ خدیجہ رانا۔ اسے پہلے بھی خواہ مخواہ ہی بہت بری لگی تھی اور اب اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے بھی حیا کے بارے میں خیالات کچھ ایسے ہی تھے۔

وہ جیسے ہی گھر آئی، ظفر سامنے آ گیا۔ بھاگتا ہوا، ہانپتا ہوا۔

''حیا بی بی..... حیا بی بی!''

''بول بھی چکو اب!'' وہ گاڑی لاک کرتی کوفت زدہ ہوئی۔

''آپ کو ارم بی بی بلا رہی ہیں''۔

''خیریت؟''

''خیریت نہیں لگتی جی۔ وہ بہت رو رہی ہیں'' ظفر نے رازداری سے بتایا تو وہ چونکی۔

''اچھا..... میں آتی ہوں، تم یہ میرا بیگ اندر رکھ دو''۔ وہ سیدھا ارم کے گھر کھلنے والے درمیانی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

لاؤنج میں صائمہ تائی اور سونیا بیٹھی تھیں۔ سامنے کوئی کام دار دوپٹہ پھیلا رکھا تھا اور دونوں اس کے ساتھ اُلجھی تھیں۔ آہٹ پہ سر اُٹھایا۔ اسے دیکھ کر دونوں ہی مسکرا دیں۔

''حیا! کیسی ہو؟''

''بالکل ٹھیک، ارم کدھر ہے تائی اماں! مجھے بلا رہی تھی''۔

''اندر کمرے میں ہو گی''۔

''اوکے، میں دیکھ لیتی ہوں''۔ وہ مسکرا کر راہ داری کی سمت بڑھ گئی۔

ارم کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ڈور ناب گھما کر دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا، بیڈ پر ارم اکڑوں بیٹھی تھی۔ سامنے لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا، چمکتی اسکرین کی روشنی ارم کے چہرے کو چمکا رہی تھی، جس پہ آنسو لڑیوں کی صورت بہہ رہے تھے۔

''ارم! کیا ہوا؟'' وہ قدرے فکرمندی سے ارم کے سامنے آ بیٹھی۔

ارم نے سرخ متورم آنکھیں اُٹھا کر حیا کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا، جو اسے ٹھٹکا گیا۔

''حیا! ایک بات بتاؤ!'' اس کا رندھا ہوا لہجہ عجیب سا تھا۔

''بولو!''

''ہم شریف لڑکیاں ہیں کیا؟''

''اپنے بارے میں تو یقین ہے مگر تمہارا معاملہ ذرا مشکوک ہے''۔ اس نے ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کو کہا، مگر ارم مسکرائی تک نہیں۔

''نہیں حیا! ہم دونوں کا ایک ہی معاملہ ہے''۔

''کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟ ہوا کیا ہے؟''

''حیا مجھے بتاؤ، کیا ہم مجرا کرنے والیاں ہیں؟'' وہ ایک دم رونے لگی تھی۔

''ارم!'' وہ ششدر رہ گئی۔

''بتاؤ، کیا ہم طوائفیں ہیں؟'' وہ اور زور سے رونے لگی۔

''ارم! بات کیا ہوئی ہے؟''

Downloaded From http://paksociety.com

''حیا! بولو، بتاؤ، ہم ایسی ہیں کیا؟''

''نہیں، بالکل نہیں!''

''پھر..... پھر یہ کیا ہے!'' ارم نے لیپ ٹاپ کی اسکرین کا رُخ اس کی طرف کیا۔

''کیا ہے یہ؟'' اس نے اُلجھن سے اسکرین کو دیکھا۔ ایک ویڈیو اَپ لوڈنگ ویب سائٹ کھلی ہوئی تھی اور اس پہ ایک ویڈیو چل رہی تھی۔ ویڈیو کا کیپشن اوپر رومن اُردو میں لکھا تھا۔

''شریفوں کا مجرا''۔

ویڈیو کسی شادی کے فنکشن کی تھی۔ ہر سو بجی سنوری خواتین اور درمیان میں ڈانس فلور پہ محوِ رقص دو لڑکیاں۔

ایک کا لہنگا گولڈن تھا اور دوسری کا سلور۔

پوری چھت جیسے اس کے سر پہ آن گری۔

''نہیں!'' وہ کرنٹ کھا کر اُٹھی۔ ''یہ کیا ہے؟''

''یہ شریفوں کا مجرا ہے حیا! اور یہ ہم نے کیا ہے، یہ داور بھائی کی مہندی کی ویڈیو ہے، جو کسی نے اِدھر انٹرنیٹ پر ڈال دی ہے۔ یہ پڑھو، ویڈیو ڈالنے والے نے اپنا ای میل ایڈریس بھی دیا ہے، جس پہ میل کر کے پورے ڈانس کی ویڈیو حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ دیکھو..... اس ویڈیو کو تین دن سے اب تک سینکڑوں لوگ دیکھ چکے ہیں۔ حیا! ہم برباد ہو گئے ہیں، ہم کہیں کے نہیں رہے''۔

ارم پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور وہ ساکت سی اسکرین کو تکے جا رہی تھی۔ یہ کوئی بھیانک خواب تھا۔ ہاں، یہ خواب ہی تھا اور اب وہ جاگ جانا چاہتی تھی۔

اسکرین پہ رقصاں پریوں کے سراپے میں مختلف حصوں پہ کسی نے سرخ دائرے کھینچ رکھے تھے، جیسے ہی کوئی لڑکی کسی اسٹیپ پہ جھکتی، تو فوراً سرخ دائرہ اُبھرتا۔

اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔

''نہیں..... یہ میں نے نہیں کیا''۔ وہ ایک ایک قدم پیچھے ہو رہی تھی۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ ارم اسی طرح بلک رہی تھی۔

''میں..... میں مجرا کرنے والی نہیں ہوں، میں شریف لڑکی ہوں''۔ وہ قدم قدم پیچھے ہوتی دیوار سے جا لگی۔

''یہ ہم ہی ہیں حیا! ہم برباد ہو گئے ہیں''۔

اس کا سر چکرانے لگا۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا؟ ویڈیو کے سینکڑوں ویوز لکھے آ رہے تھے۔ کیا وہ پورے شہر میں پھیل گئی تھی؟ اور اگر اس کے خاندان والوں تک پہنچی تو.....

''ابا تو مجھے گولی مار دیں گے ارم!''

''مجھے تو زندہ گاڑھ دیں گے''۔

''مگر یہ ویڈیو کس نے بنائی؟ ہم نے تو موبی والے کو بھی منع کر دیا تھا''۔

''کسی نے چھپ کر بنائی ہو گی۔ خاندان کی شادی پر بس، عورتوں میں ڈانس کی اجازت ابا لوگوں نے دی تھی، اگر انہیں پتا چلا کہ ہمارا یہ ڈانس پورے شہر کے لڑکے انجوائے کر رہے ہیں تو کیا ہو گا؟''

''کچھ کرو ارم!'' اس کا سکتہ ٹوٹا۔ وہ میز کی سے ارم کے قریب آئی۔

''میں نے اس ویب سائٹ پر رپورٹ تو کی ہے لیکن ویب سائٹ نے ایکشن لے کر ویڈیو ہٹا دی تو بھی یہ سی ڈی پر تو ہر جگہ مل رہی ہے۔ ایسی چیزیں تو منٹوں میں پھیلتی ہیں۔ ہم کہاں کہاں سے اسے ہٹوائیں گے؟''

''خدایا..... یہ کیا ہو گیا ہے؟'' وہ بے دم سی زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔ ''اگر ابا یا کسی بھائی وغیرہ کو معلوم ہو گیا تو..... اوہ خدایا۔ ہم کیا کریں؟''

Downloaded From http://paksociety.com

ارم نے بھی خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا اور وہ بھی بس کمرے کی ہو کر رہ گئی۔ سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جاتا تھا مگر کوئی حل ذہن میں نہیں آتا تھا۔

شام میں فاطمہ بیگم نے اس کے کمرے میں جھانکا۔

''حیا! اُٹھو، کتنا سوؤ گی؟ روحیل کا فون ہے امریکہ سے''۔

وہ جو چہرے پہ بازو رکھے لیٹی تھی، کرنٹ کھا کر اُٹھی۔

''روحیل کا؟ کیوں؟ کیا کہہ رہا ہے؟'' اس کے ذہن میں خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔

''کہہ رہا ہے اسے تم سے بات کرنی ہے''۔ وہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں اور وہ شل سی بیٹھی رہ گئی۔ سکون کی ندی میں زور سے پتھر آ گرا تھا۔

روحیل امریکہ میں تھا اور وہاں پر تو لوگ عموماً سارا وقت ہی آن لائن رہتے تھے، پھر ایسے میں اس کی نگاہوں سے اس ویڈیو کا گزر جانا عین ممکن تھا۔ خدایا، اب وہ کیا کرے؟

اس نے پیروں میں سلیپرز ڈالے اور مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی باہر لاؤنج میں آئی۔ کریڈل کے ساتھ اُلٹا ریسیور پڑا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا۔

''.....ہیلو؟''

''ہیلو حیا؟ کیسی ہو؟'' روحیل کی آواز میں گرم جوشی تھی، وہ کچھ اندازہ نہیں کر پائی۔

''ٹھیک.....تم.....تم ٹھیک ہو؟''

''ایک دم فٹ۔ میں نے تمہیں مبارک باد دینی تھی''۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ کیا وہ طنز کر رہا تھا؟

''کک.....کس بات کی؟''

''بھئی تم ایکسچینج پروگرام کے تحت ترکی جا رہی ہو اور کس بات کی بھلا!''

''اوہ اچھا''۔ اس کی اٹکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ وہ نڈھال سی دھپ سے صوفے پہ گری۔

''ہاں جا رہی ہوں۔ تھینک یو سو مچ''۔ ان گزرے تین دنوں میں وہ یہ بات بھلا چکی تھی۔

''کب تک جانا ہے؟'' وہ خوشی سے پوچھ رہا تھا۔

''جنوری کے اینڈ یا فروری کے شروع تک''۔

''تو کیا تم ادھر سین پھپھو کی فیملی سے ملو گی؟''

''پتا نہیں، ابھی سوچا نہیں ہے''۔ اس کے پاس اس وقت سوچنے کے لیے زیادہ بڑے مسائل تھے۔

''کیا بات ہے، تم اَپ سیٹ لگ رہی ہو؟'' وہ ذرا پریشان ہوا۔

''ارے نہیں.....'' وہ فوراً سنبھلی اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے خود کو نارمل ظاہر کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

فون بند ہوا تو وہ ارم کی طرف چلی آئی۔ وہ تکیہ منہ پہ رکھے لیٹی تھی۔

''یوں سر منہ لپیٹ کر بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوگا''۔

''تو کیا کریں؟'' ارم نے تکیہ پھینکا اور اُٹھ بیٹھی۔

''سب سے پہلے تو دونوں گھروں کے تمام کمپیوٹرز پہ اس ویب سائٹ کو بلاک کرتے ہیں تاکہ کم از کم گھر والوں کو تو نہ پتا چلے، پھر اس کا کوئی مستقل حل سوچتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے، چلو!'' اُمید کا سرا دیکھ کر ارم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بنا کسی وقت کے جب وہ تمام کمپیوٹرز پہ اس ویب سائٹ کو بلاک کر چکیں تو صائمہ تائی نے آ کر بتایا کہ رات میں ارم کو دیکھنے تایا فرقان کے کوئی فیملی فرینڈ بمع خاندان آ رہے ہیں۔ رسمی کارروائی تھی، کیونکہ وہ رشتہ تو ڈھکے چھپے الفاظ میں مانگ ہی چکے تھے۔ حیا سب کچھ بھلا کر پُرجوش ہو گئی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ہمارے دولہا بھائی بھی ساتھ ہی آئے ہیں''۔ حیا ڈرائنگ روم میں جھانک کر اندر کمرے میں آئی تو وہ منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔

''تم ایسے کیوں بیٹھی ہو؟''

ارم نے آہستہ سے سر اُٹھایا۔ سر پہ سلیقے سے دوپٹا چمائے وہ بروکھوے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ ہاں! آنکھیں ذرا ویران سی تھیں۔

''وہ ویڈیو۔۔۔!''

''دفع کرو اسے۔ آؤ سب بلا رہے ہیں۔ لڑکے کو اس کی والدہ ماجدہ نے اندر بلایا ہے، تمہیں دکھانے کے لیے۔ آؤ!'' اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔

''اور ابا؟'' ارم کی آنکھوں میں ذرا سی پریشانی اُتری۔

''ان سے اجازت لے لی ہے اور وہ باہر مردوں میں بیٹھے ہیں''۔ وہ ارم کو ہاتھ سے پکڑے ڈرائنگ روم کی طرف لے آئی۔ جالی دار پردے کے پیچھے وہ دونوں لمحے بھر کو رُکی تھیں۔

اندر صوفوں پہ صائمہ تائی، فاطمہ بیگم اور سونیا بھابھی بیٹھی تھیں۔ سامنے والے دو سنگل صوفوں پہ ایک نفیس سی خاتون اور ایک خوبرو سا نوجوان بیٹا تھا۔ سامنے رکھی میز لوازمات سے سجی تھی اور سونیا بصد اصرار مہمانوں کو بہت کچھ پیش کر رہی تھی۔

''بس بھابھی! ہمیں تو اپنے جیسی ہی بچی چاہیے۔ باحیا، باپردہ، صوم صلوٰۃ کی پابند''۔ وہ خاتون مسکرا کر کہہ رہی تھیں۔

''ارے مسز کریم! ہماری ارم تو کبھی سر ڈھکے بغیر گیٹ سے باہر نہیں نکلی''۔

''السلام علیکم''۔ وہ ارم کو ساتھ لیے اندر داخل ہوئی۔ اس کے سلام پہ سب نے سر اُٹھا کر دیکھا۔

گلابی پوری آستینوں والی شلوار قمیص میں ہم رنگ دوپٹہ اچھی طرح پھیلا کر سر پہ لیے ارم جھکی جھکی نگاہوں سے سامنے ایک صوفے پہ آ بیٹھی۔

حیا بھی ساتھ ہی تھی۔ کمر پہ گرتے سلکی بال، گرے اے لائن شرٹ اور ٹراؤزر زیب تن کیے، دوپٹہ کندھے پہ ڈالے ارم کے ساتھ ہی ٹانگ پہ ٹانگ رکھے پُراعتماد طریقے سے بیٹھ گئی، یوں بیٹھنے سے ٹراؤزر کے پائنچے ذرا اوپر کو اُٹھ گئے اور گرے قینچی چپلوں میں مقید سپید پاؤں ٹخنوں تک جھلکنے لگے۔

بیگم کریم کی مشفق سی آنکھوں میں ارم کو دیکھ کر پسندیدگی کی جھلک اُتری تھی۔ انہوں نے تائیدی انداز میں اپنے اسمارٹ سے بیٹے کو دیکھا، مگر وہ ارم کو نہیں، بلکہ بہت غور سے حیا کو دیکھ رہا تھا۔

''اور بیٹا! آپ کیا کرتی ہو؟'' بیٹے کو متوجہ نہ پا کر وہ سنبھل کر ارم سے مخاطب ہوئیں۔

''جی ماسٹرز کر رہی ہوں انگلش لٹریچر میں''۔ ارم نے جھکی جھکی نگاہوں سے جواب دیا۔

تب ہی حیا کو محسوس ہوا، وہ لڑکا مسلسل اسے دیکھ رہا ہے۔ ستائش یا پسندیدگی سے نہیں، بلکہ غور سے، جانچتی پرکھتی نظروں سے۔

دفعتاً اس نے پاکٹ سے اپنا بلیک بیری موبائل نکالا اور خاموشی سے سر جھکائے بٹن پریس کرنے لگا۔

خواتین آپس میں گفتگو میں مصروف تھیں، مگر حیا کچھ عجیب سا محسوس کرتی کنکھیوں سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ جو اپنے فون پہ جھکا تھا۔ تب ہی ہولے سے اس کے موبائل سے ''مائی نیم از شیلا'' کی آواز گونجی جسے اس نے فوراً بند کر دیا، مگر وہ سن چکی تھی۔ شیلا کے ساتھ شادیوں کا مخصوص شور بھی سنائی دیا تھا اور ارم نے بھی شاید کچھ سنا تھا، تب ہی چونک کر گردن اُٹھائی اور پھر قدرے سبکی سے واپس جھکا دی۔

حیا کو اپنی جان جسم سے نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ کیا دنیا اتنی چھوٹی تھی؟

وہ اب موبائل پہ کچھ دیکھ رہا تھا، کبھی اسکرین پہ دیکھتا اور کبھی حیا اور ارم کے چہروں پہ نگاہ ڈالتا۔ صاف ظاہر تھا، وہ کچھ ملانے کی سعی کر رہا تھا، یقین دہانی، تصدیق، ثبوت سب صاف ظاہر تھا۔

پھر ایک دم وہ اُٹھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ ایک شرمندہ سی خاموشی نے سارے ماحول کو گھیر لیا۔

حیا نے سر جھکا دیا، اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

Downloaded From http://paksociety.com

وہ بہت بے چین سی بیٹھی تھی۔ پاؤں اوپر صوفے پہ سمیٹے، ہاتھ میں ریموٹ پکڑے، وہ جھلائی ہوئی سی چینل بدل رہی تھی۔ مضطرب، بے بس، پریشان۔

اسمارٹ ٹی وی کی اسکرین پہ پورے میوزک کے ساتھ اشتہار چل رہا تھا۔ وہ غائب دماغی سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی، جہاں موبائل کمپنی کے لوگو کے ساتھ ''غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال قانوناً جرم ہے۔ پی ٹی اے'' لکھا آرہا تھا۔ جانے کب Pause کا بٹن اس سے دبا اور اشتہار وہیں رُک گیا۔ وہ اتنی دور بھٹکی ہوئی تھی کہ پلے بھی نہ کر سکی۔

دفعتاً دروازے میں فاطمہ بیگم کی شکل دکھائی دی۔ وہ تھکی تھکی سی اندر داخل ہو رہی تھیں۔ حیا ریموٹ پھینک کر تیزی سے اُٹھی۔

''کیا بات تھی؟ صائمہ تائی نے کیوں بلوایا تھا؟'' وہ بے چینی سے ان کے قریب آئی۔

''ارم کے رشتے کے لیے جو لوگ اس روز آئے تھے''۔ وہ نڈھال سی کہتی صوفے پہ بیٹھیں۔

''ہاں، کیا ہوا انہیں''۔ وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ان کے نزدیک بیٹھی۔

''انہوں نے انکار کر دیا ہے، حالانکہ رشتہ مانگ چکے تھے''۔

اور حیا کا دل بہت اندر تک ڈوب کر اُبھرا تھا۔

''کیوں؟، کیوں انکار کر دیا؟'' اس کو اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''کوئی وجہ نہیں بتاتے۔ بس ایک دم پیچھے ہٹ گئے ہیں، صائمہ بھابھی بہت اپ سیٹ تھیں''۔

''مگر کچھ تو کہا ہوگا!''

''بس یہی کہا ہے کہ ہم نے کسی آزاد خیال اور بے پردہ لڑکی کو بہو بنا کر اپنی عاقبت نہیں خراب کرنی''۔

وہ متحیر رہ گئی۔ چند روز قبل سنا تائی کا فقرہ سماعت میں گونجا تھا۔

''جب فرقان نے سختی کی کہ بھلا ایسی بے پردہ اور آزاد خیال لڑکی کو اپنی بہو بنا کر ہم نے اپنی آخرت بگاڑنی ہے کیا، تب کہیں جا کر وہ مانا''۔

کیا اس کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں؟ کیا دوسروں کی بیٹیوں پہ اُنگلیاں اُٹھانے والوں کے اپنے گھروں پہ وہی اُنگلیاں لوٹ کر آتی ہیں؟ اتنی جلدی بدلے ملنے لگتے ہیں؟ مگر وہ خوش نہیں ہو پائی۔ اگر بات کھل جاتی تو اصل بدنامی تو اسی کے حصے میں آتی۔ ارم کو تو شاید اس کی ماں ''حیا نے اسے بگاڑا ہے'' کہہ کر درمیان سے نکال لیتی اور بات تو اب بھی کھل سکتی تھی۔ وہ ویڈیو تو اب بھی انٹرنیٹ پہ موجود تھی۔

'خیر ارم کو کونسی کمی ہے رشتوں کی!'' فاطمہ بیگم اُٹھ کر کچن کی جانب چلی گئی تھیں اور وہ صوفے پہ گر سی گئی۔ ٹی وی اسکرین پہ وہ اشتہار ابھی تک رُکا ہوا تھا۔ وہ بس خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔

''غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال قانوناً جرم ہے۔ پی ٹی اے''

اب شاید ارم کے لیے کبھی کوئی رشتہ نہ آئے۔ آیا بھی تو یہی ہوگا، جو اس دفعہ ہوا تھا اور ہر کوئی ان کی طرح تو نہیں ہوگا کہ بات دبا جائے۔ کسی نے منہ پہ ساری بات کر دی تو..... خدایا! وہ کدھر جائیں گی؟

''غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال قانوناً جرم ہے۔ پی ٹی اے''۔

وہ بے خیالی سے اسے تکتی، سوچوں کی اُلجھن سے نکل کر ایک دم چونکی۔

''غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال قانوناً جرم ہے، پی ٹی اے''۔

بجلی کا ایک کوندا سا اس کے ذہن میں لپکا تھا۔ اوہ خدایا، یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی اور باہر کو لپکی۔

''ارم..... ارم.....'' بہت جوش سے چلاتے ہوئے حیا نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔

ارم موبائل پکڑے بیڈ پہ بیٹھی تھی، دروازہ کھلنے پہ گڑبڑا کر موبائل سائیڈ پہ رکھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''کیا ہوا؟'' ساتھ ہی ارم نے اپنا موبائل اُلٹا کر دیا تا کہ اسکرین چھپ جائے۔

''سنو وہ .....'' تب ہی رشتے والی بات یاد آئی۔ ''اوہ آئی ایم سوری، ان لوگوں نے رشتے سے انکار کر دیا''۔

''وہ تو ویڈیو دیکھ کر کرنا ہی تھا، خیر جانے دو، اچھا ہی ہوا''۔ وہ مطمئن تھی۔ حیا کو حیرت ہوئی مگر وہ وقت حیرت ظاہر کرنے کا نہیں تھا۔ وہ جلدی سے اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

''ارم! میری بات سنو۔ تم نے کبھی موبائل کنکشنز کے اشتہاروں میں وہ عبارت پڑھی ہے کہ غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال جرم ہے''۔

''ہاں تو؟''

''تو کیا تمہیں معلوم ہے سم رجسٹر کروانا کیوں ضروری ہوتا ہے؟''

''کیوں؟''

''تا کہ کوئی کسی سم کا غلط استعمال نہ کر سکے، چاہے وہ دہشت گردی کی واردات میں ہو یا کسی کو رانگ کالز کرنے میں، یہ سب سائبر کرائم کے تحت آتا ہے''۔

''سائبر کرائم؟'' ارم نے پلکیں جھپکائیں۔

''ہاں اور ہر سائبر کرائم پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی کو رپورٹ کیا جا سکتا ہے''۔

''کیا کہہ رہی ہو حیا! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا''۔

''ارم..... ارم..... ہماری پرسنل ویڈیو انٹرنیٹ پہ ڈال دینا بھی تو ایک سنگین جرم ہے، سائبر کرائم۔ ہم اس کی رپورٹ کر سکتے ہیں''۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟'' وہ فوراً بدکی۔ ''اگر کسی کو پتا چل گیا تو؟''

''پتا تو تب چلے گا جب ہم اس ویڈیو کو وہیں رہنے دیں، چار دن سے میں سولی پہ لٹکی ہوں، اب اس مسئلے کو ختم ہو جانا چاہیے''۔

''مگر..... مگر ہم کس کو رپورٹ کریں گے؟'' وہ نیم رضامند ہوئی تو حیا نے جھٹ اپنا موبائل نکالا۔

''پی ٹی اے کو، دروازہ بند کرو، میں اپنے کنکشن کی ہیلپ لائن سے پی ٹی اے کا نمبر لیتی ہوں''۔

ارم دوڑ کر دروازہ بند کر آئی اور حیا نمبر ملانے لگی۔

پی ٹی اے کی ہیلپ لائن کا نمبر آسانی سے مل گیا، مگر آپریٹر نے نہایت شائستگی سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اس قسم کا سائبر کرائم کسی انٹیلی جنس ایجنسی کے سائبر کرائم سیل کو رپورٹ کرنا ہوگا۔ حیا نے ان سے ملک کی سب سے بڑی سرکاری، سویلین ایجنسی کے سائبر کرائم سیل کا ای میل ایڈریس لے تو لیا مگر اب وہ متذبذب بیٹھی تھی۔

''یہ انٹیلی جنس والے خطرناک لوگ ہوتے ہیں ارم!''

''مگر اب یہ کرنا تو ہے نا!''

اور واقعی کرنا تو تھا۔

ارم نے لیپ ٹاپ کھولا اور پھر بہت بحث و تمحیص کے بعد انہوں نے ایک کمپلینٹ لکھی اور اس پتے پہ بھیج دی جو پی ٹی اے سے ان کو ملا تھا۔

بمشکل دس منٹ ہی گزرے تھے کہ حیا کا موبائل بجا۔ اس نے موبائل اُٹھا کر دیکھا۔ چمکتی اسکرین پہ انگریزی میں پرائیویٹ نمبر کالنگ Private number calling لکھا آ رہا تھا۔ ساتھ کوئی نمبر وغیرہ نہیں تھا۔ اس کے موبائل پہ نام اور نمبر دونوں آتے تھے اور اسے نہیں یاد تھا کہ کبھی کوئی نمبر اس نے پرائیویٹ نمبر کے نام سے محفوظ کیا ہو اور عجیب بات تو یہ تھی کہ نمبر تو سرے سے آ ہی نہیں رہا تھا۔

''یہ کون ہو سکتا ہے؟'' اس نے اچنبھے سے موبائل کان سے لگایا۔

''ہیلو''۔ دوسری جانب ذرا دیر خاموشی کے بعد ایک بھاری گمبھیر آواز سنائی دی۔

''السلام علیکم مس حیا سلیمان؟''

Downloaded From http://paksociety.com

''جج.....جی.....آپ کون؟''

''میں میجر احمد بات کر رہا ہوں، سائبر کرائم سیل سے۔ آپ نے ہماری ایجنسی میں رپورٹ کی ہے، ہمیں ابھی آپ کی کمپلینٹ موصول ہوئی ہے''۔

وہ جو بھی تھا، بہت خوب صورت بولتا تھا۔ گہرا، گمبھیر، مگر نرم لہجہ جس میں ذرا سی چاشنی بھری تپش تھی۔ گرم اور سرد کا امتزاج۔

''مگر.....میجر احمد.....میں نے کمپلینٹ میں اپنا نمبر تو نہیں لکھا تھا''۔ وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ ارم بھی حیرت بھرے خوف سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ جواباً وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

''نمبر تو بہت عام سی چیز ہے مس سلیمان! میں تو آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں''۔

''کیا؟''

''یہی کہ آپ سلیمان اصغر کی بیٹی ہیں۔ آپ کے والد کی ایک کنسٹرکشن کمپنی ہے۔ آپ کا بھائی رومیل جارج میسن یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ خود آپ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں ایل ایل بی آنرز شریعہ اینڈ لاء کے پانچویں سال میں ہیں۔ فروری میں آپ ایکسچینج پروگرام کے تحت استنبول جا رہی ہیں، غالباً سبانجی یونیورسٹی میں اور پچھلے ہفتے اپنے کزن داور فرقان کی مہندی کے فنکشن پہ بننے والی ویڈیو کی انٹرنیٹ پہ اپ لوڈنگ کو آپ نے رپورٹ کیا ہے۔ از دیٹ رائٹ میم؟''

وہ جو دم بخود سی سنتی جا رہی تھی، بمشکل بول پائی۔

''جی.....جی، وہی ویڈیو۔''

''اب آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''یہی کہ آپ اسے اس ویب سائٹ سے ہٹا دیں''۔ اس کی آواز میں بہت مان، بہت منت بھر آئی تھی۔

''او کے اور کچھ؟''

''اور.....اور جن لوگوں کے پاس اس کی سی ڈی ہے وہ بھی.....'' آگے اس کا گلا رُندھ گیا، احساس توہین سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

''میں شہر کے ایک ایک بندے سے وہ ویڈیو نکلوا لوں گا، آپ بے فکر رہیے''۔ اور اسے لگا منوں بوجھ اس کے اوپر سے اُتر گیا ہو۔

''تھینک یو میجر احمد''۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ فون رکھنے ہی والی ہے کہ وہ کہہ اُٹھا۔

''تھینک یو تو آپ تب کہیں جب میں یہ کام کر دوں اور اس کام کو محض شروع کرنے کے لیے بھی مجھے آپ کا تعاون چاہیے''۔

''کیسا تعاون؟''

''مادام! آپ کو ذرا سی تکلیف کرنی ہوگی، آپ کو اس ویڈیو کی باقاعدہ رپورٹ کرنے کے لیے میرے آفس آنا ہوگا''۔

''کیا؟ نہیں نہیں، میں نہیں آسکتی۔ وہ پریشانی سے بکلا گئی۔ ارم بھی فکرمندی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

''پھر تو یہ کام نہیں ہو پائے گا۔ ایسے اسٹیپ فون پہ نہیں لیے جاتے''۔ اسے لگا، وہ محظوظ سا مسکرا رہا تھا۔

''مم.....مگر میں نہیں آسکتی''۔ اور وہ کیسے آسکتی تھی؟ کسی کو پتا چل جاتا تو کتنی بدنامی ہوتی۔

''آپ کو آنا پڑے گا، میں گاڑی بھیج دیتا ہوں''۔

''نہیں نہیں، اچھا خدا حافظ''۔ اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔

''بھاڑ میں گیا یہ اور اس کا سائبر کرائم سیل۔ اگر ابا یا تایا فرقان کو پتا لگ گیا کہ ہم ایک ایجنسی کے ہیڈ کوارٹرز گئے ہیں،.....تو ہماری ٹانگیں توڑ دیں گے وہ''۔

''میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ رپورٹ نہ کرو''۔

پرائیوٹ نمبر سے پھر کال آنے لگی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر فون ہی آف کر دیا۔ اس ویڈیو سے زیادہ میجر احمد نے اسے بلیک میل کیا

Downloaded From http://paksociety.com

ہے۔ یہ خیال پھر پورا دن اس کے ذہن میں گونجتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت تھکی ہوئی پاسپورٹ آفس سے نکلی تھی۔ اسلام آباد سے پنڈی کا اتنا لمبا اور رش بھری سڑک پہ تھکا دینے والا سفر کر کے وہ آج پاسپورٹ آفس اپنا پاسپورٹ اُٹھانے آئی تھی، مگر یہاں علم ہوا کہ چودہ جنوری کو ہی پاسپورٹ مل پائے گا اور ابھی چودہ جنوری میں ہفتہ رہتا تھا۔ کوئی تکنیکی مسئلہ تھا، جس کے باعث اسلام آباد والے پاسپورٹ آفس میں پاسپورٹ کا کام رکا ہوا تھا۔ تبھی اسے پنڈی میں اپلائے کرنا پڑا تھا۔

واپسی پہ بھی اتنا ہی رش تھا۔ کچھ شاپنگ کے بعد جب وہ مری روڈ پہ آئی تو مغرب چھا رہی تھی۔ سڑک گاڑیوں سے بھری پڑی تھی اور گاڑیوں کا یہ سیلاب بہت سست روی سے بہہ رہا تھا۔ سگنل پہ اس نے گاڑی روکی اور شیشے کھول دیے۔ اس کا ذہن ابھی تک پاسپورٹ میں اُلجھا تھا۔

اگر چودہ جنوری کو پاسپورٹ ملے تو بھی ویزا لگتے لگتے بہت دیر ہو جائے گی۔ ابھی ٹکٹس نہیں آئے تھے مگر کچھ اندازہ تو تھا کہ فروری کے آغاز میں اسے ترکی جانا ہے، یعنی کم و بیش پندرہ دن اس کو ویزے کے لیے ملتے اور ترکی کا ویزا تو کبھی پندرہ دن میں نہیں لگ پاتا، پھر؟

وہ انہی سوچوں میں اُلجھی تھی، یکا یک کوئی اس کی کھلی کھڑکی پہ جھکا۔

''سوبئیو..... کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ بری طرح چونکی اور سر اُٹھا کر دیکھا۔

وہ وہی تھا، ڈولی چم چم کرتے ہرے لباس میں ملبوس وگ والے بالوں کا جوڑا اور شوخ میک اپ۔

ناگواری کی ایک لہر اس کے چہرے پہ سمٹ آئی۔ اسے بھول گیا کہ کبھی ڈولی نے اس پہ کوئی احسان کیا تھا۔

''ہٹو سامنے سے''۔ وہ جھڑک کر بولی تھی۔ وہ کھلی کھڑکی میں کچھ یوں ہاتھ رکھے کھڑا تھا کہ وہ شیشہ اونچا کر ہی نہیں سکتی تھی۔

''لو باجی! میں تو سلام دعا کرنے آئی تھی اور آپ تو غصہ ہو رہی ہو''۔ اس روز والے سخت تاثرات ڈولی کے چہرے پہ نہیں تھے بلکہ اس کے میک اَپ سے اٹے چہرے پہ سادگی و معصومیت تھی۔ کراہیت بھری سادگی اور معصومیت!

''ہٹو سامنے سے، ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔'' اسے غصہ آنے لگا تھا اور بے بسی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کوئی غلط حرکت کر ڈالے۔

''ہائے باجی! ڈولی سے ایسے بات کرتی ہو؟ اور آپ کی تریفیں (تعریفیں) کر کر کے ڈولی نے میرا سر کھا لیا تھا''۔

اس نے آواز پہ گردن گھما کر دیکھا تو فرنٹ سیٹ کی کھلی کھڑکی پہ ایک اور خواجہ سرا ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ ڈولی کی سیاہ رنگت کی نسبت اس کا رنگ ذرا صاف تھا۔ چہرے پہ البتہ اس نے بھی سوکھے آٹے کی طرح فیس پاؤڈر تھوپ رکھا تھا، مگر شوخ سرخ رنگ کی قمیص کی آستینوں سے جھلکتے بازوؤں پہ شاید وہ کچھ لگانا بھول گیا تھا، وہ دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ میں دیے جھکا کھڑا تھا۔

''یہ..... کون ہو تم؟ ہٹو میری گاڑی سے''۔ اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ وہ تنہا تھی اور ٹریفک بلاک، سامنے کوئی ٹریفک پولیس مین بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

''یہ جی میری بہن ہے پنکی۔ بڑا شوق تھا اسے آپ سے ملنے کا۔ ایک بڑی ضروری بات کرنی تھی جی ہمیں آپ سے''۔

''گیٹ لاسٹ''۔ اس نے بازو بڑھا کر فرنٹ ڈور کا شیشہ اونچا کرنا چاہا، مگر پنکی نے اپنا ہاتھ اندر کر دیا۔ ایک دم سے اس کی کلائی سامنے آئی تھی۔ حیا نے دیکھا، پنکی کی کلائی پہ ایک گلابی سرخ سا ایک انچ کا کٹا بنا تھا، جیسے جلا ہو، یا شاید برتھ مارک تھا۔

''ہٹو..... آئی سے گیٹ لاسٹ''۔ وہ عالمِ طیش میں فرنٹ ڈور کا شیشہ اوپر کرنے لگی، مگر پنکی نے اس پہ ہاتھ رکھ دیے تھے۔ شیشہ اوپر نہیں ہو پا رہا تھا۔

''باجی!، ایسے تو نہ کرو پنکی نال۔ اس کا ہاتھ زخمی ہو جائے گا جی''۔ ڈولی نے پیچھے سے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پہ رکھا تو وہ تیورا کر گھومی اور زور سے ڈولی کو دھکا دیا۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھا، سولڑ کھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ اسے چند سیکنڈ مل گئے اور اس

Downloaded From http://paksociety.com

نے جلدی جلدی اپنی طرف کا شیشہ چڑھا دیا۔

''اب تم بھی ہٹو ادھر سے، ورنہ میں لوگوں کو اکٹھا کرلوں گی''۔ وہ بازو بڑھا کر پنکی کی طرف والا شیشہ بند کرنے لگی، مگر وہ اڑ ہی گیا تھا۔

''باجی جی میں تو تمہانوں ڈولی کے دل کی بات بتانے آئی تھی اور تساں اس طرح کر رہے ہو، یہ جو ڈولی ہے نا، یہ بڑا پسند کرتی ہے آپ کو مگر اقرار نہیں کرتی''۔ پنکی مصنوعی انداز میں بن بن کر بول رہا تھا۔

پیچھے ڈولی بند شیشہ بجانے لگا تھا۔

''شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ''۔ وہ پوری قوت سے شیشہ اوپر چڑھانے لگی۔ پنکی کی اُنگلیاں جو شیشے کے کنارے سے لگی تھیں، ساتھ ساتھ اوپر اُٹھنے لگیں۔

''باجی جی..... گل تو سنو''۔ ڈولی گھوم کر پنکی کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا۔

اسی اثنا میں اشارہ کھل گیا۔ گاڑیاں آگے بڑھنے لگیں۔ حیا کی گاڑی رُکی کھڑی تھی۔ عقب میں گاڑیوں کے ہارن بجنے لگے، مگر دور کھڑا پولیس مین خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا، مدد کے لیے آگے نہ بڑھا۔

ڈولی نے پنکی کے کندھے پہ ہاتھ مار کر چلنے کا اشارہ کیا۔ پنکی نے لمحے بھر کو گردن موڑ کر ڈولی کو دیکھا تو اس کی گرفت شیشے پہ ذرا ڈھیلی ہوئی۔ حیا نے عالمِ طیش میں فوراً شیشہ اوپر چڑھایا۔ پنکی نے چونک کر دیکھا، پھر اُنگلیاں کھینچنی چاہیں مگر وہ مستقل مزاجی سے شیشہ اوپر کس رہی تھی۔ پنکی کی اُنگلیاں پھنس کر رہ گئی تھیں۔

''اوہ چھڈ وا باجی جی!'' پنکی جھنجھلا کر ہاتھ کھینچ رہا تھا مگر اُنگلیاں نکل کر نہیں دے رہی تھیں۔

ڈولی نے غصے سے شیشہ بجایا مگر حیا تنفر سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بازو لمبا کیے شیشہ آخری حد تک لے گئی تھی۔ عقب میں گاڑیوں کی قطار ہارن پہ ہارن دے رہی تھی، کچھ گاڑیاں ساتھ سے نکلنے لگی تھی۔

دفعتاً پنکی کے دائیں ہاتھ کی اُنگلی سے خون کی بوند ٹپک کر شیشے پہ لڑھکی تو اسے جیسے ہوش آیا۔ ایک جھٹکے سے اس نے لیور نیچے کیا۔ شیشہ ایک انچ نیچے گرا۔ پنکی نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے ہاتھ باہر کھینچے۔ گاڑی آگے بھگانے سے قبل اس نے بہت غور سے پنکی کے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ دائیں ہاتھ، جس کی کلائی پر کانٹے کا جلا ہوا نشان تھا، کی شہادت کی اُنگلی سے خون نکلا تھا اور باقی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے اوپر پوروں کی قدرتی لکیر پہ موٹی سی بھوری لکیر بن گئی تھی۔ یقیناً اس کے ہاتھ زخمی ہوئے تھے مگر اسے پروا نہیں تھی۔

وہ زن سے گاڑی آگے لے گئی، پھر اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ وہ دونوں خولجہ سرا بار بار مڑ مڑ کر اسے غصے سے دیکھتے سڑک پار کر رہے تھے۔ ڈولی نے پنکی کا زخمی ہاتھ تھام رکھا تھا اور غصے سے پلٹ کر حیا کی دور جاتی گاڑی کو دیکھتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر ایکسیلیٹر پہ زور بڑھا دیا۔ کم از کم اتنی اُمید اسے ضرور تھی کہ اب وہ ڈولی اس کا پیچھا کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

بہت جلد وہ غلط ثابت ہونے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

''حیا..... حیا.....!'' جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی، لاؤنج میں بیٹھے سلیمان صاحب تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ ان کے چہرے پہ غیظ و غضب چھایا تھا۔

وہ ڈر کر پیچھے ہٹی۔ تب ہی پیچھے کہیں فون کی گھنٹی بجی۔

''یہ ویڈیو تمہاری ہے؟ تم..... تم مجرے کرتی ہو!'' روحیل جو صوفے پہ بیٹھا تھا، ایک دم اُٹھا اور بہت سی سی ڈیز اس کی طرف اُچھالیں۔ وہاں سب موجود تھے۔ تایا فرقان، داور بھائی، روحیل..... سب..... اور ایک طرف ارم زمین پہ بیٹھی رو رہی تھی۔ دور کہیں فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

''نہیں..... نہیں.....'' وہ سر ہلاتے ہوئے خوف سے ان کو کہنا چاہتی تھی۔ اس کا منہ تو ہلتا تھا لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ سب اس کا خون لینے پہ تلے تھے۔

Downloaded From http://paksociety.com

دفعتاً سلیمان صاحب آگے بڑھے اور ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پہ دے مارا۔

''بے حیا..... بے حیا''۔ اسے تھپڑوں سے مارتے ہوئے سلیمان صاحب کہہ رہے تھے۔ ان کے لب ہل رہے تھے مگر ان سے آواز ڈولی کی نکل رہی تھی۔ وہ سلیمان صاحب نہیں، ڈولی بول رہی تھی..... ڈولی..... ڈولی..... پنکی..... بے حیا..... پنکی کی اُنگلیاں..... فون کی گھنٹی.....

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کیا۔ زردی روشنی ہر سُو پھیل گئی۔

اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھوا۔ وہ ٹھیک تھی۔ سب ٹھیک تھا۔ کسی کو کچھ علم نہیں ہوا تھا۔ وہ سب ایک بھیانک خواب تھا۔

''اوہ خدایا''۔ وہ نڈھال سی بیڈ کراؤن کے ساتھ پیچھے جا لگی۔ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔ دل ویسے ہی دھڑک رہا تھا۔ پورا جسم پسینے میں بھیگا تھا۔

فون کی مخصوص ٹون اسی طرح بج رہی تھی۔ ہاں، بس وہ گھنٹی خواب نہیں تھی۔

اس نے سائیڈ ٹیبل سے موبائل اُٹھایا اور چمکتی اسکرین کو دیکھا۔

''پرائیوٹ نمبر کالنگ''۔

چند لمحے لگے تھے اسے ایک فیصلے پہ پہنچنے میں اور پھر اس نے فون کان سے لگا لیا۔

''میجر احمد! میں آپ کے آفس آ کر رپورٹ کروانے کے لیے تیار ہوں، کل صبح نو بجے میرے گھر کی بیک سائیڈ پہ موجود گراؤنڈ کے انٹرنس گیٹ پہ گاڑی بھیج دیں، نو بجے، شارپ''۔

''شیور!'' اسے فاتحانہ لہجہ سنائی دیا تھا۔ اس نے آہستہ سے فون بند کر دیا۔

کبھی بھی وہ کسی لڑکے سے یوں تنہا نہیں ملی تھی، مگر نہ ملنے کی صورت میں وہ ویڈیو کبھی نہ کبھی لیک ہو جاتی تو زیادہ برا ہوتا۔

اس نے بے اختیار جھرجھری لی۔ اس خوف ناک خواب نے اسے یہ سب کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اسے لگا، اب اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ رہا میجر احمد، تو اس سے وہ نپٹ لے گی۔

☆ ☆ ☆

پلے گراؤنڈ کے گیٹ کے ساتھ توت کا تناور درخت تھا۔ وہ اس سے ٹیک لگائے منتظر کھڑی تھی۔ سرخ لمبی اے لائن قمیص اور نیچے چوڑی دار پاجامہ۔ اوپر اسٹائلش سا سرخ سوئیٹر جس کی لمبی آستین ہتھیلیوں کو ڈھانپ کر اُنگلیوں تک آتی تھیں اور کندھوں پہ براؤن چھوٹی سی اسٹول نما شال۔ لمبے بال پیچھے کمر پہ گر رہے تھے، سردی اور دھند میں وہ مضطرب سی کھڑی، سرخ پڑتی ناک لیے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑ رہی تھی۔

ارم یاز ارا..... اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ یہ خطرہ اس کو اکیلے مول لینا تھا۔

دفعتاً اس نے بے چینی سے کلائی سے سوئیٹر کی آستین پیچھے ہٹائی اور گھڑی دیکھی۔ نو بجنے میں ایک منٹ تھا۔

اسی پل زن سے ایک کار اس کے سامنے رُکی۔ سیاہ پرانی مرسڈیز، اور کسی بت کی طرح سامنے سیدھ میں دیکھتا ڈرائیور۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے آگے بڑھی اور پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ اس کے دروازہ بند کرتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بھگا دی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ سیف ہاؤس پہنچی۔

سفید دیواروں والا خالی کمرا، درمیان میں لکڑی کی میز اور کرسی، جس پہ اسے بٹھایا گیا۔ میز پہ فقط ایک ٹیلی فون رکھا تھا۔ باقی پورا کمرا خالی تھا۔

وہ مضطرب سی گردن اِدھر اُدھر گھما کر دیکھنے لگی۔ تین طرف سفید دیواریں تھیں، ان میں سے ایک دیوار میں وہ دروازہ تھا، جہاں

Downloaded From http://paksociety.com

سے وہ آئی تھی۔ البتہ چوتھی سمت اس کے بالمقابل دیوار شیشے کی بنی تھی۔ دراصل وہ شیشے کی اسکرین تھی، جو زمین سے لے کر چھت تک پھیلی تھی۔ شاید وہ چھوٹا خالی کمرا کسی بڑے کمرے کا حصہ تھا۔ جس میں شیشے کی اسکرین لگا کر پارٹیشن کر دیا گیا تھا۔

اس نے ذرا غور سے اسکرین کو دیکھا۔ اس کا شیشہ مکمل طور پر دھندلا کر دیا گیا تھا۔ جیسے مشین پھیر کر frosted کیا جاتا ہے۔ اس دھندلے شیشے کے اس پار ایک دھندلا سا منظر تھا۔ ہر شے اتنی مبہم اور دھندلی تھی کہ وہ بمشکل ایک خاکہ بنا پا رہی تھی۔ یقیناً وہ شیشہ ایک کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے درمیان میں لگایا گیا تھا اور اس کے پار کمرے کا باقی حصہ تھا۔

بس ایک دھندلا سا خاکہ سمجھ میں آتا تھا۔ شیشے کے اس پار کوئی بڑا، پُرتعیش سا آفس تھا اور آفس ٹیبل کے پیچھے ریوالونگ چیئر پہ کوئی بیٹھا تھا۔ اس کا رُخ حیا کی جانب ہی تھا۔ اس کا چہرہ واضح نہ تھا، بس ایک دھندلی سی آؤٹ لائن ہی بنتی تھی۔ خاکی یونیفارم، سر پہ کیپ، نیک لگا کرسی پہ بیٹھا، میز پہ رکھی کوئی چیز انگلیوں میں گھماتا، وہ کس طرف دیکھ رہا تھا، وہ فیصلہ نہ کر پائی۔ اس کا رُخ تو سامنے حیا کی جانب ہی تھا، شاید دیکھ بھی اسی کو رہا تھا مگر اس کی آنکھیں واضح نہ تھیں، واضح تھی تو بس ایک چیز، اس آفیسر کے گندمی چہرے کے دائیں طرف والے آدھے حصے پہ ایک بدنما سی کالک، جیسے آدھا چہرہ جھلس گیا ہو۔

دفعتاً وہ شخص آگے کو جھکا اور میز سے کچھ اُٹھا کر کان سے لگایا۔ غالباً فون کا ریسیور۔

''ٹرن..... ٹرن''۔

یک دم حیا کے سامنے میز پہ رکھا فون بجنے لگا۔ وہ چونکی۔ فون مسلسل بج رہا تھا، کیا وہ شخص اسے کال کر رہا تھا؟ اس نے دھڑکتے دل سے ریسیور اُٹھایا اور کان سے لگایا۔

''ہیلو!''

''السلام علیکم مس حیا سلیمان! دس از میجر احمد''۔ وہی بھاری، نرم نرم سا خوب صورت لہجہ۔

''وعلیکم السلام!'' وہ فون ہاتھ میں پکڑ کر کان پہ رکھے، یک ٹک سامنے اسکرین کو دیکھ رہی تھی، جس کے پار آدھے جھلسے چہرے والا آفیسر فون تھامے بیٹھا تھا۔ کیا وہی میجر احمد تھا؟

''میں اُمید کرتا ہوں کہ ہم نے آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دی''۔

''جی''۔ اس کو گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔

''میرے سامنے لیپ ٹاپ پہ تمام سسٹم کھلا ہوا ہے۔ مجھے ایک کلک کرنا ہے اور آپ کی ویڈیو صفحۂ ہستی سے یوں مٹ جائے گی، جیسے کبھی بنائی ہی نہیں گئی تھی''۔

دیوار کے پار اس دھندلے منظر میں بیٹھے اس آفیسر کے سامنے بھی ایک لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا تو وہ میجر احمد تھا؟ مگر سامنے کیوں نہیں آتا تھا؟

''اور شہر کے ایک ایک بندے سے میں یہ ویڈیو نکلوا چکا ہوں۔ بولیے حیا! میں کلک کر دوں؟''

''اور..... وہ رپورٹ؟''

''سمجھیں، وہ درج ہو گئی''۔ اسے لگا، وہ مسکرایا تھا۔

''مگر..... آپ نے کہا تھا کہ مجھے رپورٹ کے لیے.....''

''غلط کہا تھا، ایکسکیوز بنایا تھا۔ بعض اوقات بہانے بنانے پڑتے ہیں، تب جب مزید صبر نہیں ہوتا، سمجھیں؟''

فون کو جکڑا، اس کا ہاتھ پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ یہ شخص اتنی عجیب باتیں کیوں کر رہا تھا؟

''آپ..... کلک کر دیں''۔ بمشکل وہ کہہ پائی۔ وہ شخص جھکا، شاید بٹن دبانے اور پھر واپس پیچھے ہو کر بیٹھا۔

''کر دیا!''

''اوہ تھینک یو میجر احمد!'' اس کا گلا رندھنے لگا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ایک بات پوچھوں؟''

''جی؟''

''کیا یہ ویڈیو جعلی تھی؟''

''نہیں، تھی تو اصلی''۔

''تو آپ اتنی ڈر کیوں رہی تھیں؟''

''ظاہر ہے یہ ہماری فیملی ویڈیو تھی اور شادیوں پہ ڈانسز کی ویڈیو ہم نہیں بنواتے''۔

''کیوں؟'' وہ پے در پے سوالات کر رہا تھا۔

''کیا مطلب کیوں؟ شادیوں کی ویڈیو سر کولیٹ ہوتی ہیں ہر جگہ، کیا اچھا لگتا ہے ہماری ڈانس کی ویڈیو پرائے لوگ دیکھیں؟''

''مگر پرائے لوگ لائیو تو دیکھ سکتے ہیں، غالباً اس ویڈیو میں مجھے ویٹرز، موو ی میکر اور ڈی جے نظر آ رہے تھے، وہ بھی تو پرائے مرد ہیں نا؟ میں سمجھ نہیں پایا کہ اگر آپ اس طرح رقص کرنے کو صحیح سمجھتی ہیں تو ویڈیو کے باہر نکلنے پہ پریشان کیوں تھیں؟ چاہے موو ی میکر، ویٹر، ڈی جے دیکھیں یا انٹرنیٹ پہ موجود مرد، بات تو ایک ہی ہے اور اگر آپ اس کو غلط سمجھتی ہیں تو آپ نے یہ کیا ہی کیوں؟''

''میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں''۔ وہ درشتی سے بولی تو چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

''ٹھیک کہا آپ نے، خیر!'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھیے!'' اب کے اس کی آواز میں اجنبیت در آئی تھی۔

''کبھی کوئی آپ کے لیے جنت کے پتے توڑ کر لایا ہے؟''

''ہم دنیا والوں نے جنتیں کہاں دیکھی ہیں میجر احمد!'' اس کے چہرے پہ تلخی رقم تھی۔

''تب ہی تو ہم دنیا والے جانتے ہی نہیں کہ جنت کے پتے کیسے دکھتے ہیں۔ کبھی کوئی آپ کو لا دے تو انہیں تھام لیجئے گا۔ وہ آپ کو رسوا نہیں ہونے دیں گے''۔

اس کے چہرے کی تلخی سکوت میں ڈھلتی گئی۔ وہ ٹھہر سی گئی، دھندلی دیوار ابھی تک اس کے سامنے تھی۔ کون تھا اس پار؟

''آپ سن رہی ہیں؟''

''ہوں..... جی..... جی''۔ وہ چونک کر سنبھلی۔ ''میں چلتی ہوں''۔ وہ ریسیور کان سے ہٹانے ہی لگی تھی کہ وہ کہہ اُٹھا۔

''ایک منٹ، ایک آخری سوال کرنا ہے مجھے''۔

وہ اُٹھتے اُٹھتے واپس بیٹھ گئی۔ ''جی پوچھیے!''

''آپ مجھ سے شادی کریں گی؟''

اسے زور کا دھچکا لگا تھا۔ وہ گنگ سی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دھندلی دیوار کو دیکھے گئی۔

''بتایئے مس حیا!''

اس کے لب بھینچ گئے۔ حیرت اور شاک پہ غصہ غالب آ گیا۔

''مس حیا نہیں، مسز حیا!'' چبا چبا کر ایک ایک لفظ بولتی، وہ پرس تھام کر اُٹھی۔ فون کا ریسیور ابھی تک پکڑ رکھا تھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ واضح چونکا تھا۔

''افسوس کہ میرے بارے میں اتنی معلومات رکھنے کے باوجود آپ میرے بچپن کے نکاح کے بارے میں لاعلم ہیں۔ وہ نکاح جو میرے کزن جہان سکندر سے میرا بچپن میں ہی پڑھا دیا گیا تھا۔ میں شادی شدہ ہوں اور میرا شوہر ترکی میں رہتا ہے''۔

''اوہ آپ کی وہ رشتہ دار فیملی جو کبھی پاکستان نہیں آئی؟ جانتا ہوں، آپ کی پھپھو کا خاندان جو ذلت اور شرمندگی کے مارے اب شاید کبھی ادھر کا رُخ نہیں کرے گا، آخر کارنامہ بھی تو بہت شرم ناک انجام دیا تھا نا۔ ان کا انتظار کر رہی ہیں آپ؟ ارے بچپن کا نکاح تو کورٹ

Downloaded From http://paksociety.com

کی ایک ہی پیشی میں ختم ہو جاتا ہے"۔

"شٹ اَپ، جسٹ شٹ اَپ میجر احمد!" وہ چلائی تھی۔ "آپ کی ہمت بھی کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی؟ ارے بھاڑ میں جائیں آپ اور آپ کی وہ ویڈیو، آپ بھلے اسے ٹی وی پہ چلوا دیں، مجھے پروا نہیں۔ میرا ایک کام کرنے کی اتنی بڑی قیمت وصولنا چاہتے ہیں آپ؟ رہا جہان سکندر، تو وہ میرا شوہر ہے اور مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ اس کے علاوہ میری زندگی میں کوئی نہیں آ سکتا، سمجھے آپ"۔

ریسیور واپس پٹخنے سے قبل اس نے دوسری جانب سے اس کا سوگوار یت بھرا قہقہہ سنا تھا۔ پیر پٹخ کر وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ اسی پل دروازہ کھول کر ایک سپاہی اندر داخل ہوا، جو اسے اندر بٹھا کر گیا تھا، گویا اسے فوراً اشارہ کر دیا گیا تھا۔ ملاقات ختم ہو چکی تھی اور حیا کے لیے وہ بے حد تلخ ثابت ہوئی تھی۔

"گاڑی آپ کا انتظار کر رہی ہے میم! آیئے"۔ وہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ حیا نے گردن موڑ کر دیکھا۔

دھند کے اس پار وہ آدھے سیاہ چہرے والا شخص میز پہ جھکا کچھ کر رہا تھا۔ شاید کچھ لکھ رہا تھا۔ اسے لگا اس نے اس کی میز پہ کسی سرخ شے کی جھلک دیکھی ہے۔ شاید سرخ گلابوں کے گلدستے کی یا شاید یہ اس کا وہم تھا۔

جس لمحے وہ اس پرانی مرسڈیز کی پچھلی نشست پہ بیٹھی تو کھلے دروازے سے اسی سپاہی نے جھک کر ایک سرخ گلابوں کا بوکے اسے تھمایا۔ گو کہ اس کے ساتھ کوئی خط نہ تھا اور وہ پھول ان سفید گلابوں سے قطعاً مختلف تھے، پھر بھی اسے یقین ہو گیا کہ وہ گمنام خطوط بھیجنے والا میجر احمد ہی تھا اور وہ اسے بہت پہلے سے جانتا تھا۔

"یہ جا کر اپنے میجر احمد کے منہ پہ دے مارو"۔ اس نے بوکے واپس سپاہی کے بازوؤں میں پھینکا اور دروازہ کھٹاک سے بند کیا۔ مرسڈیز زن سے آگے بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"حیا..... حیا"۔

شام میں ارم بھاگتی ہوئی آئی۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

"وہ ویڈیو اس ویب سائٹ سے ریموو ہو گئی ہے"۔ اس نے فرطِ جذبات سے تقریباً بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی حیا کو جھنجھوڑ ہی دیا تھا۔

"مگر کیسے ہوا یہ سب؟"

"اس ویب سائٹ والے کو خوفِ خدا آ گیا ہو گا، مجھے کیا پتا"۔ وہ لاپروائی سے انجان بن گئی۔

"ہوں شاید، مگر اچھا ہی ہوا، اوہ ہاں! تمہاری ترکی کی کب فلائٹ ہے؟"

"پتا نہیں، پہلے پاسپورٹ تو ملے، پھر ہی ویزا ملے گا"۔ اس کو ارم کی موجودگی سے کوفت ہونے لگی تھی۔ کچھ اس کے تاثرات سے ہی ظاہر تھا، ارم جلد ہی اُٹھ کر چلی گئی۔ وہ پھر سے اپنی سوچوں میں اُلجھ گئی۔

میجر احمد..... اس کا آدھا جھلسا چہرہ..... سامنے نہ آنا..... پردے کے پیچھے سے بات کرنا..... اور وہ اس کی عجیب فلسفیانہ باتیں..... جنت وغیرہ کا تذکرہ..... باز پرس کرنا..... اور پھر شادی کا سوال، اوہ خدایا..... کیسا عجیب آدمی تھا وہ..... اور..... اور اس کی ایک بات جس کے بارے میں وہ اس وقت شدید عالمِ طیش میں ہونے کے باعث سوال نہیں کر سکی تھی۔

"آپ کی پھپھو کا خاندان جو ذلت اور شرمندگی کے مارے اب شاید کبھی ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔ آخر کارنامہ بھی تو بہت شرم ناک سرانجام دیا تھا نا"۔

کیوں کہی تھی اس نے یہ بات؟ کیسی ذلت و شرمندگی؟ کیسا شرم ناک کارنامہ؟

پھپھو کا خاندان واقعتاً پلٹ کر نہیں آیا تھا، تو کیا اس کی وجہ ان کی اپنے ملک اور خاندان سے بے زاری نہیں تھی، جیسا کہ وہ قیاس کرتی تھی، بلکہ کوئی اور تھی؟ کوئی ذلت آمیز کام جو انہوں نے سرانجام دیا تھا؟ اور انہوں نے کس نے؟ پھپھو؟ ان کے شوہر؟ یا جہان سکندر

Downloaded From http://paksociety.com

نے؟ کیا گتھی تھی بھلا؟ مگر میجر احمد سے وہ استفسار کر نہیں سکتی تھی، نہ ہی اس کا دوبارہ کوئی فون آیا تھا..... پھر؟

اور وہ خطوط..... وہ گلدستے..... وہ بھی اسی نے بھیجے تھے۔ اسے اس کی سانجی جانے کا کیسے علم ہوا؟ یقیناً وہ اس کی کال ٹیپ کر رہا تھا جب زارا کو اس نے بتایا تھا اور وہ اس وقت یقیناً اس کے گھر کے باہر ہی ہوگا، مگر وہ گلدستہ تو کچن کی ٹیبل پہ رکھا تھا۔ تو کیا وہ ان کے گھر بھی داخل ہو سکتا تھا؟ اور اس کے کمرے میں بھی؟

خوف کی ایک لہر نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ اُٹھ کر کمرے کا دروازہ لاک کرنے ہی لگی تھی کہ فاطمہ بیگم دروازہ کھول کر اندر آئیں۔

''حیا..... تمہارے ابا تمہیں بلا رہے ہیں''۔

''او کے، آ رہی ہوں''۔ اس نے تکیے پہ رکھا دوپٹہ اُٹھا کر گلے میں ڈالا، سلیپرز پہنے اور باہر آئی۔

''ابا؟'' اس نے اُنگلی کی پشت سے ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''آ جاؤ حیا''۔

اس نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے بیڈ پہ سلیمان صاحب بیٹھے تھے۔ سوچ میں ڈوبے، متفکر، اس کے منتظر..... ساتھ ایک طرف صوفے پہ فاطمہ بیگم موجود تھیں۔ ان کی خوب صورت آنکھیں سوگوار تھیں اور باوقار سراپے پہ افسردگی چھائی تھی۔

''آپ نے بلایا تھا ابا؟''

''ہاں، آؤ بیٹھو''۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے چلتی ہوئی آئی اور بیڈ کی پائینتی پہ ٹک گئی۔ سلیمان صاحب چند لمحے خاموش رہے، شاید وہ کوئی تمہید سوچ رہے تھے مگر حیا کو اُمید تھی کہ وہ بنا تمہید کے ہی سیدھی بات کر ڈالیں گے۔

''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے''۔

اس نے گردن اُٹھائی۔ وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

''اب تمہیں کورٹ کے ذریعے سین کے بیٹے سے خلع لے لینی چاہیے''۔

کوئی اس کے منہ پہ چابک دے مارتا، تب بھی شاید اسے اتنا درد نہ ہوتا، جتنا اب ہوا تھا۔

''میں نے وکیل سے بات کر لی ہے۔ عدالت کی ایک پیشی میں علیحدگی ہو جائے گی اور جتنے بے زار وہ لوگ ہم سے ہیں، یقیناً انہیں اس بات سے بہت خوشی ہوگی''۔

اس نے شاکی نگاہوں سے ماں کو دیکھا تو انہوں نے بے بسی سے شانے اُچکا دیے۔

''تمہارے ابا ٹھیک کہہ رہے ہیں''۔

''اور اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ ان کے رویے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس رشتے کو رکھنا ہی نہیں چاہتے''۔

''ابا! کیا یہ واحد حل ہے؟'' بہت دیر بعد وہ بولی تو اس کی آواز میں ٹوٹے خوابوں کا دُکھ تھا۔

''کیا اس کے علاوہ بھی کوئی حل ہے؟ حیا! دنیا کا کوئی باپ اپنی بیٹی کا گھر نہیں توڑنا چاہتا اور میں کبھی تمہیں یہ نہ کہتا، لیکن کس قیمت پر؟ کس قیمت پر ہم یہ رشتہ نبھانے کی کوشش کریں، جب وہ کوئی اُمید ہی نہیں دلاتے؟''

''اگر آپ کو واقعی لگتا ہے کہ آپ میرا گھر بسا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں تو مجھے ترکی جانے دیں، وہاں میں اس کو ضرور ڈھونڈوں گی اور پوچھوں گی کہ اگر وہ گھر بنانا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ مجھے طلاق دے دے۔ اگر نہیں دیتا تو وہیں کورٹ چلی جاؤں گی مگر مجھے ایک آخری کوشش کر لینے دیں، پلیز!''

وہ خاموش ہو گئے، شاید قائل ہو گئے تھے۔

''ابا آپ مجھے پانچ ماہ کا وقت دیں۔ اگر اس کے آخر میں بھی آپ کو لگے کہ مجھے خلع لے لینی چاہیے، تو میں آپ کے فیصلے میں

Downloaded From http://paksociety.com

آپ کے ساتھ ہوں گی!'' وہ اُٹھی اور پھر بنا کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ خبطی لڑکی اسے کلاس کے باہر ہی مل گئی تھی۔ وہ فائلیں سنبھالتی باہر جا رہی تھی، جب اس نے حیا کو روک لیا۔

''سنیں مس سلیمان!'' وہ جیسے مجبوراً اسے مخاطب کر رہی تھی۔ حیا نے کوفت سے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں خدیجہ رانا کھڑی تھی۔ آنکھوں پہ بڑا سا چشمہ لگائے، بالوں کی اونچی پونی باندھے، سینے سے فائل لگائے۔ ڈی جے..... جسے ڈی جے صرف اس کے فرینڈز کہا کرتے تھے، اور وہ اس کی فرینڈ نہ تھی، نہ بننا چاہتی تھی۔

''جی خدیجہ؟'' بادلِ نخواستہ اس نے ذرا مروت سے جواب دیا۔

''آپ نے ویزا کے لیے اپلائی کر دیا؟ دراصل میم فرخندہ نے کہا ہے کہ ہم دونوں کو جلد از جلد ویزا کے لیے اپلائی کرنا چاہیے کیونکہ فروری کے پہلے ہفتے میں ہم نے سانچی کو جوائن کرنا ہے اور آج تیرہ تاریخ ہے۔ ہمارے پاس بس پندرہ دن ہیں اور ترکی کا ویزا پندرہ دن میں کبھی نہیں لگا کرتا''۔

وہ پریشانی سے تیز تیز بولے جا رہی تھی۔ اس کی بات کچھ ایسی تھی کہ حیا کو سنجیدہ ہونا پڑا، ورنہ ابھی تک وہ ابا کی کہی گئی باتیں سوچ رہی تھی۔

''اوہ..... تو تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''کل لازماً ٹرکش ایمبیسی جا کر ویزے کے لیے اپلائی کرنا ہے۔ آپ کو پتا ہے ٹرکش ایمبیسی کا عجیب سا رول ہے کہ ہر روز سب سے پہلے آنے والے پندرہ امیدواروں کا ہی انٹرویو ہوتا ہے۔ ایمبیسی صبح سات بجے ہی کھل جاتی ہے اور وہاں لوگوں کی لائن لگی ہوتی ہے۔ اگر ہم ایک منٹ بھی لیٹ ہوئے تو وہ ہمیں اگلے دن پہ ڈال دیں گے۔ آپ سن رہی ہیں نا؟''

''ہوں..... جی''۔ اس نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔ پتا نہیں وہ کیا بولے جا رہی تھی۔

''آپ مجھے اپنا نمبر لکھوا دیں، تاکہ ہم کوآرڈی نیٹ کر سکیں''۔

اس نے بے دلی سے اپنا نمبر لکھوا دیا۔ خدیجہ اسے اپنے فون پہ نوٹ کرتی گئی۔

''ٹھیک ہے، کل صبح ساڑھے چھ تک آپ ڈپلومیٹک انکلیو تک پہنچ جائیے گا، میں وہیں ہوں گی''۔

اس نے اچھا کہہ کر جان چھڑانے والے انداز میں سر ہلایا۔

''اور پلیز دیر مت کیجیے گا۔ یہ نہ ہو کہ آپ کی وجہ سے میرا بھی ویزا رہ جائے مس سلیمان!'' وہ ناک چڑھا کر یہ جتا گئی کہ آخر وہ بھی خدیجہ رانا ہے۔

''کیا کمپنی ملی ہے مجھے، اُف!'' وہ پیر پٹخ کر آگے بڑھ گئی۔ ابا کی باتوں نے اسے اتنا ڈسٹرب کیا تھا کہ اس وقت ویزا وہ آخری چیز تھا، جس کے بارے میں وہ سوچ سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کی تاریکی کو دُکانوں کی شیشے کی دیواروں سے جھلکتی روشنیاں روشن کیے ہوئے تھیں۔ زرد روشنیوں کا عکس سامنے لمبی سیدھی سڑک پہ بھی پڑا تھا، جس کے ایک طرف پارکنگ کی گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا تھا۔ چبوترے پہ دن میں بک فیر کے اسٹال لگا کرتے تھے، آج کل وہ بند تھے۔ یہ جناح سپر تھا اور وہ اس وقت زرد روشنیوں کے عکس سے چمکتی سڑک پہ چل رہی تھی۔

سیاہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، شانوں پہ پھسلتے لمبے بال لیے، وہ سر جھکائے خود فراموشی کے عالم میں قدم اُٹھا رہی تھی۔ ابا اور اماں کی کہی گئی باتیں دل و دماغ میں گونج رہی تھیں۔

جہان سکندر کون تھا؟ اس کا منکوح، کزن، شوہر..... وہ شخص جس کے خواب اس نے ساری عمر دیکھے تھے، اتنی آسانی سے وہ کیسے اس سے دست بردار ہو جائے؟ کیا ابا، اماں نہیں جانتے تھے کہ خواب اگر اپنے ہاتھوں سے توڑے جائیں تو اُنگلیاں بھی زخمی ہو جاتی ہیں پھر

Downloaded From http://paksociety.com

کیسے وہ خود کو زخم دے؟ اگر وہ جہان یاسین پھپھو کے لیے کوئی ان چاہا رشتہ تھی تو بھی ان کو صفائی کا ایک موقع دیئے بغیر ہی کیسے خود کو ان سے الگ کر لے؟ یہ مکھن نہیں تھا جس سے بال نکالنا تھا۔ یہ تو کانٹوں سے اُلجھا دامن تھا۔ اگر کھینچ کر الگ کیا تو دامن پھٹ جائے گا اور اگر کانٹے نکالنے کی کوشش کی تو اُنگلیاں زخمی ہو جائیں گی۔ مگر کیا پتا اس کانٹوں کے پودے پہ گلاب بھی کھلتے ہوں..... سرخ گلاب..... سبز پتے..... رنگوں، خوشیوں اور خوابوں کے۔

وہ سیٹی کی تیز آواز تھی، جس نے اسے خیالوں کے ہجوم سے نکالا۔ اس نے چونک کر سر اُٹھایا۔

وہ تین لڑکے تھے۔ جینز اور جیکٹس میں ملبوس، وہ مختلف سمتوں سے اس کی طرف آ رہے تھے، یوں کہ ہر طرف وہی تھے، گھیرا..... نرغہ..... تنگ دائرہ۔

جگہ قدرے سنسان تھی۔ خالی چبوترا تاریکی میں ڈوبا تھا۔ جگمگاتی روشن دُکانیں ذرا دور تھیں، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

وہ تیزی سے پلٹی مگر ادھر سے بھی ان کا ہی کوئی چوتھا آ رہا تھا۔

وہ مبہم آوازیں نکالتے، معنی خیز اشارے کرتے اس کے اِرد گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ دبی آوازوں کا شور اس کو گھیرنے لگا تھا۔

وہ قریب آتے دو لڑکوں کے درمیان سے تیزی سے سر جھکائے گزرنے لگی مگر دائیں والے لڑکے نے سبک رفتاری سے اس کی کلائی کو تھام کر اپنی جانب کھینچا، ابھی اس کے لبوں سے چیخ بھی نہیں نکلی تھی کہ آگے بڑھنے والا خود بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ ٹن کی زوردار آواز کے ساتھ کسی نے اس لڑکے کے سر کے پچھلے حصے پہ کچھ مارا تھا۔

''مرن جوگے..... باجی کو تنگ کرتے ہو، چھوڑوں گی نہیں میں تمہیں''۔ وہ اونچی لمبی، ہٹی کٹی سی ڈولی ہاتھ میں پکڑا فرائنگ پان گھما گھما کر ان کو مار رہی تھی۔

حیا ہکا بکا سی دو قدم پیچھے ہوئی۔

جس کو لگا تھا وہ سر پکڑے بلبلاتا ہوا پیچھے بھاگا۔ باقی دو بھی ساتھ ہی دوڑے۔ ایک نے ذرا پھرتی دکھا کر ڈولی کو لات مارنی چاہی، ڈولی نے اسی فرائنگ پان کو گھما کر ایسی ضرب دی کہ اس لڑکے کا گھٹنا چیخ اُٹھا۔ شاید ٹوٹ گیا تھا، کم از کم اس کی چیخ سے تو حیا کو یہی لگا تھا اور وہ لنگڑاتا ہوا بھاگ اُٹھا۔

''آئے بڑے سالے، ڈولی سے پنگا لیتے ہیں''۔ وہ فاتحانہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اب حیا کی طرف مڑا۔

سفید آٹے سے گویا اٹا ہوا چہرہ، آنکھوں کے گرد لمبی کالی لکیریں کھینچ کر لائنر لگایا ہوا اور آنکھوں میں نیلے سبز سے لینز، گالوں پہ سرخ پاؤڈر، بھڑکیلا آئی شیڈ و اور سرخ چونچ کی طرح کی لپ اسٹک، بھورے گولڈن بالوں کی لٹیں، سر پہ لیے دوپٹے سے نکل رہی تھیں۔ یقیناً وگ تھی جیسے کہ عموماً ہوتی ہے۔

پہلی دفعہ جب اس نے ڈولی کو دیکھا تھا، اسے کراہیت آئی تھی۔ دوسری دفعہ خوف اور اس روز ٹریفک جام پہ اسے دیکھ کر غصہ آیا تھا اور آج..... آج کچھ بھی نہیں، وہ خاموشی سے تیز تیز سانس لیتی اس کو دیکھ رہی تھی۔

''چھوڑو جی ان حرام خوروں کو باجی! ان کا تو کام ہی یہی ہے، میں بھی بڑی دیر سے تاڑ رہی تھی ان کو، پر مجھے کیا پتا تھا کہ اپنی باجی جی کو تنگ کر رہے ہیں، آئے بڑے''۔

وہ پوری بات سنے بغیر ہی پلٹ گئی۔ سینے پہ بازو لپیٹے، سر جھکائے، تیز تیز قدموں سے چبوترے کی جانب بڑھنے لگی۔ ایک خواجہ سرا کے ساتھ رات کے اس پہر سڑک پہ کھڑے ہونا قطعاً درست نہ تھا۔

''ارے باجی جی..... گل تو سنو''۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔ حیا چلتے چلتے رُکی اور پلٹ کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''کیا ہے؟'' اس کا موی چہرہ دکانوں کی زرد روشنیوں میں دمک رہا تھا۔

''ہائے ربا! باجی جی تسی کتنے سوہنے ہو جی''۔ وہ دونوں ہاتھ رخساروں پہ رکھے خوشی سے چہکا۔

اسے کراہیت آئی، نہ خوف، بس چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''شکریہ ہی کہہ دو جی''۔

''شکریہ.....اور کچھ؟'' اس کا انداز سپاٹ تھا۔

''تسی تے ناراض لگدے ہو جی''۔

''ڈولی! تم کیوں ہر جگہ میرے پیچھے آتے ہو؟''

''ہاں تو ٹینشن تے نہیں دی تہانوں، ہمیشہ مدد ای کیتی اے''۔

''تمہیں کس نے کہا ہے میری مدد کو؟ کس نے تمہیں میرے پیچھے لگایا ہے؟ بولو، جواب دو''۔

ڈولی کا منہ آدھا کھل گیا۔ لینز لگی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر آنسو تیرنے لگے۔

''کسی نے نہیں جی''۔ بڑی دیر بعد وہ دُکھ سے بولا۔ ''مجھے آپ اچھی لگتی ہو، اس لیے آپ کا خیال رکھتی ہوں، آپ کو برا لگتا ہے تو نہیں آؤں گی''۔

دفعتاً حیا کا فون بجا۔ اس نے چونک کر ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھا۔ اس پہ پرائیویٹ نمبر کالنگ لکھا آرہا تھا۔ وہ پیر پٹخ کر چبوترے کی طرف آئی اور پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ فون ابھی تک بج رہا تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا اور ڈولی کو دیکھا، جو چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا، سسکتا ہوا اس تک آرہا تھا۔

''ہیلو؟''

''ہیلو مس حیا.....کیسی ہیں آپ؟'' وہ میجر احمد تھا۔ اس کی آواز کے پیچھے بہت شور تھا۔

ڈولی آہستہ سے اس سے ذرا فاصلے پہ چبوترے پہ بیٹھ گیا۔ سر جھکائے وہ ہتھیلی سے آنسو پونچھ رہا تھا۔

''خدا کے لیے مجھے فون مت کیا کریں اور یہ جو بندے آپ نے میرے پیچھے لگائے ہیں نا، میں ان میں سے ایک ایک کا خون کردوں گی اور اس سب کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ میں شادی شدہ ہوں اور جلد ہی اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤں گی، میرا پیچھا چھوڑ دیں، سمجھے آپ؟''

مزید کچھ سنے بغیر اس نے فون رکھ دیا۔

''تسی گھر بار والے ہو جی؟'' ڈولی نے چہرہ اس کی طرف اُٹھایا۔

''ہاں، تمہارے اس میجر نے تمہیں بتایا نہیں کیا؟ اسی نے میرے پیچھے لگایا ہے نا تمہیں؟''

''اللہ پاک کی قسم لے لو جی، مجھے کسی میجر ویجر نے نہیں بھیجا، میں خود آتا ہوں۔ اللہ کی قسم جی''۔ وہ روتے روتے کہہ رہا تھا۔ حیا کے دل کو کچھ ہوا، اسے لگا وہ سچ بول رہا ہے۔

''میں کسی کو جا کر آپ کی باتیں نہیں بتایا۔ مجھے بڑا پیار ہے جی آپ سے، قسم سے''۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھے گئی۔ کچھ تھا اس میں، پُراسرار، خوف زدہ کرتا، مگر ترس و ترحم آمیز۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مت روؤ''۔

''میں جی بڑا پیار کرتی ہوں آپ سے.....اسی لیے آتی ہوں، پر تسی تے الزام لا رہے ہو''۔ وہ اب سسکتے ہوئے اپنا سر پیٹنے لگا تھا۔

''اچھا.....اچھا.....ناؤ اسٹاپ اٹ!'' وہ چپ چاپ بیٹھا اسے تکتا رہا، جبکہ وہ سامنے خلاؤں میں گھورتی رہی۔

''تسی جا رہے ہو کہیں؟''

حیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''تسی فون میں کہیا نا''۔ اس نے وضاحت کی۔

''ہاں، میں یورپ جا رہی ہوں''۔

''وہ جہاں امریکہ ہے؟ وہ انگریزی فلموں والا؟'' وہ رونا بھول کر خوشی سے چہکا۔ شاید وہ واقعی ایک عام خواجہ سرا تھا یا پھر کوئی بہت

Downloaded From http://paksociety.com

مکار، اداکار۔

''ہاں وہی''۔اس نے تردید نہیں کی۔

''ادھر کون ہے جی؟''

''میرا شوہر رہتا ہے وہاں''۔وہ اب سامنے روشن دکانوں کی قطار کو دیکھ رہی تھی۔

''کیسا ہے جی تمہارا شوہر؟''

''میں نہیں جانتی ڈولی.....اگر میں جانتی ہوتی تو آج ادھر نہ بیٹھی ہوتی''۔

اس کی لانبی پلکیں ذرا سی بھیگیں، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پانی تیرنے لگا تھا۔

''پر جی.....''

''تم دعا کرو ڈولی! وہ مجھے مل جائے''۔وہ آنکھوں کی نمی چھپاتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ڈولی نے سر اُٹھا کر دیکھا۔وہ اُنگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ صاف کرتی سڑک کی طرف جا رہی تھی۔

ڈولی کی آنکھوں میں بے پناہ اُداسی اُتر آئی۔

''خدا کرے وہ تمہیں کبھی نہ ملے حیا سلیمان.....خدا کرے تم اس سے مایوس ہو کر جلد ہی واپس آ جاؤ۔اور خدا کرے تم ادھر جا ہی نہ سکو''۔

وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی، جب اس نے ڈولی کو کہتے سنا، مگر نہیں، وہ ڈولی کی آواز نہیں تھی، وہ کسی مرد کی آواز تھی۔ بھرپور، خوب صورت اور اُداس، ایسی آواز جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔وہ میجر احمد کی آواز سے زیادہ خوب صورت تھی اور اس میں جہان سکندر کی اجنبی آواز جیسی بے رُخی بھی نہ تھی۔

اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔تیزی سے اس نے گردن موڑی۔

دور اندھیرے میں ڈوبا چبوترہ خالی تھا۔وہاں دور، دور تک کسی کا نام ونشان نہیں تھا۔

زندگی میں پہلی بار اس کے اندر ڈولی سے دوبارہ ملنے کی خواہش نے جنم لیا تھا۔اسے جاننا تھا کہ ڈولی کون ہے، کیا ہے، کیوں ہے۔

☆ ☆ ☆

اس رات وہ بمشکل دو، تین گھنٹے تک سو سکی تھی۔پھر فجر کی اذان سے بھی پہلے تیار ہو کر وہ ڈپلومیٹک انکلیو پہنچ گئی کہ خدیجہ کی بار بار کال آ رہی تھی۔

''شکر ہے آپ آ گئیں''۔خدیجہ اسے باہر ہی مل گئی۔اس کی عینک کے پیچھے چھپی آنکھیں فکر مند لگ رہی تھیں۔

حیا سادہ شلوار قمیص اور سیاہ جیکٹ میں ملبوس تھی۔لمبے کھلے بال کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے وہ خدیجہ تک آئی۔

''اب کدھر جانا ہے؟''

''اندر.....یہ شٹل لے لیتے ہیں۔یہ ٹرکش ایمبیسی تک پہنچا دے گی''۔

تب ہی ایک عمر رسیدہ صاحب اور خاتون تیزی سے شٹل کی طرف بڑھتے دکھائی دیے۔

''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ یہ انکل آنٹی بھی ٹرکش ایمبیسی جا رہے ہیں۔حیا! جلدی کریں، ہمیں پہلے پندرہ میں سے ہونا ہے''۔

وہ حیا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھی، پھر خیال آنے پہ پوچھ لیا۔''اندر آئی ڈی کارڈ سے انٹری ہوگی، آپ آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ لائی ہیں نا؟''

اور حیا کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔وہ رات اتنی ڈسٹرب رہی کہ بھول ہی گیا کہ.....

''پاسپورٹ.....پاسپورٹ تو مجھے آج ملنا تھا۔وہ تو ابھی بنا ہی نہیں ہے''۔

''حیا!'' خدیجہ منہ کھولے ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔

''نہیں.....آئی ایم سوری.....میں.....اور خدیجہ.....آئی ایم رئیلی سوری، میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہے''۔اس کا سر گھومنے

Downloaded From http://paksociety.com

لگا تھا۔ وہ اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتی تھی؟

''آپ.....آپ کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے تو آپ خود کیوں آئی ہیں، ہاں؟ آپ کی وجہ سے میرا اسکالرشپ بھی رہ جائے گا، اتنا احساس ہے آپ کو؟''

وہ پھٹ پڑی تھی اور حیا، جو اتنی مغرور اور خود پسند تھی، جس کی شخصیت سے لباس تک ہر شے پرفیکٹ ہوتی تھی اور جس کی مثالیں اس کی کلاس فیلو دیا کرتی تھیں، وہ ایک دم رو پڑی۔

''آئی ایم سوری خدیجہ.....میرے کچھ پرابلمز تھے، میری لائف.....میری لائف بہت ڈسٹرب ہو گئی ہے، میں.....'' وہ جلدی جلدی بے اختیار اُمڈ آنے والے آنسو صاف کرنے لگی۔

''اٹس او کے خدیجہ! آئی ایم سوری، مگر آپ جائیں، میں کل ٹرائی کر لوں گی''۔

خدیجہ چند لمحے خاموش رہی، پھر آہستہ سے بولی۔

''اپنا آئی ڈی کارڈ مجھے دیں''۔

''جی؟''

''اپنا آئی ڈی کارڈ مجھے دیں اور واپس جا کر پاسپورٹ آفس سے اپنا پاسپورٹ اُٹھا کر لائیں۔ اُمید ہے آئی ڈی کارڈ سے آپ کی انٹری ہو جائے گی اور ہماری باری آنے تک آپ واپس پہنچ جائیں گی''۔

''مگر.....مگر پاسپورٹ آفس تو پنڈی میں ہے اور مجھے تو جاتے ہوئے بھی ایک گھنٹہ لگ جائے گا اور پاسپورٹ آفس تو کھلے گا ہی نو بجے، جبکہ ایمبیسی سات بجے کھل جائے گی''۔ اس نے فکرمندی سے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

''یہ ناممکن ہے۔ میں کبھی بھی اتنی جلدی واپس نہیں پہنچ پاؤں گی کہ پہلے پندرہ میں سے ہو سکوں''۔

''حیا! میں نے زندگی میں ایک ہی بات سیکھی ہے کہ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی، جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے۔ آپ ابھی سے ہار مان لینا چاہتی ہیں؟ لائیں، آئی ڈی کارڈ دیں، مجھے ان انکل آنٹی سے پہلے پہنچنا ہے''۔ وہ اس کے ہاتھ میں پکڑا آئی ڈی کارڈ جھپٹ کر شٹل کی طرف دوڑتی ہوئی چلی گئی۔

اس نے آنکھوں کے کنارے پونچھے اور پھر کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھا۔ کیا اس کا ویزا لگ جائے گا؟ یا ڈولی کی بددعا پوری ہو جائے گی اور وہ کبھی ترکی نہیں جا سکے گی؟ اسے کبھی جہان سکندر نہیں مل سکے گا؟

مگر خدیجہ نے کہا تھا، انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ خود ہار نہ مان لے اور اس نے سوچا، وہ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گی۔

بے دردی سے آنکھیں رگڑ کر وہ گاڑی کی طرف لپکی تھی۔

بہت ریش ڈرائیو کر کے وہ پنڈی آئی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ اسے بند پاسپورٹ آفس کے باہر بیٹھنا پڑا، خدا خدا کر کے نو بجے آفس کھلا تو وہ اندر بھاگی۔ شاید اس کی ہمت دکھانے کا صلہ تھا۔ دس منٹ بعد وہ اپنا پاسپورٹ لیے آفس کی بیرونی سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ تب ہی کسی غیر شناسا نمبر سے کال آئی۔ اس نے کسی خیال کے تحت فون اُٹھا لیا۔

''ہیلو؟''

''ہیلو حیا؟ میں خدیجہ بول رہی ہوں۔ میرا فون تو باہر بھائی کے پاس ہے، کیونکہ اندر سیل فون کی پرمیشن نہیں ہے، ابھی ایمبیسی کے گارڈ سے فون لے کر سو منتیں کر کے کال کر رہی ہوں''۔ وہ ایک ہی سانس میں تیز تیز بولے گئی۔ ''آپ کدھر ہیں؟''

''بس مجھے پاسپورٹ مل گیا ہے، میں آ رہی ہوں۔ میری انٹری ہوئی؟'' اس نے گاڑی میں بیٹھ کر چابی اگنیشن میں گھمائی۔

''شکر ہے میں نے تیز بھاگ کر ان انکل آنٹی کو بائی پاس کر لیا۔ میں چودہ نمبر پہ تھی اور آپ کی بھی انٹری کرا دی ہے، آپ کا پندرہواں نمبر ہے''۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اوہ شکر!''

''لیکن انہوں نے ان انکل آنٹی کو روک رکھا ہے کہ اگر آپ نہ آئیں تو ان کا انٹرویو ہو جائے گا اور وہ آنٹی مسلسل تسبیح پڑھ رہی ہیں، حیا! آپ جلدی سے آجائیں''۔

''میں آرہی ہوں، بس ابھی آفس ٹائم ہے نا تو ٹریفک بہت ہیوی ہے''۔

''بس جلدی سے آجائیں، یہ بار بار پوچھ رہے ہیں کہ میری دوسری ساتھی کدھر ہیں''۔

''بس تھوڑی دیر اور!'' اس نے ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھا دیا۔

ٹریفک حسبِ معمول بہت پھنسا ہوا تھا۔ بے پناہ رش، ہارن کا شور، بند سگنل، پھنسی ہوئی گاڑیاں۔ وہ بار بار فکری مندی سے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی اور پھر سست روی سے چلتے ٹریفک کو، بمشکل مری روڈ سے نکل پائی تو سکون کا سانس لیا۔

معمول کی چیکنگ کے بعد وہ گیارہ بجے تک اس اوپن ایر لاؤنج میں پہنچ پائی جہاں خدیجہ تھی۔ ترک رگز، مخصوص ترک بلیو آئی (evil eye) اور ترکی کے نقشوں سے وہ لاؤنج سجایا گیا تھا۔

خدیجہ ایک صوفے پر منتظر، پریشان سی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''شکر ہے آپ آگئیں حیا! انہوں نے سب کے انٹرویو روک رکھے ہیں۔ پہلے ہمارا ہوگا''۔

''اچھا..... مگر کیوں؟''

لیکن کیوں کا جواب سننے کا وقت نہیں تھا اور پھر ان کو انٹرویو کے لیے کال کر لیا گیا تھا۔

وہ خوش شکل سا ترک ڈپلومیٹ ان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ وہ خدیجہ کے آگے چلتی ہوئی سامنے ہوئی اور اپنی فائل شیشے کی کھڑکی کے سوراخ سے اندر دی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر اس کا ویزا مسترد ہو گیا تو.....؟

اس آفیسر نے ان کی فائلیں اُٹھائیں، ان سے فارم نکالے اور فائلیں واپس بند کر کے رکھ دیں۔ اگر اس نے ویزا دینا ہوتا تو ان کا انٹرویو کرتا، کچھ تو پڑھتا، کوئی سوال تو پوچھا مگر وہ بس سرسری سا فارم کو دیکھ رہا تھا، تو کیا وہ واقعی اس کا ویزا مسترد کرنے لگا تھا۔

فارم پہ ایک نگاہ دوڑا کر اس نے سر اُٹھایا اور سنجیدگی سے ان دونوں کو دیکھا، جو بنا پلک جھپکے، سانس روکے اس کو دیکھ رہی تھیں۔

''آپ کدھر تھیں؟ میں اتنے دنوں سے آپ کا ویٹ کر رہا تھا''۔ اس نے ساتھ ہی میز پہ رکھا ایک کاغذ اُٹھایا۔ ''مجھے سبانجی یونیورسٹی نے یہ لسٹ بھجوائی تھی، اس میں آپ کے نام ہیں تاکہ میں آپ کا ویزا لگا دوں۔ خیر، ویزا کل تک اسٹیمپ ہو جائے گا، آپ میں سے کوئی ایک کل آکر دونوں پاسپورٹ پک کر لے۔ شام چار بجے تک، رائٹ؟''

''رائٹ!'' فرطِ جذبات سے ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ دل یوں دھڑک رہا تھا گویا ابھی سینہ توڑ کر باہر آجائے گا۔ وہ جیسے ہی اس کے آفس سے نکلیں، ایک ساتھ رُک گئیں اور ایک دوسرے کو دیکھا۔

''آئی ایم سوری حیا!''

''آئی ایم سوری خدیجہ!''

بیک وقت دونوں کے لبوں سے نکلا تھا اور پھر وہ دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

بالآخر اسے یقین آگیا تھا کہ ہاں، وہ واقعی ترکی جا رہی ہے۔ وہ بھی پورے پانچ ماہ کے لیے۔ وہ ترکی جہاں وہ رہتا ہے۔ وہ جو ہمیشہ سے اس کے دل کے ساتھ رہا تھا۔

Welcome me O Sabanci !

''ویلکم می او سبانجی!'' (مجھے خوش آمدید کہو، اے سبانجی!)

☆ ☆ ☆

''بھائی تو چلے گئے تھے مجھے ڈراپ کر کے، میں آپ کے سیل سے ان کو کال کر لوں کہ وہ مجھے پک کر لیں؟'' ڈپلومینک انکلیو سے

Downloaded From http://paksociety.com

نکلتے ہوئے خدیجہ نے پریشانی ظاہر کی تو اس نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔

''نو پرابلم، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گی خدیجہ!''

''آپ مجھے ڈی جے اور تم کہہ سکتی ہیں''۔

''شیور''۔ اس نے پارکنگ میں کھڑی کار کا لاک کھولا۔ ''مجھے جناح سپر جانا تھا۔ یوں نہ کریں کہ کچھ شاپنگ کر لیں؟ آپ نے کچھ تو لینا ہوگا خدیجہ؟'' اس کی تاکید کے باوجود وہ تکلف ختم نہ کر سکی۔

''سوئیٹرز لینے ہیں، وہاں بہت سردی ہوگی''۔

''پھر وہیں چلتے ہیں''۔

''سائینوشور کے بالمقابل چبوترہ خالی تھا مگر دن کے وقت وہ اتنا ویران نہیں لگ رہا تھا، جتنا پچھلی رات لگا تھا اور وہ آواز..... وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

''اوہ نیڈل امپیر یشنز پہ سیل لگی ہے۔ آئیں، کچھ دیکھ لیتے ہیں''۔ وہ کافی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ یہاں سے کوئی اچھا شرٹ پیس لے آئے اور آج تو سیل بھی لگی تھی۔ وہ اور خدیجہ آگے پیچھے شیشے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئیں۔

شاپ کے اندر وہی مخصوص ماحول تھا۔ ہیٹر کی گرمی اور باہر کی خنکی کا ملا جلا تاثر۔ زرد سپاٹ لائٹس سے چمکتی چھت اور ہر طرف شو کیسز پہ پھیلے کڑھائی والے کپڑے.....

وہ محوی اسٹینڈ پہ لگے نمونے دیکھتی آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی تھی۔ سامنے ورک ٹیبل تھی جس کے پیچھے کھڑا مستعد سیلز مین اسے دیکھ کر فوراً متوجہ ہوا تھا۔

''جی میم؟''

''یہ پنک والا دکھائیں، جس پہ وائٹ ایمبرائڈری ہے''۔ اس نے اُنگلی سے پیچھے رول کیے ہوئے تھان کی طرف اشارہ کیا۔ سیلز مین نے گردن پھیر کر دیکھا۔

''میم! یہ میں نے سامنے رکھا ہے، یہ سامنے ہی پڑا ہے''۔ وہ اس سے چند فٹ بائیں جانب اشارہ کر رہا تھا جہاں ایک فیملی کھڑی اسی کپڑے کا معائنہ کر رہی تھی۔

''اوہ تھینکس''۔ وہ چند قدم چل کر بائیں جانب آئی، جہاں میز پہ وہ خوب صورت کڑھائی والا شرٹ کا فرنٹ پیس پھیلا ہوا تھا۔ حیا کے بالکل بائیں طرف کھڑا ایک نوجوان سر جھکائے ہاتھ میں کپڑے کو مسل کر چیک کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نفیس، معمر سی خاتون اور ایک کم عمر اونچی پونی ٹیل والی لڑکی کھڑی تھی۔

''ممی! یہ پنک والا لے لیتے ہیں، ثانیہ بھابھی کا کمپلیکشن فیئر ہے، ان پہ سوٹ کرے گا، کیوں بھائی؟'' وہ اب نوجوان سے رائے مانگ رہی تھی۔ حیا نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اسے بس یہی جلدی تھی کہ کب وہ شخص اس کپڑے کو چھوڑے اور وہ اسے دیکھ پائے۔ اس وقت بھی گلابی شرٹ کا کپڑا اس شخص کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اسے ہاتھ میں یوں پکڑ رکھا تھا کہ اس کی ہتھیلی والی طرف اوپر تھی۔ حیا اس کے ہاتھ میں پکڑے کپڑے کو دیکھ رہی تھی، جب دفعتاً اس کی نگاہیں کپڑے سے اس شخص کی کلائی پہ پھسلتی گئیں۔ وہ بری طرح چونکی۔

اس کی کلائی پہ کانٹے کا سرخ گلابی سا نشان تھا۔ جیسے جلا ہو..... یا..... کوئی برتھ مارک.....

Downloaded From http://paksociety.com

باب 2

وہ اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ گلابی کپڑے کو ہاتھ میں مسل کر چیک کرتا ہوا وہ مکمل طور پر یہ اپنی فیملی کی طرف متوجہ تھا۔ وہ یہاں سے اس کا نیم رخ ہی دیکھ سکتی تھی۔

وہ دراز قد تھا۔ رنگ صاف اور آنکھوں پر فریم لیس گلاسز تھے۔ چہرے پہ متانت اور سنجیدگی تھی۔ جینز اور جیکٹ میں ملبوس وہ اچھا خاصا اسمارٹ نوجوان تھا۔

حیا نے دوبارہ اس کے ہاتھ کو دیکھا جس میں اس نے کپڑا پکڑ رکھا تھا۔ اسی پل اس کی بہن نے وہ کپڑا نرمی سے اپنی جانب کھینچا۔ گلابی ریشم اس کی ہتھیلی سے پھسل گیا۔ اب اس کی انگلیاں سامنے تھیں جن کے اوپری پوروں کی قدرتی لکیر پہ بھوری سی لکیر پڑی تھی۔

اسے بے اختیار شیشے میں آئی وہ انگلیاں یاد آئیں۔

بہت احتیاط سے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خدیجہ قدرے فاصلے پہ کھڑی ڈمی کا لباس دیکھ رہی تھی۔ آس پاس کوئی اس کا جاننے والا نہیں تھا۔ یقیناً وہ یہاں تماشا کر سکتی تھی۔

''پنکی!''

اس نے دانستہ قریب کھڑے نوجوان کی طرف چہرہ کر کے با آواز بلند پکارا۔ وہ اپنی بہن کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس نے شاید سنا ہی نہیں۔ البتہ اس کی بہن حیا کو اپنی جانب دیکھتا پا کر کچھ بولتے بولتے رکی تھی۔

''پنکی!'' اس نے ذرا زور سے پکارا۔

کم عمر لڑکی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ اس کی والدہ بھی بیٹی کی نگاہ کے تعاقب میں اس طرف دیکھنے لگی تھیں۔ ان دونوں کے یوں رک کر حیا کو دیکھنے کے باعث اس نوجوان نے گردن موڑی۔ حیا نے دیکھا' اس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ جھلسنے کا نشان بہت گہرا نہ تھا، بس اتنا کہ آدھا چہرہ صاف گندمی رنگ کا لگتا تو دوسرا حصہ گہرا سانولا۔

''پنکی! ڈولی کہاں ہے؟'' وہ سینے پہ بازو لپیٹے بڑے تیکھے انداز میں بولی اور چونکہ وہ اس نوجوان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی تو وہ ذرا الجھ سا گیا۔

''سوری؟''

''میں نے پوچھا ہے، ڈولی کہاں ہے؟''

''کون؟ میں سمجھا نہیں!'' وہ دھیمے مگر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اگر آپ کے دماغ پہ چوٹ آنے کی وجہ سے آپ کی یادداشت کھو گئی ہے تو بے فکر رہیے، میں آپ کو یاد کرائے دیتی ہوں۔ ڈولی آپ کا وہ خواجہ سرا دوست ہے جس کے ساتھ مل کر آپ روز خواجہ سرا بنے سڑک پر بھیک مانگ رہے تھے۔ پنکی نام بتایا تھا آپ نے اپنا، نہیں؟''

اس کی پیشانی شکن آلودہ ہو گئی۔ آنکھوں میں غصہ در آیا، تاہم وہ ذرا برداشت کر کے بولا۔

''میڈم! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں آپ کو جانتا تک نہیں ہوں۔''

''مگر میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ آپ کی انگلیوں پہ نشان میری گاڑی کی کھڑکی کے شیشے میں پھنسنے کا باعث ہی آئے تھے۔ مجھے یاد ہے مسٹر!''

''آپ کون ہیں اور پرابلم کیا ہے آپ کو؟'' وہ لڑکی مزید برداشت نہیں کر سکی تھی۔

''میں وہ ہوں جس نے آپ کے ان بھائی صاحب کو خواجہ سرا بنے دیکھا تھا۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''اُف اف!'' اس نوجوان نے غصے سے کھڑکا۔ ''میں شرافت سے آپ کی بکواس سن رہا ہوں اور آپ بے لگام ہوتی جارہی ہیں۔ اس سے آگے اگر پنے کوئی فضول گوئی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''اتنی ہی شرافت ہے آپ میں تو خواجہ سرا کیوں بنے ہوئے تھے؟'' کسی نے اس کے عقب میں کہا تو وہ چونکی۔ خدیجہ بہت اعتماد سے کہتی اس کے برابر آن کھڑی ہوئی تھی۔ حیا کو ایک دم ہی جیسے ڈھارس سی ملی۔

''آپ کا دماغ خراب ہے اپنی بہن کو سمجھائیں! میرے بھائی سے تعارف کا اچھا بہانہ ڈھونڈا ہے انہوں نے۔'' لڑکی بھڑک کر بولی۔

شاپ میں بہت سے لوگ سب کچھ چھوڑ کر ان کو دیکھ رہے تھے۔

''تعارف، مائی فٹ!'' جواباً خدیجہ بھی اونچی آواز میں بولی۔ ''آپ کے بھائی کو میں نے بھی خواجہ سرا بنا دیکھا تھا۔ میں ابھی دس اور لوگ لا سکتی ہوں جو اس بات کی گواہی دیں گے۔''

''عجیب خاتون ہیں آپ، خوامخواہ تنگ کیے جارہی ہیں۔ یہ تعارف کے بہانے کسی اور کے سامنے جا کر بتائیے۔''

''سر، میڈیم!'' شاپ کا منیجر تیزی سے ان کی طرف آیا تھا۔ ''پلیز آپ ادھر تماشا نہ کریں۔ دوسرے کسٹمرز ڈسٹرب..... اوہ میجر صاحب۔'' اب اس نے اس نوجوان کا چہرہ دیکھا تو شناسائی بھری حیرت سے بولا! ''بہت معذرت سر! آپ محترمہ۔'' وہ حیا کی طرف مڑا۔ ''آپ پلیز شور نہ کریں۔ اگر آپ نے خریداری نہیں کرنی تو آپ جا سکتی ہیں۔''

حیا کے تو تلووں پر لگی، سر پہ بجھی۔

''آپ ہوتے کون ہیں مجھے شاپ سے نکالنے والے؟''

''احمد بھائی! چلیں ہم ہی چلتے ہیں۔ ان کا تو دماغ خراب ہے۔'' لڑکی نے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے کپڑا پھینکا اور پلٹی۔ وہ نوجوان ایک تنفر بھری نگاہ اس پہ ڈال کر، اپنی ماں کا شانہ تھامے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ حیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''احمد بھائی..... میجر صاحب..... تو کیا وہ.....''

''توبہ ہے، ان آج کل کی لڑکیوں کی۔'' والدہ صاحبہ مسلسل ناپسندیدگی سے بڑبڑاتی نکل گئیں۔

وہ لب بھینچے کھڑی انہیں جاتے دیکھے گئی۔ اسے اس شخص کے میجر احمد ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔

''حیا! اس سے پہلے کہ یہ منیجر ہمیں دھکے دے کر نکالے، ہم بھی کھسک جائیں۔'' ڈی جے نے اس کے قریب سرگوشی کی تو وہ چونکی، پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

باہر کھلی فضا میں آ کر اس نے بے اختیار کہا تھا۔

''تھینک یو ڈی جے!'' اور یہ وہ پہلی دفعہ تھا جب اس نے خدیجہ کو اس کے معروف نام سے پکارا تھا۔

ڈی جے بے ساختہ ہنس دی۔

''مجھے پتا تھا آپ جھوٹ نہیں بولتیں۔ آپ نے واقعی وہی دیکھا ہوگا جو کہہ رہی تھیں۔''

''مگر ڈی جے! میں نے واقعی اسے خواجہ سرا بنے دیکھا تھا۔''

''حیا! آپ نے اسے بس خواجہ سرا بنے دیکھا تھا نا؟ تو ہو سکتا ہے وہ صرف ایڈونچر کے لیے ایسا بنا ہو۔''

''پتا نہیں!'' اس نے بے زاری سے شانے اچکائے۔

''چلو چلتے ہیں۔'' وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اٹھائیس جنوری کو اسے اتحاد ایئر لائنز کا ٹکٹ ای میل کر دیا گیا جس کا اس کو پرنٹ آؤٹ نکلوانا تھا، پھر اسی ٹکٹ پر اسے پانچ فروری کی صبح استنبول کے لیے روانہ ہونا تھا۔

شام میں وہ ارم سے اس کا evo مانگنے تایا فرقان کے گھر آئی تھی۔ اس کا نیٹ کام نہیں کر رہا تھا، اور ابا ابھی آفس سے نہیں آئے

Downloaded From http://paksociety.com

تھے ورنہ ان کا استعمال کر لیتی۔ خدیجہ کا پیغام آیا تھا کہ سبانجی یونیورسٹی نے ہاسٹل کا الیکٹرک فارم پر کرنے کے لیے بھیجا ہے، سو وہ میل چیک کر لے۔

تایا فرقان لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر مسکرائے۔

''آ گئی تایا کی یاد؟'' انھوں نے صفحہ پلٹتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''جی!'' وہ بظاہر مسکراتے ہوئے انکے پاس چلی آئی۔ ورنہ اس روز کی صائمہ تائی کی باتیں ابھی تک نشتر کی طرح چبھتی تھیں۔

''فلائٹ کب ہے؟'' وہ اخبار پہ نگاہیں مرکوز کیے پوچھ رہے تھے۔

''پانچ فروری کو۔''

''ہوں، اپنا خیال رکھنا۔ ویسے بیٹیوں کو تنہا اتنا دور بھیجنا نہیں چاہیے۔ سلیمان کا حوصلہ ہے بھئی! خیر تم ترکی میں اپنے لباس اور اقدار کا خیال رکھنا، سر سے دوپٹا نہ اتارنا، جیسے ارم نہیں اتارتی۔'' آخری فقرہ کہتے ہوئے ان کے لہجے میں فخر در آیا تھا۔ حیا کے حلق تک کڑواہٹ گھل گئی۔

''جی بہتر! میں ذرا ارم سے مل لوں۔'' وہ جان چھڑا کر اندر آ گئی۔

کاش کہ وہ تایا فرقان کو بتا سکتی کہ مغربی لباس جو وہ یہاں ان کی وجہ سے نہیں پہنتی، وہاں ضرور پہنے گی۔ اس نے بہت سے ٹاپس اور جینز خرید کر اپنے سامان میں رکھ لئے تھے، اور رہی سر ڈھکنے کی بات تو وہ خیر سے سبانجی میں سختی سے ''حرام'' تھا..... شکر!

ارم کمرے میں نہیں تھی۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا اور اندر سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ بے دلی سے اس کے بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ ارم شاور لینے میں بہت دیر لگاتی تھی۔ سو مجبوراً اسے انتظار کرنا تھا۔

دفعتاً سیل فون کی گھنٹی بجی۔ حیا چونکی۔

ارم کا سیل فون اس کے ساتھ ہی تکیے پر رکھا تھا۔ اس نے گردن جھکا کر دیکھا۔ سیل فون کی روشن اسکرین پر ''ایک نیا پیغام'' جگمگا رہا تھا۔ ساتھ ہی بھیجنے والے کا نام لکھا آ رہا تھا۔ ''حیا سلمان''

وہ بے یقینی سے فون کی اسکرین کو دیکھے گئی۔

کیا کسی نے ارم کو اس کے نمبر سے پیغام بھیجا تھا یا ارم نے کسی کا نمبر اس کے نام کے ساتھ محفوظ کر رکھا تھا؟

حیا نے محتاط نگاہوں سے باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھا، اور فون پہ ایک دو بٹن دبائے۔ پیغام لمحے بھر بعد کھل گیا۔

''میں کال کر لوں؟ صبح سے بات نہیں ہوئی، اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ یہ دل اتنا مضبوط نہیں ہے جان! رپلائی!''

اس نے جلدی سے پیغام مٹایا اور سیل فون واپس تکیے پر الٹا کر کے رکھ دیا۔ ایک لمحے میں اسے سب سمجھ میں آ گیا تھا۔

ارم..... تایا فرقان کی اسکارف والی، سر ڈھکنے والی بیٹی۔ ایک عدد بوائے فرینڈ کی مالک تھی جسے لوگوں سے چھپانے کے لیے اس نے ''حیا سلیمان'' کا نام دے رکھا تھا۔ تب ہی وہ اس رشتے پہ خوش نہیں تھی، حیا کو یاد آیا۔

وہ مزید بیٹھے بنا وہاں سے نکل آئی۔ evo اس نے تایا فرقان سے مانگ لیا، مگر جاتے جاتے ایک طنز و استہزاء بھری مسکراہٹ کے ساتھ ان کو ضرور دیکھا تھا۔ کاش! وہ ارم کے حجاب کا پول کھول سکتی تو تایا کی شکل دیکھنے والی ہوتی۔ حجاب اوڑھنا یا نقاب کرنا کردار کی پختگی کی علامت نہیں ہوتی، اس نے بے اختیار سوچا تھا اور تب وہ ایسا ہی سوچتی تھی۔

سبانجی یونیورسٹی نے اسے اس کے ہاسٹل کے متعلق ترجیحات جاننے کے لیے ایک سوال نامہ بھیجا تھا۔ لیپ ٹاپ گود میں رکھے، وہ بیڈ پہ نیم دراز دلچسپی سے سوالات پڑھتی، صرف اپنا موڈ بہتر کرنے کے لیے مضحکہ خیز جواب بھیجنے لگی۔

''کیا آپ اپنی کسی ہم وطن ایکسچینج اسٹوڈنٹ کے ساتھ کمرا شیئر کرنا چاہیں گی؟''

''بالکل بھی نہیں!'' اس کی انگلیاں تیزی سے لیپ ٹاپ کی کنجیوں پہ حرکت کر رہی تھیں۔

''کیا آپ اسموکنگ کرتی ہیں؟''

''بالکل کرتی ہوں۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''ڈرنک کرتی ہیں؟''

''وہ بھی کرتی ہوں''

''آپ کس قسم کی طبیعت کی مالک ہیں؟''

''سخت جھگڑالو اور خونخوار۔''

وہ مسکراہٹ دبائے جواب لکھ رہی تھی۔ جب صفحہ ختم ہوا تو اس نے ''نیکسٹ'' کو دبایا۔ سوچ رہی تھی کہ اگلے صفحے کے جوابات پُر کر کے اس فارم کو منسوخ کر دیگی۔ اس فارم کو جمع کرانے کا اس کا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا، مگر جب نیکسٹ دبانے پہ اگلے صفحے کے بجائے،

''فارم فل کرنے کا شکریہ.....ہم آپ کا ڈورم الاٹ کرتے وقت آپ کی دی گئی ترجیحات کا خیال رکھیں گے۔''

لکھا آیا تو اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''لعنت ہو تم سب پر!'' وہ جھنجلا کر اٹھی اور لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا، فارم سبانجی کو جا چکا تھا اور اسکا پہلا ہی تأثر کتنا برا پڑا ہوگا، وہ جانتی تھی۔

اس کی پیکنگ ابھی نامکمل تھی۔ اس نے ایک نگاہ کھلے سوٹ کیسز اور بکھری اشیا پہ ڈالی، پھر کچھ سوچ کر باہر آئی۔

لاؤنج خالی تھا۔ حیا نے ٹیلی فون اسٹینڈ پہ رکھی ڈائری اٹھائی اور صفحے پلٹنے لگی۔ ''ایس'' کے صفحے پہ چار سطور میں سین پھپھو کے گھر کا پتا اور ایک فون نمبر لکھا تھا۔ اس نے وہ صفحہ پھاڑا اور تہہ کر کے مٹھی میں دبا لیا۔

ایک دفعہ جہان سکندر اسے مل جائے، پھر وہ ان بیتے ماہ و سال کا حساب ضرور لے گی۔ وہ واپس بیڈ پہ آ کر بیٹھی اور سامنے لیپ ٹاپ پہ کھلے پڑے میل باکس کو دیکھا۔ وہاں اب ایک نئی ای میل کا نشان جگمگا رہا تھا۔

''نیشنل رسپانس سینٹر فار سائبر کرائم۔''

اس نے قدرے الجھ کر اس میل کو دیکھا اور کھولا۔ بھلا اب سائبر کرائم سیل والے اس سے کیوں رابطہ کر رہے تھے؟

صفحہ کھل گیا اور وہ جیسے جیسے پڑھتی گئی، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں۔

یہ ای میل سائبر کرائم سیل سے حیا کی اُس میل کے جواب میں آئی تھی جو چند روز قبل اس نے بطور شکایت بھیجی تھی اور جس میں اس نے ویڈیو کا ذکر کیا تھا۔ اب اس کے جواب میں ہیلپ ڈیسک آفیسر نے اس کو ایک باقاعدہ کمپلینٹ فارم بھیجا، جس کو بھرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنا فون نمبر، گھر کا پتا، شناختی کارڈ نمبر وغیرہ لکھ کر بھیجنے تھے۔ یہ فارم ایف آئی آر کے مترادف تھا، سو تمام تفصیلات ضروری تھیں۔

وہ یک ٹک اس فارم کو دیکھے گئی۔ اگر سائبر کرائم سیل نے اُسے جواب اب دیا تھا تو وہ پرائیویٹ نمبر سے آنے والی کال، وہ میجر احمد کا آفس، وہ سب کیا تھا؟ کیا اسے بے وقوف بنایا گیا تھا؟ کیا واقعی وہ اصلی میجر تھا یا.....؟ مگر پھر اس کے پاس اس ویڈیو کو مکمل طور پر انٹرنیٹ سے ہٹوانے کی طاقت اور اثر و رسوخ کیسے آیا؟

وہ الجھتے ذہن کے ساتھ جلدی جلدی جواب ٹائپ کرنے لگی۔ اسے سائبر کرائم سیل کو مختصر الفاظ میں یہ یقین دہانی کروانی تھی کہ وہ ویڈیو اب ہٹ چکی ہے، اور وہ اپنی شکایت واپس لے رہی ہے۔ اسے اب فوری طور پر ان خفیہ والوں سے پیچھا چھڑانا تھا۔

میل لکھ کر اس نے ''سینڈ'' کو دبایا، اور پُر سوچ نگاہوں سے اسکرین دیکھے گئی۔

میجر احمد کا تعلق سائبر کرائم سیل سے نہیں تھا، اس بات کا اس کو یقین ہو چلا تھا۔

☆ ☆ ☆

ائرپورٹ پہ ڈی جے بری طرح رو رہی تھی اس کے والدین اس کے ساتھ کھڑے اسے تسلی دے رہے تھے۔ حیا کچھ دیر تو اسے چپ کروانے کی کوشش کرتی رہی، پھر عاجز سی ہو کر قدرے فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی اور جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑے سکون سے ڈی جے کو روتے دیکھتی رہی۔

آج اُس نے شلوار قمیص پہ سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اور دوپٹہ مفلر کی طرح گردن سے لپٹا تھا بس آج آخری روز تھا۔ پھر ترکی

Downloaded From http://paksociety.com

میں وہ اپنی مرضی کا لباس پہنے گی اور اپنی مرضی سے اکیلی ہر جگہ گھومے گی، بنا روک ٹوک، بنا تایا فرقان یا ابا کی ڈانٹ کے خوف کے۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور انکی فلائٹ اگلی صبح (پانچ فروری کی صبح) چار بجے کی تھی۔

''کتنا روتی ہے یہ، تم خیال رکھنا اس کا!''

سلیمان صاحب کو ڈی جے کے مسلسل رونے پہ کوفت ہونے لگی تھی۔ جب تک وہ واپس ہوئے، ڈی جے روئے جا رہی تھی۔

اس کے آنسو تب جا کر تھمے جب اتحاد ایئر لائنز کی وہ پاکستانی نژاد آفیسران کے پاس آئی اور بہت شائستگی سے ان کو مخاطب کیا۔

''میڈم! آپ لوگ پلیز اپنے ڈاکومنٹس اور لیپ ٹاپس سوٹ کیس سے نکال کر ہینڈ کیری میں رکھ لیں، تاکہ اگر آپ کا سامان گم بھی ہو جائے تو اکم از کم ڈاکومنٹس محفوظ رہیں۔''

''ایویں ہی سامان گم ہو جائے؟'' ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کر کے ڈی جے نے غصے سے کہا۔ وہ سارا رونا بھول گئی تھی۔ ''ہم نے ہینڈ کیری میں اتنا بوجھ نہیں اٹھانا۔''

''میم! یہی بہتر ہے، کیونکہ بعض اوقات سامان گم بھی ہو جایا کرتے ہیں، کہیں یہ نہ ہو کہ بعد ازاں آپ کسی مسئلے سے دوچار ہوں۔''

وہ اس ترک ایئر لائن میں کام کرنے والی ایک پاکستانی لڑکی تھی اور ان کے پہلی دفعہ بین الاقوامی فلائٹ لینے کے پیش نظر کہہ رہی تھی۔ اور حیا مان بھی جاتی، مگر ڈی جے اڑ گئی۔

''ہرگز نہیں، ہم نے اتنا بھاری ہینڈ کیری نہیں اٹھانا۔''

''پلین میں آپ کو نہیں اٹھانا پڑے گا۔'' آفیسر کی شائستگی برہمی میں بدلنے لگی۔

''پلین میں جانے تک تو اٹھانا ہی پڑے گا۔''

''پھر تو ترکی میں آپ پر اللہ ہی رحم کرے!'' وہ پیر پٹختی چلی گئی تو ڈی جے نے اپنی متورم آنکھوں اور فاتحانہ مسکراہٹ کیساتھ حیا کو دیکھا اور انگلی سے عینک پیچھے کی۔

''انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی، جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے!''

حیا بے اختیار ہنس دی۔ اسے ڈی جے اچھی لگی تھی۔

فلائٹ میں ان دونوں کو نشستیں ایک ہی قطار میں ملیں۔ درمیانی راستے کے دائیں طرف جڑی تین نشستوں میں سے کھڑکی کے ساتھ والی حیا کو ملی اور راستے والی نشست ڈی جے کو، درمیانی نشست خالی تھی۔

''کیا ہی مزا آ جائے حیا! اگر اس سیٹ پہ کوئی ہینڈسم اور چارمنگ سا لڑکا آ کر.....'' ڈی جے کے الفاظ ادھورے ہی رہ گئے۔

ایک بھاری بھرکم سے پاکستانی صاحب جو اپنے ٹوپیس میں بے حد پھنسے پھنسے سے لگ رہے تھے، اطمینان سے چلتے ہوئے آئے اور دھپ سے ان دونوں کے درمیان بیٹھ گئے۔

حیا ذرا غیر آرام دہ محسوس کر کے مزید کھڑکی کی طرف کھسک گئی اور خدیجہ مخالف سمت۔

''مجھے عثمان شبیر کہتے ہیں، شیخ عثمان شبیر۔'' اپنی بھاری آواز میں وہ خوش دلی سے گویا ہوئے۔

''نائس!'' حیا بظاہر اپنے چھوٹے سے گولڈن کلچ کو کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ یہ وہی کلچ تھا جو دلاور بھائی کی مہندی پہ اس نے گولڈن لہنگے کیساتھ لیا تھا۔

''گڈ!'' ڈی جے نے میگزین اٹھا کر چہرے کیسامنے پھیلا لیا۔

''میں ترکی سے آیا ہوں، دراصل وہیں رہائش پذیر ہوں، میری بیوی اور بیٹا بھی وہیں رہتے ہیں۔''

حیا مزید اپنے پرس پہ جھک گئی اور ڈی جے نے میگزین چہرے کے اتنا قریب کر لیا کہ اس کی ناک صفحات کو چھونے لگی۔

''مگر وہ میرا بیٹا نہیں ہے، جانتی ہو وہ کس کا بیٹا ہے؟''

مزید نظر انداز کرنا بے کار تھا۔ حیا نے رخ عثمان شبیر کی جانب موڑا اور ڈی جے نے بیزاری سے میگزین نیچے کر لیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''آپ بتائیں، کس کا بیٹا ہے وہ؟''

عثمان شبیر کو شاید صدیوں سے کسی سامع کی تلاش تھی۔ وہ اپنی داستان حیات فوراً ہی شروع کر بیٹھے۔ ڈی جے مسلسل جمائیاں روک رہی تھی اور حیا شدید متلی محسوس کر رہی تھی۔ وہ کل صبح کی جاگی ہوئی تھی اور اب اس صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اوپر سے جہاز کا سفر! اس نے ڈی جے کے سامنے ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ پہلی بار جہاز میں بیٹھ رہی ہے، آخر ڈی جے کیا سوچتی کہ کیسی لڑکی ہے، کبھی ہوائی سفر ہی نہیں کیا۔ اب کیا بتاتی کہ کبھی کوئی ایسی صورت ہی نہیں بن سکی۔

اس سب پہ مستزاد ان صاحب کی الم ناک داستان، جو مختصراً کچھ ایسے تھی کہ وہ اور ان کی بیگم عرصہ تیس سال سے ترکی میں رہائش پذیر تھے۔ چونکہ اولاد نہیں تھی، اس لیے انہوں نے عثمان صاحب کے ایک کزن کا بیٹا گود لیا تھا۔ وہ بیٹا بے جا لاڈ پیار سے خاصا بگڑ چکا تھا، سو اس صورتحال کو سنوارنے کے لیے انھوں کچے کھوہ میں رہائش پذیر اپنی بھانجی سے اس کا رشتہ طے کر دیا تھا، جس پہ آٹھویں فیل بھانجی صاحبہ بہت خوش اور بیٹا بہت ناراض تھا اور اس کے پیشتر کہ وہ اپنی پاکستان آمد کی وجہ بیان کرتے، مینیو کارڈز آ گئے۔

وہ دونوں پھر سے تازہ دم ہو گئیں۔ مینیو پہ کچھ نام جانے پہچانے اور کچھ اردو سے ملتے جلتے تھے۔

''جیرہ آلو و سبز کلٹلس، پنیر جلفریزی، سادہ پراٹھا، تیکھی بریانی، Sayadiat samak وغیرہ۔''

حیا نے ڈی جے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ درمیان میں موجود بھاری بھرکم دیوار کے باعث وہ آگے ہو کر بیٹھی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا منگوائیں۔

''ٹرکش فوڈ بہت زبردست ہوتا ہے اور ترک لوگ کھانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں، میں بتاتا ہوں کہ کیا منگواؤ۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر متذبذب سی حیا نے ہتھیار ڈال دیے۔

''بہت بہتر، بتائیے۔'' وہ گہری سانس لے کر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

''پہلے تو Sayadiat samak منگواتے ہیں۔ یہ روایتی ترک چاول ہیں، سفید مچھلی، فرائیڈ پیاز اور کاجو کے ساتھ۔''

''مشروم اینڈ چیز آملیٹ، جیرہ آلو.....'' وہ بہت اعتماد سے آرڈر لکھواتے گئے۔ مگر جب کھانا آیا تو حیا کا دل خراب ہونے لگا۔ کھانے کی خوشبو سونگھ کر ہی اس کا جی متلانے لگا تھا۔ عثمان شبیر بڑے بڑے لقمے لیتے مزے سے کھا رہے تھے۔ ڈی جے بمشکل ایک چمچہ لیکر ہی دوہری ہوئی۔ حیا بھی بدمزہ ہو گئی تھی۔ اتنا پھیکا کھانا اس نے آج تک نہیں کھایا تھا۔

بمشکل چکھ کر انھوں نے برتن پرے کر دیے۔ عثمان شبیر ابھی تک پوری دلجمعی سے کھا رہے تھے۔ عجیب سی خوشبوئیں اس کے نتھنوں میں گھس رہی تھیں۔ اگر یہی ترک فوڈ تھا تو اسے لگا، ترکی میں پانچ ماہ وہ بھوکی رہے گی۔ ایسا جی تو اس کا ڈائیو بس میں بھی نہیں متلاتا تھا، جیسے ادھر ہو رہا تھا۔ وہ چہرے پہ دوپٹا رکھ کر سو گئی۔

☆ ☆ ☆

اسلام آباد سے پورے ڈھائی گھنٹے بعد انہیں ابوظہبی ائیرپورٹ پہ اترنا تھا۔ وہاں کچھ دیر کا قیام تھا اور پھر.....استنبول!

ابوظہبی اترنے سے قبل کھڑکی کے پار زمین کا گولائی میں کٹاؤ دکھائی دینے لگا تھا۔ زمین کا وہ کرّہ اتنا حسین تھا کہ اس کی ساری بیزاری اور نیند بھاگ گئی۔ وہ محویت سے یک ٹک وہ منظر دیکھے گئی۔

ابوظہبی ائیرپورٹ پر انھوں نے ٹرمنل تھری پہ لینڈ کیا تھا۔ استنبول کی فلائٹ انھوں نے ٹرمنل ون سے پکڑنی تھی، مگر پہلے.....

گھر فون کرنا تھا!

وہ دونوں آگے پیچھے تیز تیز چلتی، کالنگ کارڈ خریدنے گئیں۔ پانچ یوروز کا اتصلات کا کارڈ خریدا اور فون بوتھ کی طرف بھاگیں۔ قطار میں فون بوتھ لگے تھے۔ حیا نے ایک ایک کر کے پہلے تینوں پہ کارڈ لگانے کی کوشش کی، مگر کارڈ تھا کہ ڈلنے کا نام ہی نہ لے، اسے ائیرپورٹ پہ فون بوتھ استعمال کرنے کا پہلا تجربہ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

''حیا اس بندے کو دیکھو جیسے یہ کارڈ ڈال رہا ہے، ویسے ہی ڈالو۔'' ڈی جے نے اسے کہنی ماری تو حیا نے پلٹ کر دیکھا۔ چوتھے

Downloaded From http://paksociety.com

بوتھ پہ ایک شخص ان کی طرف پشت کیے، اپنا کارڈ ڈال رہا تھا۔ حیا کو دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کون سا طریقہ استعمال کر رہا ہے۔ سو وہ ڈی جے کا ہاتھ تھامے اس کے سر پر جا پہنچی۔

وہ رسیور کان سے لگائے نمبر ملا رہا تھا۔

''پلیز ہمیں یہ کارڈ ڈال دیں۔ میں اسے ڈال نہیں پا رہی۔'' حیا نے کارڈ اس کی طرف بڑھایا، وہ چونک کر پلٹا۔

وہ سیاہ رنگت، گھنگریالے بالوں اور اونچے قد کا نسلاً حبشی تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کارڈ لیتے ہوئے ان دونوں لڑکیوں پہ نگاہ ڈالی۔ ایک سیاہ لمبے بالوں اور بڑی آنکھوں والی خوبصورت سی لڑکی جو جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔ دوسری بڑے چشمے اور ڈھیلی پونی والی لڑکی جس نے سوئیٹر تہ کر کے بازو پہ ڈال رکھا تھا۔ دونوں منتظری اسے دیکھ رہی تھیں۔

''اچھا میں ذرا بات کر لوں، پھر.....!'' اسے شاید کان سے لگے رسیور میں کوئی آواز سنائی دی تھی، تب ہی رخ موڑ گیا۔

وہ دونوں اسی طرح کھڑی اسے دیکھتی رہیں۔ ان سے وہ انگریزی میں مخاطب ہوا تھا، مگر اب فون پہ عربی میں بات کر رہا تھا۔

ڈی جے تو بور ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، مگر شریعہ اینڈ لاء کے پانچ برسوں نے حیا کو عربی اچھی طرح سے سکھا دی تھی۔ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں اپنے ایل ایل بی کے پہلے برس ان کو عربی ہی سکھائی جاتی تھی، اور انکی کلاسز میں الجیرین اور مصری اساتذہ انہیں عربی میں ہی لیکچرز دیا کرتے تھے۔

''میں استنبول آ رہا ہوں۔'' وہ اب رخ پھیرے قدرے پریشانی سے کہہ رہا تھا۔ ''ہاں شام تک گھر پہنچ جاؤں گا۔ تم نے حارث کو ڈاکٹر کو دکھایا؟ اچھا؟ کیا کہتا ہے ڈاکٹر؟... کردوں گا پیسوں کا انتظام، کہا جو ہے، بار بار ایک ہی بات مت دہرایا کرو، جاہل عورت!'' طیش سے اس کی دبی دبی سی آواز بلند ہوئی۔ ''ہاں! میری عبدالرحمان سے بات ہو گئی تھی، اسی کے کام کے لیے خوار ہو رہا ہوں، مگر وہ زیادہ رقم نہیں دے گا۔ ایک جگہ اور بھی بات کی ہے۔''

اس نے رک کر کچھ سنا اور پھر مزید جھنجھلاہٹ سے بولا۔ ''اچھا فون رکھ رہا ہوں، مرحبا!'' اس نے کھٹاک سے فون رکھا اور انکی طرف پلٹا۔ ''سوری گرلز!'' بمشکل چہرے پر بشاشت لاتے ہوئے وہ اب انکا کارڈ لگانے لگا۔ پہلی ہی کوشش کامیاب ہو گئی۔ وہ شاید کارڈ کو الٹا پکڑ رہی تھی۔

''لیجیے!'' سیاہ فام نے رسیور اس کی طرف بڑھایا۔ پھر ان سے ہٹ کر دو چلا گیا۔

''بس ایک ایک منٹ کی کال کریں گے۔'' حیا نے نمبر ملاتے ہوئے ڈی جے کو تنبیہہ کی۔ سلیمان صاحب نے پہلی ہی گھنٹی پہ فون اٹھا لیا۔

''وہ چپ ہوئی کہ نہیں؟ توبہ کتنا روتی ہے۔''

''جی جی ابا جی! وہ چپ ہو گئی ہے'' اور پھر جلدی جلدی اپنی خیریت بتا کر فون بند کر دیا۔ ڈی جے نے بھی بمشکل ایک ہی منٹ گھر بات کی۔ بعد میں بقیہ رقم دیکھی تو بمشکل ایک یورو استعمال ہوا۔ باقی چار یورو کا بیلنس ابھی موجود تھا۔ دونوں اپنی عجلت و کنجوسی پہ خوب پچھتائیں کہ اب بوتھ سے نکل کر تو یہ کارڈ کسی کام کا نہیں تھا۔ حیا نے اسے اپنے گولڈن پاؤچ میں ڈال لیا۔

اب انہیں اپنا سامان لینا تھا۔ وہاں بہت سے ٹائرز چل رہے تھے۔ ہر ٹائر پر بیگز اور سوٹ کیس قطار میں رکھے چلے آ رہے تھے۔ انہیں قطعاً علم نہیں تھا کہ اپنے بیگز کو کہاں تلاشیں؟

وہ دونوں بدحواس سی ایک ٹائر سے دوسرے کی طرف بھاگنے لگیں۔ ڈی جے کا تھوڑی دیر میں ہی سانس پھول گیا۔ کبھی حیا کو ایک جگہ اپنے سیاہ سوٹ کیس کا گمان گزرتا تو وہ ڈی جے کا ہاتھ کھینچ کر ادھر بھاگتی، مگر قریب سے دیکھنے پہ وہ کسی اور کا بیگ نکلتا، تو کبھی ڈی جے اپنے بھورے تھیلے کو پہچان کر چلاتے ہوئے ایک طرف دوڑتی، مگر اس پہ کسی اور کا نام درج ہوتا۔

''حیا بتاؤ! اب بیگز کہاں سے ڈھونڈیں؟'' ڈی جے نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ حیا نے بمشکل تھوک نگلی اور چہرے پہ آتے بال کانوں کے پیچھے اڑسے۔ اب سچ بولنے کا وقت تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ڈی جے! مجھے سچ میں نہیں سمجھ آ رہی، میں آج زندگی میں پہلی دفعہ جہاز میں بیٹھ رہی ہوں۔''

ڈی جے نے چند لمحے اس کا چہرہ دیکھا، پھر اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی۔

''ہاتھ مارو! میں بھی آج پہلی دفعہ جہاز میں بیٹھی ہوں۔''

حیا نے زور سے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا اور دونوں ہنس پڑیں۔

کافی دیر بعد ان کو ٹائرز کی لسٹ نظر آئی، جس پہ ہر فلائٹ کے مخصوص ٹائر کا نمبر درج تھا۔ فہرست دیکھ کر دو منٹ میں ہی اپنا مطلوبہ ٹائر مل گیا۔ سامان لیکر حیا اتنی تھک چکی تھی کہ جب ڈی جے نے وہیں ایک جگہ چمکتے فرش پہ بیٹھنے کو کہا تو وہ اپنا سارا نخرہ اور غرور بالائے طاق رکھ کر ادھر زمین پہ بیٹھ گئی۔ اپنے بیگز کے ساتھ وہ دونوں اب مزے سے فرش پہ بیٹھیں ہر آتے جاتے کو دیکھ رہی تھیں اور ارد گرد مہذب، نفیس لوگ حیرت سے ان کو دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

ٹرمینل ون سے جو پرواز ان کو ملی، اس میں بھی عثمان شبیر ساتھ ہی تھے۔ اپنی داستان حیات فراموش کر کے وہ اب ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا انٹرویو کرنے لگے۔

''کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ کیوں آئی ہو؟ ترکی میں کدھر جانا ہے؟ کیوں جانا ہے؟''

''سبانجی؟ سبانجی یونیورسٹی؟'' انھوں نے اتنی بلند آواز میں دہرایا کہ اگلی نشست پہ بیٹھی ترک خاتون نے گردن موڑ کر قدرے اونچے ہو کر ان کو دیکھا۔

''سبانجی!'' اس سے آگے خاتون نے قدرے ستائش سے چند الفاظ ترک میں کہے، جو حیا کو سمجھ نہ آئے، جواباً عثمان شبیر نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کچھ کہا تو وہ خاتون قدرے گڑبڑا کر واپس رخ پھیر گئیں۔

''آپ نے ان کو کیا کہا؟'' حیا نے کڑی نگاہوں سے انہیں گھورا۔

''کچھ نہیں، تم بتاؤ، یہ پاکستان میں والدین اتنے آزاد خیال کب سے ہو گئے کہ جوان بچیوں کو اکیلے ترکی بھیج دیں؟''

''اکیلے نہیں ہیں ہم، پورا گروپ ہے، ہم دو اسٹوڈنٹس ہیں اور باقی فیکلٹی ممبران ہیں، جو دو روز قبل روانہ ہو چکے ہیں۔'' مگر انہوں نے تو جیسے سنا ہی نہیں...

''خیر اب اکیلی جا رہی ہو تو خیال رکھنا کہ.....'' اور پھر ان کا وعظ شروع ہو گیا۔ نماز پڑھا کرو، قرآن پڑھا کرو، پردہ کیا کرو، سچ بولا کرو، اللہ سے ڈرو، غرض ہر وہ بات جو اپنے بیٹے کی تربیت کے وقت انہیں بھول گئی تھی، اب اچانک یاد آ گئی۔ حیا نے قدرے جھنجھلا کر رخ پھیر لیا۔

دوپہر دو بجے کھڑکی کے اس پار..... نیچے..... بہت نیچے..... وہ پرفسوں منظر پھیلنے لگا۔

مرمرا کا سمندر، اوپر بادل اور برف..... یوں جیسے نیلی چادر پہ سفید روئی کے گالے تیر رہے ہوں، وہ اس منظر کے سحر میں کھوتی چلی گئی۔

جہاں سکندر کا ترکی اس کے قدموں تلے تھا۔

''یہ رکھ لو۔'' پرواز اترنے کا اعلان ہونے لگا تو نہایت زبردستی عثمان شبیر نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے تھمایا۔ ''اس پہ میرے گھر، سیل اور آفس کے نمبرز لکھے ہیں۔ کبھی کبھار میں گھر پہ نہیں ہوتا اور کبھی کبھار میرا سیل بھی آف ہوتا ہے، مگر آفس کے نمبر پہ میں ہمیشہ ملتا ہوں۔ میری سیکرٹری کی فضولیات سے بچنے کے لیے ڈائریکٹ میری پرائیویٹ ایکسٹینشن ڈائل کرنا۔ وہ ہے 14 یعنی چودہ، کیونکہ میری اور پاکستان کی تاریخ پیدائش چودہ اگست ہے۔ رکھ لو، ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

عثمان شبیر سے بمشکل جان چھوٹ رہی تھی۔ انکو کبھی کال کرنا یا دوبارہ ملاقات کا تصور ہی حیا کے لیے سوہان روح تھا، پھر بھی ان کے اصرار پہ اس نے اپنے سنہری پاؤچ میں وہ کارڈ بغیر دیکھے رکھ لیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

اتاترک انٹرنیشنل ائرپورٹ استنبول کی یورپی طرف واقع تھا۔ یہ اسے بعد میں علم ہوا تھا، البتہ جو بات ہمیشہ سے معلوم تھی، وہ یہ تھی کہ استنبول دنیا کا وہ واحد شہر تھا، جو دو خطوں کو باہم ملاتا ہے... یورپ اور ایشیا۔

استنبول کے دو حصے تھے۔ ایک یورپی طرف کہلاتا تھا اور دوسرا ایشیائی طرف یا اناطولین طرف (اناطولین طرف کو عرفِ عام میں 'پرانا شہر' بھی کہا جاتا تھا)۔

وہ دونوں جب اپنے سامان کی ٹرالیاں دھکیلتے آگے آئیں تو رومی فورم کے ارکان اُن کو مل گئے، جو انہیں لینے آئے ہوئے تھے۔ رومی فورم ایک ترک این جی او تھی جو بالخصوص ایکسچینج اسٹوڈنٹس کا بہت خیال رکھتی تھی۔

وہ دو لڑکے تھے، احمت اور چغتائی۔

''چغتائی نام تو ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے، جیسے مصور عبدالرحمٰن چغتائی، ہے نا حیا۔'' ڈی جے نے سرگوشی کی تھی۔

''اسلام علیکم!'' وہ بہت گرمجوشی اور احترام سے ملے۔ چغتائی نے ان سے بیگز لے لیے۔ ''آیئے، باہر گاڑی انتظار کر رہی ہے۔''

''چغتائی برادرز! پلیز پانی پلا دیں۔ بہت پیاس لگی ہے۔'' حیا کی طرح ڈی جے بھی پیاس سے بے حال تھی۔ چغتائی نے سر اثبات میں ہلایا اور احمت کے ساتھ سامان اٹھانے لگا۔ پھر وہ دونوں ان کے آگے چلتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گئے۔

بے حد مہمان نواز قوم کے اس سپوت نے ان کو پانی کیوں نہیں پلوایا، یہ معمہ وہ ساری زندگی حل نہیں کر سکی۔ قوی امکان یہ تھا کہ چغتائی کی انگریزی کمزور تھی، جس کے باعث وہ انکا مدعا سمجھ نہیں پایا تھا۔

باہر نکلنے سے قبل انھوں نے اپنی رقم ترک لیرا اور یوروز میں تبدیل کروالی تھی۔ ایک لیرا پاکستانی پچپن روپے کا تھا اور ایک یورو ایک سو پچیس روپے کا.....

''ففٹی فائیو.....ون ٹوئنٹی فائیو.....ففٹی فائیو.....ون ٹوئنٹی فائیو.....'' ڈی جے زیرلب کرنسی کی مالیت کا حساب لگاتی اور انکی قیمت یاد کرتی باہر آئی تھی۔

ائرپورٹ کا دروازہ کھلتے ہی سردی کی ایسی یخ بستہ، ہڈیوں میں گھستی، خون منجمد کرتی لہر نے انکا استقبال کیا کہ چند لمحوں میں حیا کے ہونٹ نیلے پڑنے لگے۔ یہاں مری اور ایوبیہ کی سرد ترین ہوا سے بھی کئی گنا سرد ہوا چل رہی تھی۔ حیا نے بے اختیار بازو سینے پہ لپیٹ لیے۔ وہ ٹھٹھرنے لگی تھی۔

انکا سامان خاص وزنی اور بے تحاشا تھا۔ دونوں لڑکے سرمئی رنگ کی ہائی ایس میں بیگز رکھتے رکھتے ہانپ گئے تھے۔

''آپ واقعی صرف پانچ ماہ کے لیے آئی ہیں؟'' چغتائی نے سادگی سے پوچھا، تو احمت نے اسے گھور کر موضوع بدل دیا۔

''ہماری روایت ہے کہ جو بھی اتاترک ائرپورٹ سے استنبول آتا ہے، ہم اسے سب سے پہلے سلطان ابوایوب انصاریؓ کے مزار پہ لیکر جاتے ہیں۔ اس سے اس کا ترکی میں قیام اچھا گزرتا ہے۔'' احمت کہہ کر بیگ گاڑی میں رکھنے لگا تو ڈی جے نے سرگوشی کی۔

''مگر حیا! یہ تو توہم پرستی اور شرک.....''

اس نے زور سے کہنی مار کر ڈی جے کو خاموش کرایا، پھر اندر بیٹھتے ہوئے دبی آواز میں گھرکا۔

''میزبانوں سے اس سردی میں بحث کی تو وہ تمہیں یہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے پاگل! صبح تک منجمد ہو کر پڑی ہو گی اور آئندہ ترکی آنے والے سب سے پہلے تمہارے منجمد مجسمے کی زیارت کیا کریں گے۔''

احمت کو ٹوٹی پھوٹی انگریزی آتی تھی، سو وہ سارا راستہ گردوپیش کے متعلق بتاتا رہا۔ حیا کو اس سفرنامے سے دلچسپی نہ تھی سو رخ پھیرے کھڑکی کے باہر دیکھے گئی۔

وہ جو امریکی فلموں والی بلند و بالا عمارتوں کی آس لگائے بیٹھی تھی، قدرے مایوس ہوئی، کیونکہ استنبول شروع میں تو یوں لگا جیسے اسلام آباد ہو مگر آہستہ آہستہ غور کرنے پہ محسوس ہوا کہ نہیں..... وہ واقعی یورپ تھا۔ دکانوں کے چمکتے شیشے، صاف سڑکیں، مغربی لباس میں پھرتے لوگ، دکانوں کی چھتوں اور درختوں کے اوپر پڑی برف اور سڑک کنارے بچھی برف کی تہیں، گویا سفید گھاس ہو۔

Downloaded From http://paksociety.com

عجیب بات یہ تھی کہ اس کہر اور سردی میں بھی ترک لڑکیاں بڑے مزے سے منی اسکرٹس میں ملبوس اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔

''خدا کرے، آج رات برف نہ پڑے۔'' چغتائی نے موڑ کاٹتے ہوئے ایک پُرتشویش نگاہ باہر پھیلے برف زار پہ ڈالی۔

''ہاں! خدا کرے رات واقعی برف نہ پڑے۔''

احمت نے تائید کی۔

حیا اور ڈی جے نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ڈی جے آہستہ سے اردو میں بڑبڑائی۔

''ایویں نہ پڑے... خود تو برف باری دیکھ دیکھ کر اکتا چکے ہیں، ہمیں تو دیکھنے دیں۔ اللہ کرے، رات برف ضرور پڑے آمین، ثم آمین۔'' اور حیا نے دل میں اس کی تائید کی۔

ونڈ سکرین کے اس پار یورپین شہر کا اختتام دکھائی دے رہا تھا۔ آگے نیلا سمندر بہہ رہا تھا اور اسکے دوسری طرف استنبول کا ایشیائی حصہ آباد تھا۔ دونوں حصوں کو ایک عظیم الشان پل نے جوڑ رکھا تھا۔ دو خطوں کا ملاپ، دو تہذیبوں کا سنگم...

''مرمرا کے سمندر کا جو حصہ استنبول کے درمیان سے گزرتا ہے، اسے بوسفورس کا سمندر کہا جاتا ہے۔ اس پل کا نام بھی بوسفورس برج Bosphorus Bridge ہے۔'' احمد بتانے لگا۔

''مگر ہم تو مزار پہ جا رہے تھے جو کہ یورپین حصے ہی میں ہے، پھر پل عبور کرنے کا مقصد؟'' قریب آتے پل کو دیکھ کر حیا نے حیرت سے پوچھا، کیونکہ پل کے اس طرف اناطولین شہر تھا۔

''ہم نے پل عبور نہیں کرنا، اس کے قریب سے کسی کو اٹھانا ہے، ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے، آگے مزار تک آپ کو اسی نے لے کر جانا ہے۔''

چغتائی نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ احمت اب لاک کھول کر باہر نکل رہا تھا۔

حیا نے اس خوبصورت، اونچے پل کو دیکھا اور سوچا کہ کتنے برس وہ اسی پل پر سے گزرا ہوگا۔ کتنی ہی دفعہ اس نے بوسفورس کے نیلے پانیوں پہ چاند کی پریوں کا رقص دیکھا ہوگا۔ جب وہ اس سے ملے گی تو کیا اس کی آنکھوں میں استنبول کی سفید گھاس سی برف جمی ہوگی یا مرمرا کے پانیوں کا جوش ہوگا؟ اور کیا وہ کبھی اس سے مل پائے گی؟ اس خیال پہ اس کا دل جیسے مرمرا کے سمندر میں ڈوب کر کسی لٹی پٹی کشتی کی طرح ہولے سے ابھرا تھا۔

کھڑکی کے اس پار سے ایک دراز قد لڑکی کار کی طرف چلی آ رہی تھی۔ چہرے کے گرد اسکارف لپیٹے، بلیو جینز کے اوپر گھٹنوں تک آتا سفید کوٹ پہنے، وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے چلتی آ رہی تھی۔ اس کی رنگت استنبول کے سورج کی طرح سنہری اور آنکھیں بوجھل بادلوں کی مانند سرمئی تھیں۔

وہ لڑکی ان دونوں ترک لڑکوں کے پاس پہنچی اور مسکراتے ہوئے چغتائی کے ہاتھ سے چابی لی۔ رحمت پیچھے کھڑی ہائی ایس کی جانب اشارہ کر کے کچھ کہنے لگا۔ وہ لڑکی اپنی نرم مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلاتی سنتی گئی۔ پھر وہ دونوں چلے گئے اور وہ لڑکی کار کی طرف آئی۔ دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ کر گردن پیچھے گھمائی۔

''سلام علیکم..... اور ترکی میں خوش آمدید.....'' اس کی انگریزی شستہ اور انداز بے حد نرم تھا۔ حیا نے محسوس کیا کہ ترک السلام علیکم کے بجائے سلام علیکم Salamun Alaikum کہتے تھے۔

''وعلیکم السلام۔'' حیا نے اس کا بڑھا ہاتھ تھاما تو اسے لگا، اس نے اتنا نرم ہاتھ کبھی نہیں چھوا۔ وہ ہاتھ نہیں گویا مکھن کا ٹکڑا تھا۔

''میرا نام ہالے نور ہے، میرا تعلق رُومی فورم سے ہے۔ میں سانجی سے میٹریل سائنس اینڈ انجینئرنگ میں ایم ایس کر رہی ہوں۔ ائرپورٹ پر آپ کو لینے کے لیے بھی مجھے ہی آنا تھا، مگر میں کہیں پھنس گئی تھی، اس لیے نہیں آ سکی، بہت معذرت'' اس نے کار واپس موڑ دی تھی۔

''حیا سلیمان...''

''خدیجہ رانا...''

Downloaded From http://paksociety.com

ان کے تعارف کو ہالے نور نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ سنا اور سر اثبات میں ہلایا۔ وہ واقعی نور کا ہالہ تھی۔ ڈھلی ہوئی چاندنی۔

''اب ہم انصاری محلّہ جا رہے ہیں'' وہ اسٹیرنگ وہیل گھماتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

'محلّہ؟ اردو والا محلّہ، حیا!'' ڈی جے نے دھیرے سے سرگوشی کی۔

''شاید..... تب ہی تو کہتے ہیں کہ اردو ترک سے نکلی ہے، تم نے میٹرک میں اردو زبان کے مضمون میں اس فقرے کا رٹا نہیں لگایا تھا کہ 'لفظ اردو ترک زبان سے نکلا ہے جس کے معنی.....''

''لشکر کے ہیں!'' ڈی جے نے چہک کر فقرہ مکمل کیا۔

''ایوب سلطان جامعہ'' کے بیرونی بازار کا نام ہے انصاری محلّہ تھا۔ بے حد رش، بہت سے لوگ اور ہر سو اڑتے، چگتے کبوتر، وہ تینوں لوگوں کے درمیان بمشکل راستہ بناتیں، مسجد کے احاطے تک پہنچی تھیں۔

نماز سے فارغ ہو کر حیا نے دیکھا، وہاں جامعہ کا نام Eyup Sultan Camii لکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ جامعہ میں j کی جگہ C لکھا ہے، جو کہ غلط لگ رہا تھا۔

''ہماری زبان میں c کو عربی کے جیم کی آواز سے پڑھا جاتا ہے۔'' انصاری محلے کے رش سے گزرتے ہوئے اس کی حیرت پہ ہالے نے بتایا۔ وہ مسکراتی ہوئی بڑے اعتماد سے اپنے سفید کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چل رہی تھی۔ اس کی بات پہ حیا بے اختیار چونکی۔

''حیران کیوں ہو؟'' ہالے نے رک کر شاپر سے اپنے جوتے نکالتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہاں مسجد میں داخلے کے وقت جوتے باہر رکھنے کے بجائے شاپر میں رکھنے اور ساتھ شاپر ہمہ وقت اٹھائے رکھنے کا رواج تھا۔

''یعنی اگر کسی کا نام جہان ہو تو وہ ترک ہجوں میں اسے کیسے لکھے گا؟'' بلا ارادہ اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر فوراً گڑبڑا کر ڈی جے کو دیکھا۔ وہ ذرا فاصلے پر کبوتروں کی تصاویر کھینچ رہی تھی۔ اس نے نہیں سنا تھا۔

ہالے شاپر ڈسٹ بن میں پھینک کر سیدھی ہوئی اور مسکرا کر ہجے کر کے بتایا۔ (Cihan)

''اوہ!'' اس نے خفیف سا سر جھٹکا۔ تب ہی وہ اسے فیس بک پہ نہیں ملا تھا۔ وہ اس کو jihan لکھ کر ڈھونڈتی رہی، مگر وہ تو اپنے نام کو Chian لکھتا ہوگا۔

گلی صاف ستھری اور کشادہ تھی۔ دونوں اطراف میں دکانوں کے دروازے کھلے تھے۔ آگے کرسیاں میزیں بچھی تھیں اردگرد بہت سے سے اسٹال لگے تھے۔ سڑک کے کناروں پہ کھلے عام کتے ٹہل رہے تھے۔ مگر وہ بھونکتے نہیں تھے۔

حیا کو بھوک لگ رہی تھی اور وہ اب اس سفرنامے سے بور ہونے لگی تھی۔ بمشکل وہ تینوں اس رش بھرے محلے سے نکلیں۔

''ایکسچینج اسٹوڈنٹس کو ان کا پہلا کھانا ایک ترک میزبان خاندان دیا کرتا ہے اور ابھی ہم اسی میزبان خاندان کے گھر جا رہے ہیں۔''

جب وہ کار میں بوسفورس کے پل پر سے گزر رہی تھیں تو ہالے نے بتایا۔ کھانے کا سن کر اس پہ چھائی بیزاریت ذرا کم ہوئی۔

میزبان خاندان کا گھر استنبول کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ کشادہ سڑک، خوب صورت بنگلوں کی قطار، اور بنگلوں کے سامنے سبزے پہ جمی برف۔

ان کے اسکالرشپ کو آرڈی نیٹر نے چند باتیں انہیں ذہن نشین کروادی تھیں کہ:۔

ترکی میں جوتے گھر سے باہر اتارتے ہیں...

گھاس پہ نہیں چلنا...

اور ملاقات کے وقت ترک خاندان کے بڑے کا ہاتھ چومنا ہے۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس تکلف کو رہنے دو۔'' ان دونوں نے گھر کے داخلی دروازے کے باہر بچھے میٹ پہ جوتے اتارے تو اندر سے آتی وہ مشفق اور معمر خاتون پیار بھری خفگی سے بولی تھیں۔ ''پہلے دن کوئی اصول نہیں ہوتے، سلام علیکم اور ترکی میں خوش آمدید۔''

''آپ کے اصولوں کی پاسداری ہمارے لیے فخر ہے۔'' حیا نے مسکراتے ہوئے ان کا ہاتھ تھاما اور سر جھکا کر انکے ہاتھ کی

Downloaded From http://paksociety.com

پشت کو لبوں سے لگایا۔

معمر خاتون، مسز عبداللہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ ''اندر آجاؤ۔'' وہ راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹیں۔ ان کی سرخ بالوں والی بیٹی آگے بڑھی اور کارپٹ شوز حیا اور ڈی جے کے قدموں میں رکھے۔ وہ ریشمی کپڑے سے بنے کوٹ شوز کی شکل کے جوتے تھے۔ دونوں نے جھک کر وہ جوتے پہنے اور اندر داخل ہوئیں۔

اس ترک گھر کا فرش لکڑی کا بنا تھا۔ لونگ روم کے فرش پہ بہت خوب صورت قالین بچھے تھے۔ وہ باتھ روم ہاتھ دھونے آئی تو دیکھا، وہاں الگ سے ٹونٹی وغیرہ نہیں تھی۔ بلکہ ایک طرف قطار میں نل لگے تھے، البتہ باتھ روم کے فرش پر بھی رگز (پائیدان) اور کاؤچ بچھے تھے، حیرت انگیز!

وہ واپس آئی تو ڈائننگ ہال میں کھانا لگایا جا رہا تھا۔ ڈی جے جھک کر پیار سے مسز عبداللہ کی چھ سالہ نواسی عروہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ تین خواتین پر مشتمل چھوٹا سا کنبہ تھا اور چونکہ وہ دونوں لڑکیاں تھیں، سو ہالے نے ایسے ترک خاندان کا چناؤ کیا تھا، جس میں کوئی مرد نہ ہو۔ اسی پل مسز عبداللہ سوپ کا بڑا سا پیالہ اٹھائے آئیں۔ ہالے ان کی مستعدی سے مدد کروا رہی تھی۔

''تم کیا کہہ رہی تھیں، تمہارا یہاں کوئی رشتہ دار بھی ہے؟'' انہوں نے سوپ کا ڈونگا میز پہ رکھا۔ حیا نے ایک نظر اس ملغوبے کو دیکھا۔

''جی..... میری پھپھو ہیں ادھر۔'' وہ سوپ کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کدھر رہتی ہیں؟''

''ادھر!'' اس نے پرس سے وہ مڑا تڑا کاغذ نکال کر ہالے کو تھمایا۔ ہالے نے ایک نظر اس کاغذ کو دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کل میں ملوا دوں گی تمہیں ان سے، کھانا شروع کرو۔'' اس نے کاغذ واپس حیا کی جانب بڑھا دیا۔

''ڈی جے! ہم واقعی ترکی میں بھوکوں مریں گے۔ اس ملغوبے کی شکل تو دیکھو، مجھے تو پھر سے متلی ہو رہی ہے۔'' حیا جبراً مسکراتے ہوئے ہولے سے اردو میں بولی۔ مسز عبداللہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''یہ کہہ رہی ہے کہ ان خواتین کا خلوص اسے شرمندہ کر رہا ہے۔'' ڈی جے نے جلدی سے ترجمانی کرتے ہوئے میز کے نیچے سے اس کا پیر زور سے کچلا۔

''اوہ شکریہ۔'' مسز عبداللہ مسکرا کر کھانا پیش کرنے لگیں۔

سوپ دراصل سرخ مسور کی دال کا شوربہ تھا اور اردو جیسی ترک میں اسے چوربہ کہتے تھے۔ وہ ذائقے میں شکل سے بڑھ کر بدمزا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی دونوں پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کی برداشت جواب دینے لگی۔

''حیا! مجھے الٹی آنے والی ہے۔''

''اور میں مرنے کے قریب ہوں۔''

وہ بدقت مسکراہٹ چہروں پہ سجائے چمچہ بھر رہی تھیں۔ ترک خواتین بہت مرغوبیت سے سوپ پی رہی تھیں۔

چوربہ ختم ہوا تو کھانا آ گیا۔ وہ اس سے بھی بڑھ کر بدمزا۔ ایک چاولوں کا پلاؤ تھا۔ پاکستان میں پلاؤ کو ''پ'' کے اوپر پیش کے ساتھ بولا جاتا ہے، مگر یہاں اسے ''پ'' کے تلے زیر کے ساتھ بولا جاتا تھا۔ پلاؤ شکل میں ابلے چاولوں سے مختلف نہ تھا۔ ساتھ چنے کا سالن اور مرغی کی گریوی تھی جو کہ منچورین کی طرح دِکھتی تھی۔

وہ ڈیڑھ دن کی بھوکی تھیں اور اوپر سے یہ بدمزا کھانے نے مزید حالت خراب کر رہے تھے۔ وہی ترک خواتین ہی کھا رہی تھیں۔ پلاؤ کا پیالہ بھی ختم ہو چکا تھا اور ہم پاکستانی میزبانوں کے برعکس وہ اسے دوبارہ بھرنے کے لیے دوڑی نہیں تھیں۔ وجہ ان کی خلوص کی کمی نہ تھی، بلکہ شاید یہی ان کا طریقہ تھا کہ پیالہ ایک ہی دفعہ بھر کر رکھا جاتا تھا۔

''خدیجہ! تمہاری دوست مجھے کچھ پریشان سی لگ رہی ہے، خیریت؟'' مسز عبداللہ نے پوچھ ہی لیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

ڈی جے نے گڑبڑا کر اسے دیکھا۔ سب کھانے سے ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

حیا نے میز تلے آہستہ سے اپنا پاؤں ڈی جے کے پاؤں پہ رکھا۔

''فیملی فرنٹ کی ہما، کوئی معقول وجہ بتاؤ ان کو۔''

''نہیں..... وہ..... دراصل..... حیا..... حیا بہت ڈرپورک ہے۔ اسے اسٹریٹ کرائم سے بہت ڈر لگتا ہے اور یہ پہلی دفعہ اکیلی یورپ آئی ہے، تو یہ پوچھ رہی ہے کہ کہیں استنبول میں ہمارا آرگنائزڈ کرمنلز سے تو واسطہ نہیں پڑے گا؟''

حیا خفت سے سر جھکائے لب کاٹتی رہی۔ وہ خالی ہاتھ ان کے گھر آئی تھیں اور انھوں نے میز بھر دی تھی، پھر بھی اس کے نخرے ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ اُسے بے حد پچھتاوا ہوا۔ وہ بات سنبھالنے پہ ڈی جے کی بے حد ممنون تھی۔

''قطعاً نہیں، استنبول بہت محفوظ شہر ہے۔''

سرخ بالوں والی لڑکی رسان سے بولی۔ ''یہاں کی پولیس ایسے لوگوں کو کھلے عام نہیں پھرنے دیتی۔''

''بالکل..... استنبول میں قانون کی بہت پاسداری کی جاتی ہے۔'' ہالے نے تائید کی۔ مسز عبداللہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ ان کے چہرے پہ کچھ ایسا تھا کہ حیا انہیں دیکھے گئی۔

جب ہالے نور استنبول کی شان میں ایک لمبا سا قصیدہ پڑھ کر فارغ ہوئی تو مسز عبداللہ نے گہری سانس لی۔

''خدا کرے، تمہارا واسطہ کبھی عبدالرحمان پاشا سے نہ پڑے۔''

حیا نے دھیرے سے کانٹا واپس پلیٹ میں رکھا۔ ایک دم پورے ہال میں اتنا سناٹا چھا گیا تھا کہ کانٹے کی کانچ سے ٹکرانے کی آواز سب نے سنی۔

''کون پاشا؟'' ڈی جے نے الجھ کر مسز عبداللہ کو دیکھا۔

''وہ ممبئی کا ایک اسمگلر ہے، یورپ سے ایشیا اسلحہ اسمگل کرتا ہے۔ استنبول میں اگر چڑیا کا بچہ بھی لاپتہ ہو جائے تو اس میں پاشا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بوسفورس کے سمندر میں ایک جزیرہ ہے، بیوک ادا۔ اس جزیرے پہ اس مافیا کا راج ہے۔''

''اور میری مام کو خواب بہت آتے ہیں۔'' ان کی بیٹی نے خفگی سے ان کو دیکھا۔

''یہ لڑکیاں سمجھتی ہیں، میری عقل میرا ساتھ چھوڑنے لگی ہے۔''

''بالکل ٹھیک سمجھتی ہیں اور ایکسکیوز اسٹوڈنٹس! کان کھول کر سن لو۔'' ہالے نے قدرے تلملا کر مداخلت کی۔ ''استنبول میں ایسا کوئی کرائم سین نہیں ہے، یہ سب گھریلو عورتوں کے افسانے ہیں۔ یہاں کوئی بھارتی اسمگلر نہیں ہے۔''

دونوں ترک لڑکیاں اپنے تئیں بات ختم کر کے اب سوئٹ ڈش کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ خدیجہ بھی ان کی باتوں پہ مطمئن ہو کر شکر پارے کھانے لگی تھی، مگر حیا کے حلق میں وہ بہت میٹھے سے شکر پارے کہیں اٹک سے گئے تھے۔

ابوظہبی انٹرنیشنل ائرپورٹ پہ اس نے اس حبشی کے منہ سے پاشا کا نام سنا تھا۔ وہ نہایت مضمحل سا اپنی بیوی سے عربی میں بات کر رہا تھا۔ اپنے بیٹے کے علاج کا ذکر۔ مگر ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور پاشا کے کام کا ذکر کر رہا ہو اور واقعی ترک گھریلو عورتوں کے افسانوں کے مرکز 'پاشا' کا کوئی وجود نہ ہو۔

الوداعی لمحات میں جب باقی سب آگے نکل چکے تو مسز عبداللہ نے دھیرے سے حیا کے قریب سرگوشی کی۔

''یہ لڑکیاں استنبول کی برائی نہیں سن سکتیں۔ تمہیں اس لیے بتایا کہ تم کرائم سے ڈرتی ہو اور خوب صورت بھی ہو، خوبصورت لڑکیوں پہ عموماً ایسے لوگ نظر رکھتے ہیں۔''

حیا نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ان کے جھریوں زدہ چہرے پہ سچائی بکھری تھی۔

''وہ واقعی اتنا وجود رکھتا ہے۔'' وہ بالکل سن سی ہوئی انہیں دیکھے گئی۔ کیا افواہوں کا خوف مجسم صورت میں ان کے سامنے آ گیا تھا،

Downloaded From http://paksociety.com

یا ان کی عقل واقعی ان کا ساتھ چھوڑ رہی تھی؟

☆ ☆ ☆

شام کے سائے گہرے پڑ رہے تھے، جب وہ سبانجی یونیورسٹی پہنچیں۔ سبانجی امراء کی جامعہ تھی۔ وہاں چار ماہ کے ایک سمسٹر کی فیس بھی دس ہزار ڈالرز سے کم نہ تھی۔ شہر سے دور، مضافات میں واقع وہ قدرے گولائی میں تعمیر کردہ عمارت بہت پرسکون دکھتی تھی۔ چونکہ وہ جگہ استنبول شہر سے قریباً پینتالیس منٹ کے فاصلے پہ تھی، اس لیے سبانجی میں ڈے اسکالرز نہیں ہوتے تھے۔ اس کے تمام طلبہ وطالبات بشمول ہالے نور جیسے لوگوں کے، جن کے گھر استنبول میں ہی تھے، ہاسٹل میں رہائش پذیر تھے۔

یونیورسٹی کی عمارت سے دور برف سے ڈھکے میدانوں میں ایک جگہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ وہ ان کے رہائشی ڈورم بلاکس تھے۔ انگریزی حرف ایل کی صورت کھڑی تین تین منزلہ عمارتیں، جن کے کمروں کے آگے بالکونیاں بنی تھیں۔ چھ کمرے ایل کی ایک لکیر پہ تھے اور چھ دوسری لکیر پر تھے۔

''تمہارا کمرہ دوسری منزل پہ ہے۔'' ہالے نے اس کا سامان گاڑی سے نکالتے ہوئے بتایا۔ حیا اور ڈی جے دوسرا بیگ گھسیٹ کر لا رہی تھیں۔

ایل کی شکل کا ڈورم بلاک جس کو ہالے بی ون کہہ رہی تھی، کے باہر گولائی میں چکر کھاتی سیڑھیاں کھلے آسمان تلے بنی تھیں، جو اوپر تک لے جاتی تھیں۔ لوہے کی ان سیڑھیوں کے ہر دو زینوں کے درمیان خلا تھا اور زینوں پہ برف کی موٹی تہ تھی۔ ذرا سا پاؤں پھسلے اور آپ کی ٹانگ اس گیپ میں سے نیچے پھسل جائے۔ وہ تینوں گرتی پڑتی بمشکل حیا کا سامان اوپر لائیں۔

''کمرا تو اچھا ہے، ہم یہاں رہیں گے؟'' حیا نے ہالے کی تھمائی چابی سے اپنی dormitory کا دروازہ دھکیلا تو بے اختیار لبوں سے نکلا۔

''ہم نہیں، صرف تم، کیونکہ خدیجہ کا بلاک بی ٹو ہے۔ وہ جو سامنے ہے۔'' اس نے انگلی سے دور برفیلے میدان میں بنی عمارت کی جانب اشارہ کیا۔

''کیا مطلب، میں ادھر اکیلی؟'' وہ دنگ رہ گئی۔

''بعد میں تم بدلوا سکتی ہو ڈورم آفیسر سے کہہ کر۔ ابھی تم آرام کرو، ہر کمرے میں چار اسٹوڈنٹس ہوتے ہیں۔ ہر اسٹوڈنٹ کی ٹیلی فون ایکسٹینشن اس کی میز پہ ہوتی ہے۔ آج کل چھٹیاں ہیں، اکثر طالبعلم اپنے گھر گئے ہوئے ہیں۔ تمہارا کمرا خالی ہے، مگر تم جا کر اپنے بیڈ پر ہی سونا، ترک لڑکیوں کے بستر پہ کوئی سو جائے تو وہ بہت برا مانتی ہیں۔ کوئی مسئلہ ہو تو میرا ڈورم بلاک بی فور میں ہے، او کے؟'' مسکرا کر وہ بولی تو حیا نے سر ہلا دیا۔

ڈی جے نے بے چارگی سے اسے دیکھا اور ہالے کے ہمراہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

''ہالے! سنو، اس عمارت کے پیچھے کیا ہے؟'' کسی خیال کے تحت اس نے پکارا۔ ہالے مسکرا کر پلٹی اور بولی ''جنگل!'' پھر وہ دونوں زینے اتر گئیں۔

حیا ایک جھرجھری لے کر پلٹی اور اندر کمرے میں قدم رکھا۔

کمرا خوبصورتی سے آراستہ تھا۔ ہر دیوار کے ساتھ ایک ایک ڈبل سٹوری بنک bunk رکھا تھا۔ عموماً ایسے بنکس میں نیچے ایک بیڈ اور اوپر بھی ایک بیڈ ہوتا ہے، مگر اس میں نیچے بڑی سی رائٹنگ ٹیبل بنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لکڑی کی سیڑھی اوپر جاتی، جہاں ایک آرام دہ بیڈ تھا۔ میز پہ ایک ٹیلیفون رکھا تھا۔ وہ چاروں بنکس کو دیکھتی اپنے نام کی میز کی کرسی کھینچ کر نڈھال سی بیٹھ گئی۔

وہ ایک تھکا دینے والا دن ثابت ہوا تھا، مگر ابھی وہ تھکن کے بجائے عجیب سی اداسی میں گھری تھی۔

غیر ملک، غیر خطہ، غیر جگہ اور تنہا کمرا۔ جس کے پیچھے جنگل تھا۔ اسے جانے کیوں بے چینی ہونے لگی۔ وہ فریش ہونے کے لیے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی، تاکہ باہر کہیں باتھ روم ڈھونڈے، ابھی اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ دو کمرے چھوڑ کر ایک کمرے کا دروازہ

Downloaded From http://paksociety.com

کھلا اور اس میں سے ایک لڑکا بیگ اٹھائے نکلا۔

اس نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور پھر مقفل کر دیا۔

گرلز ہاسٹل میں لڑکا؟ اگر پاکستان میں ہوتی تو یقیناً یہی سوچتی، مگر یہ بات تو سانجی کے پراسپکٹس میں پڑھ چکی تھی کہ وہ مخلوط ہاسٹل تھا۔ البتہ ایک کمرے کے اندر صرف ایک صنف والے افراد ہی رہ سکتے تھے۔

وہ بددل سی ہو کر واپس کرسی پہ آ بیٹھی۔

سامنے والی دیوار پہ ایک سفید اور سیاہ تصویر آویزاں تھی، پنسل سے بنایا گیا وہ خاکہ ایک کلہاڑے کا تھا، جس کے پھل سے خون کی بوندیں گر رہی تھیں۔

خاکہ بے رنگ تھا، مگر خون کے قطروں کو بے حد شوخ سرخ رنگ سے بنایا گیا تھا۔

اس نے جھرجھری لے کر دوسری دیوار کو دیکھا۔

وہاں ایک لڑکی کے چہرے کا بے رنگ پنسل سے بنا خاکہ ٹنگا ہوا تھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے آنکھیں میچے ہوئے تھی، اس کی گرد ن پہ چھری چل رہی تھی۔ اور اس سے بھڑ کیلے سرخ خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

وہ مضطرب سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان تصاویر والی دیوار کے ساتھ لگے بینک کی میز پہ بہت سے چاقو اور چھریاں قطار میں رکھے تھے۔ ہر سائز، ہر قسم اور ہر دھار کا چاقو، جن کے لوہے کے پھل مدھم روشنی میں بھی چمک رہے تھے۔

وہ ایکدم بہت خوفزدہ ہو کر باہر لپکی۔

کوریڈور میں بہت اندھیرا تھا۔ دور نیچے برف سے ڈھکے میدان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھی، جیسے ہی اس نے پہلے زینے پہ قدم رکھا، اوپر چھت پہ لگا بلب ایک دم جل اٹھا۔

وہ ٹھٹک کر رکی اور گردن گھمائی۔ کوریڈور خالی تھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر بلب کس نے جلایا؟

اس کی گردن کی پشت کے بال کھڑے ہونے لگے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ پلٹی اور زینے اترنے لگی۔ تب ہی ایک دم ٹھاہ کی آواز کے ساتھ اوپر کوئی دروازہ بند ہوا۔ اس نے پتھر بن جانے کے خوف سے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی چلی گئی۔

آخری زینے سے اتر کر اس نے جیسے ہی برف زار پہ قدم رکھا، اوپر بالکونی میں جلتا بلب بجھ گیا۔

باہر زور و شور سے برف گر رہی تھی۔ تازہ پڑی برف سے اس کے قدم پھسلنے لگے تھے۔ سفید سفید گالے اس کے بالوں اور جیکٹ پہ آ ٹھہرے تھے۔ وہ گرتے پڑتے ڈی جے کے بلاک بی ٹو کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے پہلی دفعہ اپنی مانگی گئی کسی دعا پہ پچھتاوا ہوا تھا ''کاش! آج یہ برف نہ پڑتی۔''

بی ٹو کی دوسری منزل کی بالکونی میں وہ دم لینے کو رکی۔ اسے منزل یاد تھی، مگر کمرے کا نمبر بھول چکا تھا۔ اس نے ہونٹوں کے گرد ہاتھوں کا پیالا بنا کر زور سے آواز دی۔

''ڈی جے..... تم کہاں ہو؟''

''ڈی جے.....''

''ڈی جے.....''

ایک دروازہ جھٹ سے کھلا اور کسی نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اندر کھینچا۔

''اگر تم دو منٹ مزید تاخیر کرتیں تو میں مر چکی ہوتی حیا!'' ڈی جے بھی اس کی طرح تنہا اور خوف زدہ لگ رہی تھی۔ مگر اس کمرے میں آ کر حیا کا سارا خوف اڑن چھو ہو چکا تھا۔

''ڈرو مت، تمہارے لیے ہی تو آئی ہوں۔ مجھے پتا تھا، تم اکیلی ڈر رہی ہو گی، ورنہ میرا کیا ہے، میں تو کہیں بھی رہ لیتی ہوں۔'' وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر بولی، پھر بے اختیار جمائی روکی۔ خوف ختم ہوا تو نیند طاری ہونے لگی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''مگر ڈی جے! میں سوؤں گی کدھر؟''

''ان تین خالی بیڈز پہ کانٹے بچھے ہوئے ہیں کیا؟''

''مگر ہالے نے کہا تھا کہ ترک لڑکیاں.....''

''فی الحال یہاں نہ ہالے ہے، نہ ہی ترک لڑکیاں.....''

''مگر اللہ تو دیکھ رہا ہے!'' غیر ملک میں اس کا سویا ہوا خوفِ خدا جاگ اٹھا تھا۔

''اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہالے کو پتا نہیں لگنے دے گا۔ اب بستر میں گھسو اور سو جاؤ۔ خدا جانے مجھے کس پاگل کتے نے کاٹا تھا، جو تر کی آ گئی۔ آگے جھیل، پیچھے جنگل، اتنی وحشت.....''

ڈی جے کمبل میں لیٹے بڑبڑائے جا رہی تھی۔ نیند سے تو وہ بھی بے حال ہونے لگی تھی، سو ڈی جے کے قریبی بینک کی سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر کمبل میں لیٹ گئی۔

''حیا.....'' وہ کچی نیند میں تھی، جب ڈی جے نے اسے پکارا۔

''ہوں؟'' اس کی پلکیں اتنی بوجھل تھیں کہ انہیں کھول نہیں پا رہی تھی۔

''سامنے والے کمرے میں بڑے ہینڈسم لڑکے رہتے ہیں، میں نے انہیں کمرے میں جاتے دیکھا ہے۔''

''اچھا.....'' اس کا ذہن غنودگی میں ڈوب رہا تھا۔

''اور سنو، وہ پلاؤ اتنا برا بھی نہیں تھا، ہمیں صرف سفر کی تھکاوٹ کے باعث برا لگا، اور سنو.....''

مگر ڈی جے کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ سو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

دروازے پہ مدھم سی دستک ہوئی تو وہ سرعت سے کرسی سے اٹھی۔ ایک نظر سوتی ڈی جے پہ ڈالی، دوسری اپنے زیرِ استعمال بینک پہ جو دوبارہ سے بنا سلوٹ اور شکن کے بنایا جا چکا تھا اور جس پہ ترک لڑکیوں کے اعتماد کے خون کیے جانے کی کوئی نشانی باقی نہ تھی.....اور دروازہ کھول دیا۔

''سلام علیکم ایکسچینج اسٹوڈنٹس!'' ہالے نور ہشاش بشاش سی مسکراتی کھڑی تھی۔ وہ یوں تھی گویا دھلی ہوئی چاندنی۔ سیاہ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹے، ہلکی سبز لمبی جیکٹ تلے سفید جینز پہنے، شانے پہ بیگ اور ہاتھ میں چابیوں کا گچھا پکڑے وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔

''وعلیکم السلام، آؤ ہالے!''

''میں تمہارے ڈورم میں گئی تھی مگر تم ادھر نہیں تھیں۔ میں نے اندازہ کیا کہ تم یہیں ہو گی۔'' ہالے نے اپنا بیگ میز پہ رکھا اور کرسی کھینچ کر فاصلے سے بیٹھی۔

''ہاں میں علی الصبح ہی ادھر آ گئی تھی۔ ڈی جے کی یاد آ رہی تھی۔''

'خدیجہ سو رہی ہے؟'' ہالے نے گردن اونچی کر کے اوپر دیکھا، جہاں ڈی جے دو موٹے کمبل گھڑی کی صورت خود پہ ڈالے سو رہی تھی۔

''ہاں اور شاید دیر تک سوتی رہے۔''

''اوہ.....میں نے سوچا تھا کہ تمہارے فون رجسٹرڈ کروانے چلیں آج۔ ترکی میں غیر ملکی فون پہ ترک سم کارڈ ایک ہفتے کے بعد بلاک ہو جاتا ہے۔''

''ہاں بالکل، تم لوگ جاؤ اور میرا فون بھی لے جاؤ، میں ابھی دو گھنٹے مزید سوؤں گی۔''

کمبلوں کے اندر سے آواز آئی تو ہالے مسکرا دی، مسکراتے ہوئے اس کی چمکتی سرمئی آنکھیں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔

''چلو حیا! ہم دونوں چلتے ہیں۔''

Downloaded From http://paksociety.com

وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑی ہوگئی تھیں۔ حیا صبح اپنے کمرے میں جا کر فریش ہوآئی تھی۔ ابھی وہ سیاہ چوڑی دار پاجامے اور ٹخنوں تک آتی سیاہ لمبی قمیص میں ملبوس تھی۔ شیفون کا دوپٹہ گردن کے گرد مفلر کی طرح لپیٹے، اور اوپر لمبا سیاہ سویٹر پہنے ہوئے تھی جس کے بٹن سامنے سے کھلے تھے۔

''کچھ دن میرے خوش قسمت دن ہوتے ہیں، جب میرے پاس کار ہوتی ہے اور کچھ دن بدقسمت دن جب میرے پاس کار نہیں ہوتی۔ اور آج میرا خوش قسمت دن ہے۔'' ہالے نے اٹھتے ہوئے بتایا۔

''ابھی ہم قریبی دوکانوں میں جائیں گے، اگر وہاں سے فون رجسٹرڈ نہ ہوئے تو جواہر چلیں گے، اس کے بعد وہاں سے جہانگیر۔''

''جواہر؟'' حیا نے ابرو اٹھائی، جہانگیر کو اس نے کسی ترک کا نام سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

''جواہر شاپنگ مال ہے۔ یورپ کا سب سے بڑا اور دنیا کا چھٹا بڑا شاپنگ مال!''

''اوہ اچھا جیسے پاک ٹاورز.....'' اوپر کمبلوں سے آواز آئی۔

''پاک ٹاور؟'' ہالے نے گردن اٹھا کر خدیجہ کے کمبلوں کو دیکھا۔

''ہمارا پاک ٹاورز، ایشیا کے سب سے بڑا شاپنگ مال شمار ہوتا ہے۔'' وہ غنودہ آواز میں بولی۔

''نائس!'' ہالے ستائش سے مسکرا کر باہر نکل گئی۔

حیا نے اس کے جانے کی تسلی کر لی، پھر لپک کر پیچھے آئی اور سیڑھی پہ چڑھ کر ڈی جے کا کمبل کھینچا۔

''یہ پاک ٹاورز ایشیا کا سب سے بڑا مال کب سے ہوگیا؟''

''اس نے کون سا جا کر چیک کر لینا ہے۔ تھوڑا شو مارنے میں کیا حرج ہے؟''

ڈی جے غڑاپ سے پھر کمبل میں گھس گئی۔

☆ ☆ ☆

ہالے ڈرائیو کرتے ہوئے متاسف سی بار بار معذرت کر رہی تھی۔ فون رجسٹر نہیں ہو سکتے تھے۔ Avea کی دوکان پہلے تو ملی نہیں، دوسری موبائل کمپنیوں کی دوکانیں ہی ہر جگہ تھیں۔ یوں جیسے آپ کو زونگ کی دوکان کی تلاش ہو اور ہر طرف یوفون کی دوکانیں ہوں۔ بمشکل ایک دوکان ملی تو اس کا منیجر شاپ بند کر کے جا رہا تھا۔ لاکھ منتوں پر بھی اس نے دوکان نہیں کھولی اور چلا گیا۔ اب ہالے مسلسل شرمندگی کا اظہار کر رہی تھی۔

''بس کرو ہالے! بعد میں ہو جائے گا یہ کام، اب مجھے شرمندہ مت کرو۔''

''خیر تمہارا دوسرا کام تو کروں، جہانگیر چلتے ہیں۔''

ہالے نے گہری سانس اندر کھینچی۔ گاڑی سڑک پہ رواں دواں تھی اور کھڑکی کے باہر ہر سو برف دکھائی دے رہی تھی۔

''تم ایڈریس دکھاؤ، ہم پہنچنے والے ہیں۔''

''کدھر؟'' حیا نے ناسمجھی سے ڈرائیو کرتی ہالے کو دیکھا۔

''جہانگیر اور کدھر؟''

''وہاں کیا ہے؟''

''تمہاری آنٹی کا گھر، کل کہا جو تھا کہ تمہیں لے جاؤں گی، صبح بتایا بھی تھا، بھول گئیں؟''

''تم..... مجھے ادھر لے کر جا رہی ہو؟'' وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''ہاں نا..... اب ایڈریس بتاؤ، اسٹریٹ نمبر تو مجھے یاد رہ گیا تھا، آگے بتاؤ۔''

''اوہ ہالے!'' اس نے ہڑبڑا کر پرس سے وہ مڑا تڑا سا کاغذ نکالا..... اس نے کاغذ پہ دیکھا، اس علاقے کا نام Cihangir

Downloaded From http://paksociety.com

لکھا تھا، وہ اسے سہانگیر پڑھتی رہی تھی، اب اسے یاد آیا کہ ترکوں کا سی، جیم کی آواز سے پڑھا جاتا تھا۔ اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ ادھر جانا ہے تو وہ تحائف ہی اٹھا لیتی جو اماں نے بھیجے تھے۔ ذرا اچھے کپڑے ہی پہن لیتی تھوڑا سا میک اپ ہی کر لیتی۔

''لو، یہ تو سامنے ہی تھا۔ اب تم جاؤ، مجھے ادھر تھوڑا کام ہے، میرا نمبر تم نے فون میں فیڈ کر لیا ہے نا؟ جب فارغ ہونا تو مجھے کال کر لینا۔ میں آجاؤں گی، گھنٹہ تو مجھے لگ ہی جائے گا، پھر کھانا ساتھ کھائیں گے۔''

گاڑی رک چکی تھی۔ حیا نے بے توجہی سے اس کی ہدایات سنیں اور دروازہ کھول کر نیچے اتری۔

اس کے دروازہ بند کرتے ہی ہالے گاڑی زن سے بھگا کر لے گئی۔

وہ ایک خوبصورت چھوٹا سا بنگلہ تھا۔ بیرونی چار دیواری کی جگہ سفید رنگ کی لکڑی کی باڑ لگی تھی۔ گیٹ بھی لکڑی کی باڑ کا بنا تھا۔ گیٹ کے پیچھے چھوٹا سا باغیچہ تھا اور اس کے آگے وہ بنگلہ۔

بنگلے کی گلابی چھت مخروطی تھی۔ داخلی سفید دروازہ ذرا اونچا تھا۔ اس تک چڑھنے کے لیے دو اسٹیپس بنے تھے۔ اسٹیپس کے دونوں اطراف خوش رنگ پھولوں والے گملے رکھے تھے۔ تو یہ تھی وہ چھوٹی سی جنت، جس میں وہ رہتا تھا، اور جس سے باہر نکلنے کا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

وہ گیٹ کو دھکیل کر، پتھروں کی روش پہ چلتی ان اسٹیپس تک آئی، اونچے سفید دروازے پہ سنہری رنگ کی تختی لگی تھی۔

''سکندر شاہ.....''

وہ ترک ہجوں میں لکھا نام اس کے پھوپھا کا ہی تھا۔ گھنٹی کی تلاش میں اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اس گھر میں بہت سی لکڑی کی کھڑکیاں بنی تھیں اور شاید کوئی کھڑکی کھلی تھی، جس سے مسلسل ایک ٹھک ٹھک کی آواز آرہی تھی۔ جیسے کوئی ہتھوڑے یا کلہاڑے کو لکڑی پہ زور سے مار رہا ہو۔

اس نے کپکپاتی انگلی گھنٹی پہ رکھی اور سنہری ڈور ناب کے چمکتے دھات میں اپنا عکس دیکھا۔

کاجل سے لبریز بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، دونوں شانوں پر پھسل کر نیچے گرتے لمبے بال اور سردی سے سرخ پڑتی ناک۔ وہ سیاہ لباس میں چینی کی مورت لگ ہی تھی، گھبرائی ہوئی پریشان سی مورت۔

اس نے گھنٹی سے انگلی ہٹائی تو ٹھک ٹھک کی آواز بند ہوگئی۔ چند لمحے بعد لکڑی کے فرش پہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی انجانی زبان میں بڑبڑاتا دروازہ کھولنے آرہا تھا۔

وہ لب کاٹتے ہوئے کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی، جب دروازہ کھلا۔ چوکھٹ پہ بچھے ڈورمیٹ پہ اسے دروازہ کھولنے والے کے ننگے پاؤں دکھائی دیے۔ اس کی نگاہیں دھیرے سے اوپر اٹھتی گئیں۔

بلیو جینز اور اوپر گرے سویٹر میں ملبوس، وہ ایک ہاتھ میں ہتھوڑی پکڑے کھڑا تھا۔ سوئیٹر کی آستینیں اس نے کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں اور اس کے کسرتی بازو جھلک رہے تھے۔

حیا نے دھیرے سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا سانس لمحے بھر کو ساکت ہوا تھا۔ وہ ویسا ہی تھا جیسے اپنے بچپن کی تصاویر میں لگا کرتا تھا۔ وہی بھورے مائل بال جو بہت اسٹائلش انداز میں ماتھے پہ گرتے تھے۔ پرکشش آنکھیں، اٹھی ہوئی مغرور ناک، سنہری رنگت کے تیکھے نقوش، وہ ماتھے پہ تیوری لیے آنکھیں سکیڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

بلاشبہ، وہ بہت ہینڈسم تھا۔

''سن کمسن؟'' اس نے ترک میں کچھ پوچھا تو وہ چونکی۔

''سس..... سین سکندر..... سین سکندر کا گھر یہی ہے؟''

''جی یہی ہے۔'' وہ انگریزی میں بتا کر سوالیہ جانچتی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

اسے لگا وہ بوسفورس کے پُل پہ ہتھیلیاں پھیلائے کھڑی ہے، اور نیلے پانیوں کو چھو کر آتی ہوا اس کے بال پیچھے کو اڑا رہی ہے۔ وہ

Downloaded From http://paksociety.com

کسی گہرے خواب کے زیر اثر تھی۔ حسین خواب کے.....

''میں ان کی مہمان ہوں۔ پاکستان سے آئی ہوں۔'' وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ اس کے سامنے اس کی ساری خود اعتمادی ہوا ہوگئی تھی۔ ایک دم وہ خود کو بہت کمزور محسوس کرنے لگی تھی۔

''کیسی مہمان؟'' اس کا انداز اکھڑا اکھڑا سا تھا، جیسے وہ کسی ضروری کام میں مصروف تھا جس میں حیا مخل ہوئی تھی۔

''میں حیا ہوں..... حیا سلیمان۔'' اس نے پرامید نگاہوں سے جہان سکندر کا چہرہ دیکھا کہ ابھی اس کا نام سن کر اس کی پُرکشش آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق.....

''کون حیا سلیمان؟''

اس کے قدموں تلے باسفورس کا پل شق ہوا تھا وہ بے دم سی نیچے گہرے نیلے پانیوں میں جا گری تھی۔

''کون حیا سلیمان؟'' یہ آواز دہراتے ہوئے وہ سن سی ہوتی، اسے تک رہی تھی۔ اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اس شخص کے چہرے پہ زمانوں کی اجنبیت اور بیزاری تھی، پہچاننے یا نہ پہچاننے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ جہان سکندر تو اس سے واقف ہی نہ تھا۔

''کون، مادام؟'' اس نے قدرے اکتا کر دہرایا۔

حیا نے خفیف سا سر جھٹکا، پھر لب بھینچ لیے

''میں سبین پھوپھو سے ملنے آئی ہوں۔ ان کے بھائی سلیمان کی بیٹی ہوں۔ وہ جانتی ہیں مجھے۔''

''او کے، اندر آجاؤ۔'' وہ شانے اچکا کر واپس پلٹ گیا۔

وہ جھجک کر اوپر زینے پہ چڑھی پائیدان کو دیکھ کر کچھ یاد آیا تو، فوراً پیر جوتوں سے نکالے اور لکڑی کے فرش پہ قدم رکھا۔ فرش بے حد سرد تھا۔ دور راہداری کے اس پار جہاں اس نے جہان کو جاتے دیکھا تھا۔ وہاں سے ہتھوڑی کی ٹھک ٹھک پھر سے شروع ہو چکی تھی۔

وہ راہداری عبور کر کے کچن کے کھلے دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

امریکی طرز کا کچن نفاست سے آراستہ تھا۔ عین وسط میں گول میز کے گرد چار کرسیوں کا پھول بنا تھا۔ ایک جانب کاؤنٹر کے ساتھ وہ حیا کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھوڑی تھی، جس سے وہ اوپر کیبنٹ کے کھلے دروازے کے جوڑ پہ زور زور سے ضربیں لگا رہا تھا۔

وہ چند لمحے کے شش و پنج کے بعد ڈھیٹ بن کر آگے آئی اور قدرے آواز کے ساتھ کرسی کھینچی۔ وہ بے اختیار چونک کر پلٹا۔

''ڈرائنگ روم میں..... خیر!'' وہ ناگواری سے لب بھینچ کر واپس کیبنٹ کی طرف مڑ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کیبنٹ کے دروازے کے جوڑ پہ کسی شے کو پکڑ رکھا تھا اور دوسرے سے ہتھوڑی مار رہا تھا۔

حیا سلیمان نے زندگی میں کبھی اتنی تذلیل محسوس نہیں کی تھی۔

''مام..... مام.....'' چند لمحے گزرے تو وہ اسی طرح کام کی طرف متوجہ، چہرے پہ ڈھیروں سنجیدگی لیے پکارنے لگا۔

وہ انگلیاں مروڑتی، ٹانگ پہ ٹانگ رکھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دفعتاً چوکھٹ پہ آہٹ، ہوئی تو سر اٹھایا۔

راہداری سے برتن ہاتھ میں لیے سبین پھپھو اسی پل کچن میں داخل ہوئی تھیں۔ کندھوں تک آتے باب کٹ بال اور کھلے لمبے اسکرٹ کے اوپر سرمئی سویٹر پہنے، وہ کچھ بولتی آ رہی تھیں۔ اسے بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک کر رکیں۔

''حیا..... میرا بچہ..... تم کب آئیں؟'' برتن کاؤنٹر پہ تقریباً گرا کر وہ والہانہ انداز میں اس کی طرف لپکیں۔ وہ جو جہان کے سرد مہر رویے پہ بددل سی بیٹھی تھی، گڑبڑا کر اٹھی بہت گرم جوشی سے اسے گلے لگا کر انھوں نے اس کی پیشانی چومی، پھر بے حد محبت و اپنائیت بھری نم آنکھوں سے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

''فاطمہ نے بتایا تھا کہ تم کچھ روز تک آؤ گی ملنے۔ میں سوچ رہی تھی کہ تم تھکن اتار لو تو میں خود ہی تم سے ملنے آؤں گی۔ کیسی ہو تم؟

Downloaded From http://paksociety.com

کتنی پیاری ہوگئی ہو۔"

وہ اب اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی محبت سے اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں پھپھو! آپ کیسی ہیں؟" وہ بدقت مسکراتی انہی کی طرح انگریزی میں گفتگو کر رہی تھی۔

"تم کتنی بڑی ہوگئی ہو۔ آنکھیں تو بالکل سلیمان بھائی جیسی ہیں۔"

"لوگ کہتے ہیں، میری آنکھیں میری اماں سے ملتی ہیں پھپھو!" وہ ہلکا سا جتا گئی۔

"بھئی مجھے تم تو میرے بھائی کا ہی عکس لگتی ہو۔ اور سب کیسے ہیں؟" وہ ایک ایک کا حال پوچھے گئیں۔ وہ سب کی خیریت بتا کر کہنے لگی۔

"آپ داور بھائی کی شادی میں نہیں آئیں۔"

"داور بھی کتنا بڑا ہوگیا ہے ماشاءاللہ شادی بھی ہوگئی۔ کیسی رہی شادی؟ میں نے ویڈیو دیکھی تھی تمہاری۔"

اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"کون سی ویڈیو؟" اس کا سانس رکنے لگا۔ ایک دم ہی کمرے میں بہت گھٹن ہوگئی تھی۔

"وہ جو داور کے ولیمہ پہ اسٹیج پہ بنائی گئی تھی۔ تم نے ریڈ فراک پہن رکھی تھی۔ میں نے روحیل کے فیس بک پہ دیکھی تھی۔"

"روحیل سے کانٹیکٹ ہے آپ کا؟" اس کی رکی سانس ایک خوشگوار حیرت کیساتھ بحال ہوئی۔ "اور آپ فیس بک یوز کرتی ہیں؟"

وہ ان دونوں کی جانب پشت کیے کیبنٹ کے دروازے پہ اسی طرح ضربیں لگا رہا تھا۔

"ہاں، بس روحیل کی البمز دیکھنے کے لیے کرتی ہوں۔ تم استعمال کرتی ہو فیس بک؟"

"نہیں، پہلے کرتی تھی، پھر چھوڑ دیا۔ مجھے یہ سوشل نیٹ ورکس پسند نہیں ہیں، ہر شخص آپ کی زندگی میں جھانک رہا ہوتا ہے، انسان کی کوئی پرائیویسی ہی نہیں رہتی۔"

"اوہ حیا! تم جہان سے ملیں؟" ایک دم خیال آنے پہ انھوں نے گردن پھیر کر اپنے بیٹے کو دیکھا، جو چہرے پہ ڈھیروں سختی لیے اپنے کام کی جانب متوجہ تھا۔

"جہان! تم حیا سے ملے ہو؟ یہ سلیمان بھائی کی بیٹی اور روحیل کی بہن ہے۔ تمہاری فرسٹ کزن۔"

"ہوں۔ مل چکا ہوں۔" وہ اب جھک کر دراز سے کیل نکال رہا تھا۔

"یہ رشتہ داریاں یاد رکھنے کے معاملے میں بہت پور ہے۔ ویسے کوشش تو کرتا ہے اور اسے رشتے یاد بھی رہتے ہیں۔"

"دراصل پھپھو! انسان کو رشتے تب یاد رہتے ہیں جب اس کے ماں باپ اسے رشتے یاد دلائیں۔ بچوں کا کیا قصور؟ سارا قصور تو والدین کا ہوتا ہے۔ اگر والدین ہی اولاد کو کبھی رشتہ داروں سے نہ ملوائیں تو الزام کس کے سر پہ رکھا جائے؟"

سین پھپھو کا جوش و خروش سے دمکتا چہرہ پھیکا پڑ گیا مگر وہ اسی طرح تلخی سے کہتی جا رہی تھی۔ جہان اب بھی کام میں مصروف تھا۔ "مثلاً اب آپ لوگ ہیں۔ آپ کئی دہائیوں سے ادھر مقیم ہیں اور شاید آپ کا واپس آنے اور اپنے خونی رشتوں سے ملنے کا دل ہی نہیں چاہتا تو ہے ناں یہ ان فیئر.....نہیں؟"

پھپھو کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ لٹھے کی مانند سفید اور پھیکا۔ پھر وہ بدقت ذرا سا مسکرائیں اور ہولے سے سر جھٹکا۔

"ٹھیک.....ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بس کبھی آ ہی نہ سکے۔"

وہ اب مطمئن تھی۔ اپنے لہجے پہ اسے قطعی افسوس نہیں ہوا تھا۔ یہ ان لوگوں کی بے رخی تھی جس کے باعث اس کا ان سے تعلق ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔ وہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق تھی۔ کسی کی منکوحہ ہو کر بھی خاندان کے لڑکے اس سے امید لگانے لگے تھے۔ اس کڑوی دوائی کا ذرا سا ذائقہ یہ ذمہ داران بھی تو چکھیں، جنہیں اپنے بیٹے کو یہ بتانا یاد رہا تھا کہ وہ اس کی کزن ہے اور بس۔

دفعتاً اس کی نگاہ فریج کے اوپر رکھے فوٹو فریم پہ پڑی۔ اس میں ایک خوش شکل، درمیانی عمر کے صاحب مسکرا رہے تھے۔ سر پہ

Downloaded From http://paksociety.com

آرمی کیپ اور خاکی وردی کے کندھوں پہ سجے تمغے و پھول ستارے۔

''یہ پھوپھا ہیں؟'' وہ گردن اٹھا کر حیرت سے تصویر دیکھنے لگی۔ سین پھپھو نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور دھیرے سے سر ہلا دیا۔

''انسان کو رشتے تب یاد رہتے ہیں، جب اس کے ماں باپ اس کو رشتے یاد دلائیں۔'' وہ پلٹے بنا خاصا جتا کر بولا تو حیا چونکی۔

وہ تو اسے اتنا لاتعلق سمجھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا، جہان نے اس کی تلخ باتوں پہ دھیان نہیں دیا، مگر نہیں، وہ بظاہر نظر انداز کیے سب سن رہا تھا۔ وہ ذرا محتاط سی ہو کر سیدھی ہوئی۔

''میرا مطلب ہے، پھوپھا آرمی میں تھے؟ پاکستان آرمی میں؟''

''نہیں!'' جہان ہتھوڑی سلیب پہ رکھ کر آگے بڑھا اور فریج پہ رکھا فریم ہاتھ سے گرا دیا، تصویر والی طرف فریج کی چھت پہ سجدہ ریز ہو گئی۔

''حیا! تم نے کھانا تو نہیں کھایا نا؟ میں بس لگا رہی ہوں۔'' پھپھو اب سنبھل کر دوبارہ سے ہشاش بشاش سی ہو گئی تھیں۔

حیا جواب دیے بنا تحیر سے فریج کے اوپر اوندھے منہ گرے فریم کو دیکھے گئی۔ اس کے ایک سوال کے جواب میں جس بدمزاجی سے جہان نے فریم گرایا تھا، وہ ابھی تک اس پہ گنگ تھی۔

''ممی آپ کا کیبنٹ تیار ہے۔'' وہ اب کیبنٹ کا دروازہ کھول بند کر کے چیک کر رہا تھا۔

''تھینک یو جہان، اور باتھ روم کا نل بھی!'' پھپھو نے گول میز پہ پلاؤ کا بڑا سا پیالا رکھتے ہوئے یاد دلایا۔

''اے ہے... پھر وہی بدمزا پلاؤ؟'' وہ خفیف سا سر جھٹک کر رہ گئی۔

''رہنے دیں پھپھو! میں...''

''کوئی اگر مگر نہیں۔ میں تمہارے لیے کچھ خاص نہیں بنا سکی اس لیے اب انکار کر کے مجھے شرمندہ مت کرنا۔''

جہان اب دراز سے ایک ڈبہ نکال کر اندر رکھی چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ دفعتاً ڈور بیل بجی۔ جہان نے رک کر راہداری کی سمت دیکھا، پھر ڈبہ وہیں چھوڑا اور باہر نکل گیا۔

''شراع کرو حیا۔'' پھپھو نے مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پلیٹ اسے تھمائی۔ اس نے شکریہ کہہ کر چاول اور تھوڑا سا لوبیہ کا مسالا پلیٹ میں نکالا۔

راہداری کے اس پار جہان کسی مرد کے ساتھ ترک میں کچھ بول رہا تھا۔ دونوں کی مدھم سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

دوسرے ہی چمچ میں وہ پلاؤ اسے مزیدار لگنے لگا تھا۔ ڈی جے ٹھیک کہہ رہی تھی، ان کو کھانا صرف سفر کی تھکن کے باعث برا لگ رہا تھا۔

''پھپھو آپ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ...''

''حیا...!''

اس کا چمچہ پکڑے منہ تک جاتا ہاتھ اور بات دونوں رک گئے۔ بے حد بے یقینی سے اس نے گردن موڑی۔ جہان راہداری سے اسے پکارتا چلا آ رہا تھا۔ کیا اس مغرور اور بددماغ آدمی کو اس کا نام یاد رہ گیا تھا؟

''جی؟'' وہ بمشکل بول پائی۔

وہ کچن کے کھلے دروازے سے اندر آیا تو حیا نے دیکھا، اس کے ہاتھوں میں ایک ادھ کھلے گلابوں کا بوکے اور ایک سفید کارڈ تھا۔

''کیا تم یہاں رہنے آئی ہو؟'' وہ اس کے سامنے کھڑا سختی سے پوچھنے لگا۔

''نن..... نہیں۔'' وہ سانس روکے ان سفید گلاب کے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ اس کے لیے نہیں ہو سکتے تھے... نہیں... ہرگز نہیں...

''تو پھر اپنے ویلنٹائن کو میرے گھر کا پتہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟''

Downloaded From http://paksociety.com

اس نے زیرلب ترک میں کسی غیر مہذب لفظ سے اس نامعلوم شخص کو نوازا اور گلدستہ و کارڈ اسکے سامنے میز پر تقریباً پھینکنے کے انداز میں رکھا۔

''نہیں.....میں نے نہیں!'' وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے پھولوں کے اوپر گرے سفید کارڈ کو دیکھے گئی، جس پہ لکھے حروف نمایاں تھے۔

''فارمائی لو.....حیا سلیمان، فرام یور ویلنٹائن۔''

اور ویلنٹائن ڈے میں ہفتہ دس دن باقی تھے۔ اسے یاد تھا۔

''یہ یہاں بھی پہنچ گیا؟'' وہ ابھی تک بے یقین تھی۔

جہان اپنا ٹول بکس کھولے کھڑا چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ کچن میں ایک شرمندہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دفعتاً میز پہ رکھا حیا کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ گھر سے کال آرہی تھی اس نے کال کاٹی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''حیا.....بیٹھو بچے.....'' پھپھو نے اسے روکنا چاہا۔

''میری.....میری فرینڈ کال کر رہی ہے۔ وہ باہر آگئی ہے شاید، چلتی ہوں۔ اللہ حافظ۔''

حالانکہ پھپھو کی شکل سے ظاہر تھا کہ وہ جانتی ہیں کہ فون اس کی دوست کا نہیں تھا، مگر انھوں نے سر ہلا دیا۔ کہنے کو جیسے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ کرسی دھکیل کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

میز پہ سفید گلاب پڑے رہ گئے۔ ڈور میٹ پہ اس کے جوتے یونہی پڑے تھے۔ اس نے ان میں پاؤں ڈالے تو دیکھا، ایک کاغذ ان پر گرا ہوا تھا۔ حیا جھکی اور وہ کاغذ اٹھایا۔ وہ کسی کوریئر کمپنی کی رسید تھی غالباً جو شاید جہان نے دستخط کر کے وہیں پھینک دی تھی۔

وہ رسید الٹ پلٹ کر دیکھتی تیز قدموں سے گیٹ عبور کر گئی۔

وہ پھول آج ہی کی تاریخ میں کسی ''اے آر'' نے بک کروائے تھے۔ اے سے احمد اور آر سے.....؟ وہ دھیرے دھیرے سڑک کنارے چلنے لگی۔ رسید ابھی تک اس کے ہاتھ پہ تھی۔

وہ گھنٹہ بھر پہلے تک خود اس بات سے ناواقف تھی کہ وہ جہانگیر سے آرہی ہے، پھر اس ''اے آر'' کو کیسے علم ہوا؟ کیا وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا؟ کیا اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا؟ لیکن ایک پاکستانی آفیسر کے ایک غیر ملک میں اتنے ذرائع کیسے ہو سکتے تھے؟ صرف اسے تنگ کرنے کے لیے اتنی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کون کرے گا؟

وہ کالونی کے سرے پہ نصب بینچ پہ بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں برف سے ڈھکی گھاس پہ جمی تھیں۔ اسے ہالے کے آنے تک یہیں بیٹھنا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے اگلے روز ہی ڈورم آفیسر حقان سے بات کر کے اپنا کمرہ بدلوالیا تھا۔ اب وہ ڈی جے کے کمرے میں منتقل ہو چکی تھی۔ کمرے میں تیسری لڑکی ایک چینی نژاد ''لِنگ لِنگ'' تھی۔ اس کا پورا نام اتنا لمبا اور پیچیدہ تھا کہ اس نے یورپ کے لیے اپنا نام ''چیری'' رکھ لیا تھا۔ وہ ایکسچینج اسٹوڈنٹ تھی اور پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔

چوتھی لڑکی ایک اسرائیلی یہودی ''ٹالی'' تھی۔ واقعتاً ٹالی کے درخت کی طرح لمبی چوڑی اور گھنگھریالے بالوں والی۔ وہ بھی ایکسچینج اسٹوڈنٹ تھی۔ اور اس کی ساتھ والے کمرے کے فلسطینی ایکسچینج اسٹوڈنٹس (وہ ہینڈسم لڑکے کا ذکر ڈی جے نے پہلے روز کیا تھا) سے گاڑی چھنتی تھی۔ وہ فلسطینی لڑکے اور وہ اسرائیلی لڑکی ہر جگہ ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔ کیمپس کی سیڑھیاں ہوں یا ہاسٹل کا کامن روم۔ وہ چاروں ساتھ ہی ہوتے۔

''ان کے پاسپورٹ چیک کرواؤ، یا تو یہ اسرائیلی نہیں ہے، یا وہ فلسطینی نہیں ہیں۔ اتنا اتحاد اور دوستی؟ توبہ ہے بھئی!'' ڈی جے جب بھی ان کو ساتھ دیکھ کر آتی، یونہی کڑھتی رہتی۔ حیا نے ابھی ان لڑکوں کو نہیں دیکھا تھا، نہ ہی اسے شوق تھا۔

تمام ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس پیرس تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں کسی کو کسی ایکسچینج اسٹوڈنٹ کا نام معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بس یہ فلسطینی ہیں، یا چائنیز ہے، یہ ناروجین ہے، یہ ڈچ ہے اور یہ دونوں پاکستانی ہیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

ان کو ایک سے چار مضامین لینے کا اختیار تھا۔ ڈی جے نے دو لیے جبکہ حیا نے چار لیے۔ چوتھے ماہ کے اختتام پہ امتحان دینے کی پابندی تھی، اور یہ پانچ ماہ لازماً ترکی میں گزارنے کی پابندی تھی، باقی چاہے ہاسٹل میں رہو، چاہے نہ رہو، چاہے ساری رات باہر گزارو، کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ خوب مزے تھے۔

سبانجی میں کلاس کے اندر لڑکیوں کے سکارف پہ پابندی تھی۔

''تو یہ ہالے نور کیا کرتی ہوگی؟ حیا نے ڈی جے سے تب پوچھا، جب وہ دونوں نماز کے بہانے کلاس میں دکھائی جانیوالی ترکی کی تعارفی پریزنٹیشن سے کھسک کر آ گئی تھیں اور اب پریئر ہال میں بیٹھی چپس کھا رہی تھیں۔

''وہ کلاس میں اسکارف اتار کر ہی جاتی ہے۔'' ڈی جے چپس کترتے ہوئے بتا رہی تھی۔ وہ دونوں چوکڑی مار کر کارپٹ پہ بیٹھی تھیں۔ ایک طرف الماری میں قرآن و اسلامی کتب کے نسخے سجے تھے۔ دوسری طرف بہت سے اسکارف اور اسکرٹس ٹنگے ہوئے تھے۔ جینز والی ترک لڑکیاں اسکرٹ پہن کر نماز پڑھ لیتیں اور پھر بعد میں وہ اسکرٹ وہاں لٹکا کر چلی جاتیں۔ استنبول کے ہر زنانہ پریئر ہال میں ایسے اسکارف اور اسکرٹس لٹکے ہوتے تھے۔

''مزے کی ہے یہ ہالے نور بھی۔'' وہ انگلی سے بال پیچھے کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس نے بھی بلیو جینز کے اوپر گلابی سویٹر پہن رکھا تھا۔ پاکستان میں تایا فرقان کی ڈانٹ کے ڈر سے وہ جینز نہیں پہن سکتی تھی، لیکن شکر کہ یہاں وہ لوگ نہیں تھے اور وہ زندگی کو اپنی مرضی سے لطف اندوز ہو کر گزار رہی تھی۔

''پرسوں تم اپنی پھپھو کے گھر گئی تھیں۔ کیسا ٹرپ رہا؟''

''اچھا رہا، پھپھو نے پلاؤ بنایا تھا، وہ واقعی اتنا بدمزا پکوان نہیں ہے، جتنا ہم سمجھے تھے۔''

''میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی۔''

جب پریئر ہال میں بھی خوب بور ہو گئیں تو باہر نکل آئیں۔

سرد نم ہوا دھیمی لے میں بہہ رہی تھی۔ ہری گھاس پہ سبانجی کی گول سی عمارت پورے وقار کیساتھ کھڑی تھی، جیسے ایک گولائی کی شکل میں بنے گھر کو ہیٹ پہنا دی جائے۔ شیشے کے اونچے داخلی دروازوں کے سامنے سیڑھیاں بنی تھیں۔ سیڑھیوں کے دونوں اطراف سبزہ پھیلا تھا۔ وہ دونوں فائلیں تھامے زینے اتر رہی تھیں، جب ڈی جے نے اس کا شانہ ہلایا۔

''یہ جو آخری زینے پہ تین لڑکے کھڑے ہیں، یہ وہی فلسطینی لڑکے ہیں۔ دیکھو! ٹالی بھی ان کے ساتھ ہے۔''

اس نے ہوا سے چہرے پہ آتے بال پیچھے ہٹائے اور دیکھا۔ وہ ہینڈسم اور خوش شکل سے لڑکے سیڑھیوں کے کنارے کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔

''آؤ ان سے ملتے ہیں۔''

''مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ تم جاؤ، مجھے ذرا کام ہے۔''

وہ کھٹ کھٹ زینہ اترتی آگے بڑھ گئی۔ ڈی جے نے اسے نہیں پکارا، وہ ان فلسطینیوں کی جانب چلی گئی تھی۔ اور وہ یہی چاہتی تھی، ڈی جے سے دوستی اپنی جگہ، مگر فی الحال وہ خوب آزادی سے استنبول کو کھوجنا چاہتی تھی۔ اکیلی اور تنہا.....

قریباً گھنٹے بھر بعد وہ اپنے کمرے سے خوب تیار ہو کر نکلی اور پتھریلی سڑک پہ چلنے لگی۔

اس نے بلیو جینز کے اوپر ایک تنگ، اسٹائلش سا گھٹنوں تک آتا سرخ کوٹ پہن رکھا تھا۔ شدید سردی کے باوجود ننگے پاؤں میں پانچ انچ اونچی سرخ پنسل ہیل پہنی تھی۔ ریشمی بال ہوا سے شانوں پہ اڑ رہے تھے اور گہرے کاجل کے ساتھ رس بھری کی طرح سرخ لپ اسٹک۔ اسے سرخ لپ اسٹک ہمیشہ سے پرکشش لگتی تھی اور آج اسے معلوم تھا کہ وہ بہت حسین لگ رہی ہے۔

بس اسٹاپ آ چکا تھا، جب بادل زور سے گرجے۔ یہ بس اسٹاپ یونیورسٹی کے اندر ہی تھا۔ سبانجی کی ہیروئن ''گورسل'' تھی۔ گورسل بس سروس۔ وہ سبانجی کے طلبا کے لیے ہی چلتی تھی اور انہیں استنبول شہر تک لے جاتی تھی۔ ہالے نے اسے گورسل کا شیڈول رٹوا دیا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''جس دن تمہاری گورسل چھوٹی، تمہیں ہالے نور بہت یاد آئے گی۔'' اس نے سختی سے تاکید کرتے ہوئے کہا تھا۔ گورسل اپنے مقررہ وقت سے ایک لمحہ تاخیر نہیں کرتی تھی، اور اگر آپ چند سیکنڈ بھی دیر سے آئے تو گورسل گئی۔ اب دو گھنٹے بیٹھ کر اگلی گورسل کا انتظار کریں۔

جب وہ گورسل میں بیٹھی تو آسمان پہ سیاہ بادل اکھٹے ہو رہے تھے۔ جب گورسل نے باسفورس کا عظیم الشان پل پار کیا تو موٹی موٹی بوندیں پانی میں گر رہی تھیں اور جب وہ تاقسم اسکوائر پہ اتری تو استنبول بھیگ رہا تھا۔

تاقسم اسکوائر استنبول کا ایک مرکزی چوک تھا۔ وہاں عین وسط میں اتاترک سمیت تاریخی شخصیات کے مجسمے نصب تھے۔ ''مجسمہ آزادی'' ایک طرف ہرا بھرا سا پارک تھا، اور دوسری طرف میٹرو ٹرین کا زیر زمین اسٹیشن۔

وہ بس سے اتری تو بارش تڑا تڑ برس رہی تھی۔ موٹے موٹے قطرے اس پہ گر رہے تھے۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے تیز تیز سڑک پار کرنے لگی۔ گیلی سڑک پہ اونچی ہیل سے چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ پوری طرح بھیگ چکی تھی۔

زیر زمین میٹرو اسٹیشن تک جاتی وہ چوڑی سیڑھیاں سامنے ہی تھیں۔ وہ تقریباً دوڑ کر سیڑھیوں کے دہانے تک پہنچی ہی تھی کہ چیخ کی آواز آئی۔ وہ لڑکھڑائی اور گرتے گرتے بچی۔ اس کی دائیں سینڈل کی ہیل درمیان سے ٹوٹ گئی تھی۔ ٹوٹا ہوا اونچ کا ٹکڑا بس انکا ہوا ساتھ لٹک رہا تھا۔

اس نے خفت سے ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ مصروف انداز میں چھتریاں تانے گزر رہے تھے۔ شکر کہ کسی نے دیکھا نہیں تھا۔

بارش اسی طرح برس رہی تھی۔ اس کے بال موٹی گیلی لٹوں کی صورت چہرے کے اطراف میں چپک گئے تھے۔ اس نے کوفت سے ٹوٹے جوتے کے ساتھ زینہ اترنا چاہا، مگر یہ ناممکن تھا۔ جھنجلا کر وہ جھکی، دونوں جوتوں کے اسٹریپس کھولے، پاؤں ان میں سے نکالے اور جوتے اسٹریپس سے پکڑ کر سیدھی ہوئی۔

نیچے ٹرین کے پہنچنے کا شور مچ گیا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے ننگے پاؤں زینہ اترنے لگی۔ اس کے پہلو میں گرے ہاتھ سے لٹکے دونوں جوتے ادھر ادھر جھول رہے تھے۔

میٹرو کا ٹکٹ ڈیڑھ لیرا کا تھا، چاہے جس اسٹیشن پر بھی اترو۔ وہ ٹکٹ لے کر جلدی سے ٹرین میں داخل ہوئی تاکہ کسی کے محسوس کرنے سے قبل ہی معتبر بن کر جوتے پہن کر بیٹھ جائے۔

میٹرو میں نشستیں دونوں دیواروں کے ساتھ سیدھی قطار میں تھیں۔ کھڑے ہونے والوں کے لیے اوپر راڈ سے ہینڈل لٹک رہے تھے۔ وہ ایک ہینڈل کو پکڑے بھیڑ میں سے راستہ بنانے لگی۔ اس کی نظر کونے کی ایک خالی نشست پہ تھی مگر آگے چلتے شخص نے گویا راستہ روک رکھا تھا۔ جب تک وہ کونے والی نشست پہ بیٹھا نہیں، وہ آگے نہیں بڑھ سکی، پھر اس کے بیٹھتے ہی دھم سے اس کے برابر کی جگہ پہ آ بیٹھی۔ وہ سیاہ سوٹ میں ملبوس شخص شناسا سا لگا۔ لمحے بھر کو اس کا سانس رک سا گیا۔

وہ جہان سکندر تھا۔

بہت قیمتی اور نفیس سیاہ سوٹ میں ملبوس، جیل سے بال پیچھے کیے وہ چہرے پہ ڈھیروں سنجیدگی لیے اخبار کھول رہا تھا۔ بریف کیس اس نے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ وہ متحیر سی بیٹھی، سامنے دیکھے گئی۔ کن انکھیوں سے اسے وہ چہرے کے سامنے اخبار پھیلائے نظر آ رہا تھا۔ سامنے والی قطار اور ان کی قطار کے درمیان جگہ اوپر لگے ہینڈل پکڑ کر کھڑے لوگوں سے بھرنے لگی تھی۔

وہ اس عجیب اتفاق پہ اتنی ششدر بیٹھی تھی کہ ہاتھ سے لٹکتے جوتے بھول ہی گئے۔ یاد رہا تو بس یہی کہ وہ کتنا قریب..... مگر کتنا دور تھا۔ وہ اسے کیسے مخاطب کرے؟ اور اگر وہ اسے دیکھے بنا ٹرین سے اتر گیا تو.....؟ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

مگر وہ تو شاید اسے پہچانے بھی نہ۔ اس سرد مہر، کم گو شخص سے اسے یہی توقع تھی۔

چند پل سر کے تھے کہ جہان نے صفحہ پلٹنے کی غرض سے اخبار نیچے کیا اور انگوٹھے سے اگلے صفحے کا کنارہ موڑتے ہوئے ایک سرسری نگاہ پہلو میں بیٹھی لڑکی پہ ڈالی، پھر صفحہ پلٹ کر اخبار کی جانب متوجہ ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ جیسے رکا اور گردن موڑ کر دوبارہ اسے دیکھا۔ اس کی بھیگی موٹی لٹیں رخساروں سے چپک گئی تھیں۔ پانی کے قطرے ٹھوڑی سے نیچے گردن پہ گر رہے تھے۔ وہ اسکے متوجہ ہونے پہ بھی

Downloaded From http://paksociety.com

سانس روکے سامنے دیکھے گئی۔

''اوہ حیا.....'' وہ حیرت بھری آواز جیسے کہیں دور سے آئی تھی۔ حیا نے دھیرے سے پلکیں اس کی جانب اٹھائیں۔ کاجل کی لکیر مٹ کر نیچے بہہ گئی تھی، تب بھی ان اداس آنکھوں میں عجب سحر دکھتا تھا۔

''جہان سکندر!'' وہ بدقت رسماً مسکرائی۔

''حیا! کیسی ہو؟ اکیلی ہو؟'' کہنے کے ساتھ جہان نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ وہاں کوئی مسافر حیا کا ہم سفر نہیں لگ رہا تھا۔

''جی اکیلی ہوں۔''

''میں نے یہ بھی پوچھا ہے کہ کیسی ہو؟'' مسکراتے ہوئے اپنائیت سے کہتے ہوئے وہ اخبار تہہ کرنے لگا۔ وہ جو اس کے لیے ہتھوڑی اور میخیں نہیں رکھ سکتا تھا، اب اخبار رکھ رہا تھا؟ یا خدا! یہ وہی جہان سکندر تھا؟

''ممی تمہیں یاد کر رہی تھیں۔ تم پھر کب آؤ گی گھر؟'' اخبار ایک طرف رکھ کر اب وہ پوری طرح حیا کی جانب متوجہ تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

''بس..... شاید کچھ دن.....'' کچھ کہنے کی سعی میں اسے محسوس ہوا، جہان کی نگاہیں اس کے ہاتھ پہ پھسلی تھیں، اور پیشتر اس کے کہ وہ چھپا پاتی، وہ دیکھ چکا تھا۔

''جوتے کو کیا ہوا ہے؟ اتنی سردی میں ننگے پاؤں بیٹھی ہو۔ لاؤ دکھاؤ جوتا۔'' وہ خفا ہوا تھا یا فکرمند، اسے سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ جہان جوتا لینے کے لیے جھکا تو اس نے بے بسی سے ٹوٹی ہیل والی سینڈل سامنے کی۔

''یہ تو الگ ہونے والا ہے۔'' اس کے ہاتھ سے جوتا لیکر اب وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ حیا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''جہان! رہنے دو۔''

''ٹھہرو، شاید یہ جڑ جائے.....'' وہ جھک کر دوسرے ہاتھ سے بریف کیس میں سے کچھ نکالنے لگا۔

''جہان، لوگ دیکھ رہے ہیں!''

''یہ پکڑو ذرا۔'' وہ سیدھا ہوا اور جوتا حیا کو تھمایا، پھر ہاتھ میں پکڑا ٹیپ کھولا۔ کافی لمبا سا اسٹریپ کھول کر دانت سے کاٹا۔ حیا نے جوتا سامنے کیا۔ اس نے احتیاط سے ہیل کے نچلے لٹکتے حصے کو اوپر کے ساتھ جوڑا اور اس کے گرد چکروں میں ٹیپ لگاتا گیا۔

''اب پہنو۔'' مرہم شدہ سینڈل کو اس نے جھک کر حیا کے قدموں میں رکھا۔ حیا نے اس میں پاؤں ڈالا اور اسٹریپ بند کرنے جھکی ہی تھی کہ زور پڑنے سے دوبارہ چیخ ہوا اور ہیل کا ٹوٹا حصہ سرے سے ہی الگ ہو گیا۔

''اوہ!'' وہ متاسف ہوا۔

''کوئی بات نہیں۔'' حیا کو شرمندگی نے آن گھیرا تھا۔ یہ وہ سرد مہر اور تلخ جہان نہیں، بلکہ کوئی اپنا اپنا سا شخص تھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے جھک گیا تھا۔ حیا نے گردن ترچھی کر کے دیکھا۔ وہ اپنے بوٹ کا تسمہ کھول رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے روک پاتی، جہان اپنے بوٹ اتار چکا تھا۔

''پہن لو۔ باہر ٹھنڈ ہے، سردی لگ جائیگی۔'' اب وہ جرابیں اتار کر اپنے بریف کیس میں رکھ رہا تھا۔ اس کا انداز عام سا تھا، جیسے وہ روز ہی میٹرو میں کسی نہ کسی کو اپنے جوتے دے دیتا ہو۔

''نہیں، رہنے دو۔ میں ابھی مارکیٹ سے نیا لے لوں گی۔''

''مگر تم کیا کرو گے؟ تم تو آفس جا رہے ہو نا؟''

جہان نے ذرا سا مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ ''آفس کے کام سے سسلی جا رہا ہوں۔''

''پھر میں تمہیں جوتے واپس کیسے کروں گی؟ پتا نہیں کب تمہارے گھر آوں اور.....''

''تم ابھی اکیلی کہیں نہیں جا رہیں۔ اگلا اسٹیشن سسلی ہے۔ ادھر ہم ساتھ مال سے جوتا خریدیں گے، پھر میں اپنا بوٹ واپس لے لوں گا۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''مگر تمہارے آفس کا کام.....''

''میں ننگے پاؤں کام پہ جا کر کیا کروں گا؟'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔ وہ پہلی بار حیا کے لیے مسکرایا تھا۔ وہ یک ٹک کاجل کی مٹتی سیاہی والی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ اس کے چہرے سے چپکی موٹی گیلی لٹیں اب سوکھنے لگی تھیں اور ٹھوڑی سے گرتے پانی کے قطرے خشک ہو چکے تھے۔

''جوتے پہن لو۔ لوگ اب بھی دیکھ رہے ہیں۔''

وہ چونکی پھر خفیف سا سر جھٹکا اور دوہری ہو کر بوٹ پہننے لگی۔ وہ جب بھی سمجھتی کہ جہان لاتعلقی سے بیٹھا، اس کی بات نہیں سن رہا، وہ اس کو وہی فقرہ لوٹا دیا کرتا تھا۔ وہ سیدھی ہوئی تو جہان اخبار کھول چکا تھا۔ عجیب دھوپ چھاؤں جیسا شخص تھا۔

سسلی کے اسٹاپ پہ میٹرو سے اترتے وقت حیا نے دیکھا، جہان بہت آرام سے اس کے آگے ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی خفت، کوئی جھجک نہ تھی۔

وہ دونوں خاموشی سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ چند زینے بعد ہی اوپر سیڑھیوں کے اختتام پہ سڑک اور کھلا آسمان دکھائی دینے لگا۔ وہ جہان کے دائیں طرف تھی۔ آخری سیڑھی چڑھتے ہوئے اس نے دیکھا زمین پہ ایک کیل نکلی پڑتی تھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ مطلع کر پاتی، جہان کا پاؤں اس کیل کے نوکدار حصے پہ آیا۔ جب اس نے دوبارہ پاؤں اٹھایا تو اس کی ایڑھی سے خون کی ننھی سی بوند نکل گئی تھی۔ اس نے بے اختیار جہان کے چہرے کو دیکھا۔ وہ سکون سے سیدھ میں دیکھتا تیز تیز چل رہا تھا۔

''جہان..... تمہارا پاؤں..... تمہیں زخم آیا ہے۔'' وہ اس کے ساتھ چلنے کی کوشش میں تیزی سے چلنے لگی تھی۔

''خیر ہے۔'' وہ رکا نہیں۔

''مگر تمہارا خون نکلا ہے۔'' وہ واقعتاً پریشان تھی۔

''بچوں والی بات کرتی ہو تم بھی۔ اتنے ذرا سے خون سے میں زخمی تو نہیں ہو گیا۔ بہت ٹف زندگی گزاری ہے میں نے..... وہ دیکھو، جواہر مال۔''

اس سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہ چپ ہو کر اس کے ساتھ مال کے قریب آ رکی۔

وہ ایک بلند و بالا خوبصورت، نیلے سرمئی شیشوں سے ڈھکی عمارت تھی۔ اس کے اوپر بڑا سا ستارہ اور اطراف میں چھوٹے ستارے بنے تھے۔ بڑے ستارے کے اوپر ''Cevahir Mall'' لکھا تھا، اور جہان ترکوں کی طرح ''سی'' کو ''جے'' پڑھ رہا تھا۔

''یہ جواہر مال ہے۔ یورپ کا سب سے بڑا اور دنیا کا چھٹا بڑا شاپنگ مال۔'' وہ فخر سے بولا تھا۔

جواہر اندر سے بھی اتنا ہی عالیشان تھا۔ سفید ٹائلوں سے چمکتے فرش، اوپر تک نظر آتی پانچوں منزلوں کے برآمدے، اور ہر مال کی طرح وہ درمیان سے کھوکھلا تھا۔ عین وسط میں ایک اونچے کھجور کے درخت ٹاورز کی طرح لگے تھے، اور یہ روشنیوں و قمقموں سے مزین ٹاورز پانچویں منزل کی چھت تک جاتے تھے۔

وہ مسحور سی گردن اٹھائے اوپر پانچوں منزلوں کی بالکونیاں دیکھ رہی تھی، جہاں انسانوں کا ایک بے فکر، ہنستا مسکراتا ہجوم ہر سو بکھرا تھا۔ رنگ، خوشبو، امارت، چمک..... آہ..... وہ یورپ تھا۔

جوتے خرید کر وہ دونوں اوپر چلے آئے۔ حیا نے جوتوں کا بل بنواتے ہی جلدی سے ادائیگی کر دی تھی تاکہ جہان کو موقع ہی نہ مل سکے۔ وہ اس پہ خاصا خفا ہوا، مگر حیا پُرسکون تھی۔ ہالے نور سمیت وہ کسی بھی ترک سے کچھ بھی لینے میں عار نہیں سمجھتی تھی مگر جہان سکندر کا احسان..... کبھی نہیں!

چوتھی منزل کی دکانوں کے آگے بنی چمکتی بالکونی میں وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ لوگوں کے رش میں رستہ بناتی حیا کو جہان کی رفتار سے ملنے کے لیے تقریباً بھاگنا پڑ رہا تھا، پھر بھی وہ پیچھے رہ جاتی، اور وہ آگے نکل جاتا۔ وہ اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں اب تھکنے لگی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

شاید یہی ان کی زندگی کی کہانی تھی۔

جہان نے ایک شیشے کا دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر راستہ دیا۔

''تھینک یو۔'' وہ سرخ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی، وہ اس کے پیچھے آیا۔

وہ ریسٹونٹ تھا۔ نرم گرم ماحول، ہیٹر اور باہر کے سرما کی ملی جلی خنکی، مدھم روشنیاں، پیچھے بجتا دھیما میوزک۔

''آرڈر کرو۔'' وہ ایک کونے والی میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھ گئے تو جہان نے کہا۔ اپنا کوٹ اتار کر اس نے کرسی کی پشت پہ رکھ دیا تھا اور اب وہ کف کھول کر آستین موڑ رہا تھا۔

''مگر یہ دعوت کس خوشی میں ہے؟'' حیا دونوں کہنیاں میز پہ ٹکائے دائیں ہتھیلی ٹھوڑی تلے ٹکائے دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ چہرے کے دونوں اطراف میں گرتے بال اب خاصے سوکھ گئے تھے۔

''تمہارے اس خوبصورت کوٹ کی خوشی میں اور یہ دعوت میری طرف سے ہے، اب آرڈر کرو۔''

حیا نے گردن جھکا کر ایک سرسری نگاہ اپنے کوٹ پہ ڈالی۔ ''مگر دعوت تمہاری سے طرف سے ہے تو آرڈر تمہیں ہی کرنا چاہیے۔'' اس نے جہان کی بات نظر انداز کر دی کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' جہان نے مینیو کارڈ اٹھایا اور صفحے پلٹنے لگا۔ وہ محویت سے اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھے گئی۔ کیا وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے؟ اتنی بڑی بات وہ نہ جانتا ہو، کیا یہ ممکن تھا؟

''اس روز تم نے بہت غلط بات کی تھی جہان! مجھے تم پہ بہت غصہ آیا تھا۔'' جب وہ آرڈر کر چکا تھا وہ یونہی بند مٹھی ٹھوڑی تلے ٹکائے اسے تکتے ہوئے بولی۔

''میں نے کیا کیا تھا؟'' وہ حیران ہوا۔

''پتا نہیں کس نے میرے نام وہ پھول بھیجے اور تم نے کہا کہ میرا ویلنٹائن..... میں ایسی لڑکی نہیں ہوں جہان! نہ ہی میں جانتی ہوں کہ وہ پھول کس نے بھیجے تھے۔''

''او کے!'' جہان نے سمجھنے والے انداز میں اثبات میں سر کو جنبش دی، مگر وہ جانتی تھی، اسے یقین نہیں آیا۔

ریسٹورنٹ میں گہما گہمی تھی۔ اردگرد ویٹرز میزوں کے درمیان راستہ بناتے، ٹرے اٹھائے تیزی سے پھر رہے تھے۔ پس منظر میں بجتی موسیقی کے سُر بدل گئے تھے۔ اب ایک ترک گلوکار دھیمی لے والا گیت گنگنا رہا تھا۔

''ویسے تم صبح صبح کہاں جا رہی تھیں؟''

''میں یہیں سسلی ہی آ رہی تھی، شاپنگ وغیرہ کرنے۔'' ویٹر کافی لے آیا تھا اور اب ان دونوں کے درمیان جھکا ٹرے سے دوسرا کپ اٹھا کر میز پہ رکھ رہا تھا۔

''بہادر لڑکی ہو، اکیلی گھوم پھر لیتی ہو۔'' جہان نے مسکرا کر کہتے ہوئے اپنی کافی میں شکر ڈالی۔

''استنبول میں یہ بہادری مہنگی تو نہیں پڑے گی؟''

''مطلب؟'' کافی کا بھاپ اڑاتا ہوا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے جہان کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔ اس نے ایک گھونٹ بھر کر کپ نیچے رکھا۔

''مطلب ڈرگ مافیا، آرگنائزڈ کرائم اور اسٹیٹ سیکرٹ آرگنائزیشن جیسی ترکیبات سے واسطہ تو نہیں پڑے گا؟'' وہ کہنیاں میز پہ رکھے آگے ہوئی اور چہرے پہ سادگی سجائے آہستہ سے بولی۔ ''کیونکہ سنا ہے یہاں ان سب سے پالا پڑ سکتا ہے۔''

''کس سے سن لیں تم نے ایسی خوفناک باتیں؟'' جہان نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

''تم بتاؤ، یہ پاشا کون ہے؟''

''پاشا کو نہیں جانتیں تو ترکی کیوں آئی ہو؟ مصطفیٰ کمال پاشا..... یا کمال اتاترک... وہ ترکوں کا باپ تھا۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''وہ نہیں، میں استنبول کے پاشا کی بات کر رہی ہوں، عبدالرحمان پاشا کی۔''

کافی کا کپ لبوں تک لے جاتے ہوئے جہان نے رک کر سنجیدگی سے دیکھا۔

''کون؟'' کافی سے اڑتی بھاپ لمحے بھر کے لیے اس کے چہرے کو دھانپ گئی۔

''ایک بھارتی اسمگلر جو یورپ سے ایشیا اسلحہ سمگل کرتا ہے۔''

''کم آن!'' اس نے کپ رکھ کر سنجیدگی سے حیا کو دیکھا۔ ''استنبول میں ایسا کوئی مافیا راج نہیں ہے یہ کس نے تمہیں کہانیاں سنادی ہیں؟ یوں ہی مشہور ہونے کے لیے کسی نے اپنے بارے میں کوئی افواہ اڑائی ہوگی۔ تم استنبول کو کیا سمجھ رہی ہو؟''

ہالے کی طرح وہ ایک خالص ترک تھا۔ اپنے استنبول کے دفاع کے لیے جی جان سے تیار۔

ویٹر جہان کے اشارے پہ بل لے آیا تھا اور جہان اپنے بٹوے سے کارڈ نکال کر اس کی فائل میں رکھ رہا تھا۔

''رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے نا۔''

''حیا! یہ پاکستان نہیں ہے۔'' جہان نے ذرا تفاخر سے جتا کر کہا تو اس کے لب بھنچ گئے۔ کارڈ رکھ کر جہان نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھی۔

''پاکستان میں بھی یہ سب نہیں ہوتا اور بل میں دوں گی۔'' حیا نے تیزی سے فائل اٹھائی اور کھولی۔

''جیسے میں جانتا ہی نہیں۔'' جہان کی اگلی بات لبوں میں رہ گئی۔

ان کے دائیں طرف سے ایک ویٹر ٹرے اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اچانک ایک دوسرا ویٹر تیزی سے اس کے پیچھے سے آیا اور پہلے ویٹر سے آگے نکلنے کی کوشش کی۔ پہلے ویٹر کو ٹھوکر لگی، وہ توازن برقرار نہ رکھ پایا اور نتیجتاً اس کی دائیں ہتھیلی پہ سیدھی، رکھی لکڑی کا شرشڑ کرتا بھاپ اڑاتا sizzler platter بیف اسٹیکس سمیت الٹ گیا۔ میز پہ رکھے حیا کے ہاتھ پہ ٹرے اور گرم بیف اکھٹے آ کر لگے۔ وہ بلبلا کر کھڑی ہوئی۔ فائل اور بل نیچے جا گرے۔

''آئی ایم سوری..... آئی ایم سوری'' دونوں ویٹر بیک وقت چیزیں ٹھیک کرنے لگے۔ ٹرے سے کافی کا کپ بھی الٹ گیا تھا اور ساری کافی اب فرش پہ گری پڑی تھی۔

جہان ناگواری سے ترک میں انہیں ڈانٹنے لگا۔ چند منٹ معذرتوں اور میز صاف کرنے میں لگ گئے۔ وہ واپس بیٹھا تو حیا اپنی کلائی سہلا رہی تھی۔

''تمہیں چوٹ آئی ہے۔ دکھاؤ، زیادہ جل تو نہیں گیا۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا، مگر حیا نے کلائی پیچھے کر لی۔

''ذرا سی چوٹ سے میں زخمی تو نہیں ہوگئی۔ بہت لمبی زندگی گزاری ہے میں نے۔'' بظاہر مسکرا کر وہ درد کو دبا گئی۔ ہتھیلی سرخ پڑ چکی تھی اور شدید جل رہی تھی۔

''میری بات اور ہے، ہاتھ دکھاؤ!''

مگر اس نے ہاتھ گود میں رکھ لیا۔

ٹھیک ہے، اٹس اوکے، کافی کا شکریہ، اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بل والی بات اسے بھول گئی تھی۔

''مگر کافی تو ختم کر لو۔'' وہ قدرے پریشانی سے کھڑا ہوا۔

''رہنے دو، انتہائی بدتہذیب ویٹرز ہیں یہاں کے، چلو۔'' واپسی پہ وہ اسے میٹرو اسٹیشن تک چھوڑنے آیا تھا۔ زیر زمین جاتی سیڑھیوں کے دہانے پہ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''تم واپس نا قسم نہیں آؤ گے؟''

''نہیں، وہ دفتر یہاں سے قریب ہی ہے، جس سے کام کے سلسلے میں ملنے آیا تھا، اس طرف۔''

جہان نے بازو اٹھا کر دور ایک طرف اشارہ کیا۔ اس نے سفید شرٹ کی آستین یوں ہی کہنیوں تک موڑ رکھی تھی اور کوٹ بازو پہ

Downloaded From http://paksociety.com

ڈال رکھا تھا۔ ٹائی کی ناٹ اب تک ڈھیلی ہو چکی تھی۔ وہ یقیناً اس کا ایک ورکنگ ڈے خراب کر چکی تھی۔

''ویسے تم کیا کرتے ہو؟'' وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی، گردن اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں ایک غریب سا ریسٹورنٹ اونر ہوں، استقلال اسٹریٹ پہ جو پہلا برگر کنگ ہے، وہ میرا ہے۔ استقلال اسٹریٹ ٹاقسم اسکوائر کے بالکل ساتھ ہے۔ دیکھی ہے نا تم نے؟''

''اوں ہوں۔'' اس نے گردن دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہلائی۔

''تم اس ویک اینڈ پہ گھر کیوں نہیں آجاتیں؟ ممی خوش ہوں گی۔''

''اور تم؟'' بے ساختہ لبوں سے پھسلا۔

''میں تو ویک اینڈ پر بھی ریسٹورنٹ میں ہوتا ہوں۔''

''پھر فائدہ؟'' اس نے سوچا۔

''کوشش کروں گی۔'' وہ مسکرا دی، پھر دایاں ہاتھ جیب سے نکال کر بال پیچھے ہٹائے۔

''تمہارا ہاتھ ابھی تک سرخ ہے، اگر کسی دوست نے پوچھ لیا تو کیا کہو گی؟''

''کہہ دوں گی کہ گدلی برف کے ساتھ کیچڑ تھی گھاس پہ، وہیں پھسل گئی۔'' اس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔ (اب کزن کے ساتھ کافی پینے کا قصہ سنانے سے تو رہی۔)

''پھسل گئی تو ہتھیلی رگڑ ی گئی؟''

''ہاں!''

''اور گھٹنے؟'' جہان نے مسکرا کر اس کی جینز کی طرف دیکھا۔

''مطلب؟'' حیا نے ابرو اٹھائے۔

''لڑکی! کورا سٹور پوری بنایا کرو۔ اگر تم ہتھیلیوں کے بل کیچڑ میں گرو تو اصولاً تمہارے گھٹنوں پر بھی رگڑ آنی چاہیے۔'' پھر وہ چند قدم چل کر گھاس کے قطعے کی طرف گیا، جھک کر تین انگلیوں سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور واپس آ کر اس کے سامنے کی۔

''اسے اپنی جینز پہ لگا دو، ورنہ تمہاری فرینڈز یقین نہیں کریں گی۔''

''اتنا بھی کوئی شکی مزاج نہیں ہوتا جہان سکندر!'' اس نے ہنس کر اپنے پوروں پہ ذرا سی گیلی مٹی لی اور جھک کر گھٹنوں کے اوپر جینز پہ مل دی، پھر ہاتھ جھاڑتے ہوتے سیدھی ہوئی۔

''میں کوشش کروں گا کہ ہفتے کی صبح سارا کام ختم کر کے گھر آ جاؤں، تم ہفتے کی شام میں ضرور آنا۔''

پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کم گو، سنجیدہ طبیعت کا، لیے دیے رہنے والا شخص ضرور ہے، مغرور بھی ہے اور جلدی گھلتا ملتا بھی نہیں، مگر اندر سے وہ بہت خیال رکھنے والا بھی ہے اور باریک بین بھی۔ جو معمولی باتیں وہ نظر انداز کر دیتی تھی، وہ جہان کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہیں رہتی تھیں۔

وہ جب ہاسٹل میں واپس آئی تو ڈی جے اور ہالے ایک رسالہ کھولے کسی طویل بحث میں مگن تھیں۔ ڈی جے کی نگاہ سب سے پہلے اس کے سرخ ہاتھ پہ پڑی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟''

''ایک جگہ گدلی برف کیساتھ کیچڑ تھی، وہیں پھسل گئی۔''

ڈی جے نے بے اختیار اس کے گھٹنوں پہ لگے کیچڑ کو دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں لگ رہا ہے!''

حیا بات بدلنے کی غرض سے بولی۔ ''ہالے! یہ بالکونی بتی کون جلاتا ہے؟ جیسے ہی اس کے نیچے جاؤ تو وہ جل اٹھتی ہے۔''

ہالے جو غور سے اس کے کوٹ کو دیکھ رہی تھی، اس کے سوال پہ نگاہیں اٹھا کر اس کو دیکھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ان میں آٹومیٹک سینسرز لگے ہیں، وہ اپنی رو میں کسی انسان کی موجودگی پر یا پھر تیز ہوا، آندھی وغیرہ میں خود بخود جل اٹھتی ہیں۔''

''اور دروازہ بہت دیر سے بند ہوا، خود بخود۔''

''ان دروازوں کے کیچرز سلو ہیں۔ یہ چوکھٹ پہ دیر سے آکر لگتے ہیں، تاکہ ہر وقت کی ٹھاہ ٹھا سے طلبا کی پڑھائی ڈسٹرب نہ ہو۔''

''آہاں...'' ڈی جے نے سمجھ کر سر ہلایا۔ ''ہمارے ہاں بھی ہاسٹلز میں ایسی لائٹس اور دروازے.....''

''نہیں ہوتے۔'' حیا نے ڈی جے کی بات تیزی سے کاٹی۔ ''اور پاک ٹاور ایشیا کا دوسرا بڑا مال نہیں ہے، ہمیں غلط فہمی ہوئی تھی۔''

وہ جواہر دیکھ آئی تھی اور اسے اس بڑھک پہ خفت ہوئی تھی۔

''حیا!'' ڈی جے نے احتجاجاً گھورا۔ ہالے ابھی تک حیا کا کوٹ دیکھ رہی تھی۔ حیا الماری کی طرف چلی گئی تو ہالے گہری سانس لے کر بولی۔

''پھر حیا! تمہیں کسی ہینڈسم لڑکے نے کافی پلائی؟'' وہ جوتوں جوتی والا شاپر الماری میں رکھ رہی تھی، بری طرح چونک کر پلٹی۔

''نہیں..... کیوں؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''کافی، چائے، لنچ..... کچھ بھی نہیں؟''

''نہیں، مگر کیوں؟''

''تم عقل مند، جو سرخ کوٹ پہن کر گئی تھیں، شہر کی سیر پہ استنبول میں، اگر اتنا زیادہ سرخ رنگ پہن کر اور ہیوی میک اپ کر کے باہر نکلا جائے تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ.....'' ہالے نے مسکراہٹ دبائی ''کہ یو آر لکنگ فار اے ڈیٹ، یا پھر ون نائٹ اسٹینڈ! یہاں تو لوگ ویلنٹائن ڈے پر بھی اتنا سرخ پہن کر نہیں نکلتے۔''

''اچھا؟ پتا نہیں۔'' وہ دانستہ ان کی طرف سے رخ موڑ کر الماری میں چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

''یہ دعوت کس خوشی میں ہے؟''

''تمہارے اس خوبصورت کوٹ کی خوشی میں۔''

مارے تضحیک کے اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ وہ جہان کی مسکراہٹیں، وہ شائستگی، وہ ریسٹورنٹ لے جانا، وہ سب کسی اپنائیت کے جذبے کے تحت نہیں تھا، بلکہ..... بلکہ وہ اسے کوئی بکاؤ مال کی طرح سمجھ رہا تھا؟ خود کو پلیٹ میں رکھ کر پیش کرنے والی لڑکی؟ کوئی پیشہ ور.....؟

اس کے دل پہ بہت سے آنسو گر رہے تھے۔ جہان سکندر ہمیشہ اسی طرح اسے بے عزت کر دیا کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

آہستہ آہستہ وہ جہان سکندر کے استنبول میں ایڈجسٹ ہوتی جا رہی تھی۔

ڈی جے کی نیند اور نسیان البتہ اسے عاجز کر دیتے تھے۔ ڈی جے کو ذرا کہیں ٹیک مل جاتی، وہ آنکھیں بند کر کے سونے کے لیے تیار ہو جاتی اور پھر اس کا بھلکڑ پن..... حیا جب بھی کچھ فوٹو کاپی کروانے جاتی، اسے وہاں لاوارث پڑے کسی رجسٹر، کسی نوٹس کے جتھے، کسی کتاب پہ ہمیشہ شناسائی کا گمان گزرتا۔ وہ اسے اٹھا کر دیکھتی تو بڑا بڑا ''ڈی جے'' لکھا ہوتا تھا۔ وہ ہر چیز واپس لا کر ڈی جے کے سر پہ مارا کرتی تھی۔ اور ڈی جے ''یہ ادھر کیسے پہنچ گیا؟'' کہہ کر ہنسنے لگ جاتی۔

سبانجی میں ان کا ایک مخصوص آئی ڈی کارڈ بنا تھا۔ اس پہ تصویر کھنچوانے کی شرط سر اور گردن کھلی رکھنا تھی۔ وہ موبائل کے پری پیڈ کارڈ کی طرح تھا۔ گورسل کا ٹکٹ، فوٹو کاپیئر کی رقم اور دوپہر کے کھانے کا بل اسی کارڈ پہ ادا ہوتا تھا۔ اس میں موبائل کے ایزی لوڈ کی طرح بیلنس ڈلوایا جاتا تھا۔ انہیں ان پانچ ماہ میں ہر مہینے ایک ہزار یوروز کا اسکالرشپ ملنا تھا، مگر چند تکنیکی مسائل کے باعث کسی بھی اسکالرشپ ایکسچینج اسٹوڈنٹ کے فروری کے ایک ہزار یوروز نہیں آئے تھے۔ امید تھی کہ مارچ میں اکھٹے دو ہزار مل جائیں گے اور پھر آگے ہر مہینے باقاعدگی سے ملا کریں گے۔ تب تک پاکستان سے آئی رقم سے گزارا کرنا تھا۔ سو آج کل سب ایکسچینج اسٹوڈنٹس کا ہاتھ تنگ تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

دوپہر کا کھانا وہ سبانجی کے ڈائننگ ہال میں کھاتی تھیں۔ رات کا کھانا اپنے کمرے میں خود بنانا ہوتا۔ ہر بلاک میں ایک کچن تھا، جہاں پر ہر اسٹوڈنٹ اپنا ناشتا اور رات کا کھانا تیار کرتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہاں پر طلبا کے لیے خصوصی ڈیزائن کردہ چولہے تھے، اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں کوئی پڑھائی میں مگن چولہے پہ کچھ رکھ کر بھول جائے یا گیس کھلی چھوڑ دے اور نقصان ہو، وہ چولہے آٹو بینک تھے۔ ہر پندرہ منٹ بعد جب چولہا خوب گرم ہو جاتا تو خود بخود بند ہو جاتا۔ پھر پانچ منٹ بعد دوبارہ جل اٹھتا۔ ان کو بند ہونے سے روکنے کا کوئی طریقہ نہ تھا اور ایسے بے کار چولہوں پہ دیسی کھانے پکانا ناممکن تھا۔

ہاسٹل کے بلاکس کے قریب ہی ایک بہت بڑا گروسری پر اسٹور "دیا سا" Dia Sa تھا۔ "دیا" اس کا نام تھا اور "سا" ترک میں اسٹور کو کہتے تھے۔ وہ دونوں دیا اسٹور سے راشن لاتیں اور بل آدھا آدھا تقسیم کر لیتیں۔ ایک رات حیا کھانا بناتی اور وہ بہت اچھا سا دیسی کھانا ہوتا۔ دوسری رات ڈی جے کی باری ہوتی اور جو وہ بناتی وہ کچھ بھی ہوتا، مگر کھانا نہ ہوتا۔

"ڈی جے! میں یہ تمہارے سر پہ الٹ دوں گی۔" وہ جب بغیر بھنی ابلی ہوئی سبزی کا سالن دیکھتی یا پھر ابلے چاولوں پہ آملیٹ کے ٹکڑے تو ڈی جے پہ خوب چلایا کرتی تھی۔

اور پھر ترکی کے مسالے..... وہ اتنے پھیکے ہوتے کہ حیا چار، چار چمچے بھر کے سرخ مرچ ڈالتی تو بمشکل ذرا سا ذائقہ آتا۔ کھانے اس کے بھی پھیکے ہوتے، مگر ڈی جے سے بہتر تھے۔ البتہ اپنے کمرے میں روز جب صبح ہوتی تو ڈی جے بینک کی سیڑھیاں پھلانگ کر اترتی اور اسی طرح نہار منہ کھڑکی میں کھڑی ہو جاتی، پھر پٹ کھول کر باہر چہرہ نکال کر زور سے آواز لگاتی۔

"گڈ مارننگ ڈی جے۔"

اور جواب میں دور کسی بلاک سے ایک لڑکا زور سے پکارتا۔

"ٹی ٹی بے....."

غالباً وہ ڈی جے کے الفاظ ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا تھا۔ ڈی جے روز صبح صبح یہی عمل دہراتی۔ اس کے ٹی بے کہنے کے بعد وہ پکارتی "ذا..... لیل....." اور وہ لڑکا جواباً چلاتا۔

"دا..... دی....." اس کے بعد حیا کمبل سے منہ نکال کر کشن اٹھاتی اور ڈی جے کو زور سے دے مارتی۔ یوں اس کی اور اس ان دیکھے لڑکے کی گفتگو اختتام پذیر ہوتی۔

گھر روز ہی بات ہو جاتی تھی۔ البتہ موبائل کی رجسٹریشن میں مسئلہ ہوا تھا۔ ڈی جے کا تو رجسٹر ہو گیا، مگر حیا کے ساتھ ہوا یوں کہ اس کے پاسپورٹ پہ جہاں انٹری کی تاریخ پانچ فروری لکھی تھی، وہاں اوپر آفیسر کے دستخط کے باعث پانچ کا ہندسہ بظاہر چھ لگ رہا تھا۔ تاریخ کا ذرا سا فرق مشکل پیدا کرنے لگا اور اسکا فون رجسٹر نہ ہو سکا۔ وہ ترک سم اس پہ استعمال نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ ہفتے کے بعد غیر رجسٹرڈ فون پہ ترک سم بلاک ہو جاتی تو ہالے نے اسے اپنا ایک پرانا موبائل سیٹ لا دیا، اور وہ اس بدصورت، موٹے، بھدے فون کو برداشت کرنے پہ مجبور ہو گئی۔ اپنے موبائل پہ اس نے پاکستانی سم لگا دی تھی اور وہ رومنگ پہ ٹھیک چل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہارا کہاں کا پلان ہے؟" حیا نے چاولوں کی پلیٹ میں سے چمچہ بھرتے ڈی جے سے پوچھا۔ یہ پلاؤ اس اس کا اور ڈی جے کا مرغوب ترین کھانا بن چکا تھا۔ اور ساتھ ترک کوفتے اور پھلوں کا سلاد۔ وہ دونوں آمنے سامنے ڈائننگ ہال میں بیٹھی جلدی جلدی کھانا کھا رہی تھی۔

"میں سسلی جانا چاہتی ہوں، شاپنگ وغیرہ کے لیے اور تم تو اپنی پھپھو کے گھر جاؤ گی نا؟" ڈی جے کوفتے کے سالن میں سے تیل نکال کر دوسرے پیالے میں ڈال رہی تھی۔ وہ یوں ہی ہر سالن میں سے تیل نکالا کرتی تھی۔ تلی ہوئی چیزوں کو اخبار میں لپیٹ کر دباتی اور پھر کھاتی۔

"ہاں اور تم ہڈیوں کا ڈھانچہ اسی لیے ہو۔" حیا نے رک کر ناگواری سے اس کے عمل کو دیکھا۔ وہ بنا اثر لیے اوپر آیا تیل دوسرے پیالے میں انڈیلتی رہی۔

Downloaded From http://paksociety.com

ڈائننگ ہال بے حد وسیع و عریض تھا۔ ہر سو زرد روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہاں دو لمبی سی قطاروں میں مستطیل میزیں لگی تھیں اور دونوں قطاروں کے چاروں طرف کرسیوں کی سرحد بنی تھی۔ ہر طرف گہما گہمی، رش اور شور سا تھا۔

دفعتاً پلیٹ کے ساتھ رکھا حیا کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے چمچہ پلیٹ میں رکھا اور نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے چمکتی اسکرین کو دیکھا۔ تایا فرقان ہوم کالنگ۔۔۔

''حیا! ارم بول رہی ہوں۔''

''ہوں..... کیسی ہو ارم؟'' نوالہ منہ میں تھا، اس لیے اس کی پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

''ٹھیک..... تم سناؤ۔'' ارم کی آواز میں ذرا بے چینی تھی۔

''سب خیریت ہے، تم بتاؤ، کوئی بات ہوئی ہے کیا؟''

''نہیں..... ہاں..... سنو، ایک بات تھی۔'' ارم کی آواز دھیمی سرگوشی میں بدل گئی۔

''کہو، میں سن رہی ہوں۔'' حیا نے آہستہ سے چمچہ رکھا اور نیپکن سے لبوں کو دبایا۔ اس کے ذہن کے پردے پہ وہ ویڈیو ابھری تھی۔

''وہ..... یار عجیب سی بات ہے، مگر تم ابا وغیرہ کو نہ بتانا۔ اصل میں کل شام جب میں یونیورسٹی سے واپس آئی تو گیٹ کے قریب ایک..... خواجہ سرا تھا..... اس نے مجھے روکا۔''

حیا بالکل دم سادھے سنے گئی۔ پل بھر کو اسے ڈائننگ ہال کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ اس کی سماعت میں صرف ارم کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''پہلے تو میں ڈر گئی، مگر اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تو مجھے تسلی ہوئی۔ وہ مجھ سے تمہارا پوچھ رہا تھا کہ حیا باجی کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟ امریکہ پہنچ گئیں، خیریت سے؟ میں نے بتایا کہ وہ امریکہ نہیں، ترکی گئی ہے۔ پھر وہ کہنے لگا کہ میں تمہیں اس کا سلام اور.....'' وہ جھجکی۔

''اور دعا دے دوں۔''

''اور کچھ؟''

''نہیں، مگر تم ابا وغیرہ کو مت بتانا کہ میں نے ایک خواجہ سرا سے بات کی ہے۔''

''یہ بات تمہیں اس سے مخاطب ہونے سے قبل سوچنی چاہیے تھی۔ بہر حال میں نہیں جانتی، وہ کون ہے، کیا نام بتایا اس نے اپنا؟''

''ڈولی۔''

''پتا نہیں کون ہے۔ آئندہ ملے تو بات نہ کرنا، بلکہ نظر انداز کر کے گزر جانا۔'' مزید چند باتیں کر کے اس نے فون رکھ دیا اور دوبارہ پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ویسے تمہاری پھپھو کا کوئی ہینڈسم بیٹا ویٹا ہے؟'' ڈی جے نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے مگن سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ چونکہ کرا سے دیکھنے لگی۔ ''کیوں؟''

''تمہاری چمک دمک دیکھ کر یہ خیال آیا۔'' ڈی جے نے مسکراہٹ دباتے، اپنی عینک انگلی سے پیچھے کی۔

حیا نے یوں ہی چمچہ پکڑے گردن جھکا کر خود کو دیکھا۔ پاؤں کو چھوتے زرد فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھی۔ فراک کی زرد شیفون کی تنگ چوڑی دار آستینیں کلائی تک آتی تھیں۔ شیفون کا دوپٹا اس نے گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ بال حسب عادت سمیٹ کر دائیں کندھے پہ آگے کو ڈال رکھے تھے۔

''ہاں، ہے ایک بیٹا، مگر شادی شدہ ہے۔'' وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر پلیٹ میں پڑا کوفتہ کانٹے سے توڑنے لگی۔

''اوہوں..... سارا مزا ہی کرکرا کر دیا۔''

'اوہ ڈی جے! یہ کیا؟'' وہ ڈی جے کے پیچھے کچھ دیکھ کر رکی تھی۔

''کوفتہ ہے اور کیا۔'' ڈی جے نے کانٹے میں پھنسے کوفتے کو دیکھ کر کہا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''افوہ! اپنے پیچھے دیکھو۔'' اس نے جھنجھلا کر کہا تو ڈی جے نے گردن موڑی۔ وہاں ایک قدرے فربہی مائل لڑکی چلی آ رہی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس تھی۔

''سبا نجی میں ہم وطن؟'' ڈی جے نے بے یقینی سے پلکیں جھپکیں۔ اگلے ہی پل وہ دونوں اپنے اپنے کوٹ اٹھا کر کھانا چھوڑ کر اس کی طرف لپکیں تھیں۔

وہ لڑکی اپنی کتابیں سنبھالتی چلی آ رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ وہ ڈی جے کی شلوار قمیص اور حیا کا فراک پاجامہ بے یقینی سے دیکھ رہی تھی اور وہ دونوں اس کی شلوار قمیص۔

''آپ پاکستانی ہیں؟'' حیا پرجوش سی اس کے پاس گئی۔ ڈی جے ذرا اس سے ذرا پیچھے تھی۔

''نہیں، میں انڈین ہوں۔''

ڈی جے ڈھیلی پڑ گئی۔ ''رہنے دو حیا! مجھے ابھی ورلڈ کپ کا غم نہیں بھولا۔''

اس نے سرگوشی کی۔ تین سال پہلے مصباح الحق کا آخری بال پہ آؤٹ ہونا ڈی جے کو کبھی نہیں بھولتا تھا۔

حیا نے زور سے اپنا پاؤں ڈی جے کے جوتے پہ رکھ کر دبایا۔

''ہم پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس ہیں۔ حیا سلیمان اور یہ خدیجہ رانا۔ آپ؟''

''میں انجم ہوں۔ میں اور میرے ہزبینڈ پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اور ہم دونوں یہاں پڑھاتے بھی ہیں۔ ادھر فیکلٹی میں ہمارا اپارٹمنٹ ہے، وہیں رہتے ہیں ہم، کبھی آؤ نا ادھر۔'' انجم ان دونوں سے زیادہ پرجوش ہو گئی تھیں۔

''شیور..... انجم باجی۔'' ڈی جے ان کا مسلمان ہونا سن کر پھر سے خوش ہو گئی تھی۔ وہ تینوں کافی دیر وہاں کھڑی باتیں کرتی رہیں اور جب ڈی جے کو یاد آیا کہ گورسل نکلنے میں پانچ منٹ ہیں تو انجم باجی کو جلدی سے خدا حافظ بول کر وہ اپنا کوٹ ہاتھوں میں پکڑے باہر بھاگیں۔

☆ ☆ ☆

وہ ٹاقسم کے پارک میں سنگی بینچ پہ بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا لمبا سفید اونی کوٹ اب زرد فراک پہ پہن لیا تھا اور سر جھکائے ہاتھ میں پکڑی شکن زدہ چٹ پہ سے سین پھپھو کا نمبر موبائل پہ ملا رہی تھی۔ ابھی تک اس نے اس نمبر کو موبائل میں محفوظ نہیں کیا تھا۔

کال کا بٹن دبا کر اس نے وہ بھدا ترک فون کان سے لگایا۔

وہاں دور تک سبزہ پھیلا تھا۔ خوش نما پھول اور رنگوں، تتلیوں کی بہتات، ہوا اس کے لمبے بال اڑا رہی تھی۔ وہ موسم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے فون پہ جاتی گھنٹی سننے لگی۔

''ہیلو۔'' بہت دیر بعد جہان نے فون اٹھایا۔

''جہان..... میں حیا.....'' اس کے انداز میں خفت در آئی۔ اس سے کہہ رکھا تھا اسی لیے آج جا رہی تھی، ورنہ اس سرخ کوٹ نے تو اسے خوب بے وقعت کیا تھا۔

''ہاں حیا بولو؟'' وہ مصروف سا لگ رہا تھا۔

''وہ میں ٹاقسم پہ ہوں، تم مجھے یہاں سے پک کر کے گھر لے جا سکتے ہو؟ آج ویک اینڈ تھا تو.....''

''سوری حیا! میں شہر سے باہر ہوں، تم گھر ممی کو فون کر لو نا۔''

''یہ تمہارے گھر کا نمبر نہیں ہے؟'' اس نے حیرت سے چٹ کو دیکھا۔

''نہیں، یہ تو میرا موبائل نمبر ہے۔''

تو کیا اس نے داور بھائی کی مہندی والے روز جہان کے موبائل پہ فون ملا دیا تھا؟

''اوہ..... مجھے پھپھو کا نمبر لکھوا دو۔'' جہان نے فوراً نمبر لکھوا دیا۔

''اچھا میں ڈرائیو کر رہا ہوں، پھر بات ہوتی ہے۔'' مزید کچھ سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ عجیب اجنبی سا اپنا تھا۔

پھپھو اسے کیپ پہ لینے آئی تھیں۔ وہ جو چند لیرا زکی بچت کے چکر میں کیب کر کے نہیں گئی تھی، خوب شرمندہ ہوئی۔

''گاڑی نہیں تھی تو بتاتیں، میں تو ایسے ہی.....''

''کوئی بات نہیں، گاڑی تو جہان کے پاس ہی ہوتی ہے۔'' اور وہ مزید شرمندہ ہوئی۔ پھر گردن موڑ کر کھڑکی کے باہر دوڑتے درخت دیکھنے لگی۔

اسے پھپھو کچن میں ہی لے آئیں۔ حسب عادت وہ کام میں مصروف ہو گئیں۔

''یہ میرے لیے اتنا بکھیڑا پالنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ ارد گرد پھیلی اشیا دیکھ کر خفا ہوئی۔

''کوئی بات نہیں، تم میری بیٹی ہو، میرا ہاتھ بٹا دو گی، اسی لیے میں نے یہ سب شروع کر لیا۔'' دونوں کے درمیان پچھلی ملاقات کے ناخوشگوار اختتام کا کوئی تذکرہ نہ ہوا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''چلیں! پھر آج پلاؤ تو میں ہی بناتی ہوں، مجھے ریسپی سمجھاتی جائیں، ویسے بھی ترکوں کی میز اس پلاؤ کے بغیر ادھوری لگتی ہے۔'' وہ کورٹ اسٹینڈ پہ لٹکا کر آستین کلائی سے ذرا پیچھے کرتی واپس آئی۔ دوپٹا اس نے اتار کر کرسی پہ رکھ دیا تھا۔

''پہلے تو تم چکن کی بوٹیاں کاٹ دو۔'' انھوں نے ٹوکری میں رکھے مسلم مرغ کی طرف اشارہ کیا اور خود چولہے پہ چڑھی دیگچی میں چمچہ ہلانے لگیں۔

''چھری تو یہ پڑی ہے، کٹنگ بورڈ کدھر ہے؟'' وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''کٹنگ بورڈ.....اوہو.....وہ تو صبح سے نہیں مل رہا۔ جہان بھی پتا نہیں چیزیں اٹھا کر کدھر رکھ دیتا ہے۔ ٹھہرو! میں ایک پرانا بورڈ لے آؤں اوپر اٹیک attic سے۔''

''آپ رہنے دیں، میں لے آتی ہوں، اٹیک اوپر کس طرف ہے؟''

''سیڑھیوں سے اوپر راہداری کے آخری سرے پہ، مگر تمہیں تکلیف ہو گی، میں خود.....''

''آپ گوشت بھونیں، جل نہ جائے، میں بس ابھی آئی۔'' وہ ننگے پاؤں چلتی باہر لونگ روم میں آئی۔

سیڑھیوں کے ساتھ لگے قد آور آئینے میں اسے اپنا عکس دکھائی دیا تو ذرا سی مسکرا دی۔ فرش کو چھوتے زرد فراک میں وہ کھلتے پھول کی طرح لگ رہی تھی۔ گلے کا گھاٹ کھلا تھا اور اسکے دہانے پہ چھوٹے چھوٹے سورج مکھی کے پھولوں کی لیس نیم دائرے میں لگی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کی خوبصورت لمبی گردن میں سورج مکھی کے پھولوں کا ڈھیلا سا ہار لٹک رہا ہو۔ اس نے انگلیوں سے فراک پہلوؤں سے ذرا اٹھایا اور ننگے پاؤں لکڑی کے زینوں پہ چڑھنے لگی۔

اور راہداری کے آغاز میں ایک کمرے کا دروازہ بند تھا، شاید وہ جہان کا ایک کمرا تھا۔ ابھی گھر میں داخل ہوتے ہوئے پھپھو نے کچھ ایسا بتایا تھا۔

وہ ایک نظر بند دروازے پہ ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ فراک اب اس نے پہلوؤں سے چھوڑ دیا تھا۔

اٹیک میں آگے پیچھے بہت سے صندوق اور دوسرا کاٹھ کباڑ رکھا تھا۔ وہ متذبذب سی اندر آئی۔ بتی نہ جانے کدھر تھی۔ اس نے دروازہ کھلا رہنے دیا، باہر سے آتی روشنی کافی تھی۔

وہاں ہر سو سامان رکھا تھا، کٹنگ بورڈ نہ جانے کدھر تھا۔ وہ اندازاً آگے بڑھی اور ایک کونے والے صندوق کا کنڈا کھول کر ڈھکن اوپر اٹھایا۔

نیچے لونگ روم سے بیرونی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ ساتھ میں جہان اور پھپھو کی ملی جلی آوازیں۔ یقیناً وہ آ گیا تھا۔ وہ مسکرا کر صندوق پہ جھکی۔

اس میں الیکٹرک کا کوئی ٹوٹا پھوٹا سامان رکھا تھا۔ کٹنگ بورڈ کہیں نہ تھا۔ حیا نے ڈھکن بند کیا اور نسبتاً زیادہ کونے میں رکھے صندوق کی طرف آئی۔

Downloaded From http://paksociety.com

اپنے عقب میں اسے راہداری سے کسی دروازے کے ہولے سے کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی تھی۔ جہان اتنی جلدی اوپر پہنچ گیا؟ مگر وہ پلٹی نہیں اور صندوق کو کھولنے لگی، جس کے ڈھکن کے اوپر گرد اور مکڑی کے جالوں کی تہہ تھی۔

اس نے چند چیزیں الٹ پلٹ کیں تو بے اختیار گرد نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اسے ذرا سی کھانسی آئی۔ پورا اینک بے حد صاف تھا۔ ماسوائے ان کونے میں رکھے دو تین صندوقوں کے جیسے انہیں زمانوں سے نہ کھولا گیا ہو۔

اس کی پشت پہ اینک کا ادھ کھلا دروازہ ہولے سے کھلا۔ کوئی چوکھٹ میں آن کھڑا ہوا تھا، یوں کہ راہداری کی آتی روشنی کا راستہ رک گیا۔ پل بھر میں اینک.....نیم تاریک ہوگیا۔

وہ پلٹنے ہی لگی تھی کہ صندوق میں کسی خاکی شے کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اسے اوپر نکالا۔ وہ لکڑی کا تختہ نہیں تھا، بلکہ ایک اکڑا ہوا کپڑا تھا۔

حیا نے کپڑا کھول کر سیدھا کیا۔ ایک پرانی گرد آلود خاکی شرٹ.....اوپر سجے ستارے، تمغے اور ایک نام کی تختی۔

چوکھٹ میں کھڑا شخص چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا، اس کی طرف بڑھنے لگا۔

حیا نے نیم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ تختی پڑھی۔

''سکندر شاہ!'' اس نے بے اختیار رینک دیکھا۔ وہ کرنل کی نشاندہی کر رہا تھا۔

وہ شرٹ ہاتھ میں پکڑے کسی الجھن میں گرفتار پلٹی اور ایک دم جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔

اس کے عقب میں جہان نہیں تھا۔ وہ کوئی اور تھا۔

دراز قد، کنپٹیوں اور پیشانی سے جھلکتے سفید بال، سخت نقوش، نائٹ گاؤن میں ملبوس، وہ کڑی نگاہوں سے اسے دیکھتے قریب آ رہے تھے۔

وہ سانس روکے انہیں دیکھے گئی۔

وہ عین اس کے سر پہ آئے، اور ایک جھٹکے سے اسکی گردن دبوچی۔

''میری جاسوسی کرنے آئی ہو؟''

اس کے گلے کو دبوچتے وہ غرائے تھے۔

بے اختیار اس کے لبوں سے چیخ نکلی۔ شرٹ اس کے ہاتھ سے پھسل گئی۔ اس نے اپنی انگلیوں سے گردن کے گرد جکڑے ان کے ہاتھ کو پکڑ کر ہٹانے کی کوشش کی، مگر بے سود۔

''پاکستانیوں نے بھیجا ہے تمہیں؟ اپنے مالکوں سے بولو، انہیں بلیو پرنٹس کبھی نہیں ملیں گے۔''

''چھوڑیں مجھے۔'' وہ زور سے کھانسی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ اس کا گلا دبا رہے تھے۔

''کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا، کبھی نہیں، ہر چیز آگے دے دی گئی ہے، ہر چیز۔'' انھوں نے اسے گردن سے دبوچے اس کا سر کھلے صندق پہ جھکایا۔ وہ تڑپنے، چلانے لگی۔

''چھوڑیں مجھے۔'' وہ اپنے ناخن ان کے ہاتھ میں چبھا کر ان کو ہٹانے کی ناکام سعی کر رہی تھی۔

''تمہیں واپس نہیں جانے دوں گا۔ وہ بلیو پرنٹس تمہیں کبھی نہیں ملیں گے۔''

حیا کا سانس رکنے لگا۔ وہ اس کا سر صندق میں دیکر اوپر سے ڈھکنا بند کر رہے تھے، اسے لگا وہ مرنے والی ہے۔

''امی.....امی.....'' وہ وحشت سے چلانے لگی۔ وہ اس کو گردن سے دبوچے، اس کا سر منہ کے بل اندر دے رہے تھے۔ گرد سے اٹے صندوق میں اس کا سانس اکھڑنے لگا۔

Downloaded From http://paksociety.com

باب 3

''چھوڑیں۔'' دھاڑ سے دروازہ کھلا اور کوئی غصے سے چلاتا اندر آیا۔ اس کی گردن کے گرد جکڑے ہاتھ کو کھینچ کر الگ کیا اور ادھ کھلا ڈھکن پورا کھول کر دوہری ہو کر اوندھی جھکی حیا کو بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔

''کیا کر رہے تھے آپ؟ وہ آپ کی بیٹی کی طرح ہے، ایک بات میری دھیان سے سنیں۔ آئندہ اگر آپ نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

انگشت اٹھا کر سختی سے وہ انہیں تنبیہہ کر رہا تھا۔ جہان کو دیکھ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر خاموشی سے اسے سنتے گئے۔

''اور تم!'' وہ حیا کی طرف پلٹا۔ ایک غصیلی نگاہ اس پہ ڈالی، اور کہنی سے پکڑ کر کھینچتا باہر لایا۔ ''اوپر کیوں آئی تھیں؟ کس نے کہا تھا ادھر آؤ؟''

سیڑھیوں کے دہانے پہ لا کر اس نے حیا کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دہشت سے چہرے کا رنگ لباس کی مانند زرد پڑ چکا تھا۔ گردن پہ انگلیوں کے سرخ نشان پڑے تھے۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

''وہ پھپھو نے.....''

''پھپھو کا بیٹا مر گیا تھا جو انہوں نے تمہیں بھیجا؟ منع بھی کیا تھا، مگر یہاں کوئی سنے تو۔'' وہ غصے میں بولتا، اسے کہنی سے پکڑے نیچے سیڑھیاں تیزی سے اترنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ کھنچی چلی آ رہی تھی۔ پھپھو پریشان سی آخری سیڑھی کے پاس کھڑی تھیں۔

''میں بکواس کر کے گیا تھا نا، مگر میری سنتا کون ہے اس گھر میں؟ دو دن کے لیے نہ ہوں تو سارا انتظام الٹ جاتا ہے۔ پورے گھر کو پاگل کر دیا ہے انھوں نے۔''

وہ آگے بڑھا اور سینٹر ٹیبل پہ رکھی میز سے پانی کی بوتل اٹھا کر لبوں سے لگائی۔

وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ جہان کو اتنے شدید غصے میں اس نے پہلی دفعہ دیکھا اور اتنی شستہ اردو بولتے ہوئے بھی۔

''میں..... میں انہیں دیکھتی ہو۔'' پھپھو پریشانی سے کہتے ہوئے اوپر سیڑھیاں چڑھ گئیں۔

وہ گھونٹ پہ گھونٹ چڑھاتا گیا۔ بوتل خالی کر کے میز پہ رکھی اور اسکی طرف دیکھا۔

''باہر آؤ! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' وہ کہہ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ ڈری، سہمی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے آئی۔

وہ بیرونی دروازے کے آگے بنے اسٹیپس پہ بیٹھا تھا۔ حیا نے دروازہ بند کیا اور اسکے ساتھ آ بیٹھی۔ زرد فراک پھسل کر اس کے ننگے پاؤں کو ڈھانپ گیا۔ باہر سردی تھی، مگر اسے نہیں لگ رہی تھی۔

''جو بھی ہوا، میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

نیلی جینز کے اوپر پہنے بھورے سوئیٹر کو عادتاً کہنیوں سے ذرا آگے تک موڑے، وہ ہمیشہ کی طرح وجیہہ اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ غصہ اب کہیں نہیں تھا۔ وہ پہلے والا دھیما اور سنجیدہ جہان بن گیا تھا۔

''ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتے۔ کئی دفعہ انہوں نے ممی کو بھی مارنے کی کوشش کی ہے، مگر مجھے کچھ نہیں کہتے۔ ڈرتے نہیں ہیں، شاید نفرت کرتے ہیں۔''

سامنے سبزہ تھا۔ اس سے آگے سفید لکڑی کی باڑ اور باڑ سے ہی بنا گیٹ، باڑ کے تختوں کی درزوں سے باہر گیلی سڑک دکھائی دیتی

Downloaded From http://paksociety.com

تھی۔نم ہوا گھاس پر سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔وہ گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے چہرہ جہان کی جانب موڑے بیٹھی تھی۔فراک کا فرش کو چھوتا دامن ہوا کی لہروں سے پھڑ پھڑاتا ہوا اوپر اٹھ جاتا تو پاجامے کی تنگ چوڑیوں میں مقید ٹخنے اور پاؤں جھلکتے۔

''میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں پاکستان جاؤں۔اپنے رشتہ داروں کے درمیان رہوں،اپنا آبائی گھر دیکھو،مگر ہم پاکستان نہیں جاتے اور تم اس روز ممی کو طعنہ دے رہی تھیں کہ ہم پاکستان نہیں آتے۔''

''نن.....نہیں.....'' وہ گڑبڑا گئی،مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

''حیا!ہم کبھی پاکستان واپس نہیں جاسکتے۔''

''مگر کیوں؟'' وہ سناٹے میں رہ گئی۔وہ چند لمحے چپ رہا،پھر آہستہ سے کہنے لگا۔

''میرے دادا اپنے کاروبار کے سلسلے میں استنبول آیا کرتے تھے۔اس گھر کی زمین انہوں نے ہی خریدی تھی بعد میں ابا نے ادھر گھر بنوایا۔تب وہ پاکستان آرمی کی طرف سے یہاں پوسٹڈ تھے۔میں استنبول میں ہی پیدا ہوا تھا اور ابا کی دوبارہ اسلام آباد پوسٹنگ ہونے کے بعد بھی میں اور ممی اِدھر دادا کیساتھ رہتے تھے۔میرے دادا بہت اچھے،بہت عظیم انسان تھے۔انھوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔دین، دنیا،عزت،بہادری اور وقار سے جینے اور شان سے مرنے کا سبق انھوں نے ہی مجھے دیا تھا۔میں آٹھ سال کا تھا،جب دادا فوت ہوئے تو میں اور ممی کچھ عرصہ کے لیے پاکستان آگئے۔اور تب ہی وہ واقعہ ہوا،جس نے ہماری زندگی بدل دی۔''

حیا کا سانس رک گیا۔تب ہی تو ان کا نکاح ہوا تھا،تو کیا وہ باخبر تھا.....؟

''جن دنوں میں اور ممی پاکستان میں تھے،بلکہ تمہارے گھر میں تھے،ابا آناً فاناً ترکی فرار ہوگئے۔فرار اس لیے کہ انھوں نے ایک حساس مقام کے بلیو پرنٹس ان کو بیچ دیئے تھے جو ہمیشہ خریدنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ثبوت انھوں نے نہیں کوئی چھوڑا،مگر تفتیش شروع ہوئی تو بہت کچھ کھلنے لگا۔ابا نے ترکی سے ہی اپنا استعفیٰ بھجوادیا۔پیچھے عدالت میں مقدمہ چلا اور وہ غدار ٹھہرائے گئے۔ان کے جرائم کی فہرست خاصی طویل تھی۔ان کو سزائے موت سنادی گئی اور انھوں نے ترکی میں سیاسی پناہ حاصل کرلی۔کچھ تعلقات کام آئے اور کچھ رشوتیں،ابا کو ترک حکومت کبھی ڈی پورٹ نہ کرسکی،نہ ہی انٹرپول نے کوئی قدم اٹھایا۔قصہ مختصر،ابا جس دن پاکستان کی سرزمین پہ قدم رکھیں گے،وہ گرفتار ہوجائیں گے اور ان کو پھانسی دے دی جائیگی۔یہ بات تمہارے والدین کو پتا ہے،مگر بدنامی کے ڈر سے کسی کو بتائی نہیں جاتی۔''

وہ کسی بھی جذبے سے عاری نگاہوں سے سامنے باڑ کو دیکھتا رہا تھا۔حیا یک ٹک اسے دیکھے گئی۔اس کے گھر میں پھپھو کے شوہر کا ذکر کوئی نہیں کرتا تھا۔شاید دانستہ طور پہ ایسا کیا جاتا تھا۔

''میں ایک غدار کا بیٹا ہوں۔میرا باپ ایک ملک دشمن ہے۔اس ذلت کے باوجود ہم ابا کے ساتھ رہنے پہ مجبور ہیں۔احساس جرم ہے یا قدرت کی سزا،وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ذہن کھوتے جارہے ہیں۔سزائے موت کا خوف ان کے لیے ناسور بنتا جارہا ہے۔جو انھوں نے تمہارے ساتھ کیا،اس پہ ان کو معاف کردینا۔وہ میرے باپ ہیں اور باوجود اس کے کہ یہ حقیقت بہت جگہ پہ میرا سر جھکا دیتی ہے میں ان سے محبت کرنے پہ مجبور ہوں۔''

حیا نے گہری سانس لی۔اس کے کسی قصے میں اس کا قصہ نہیں تھا،کسی داستان میں اس کی داستان نہ تھی۔

''میں کام سے باہر جارہا ہوں،آج کھانا کھا کر جانا۔'' وہ اٹھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔شاید وہ صرف ابھی تنہائی چاہتا تھا۔

حیا گردن موڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔وہ ننگے پاؤں لکڑی کے فرش پہ چلتا سیڑھیوں کی بڑھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

''حیا.....خدیجہ!''

ٹالی نے انہیں اس وقت پکارا،جب وہ دونوں ڈی جے کے بینک پہ بیٹھی،ڈی جے کی شاپنگ پہ تبصرہ کررہی تھیں۔وہ تیرہ فروری کی دوپہر تھی۔انہیں ترکی آئے آٹھواں روز تھا اور ڈی جے جو ویلنٹائن ڈے کی رونق دیکھنے آج ٹاقسم گئی تھی مایوس سی واپس آئی تھی۔پاکستان کے برعکس ترک ہر کام چھوڑ کر سرخ رنگ میں نہانہیں جاتے تھے،بلکہ سوائے سرخ پھولوں کی فروخت کے استنبول میں ویلنٹائن ڈے کے کوئی

Downloaded From http://paksociety.com

آثار نہ تھے۔ جب ڈی جے خوب مایوس ہو چکی تو اس نے یہ کہہ کر اپنے خیالات میں ترمیم کر لی کہ ''بھاڑ میں گیا سینٹ ویلنٹائن، ہمیں اس تہوار سے کیا لینا دینا۔''

ان کی اس گفتگو میں مخل ہونے والی اسرائیلی ایکسچینج اسٹوڈنٹ تھی۔

''ہاں؟'' وہ دونوں رک کر نیچے دیکھنے لگیں، جہاں ٹالی ان کے بینک سے نیچے لٹکتی سیڑھی کے ساتھ کھڑی تھی۔

''وہ لڑکے تمہارا پوچھ رہے تھے۔''

حیا اور ڈی جے نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ٹالی کو۔

''کون سے لڑکے؟''

''وہ فلسطینی ایکسچینج اسٹوڈنٹس جو ساتھ والے ڈورم میں رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ وہ پاکستانی لڑکیاں کیسی ہیں اور یہ کہ ان کو کوئی مسئلہ وغیرہ تو نہیں ہے، اور یہ بھی کہ تم دونوں آج شام کی چائے کامن روم میں ان کے ساتھ پیو۔ وہ تمہارا انتظار کریں گے، او کے بائے۔'' ایک اسرائیلی مسکراہٹ ان کی طرف اچھالتی، ہاتھ ہلا کر وہ باہر نکل گئی۔

''یہ فلسطینیوں کو ہمارا خیال کیسے آ گیا؟''

''اس ٹالی کے درخت سے دل بھر گیا ہوگا شاید۔'' ڈی جے نے قیاس آرائی کی۔

''بکومت! وہ ہمیں صرف اپنی مسلمان بہنیں سمجھ کر بلا رہے ہوں گے۔''

''اتنے ہینڈسم لڑکوں کی بہن بننے پہ کم از کم میں تیار نہیں ہوں۔ یہ بھائی چارہ تمہیں ہی مبارک ہو۔'' ڈی جے بدک اٹھی تھی۔

''چلو پھر تیار ہو جائیں تاکہ وقت پہ پہنچ سکیں۔''

حیا لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اترنے لگی۔

''صرف ہمیں ہی بلایا ہے یا یہ عرب اسرائیل دوستی کی زندہ مثال بھی موجود ہوگی؟'' ڈی جے کا اشارہ ٹالی کی طرف تھا۔

''پتا نہیں۔'' حیا نے شانے اچکا دیے۔ وہ الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔ ہر موقع کی مناسبت سے مکمل ڈریسنگ کرنا اس کا جنون تھا۔ کپڑوں پہ ایک سلوٹ تک نہ ہو اور میک اپ کی ایک لکیر بھی اوپر نیچے نہ ہو، وہ ہر بات کا خیال رکھتی تھی۔ البتہ لڑکوں کی دعوت پہ جانے کی اجازت پاکستان میں ابا یا تایا فرقان کبھی نہ دیتے، مگر وہ ادھر کون سا دیکھ رہے تھے۔ یہ ترکی تھا اور یہاں سب چلتا تھا۔

وہ تین لڑکے تھے معتصم المرتضیٰ، حسین اور مومن۔ ان کے دو فلسطینی دوست محمد قادر اور نجیب اللہ جاتی دعوت کے شروع میں موجود رہے، پھر اٹھ کر چلے گئے، مگر ان تینوں میزبانوں نے احسن طریقے سے میزبانی نبھائی۔

وہ تینوں اسمارٹ اور گڈ لکنگ سے لڑکے ایک جیسے لگتے تھے۔ معتصم ان میں ذرا لمبا تھا۔ (اس کا نام معتصم المرتضیٰ تھا، مگر یہ ڈی جے نے بعد میں نوٹ کیا کہ وہ فیس بک پہ اپنا نام معتصم اینڈ مرتضیٰ لکھتا تھا۔ وجہ انہیں کبھی سمجھ نہ آئی۔) حسین اور معتصم ان دونوں کو بالکل اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح ٹریٹ کر رہے تھے۔ البتہ اس بھائی چارے سے مومن متفق نہ تھا۔ وہ فلرٹی، نظر باز سا لڑکا کچھ بھی تھا، مگر مومن نہ تھا۔ البتہ وہ دونوں اس کو اپنی موجودگی میں سیدھا کیے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اتنے ملنسار اور مہذب لڑکے تھے کہ حیا کو اپنے سارے کزنز ان کے سامنے بے کار لگے۔ البتہ جہان کی بات اور تھی۔ اس نے فوراً اپنی رائے میں ترمیم کی۔

''اگلے ہفتے حسین کا برتھ ڈے ہے۔'' حسین موبائل پہ فون سننے باہر گیا تو مومن نے بتایا۔

''پھر تو ہمیں اسے ٹریٹ دینی چاہیے۔'' ڈی جے سوچ کر بولی۔

''اور گفٹ بھی۔'' حیا کو خیال آیا۔

''ہم دونوں اس کے لیے ایک گھڑی خریدنے کا سوچ رہے ہیں اور جو ہم نے جواہر میں دیکھی ہے۔ 130 لیرا زکی ہے۔'' معتصم نے چائے کا آخری گھونٹ پی کر کپ میز پہ رکھا۔

''یعنی کہ پاکستانی روپوں میں.....'' حیا نے سوچتے ہوئے پرس میں ہاتھ ڈالا تاکہ موبائل کے کیلکولیٹر سے حساب کر سکے۔

Downloaded From http://paksociety.com

''سات ہزار ایک سو پچاس پاکستانی روپے۔'' معتصم جھک کر پیسٹریز کی پلیٹ سے ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے بولا۔ حیا کا پرس کو کھنگالتا ہاتھ رک گیا۔ اس نے حیرت و بے یقینی سے معتصم کو دیکھا۔

''تم نے اتنی جلدی حساب کیسے کیا؟''

''میں میتھس کا اسٹوڈنٹ ہوں۔'' وہ جھینپ کر مسکرا دیا۔

''اور معتصم کا ایک ہی خواب ہے کہ وہ میتھس میں نوبل پرائز لے۔'' مومن، حیا کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد معتصم سے آنکھ بچا کر حیا کے سراپے کا جائزہ لے لیتا تھا۔ حیا قدرے رخ موڑ کر معتصم کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تو میتھس کے اسٹوڈنٹ! جلدی سے بتاؤ کہ اس مہنگی گھڑی کو خریدنے کے لیے اگر ہم چاروں پیسے تقسیم کریں تو ہر ایک کے حصے میں کتنے.....''

''32 لیرا اور پچاس کُرش۔''

''اوکے!'' حیا نے گہری سانس لی اور پرس کھولا۔ ان کو پیسے انھوں نے زبردستی تھمائے۔ مومن کو تو کوئی اعتراض نہ تھا، مگر معتصم ان سے رقم لینے پہ متذبذب تھا، مگر یہ ایک ان کہی بات تھی کہ بغیر اسکارلرشپ کے استنبول جیسے مہنگے شہر میں وہ سب اتنا ہی افورڈ کر سکتے تھے۔

وہ تینوں جواہر کے لیے نکل رہے تھے۔ معتصم نے بتایا کہ وہ ابھی حسین سے نظر بچا کر گھڑی خرید لائیں گے۔ ان کو بھی ساتھ چلنے کی پیش کش کی اور ڈی جے ہاں کرنے ہی والی تھی کہ حیا نے اس کا پاؤں اپنے جوتے سے زور سے کچلتے بظاہر مسکراتے ہوئے انکار کر دیا۔

''نہیں! آپ لوگ جائیں، ہم آج ہی ہو کر آئے ہیں۔''

وہ تینوں چلے گئے تو ڈی جے نے برا سا منہ بنا کر اسے دیکھا۔ ''تم نے انکار کیوں کیا؟''

''پاگل عورت! تم پاکستان سے آئی ہو یا نیویارک سے؟ انکی دعوت قبول کر لی، یہ ہی بہت ہے۔ اب ہم ان کے ساتھ سیر سپاٹوں پہ بھی نکل جائیں، دماغ ٹھیک ہے؟''

''مگر وہ تو ہمارے بھائیوں کی طرح ہیں۔''

''پیچھے ہمارے اصلی والے بھائیوں کو پتا چلا تو کل ہی پاکستان واپس بلوا لیں گے۔ اس لیے اپنی اوقات میں واپس آؤ اور رات کے کھانے کی تیاری کرو۔'' وہ موبائل کے ساتھ ننھی ہینڈز فری کانوں میں لگاتے ہوئے بولی۔

''زہر ملا کر دوں گی تمہیں۔'' ڈی جے بھناتی ہوئی پیر پٹخ کر اٹھی۔

''اور اگر تم چاولوں پہ آملیٹ ڈال کر لائیں تو میں ساری ڈش تمہارے اوپر الٹ دوں گی۔''

وہ وہیں صوفے پہ لمبی بیٹھی، اب موبائل کے بٹن دبا رہی تھی۔ دھیما میوزک اس کے کانوں میں بجنے لگا۔ ڈی جے غصے میں بہت کچھ کہتی گئی، مگر اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آنکھیں موندے ہولے ہولے پاؤں جھلانے لگی۔

ڈی جے پیر پٹخ کر باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ رات ویلنٹائن کی رات تھی۔ ڈی جے کامن روم میں منعقدہ اس آل گرلز پارٹی میں جا چکی تھی، جولڑکیوں نے مل کر دی تھی، جبکہ حیا آئینے کے سامنے کھڑی اپنا کاجل درست کر رہی تھی۔ اس کی تیاری مکمل تھی، لیکن جب تک وہ اپنی آنکھوں کے کٹورے کاجل سے بھر نہ لیتی، اسے تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ابھی وہ کاجل کی سلائی کی نوک آنکھ کے کنارے سے رگڑ ہی رہی تھی کہ دروازہ بجا۔

دھیمی سی دستک اور پھر خاموشی۔

اس نے کاجل کی سلائی نیچے کی اور پلٹ کر دیکھا۔

یہ انداز ڈی جے کا تو نہیں تھا۔ وہ یوں ہی کاجل پکڑے آگے بڑھی اور ناب گھما کر دروازہ کھولا۔

باہر بالکونی میں روشنی تھی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، بالکونی تاریک ہو گئی۔ غالباً سیڑھیوں کے اوپر لگا بلب بجھ گیا تھا۔ کیا

Downloaded From http://paksociety.com

کوئی آ کر واپس پلٹ گیا تھا؟

''کون؟'' اس نے گردن آگے کر کے راہداری میں دونوں سمت دیکھا۔ ہر سو خاموشی تھی۔ بالکونی ویران تھی۔ وہاں سردی تھی اور اندر کمرا گرم تھا۔

وہ چند ثانیے کھڑی رہی، پھر دھیرے سے شانے اچکا کر پلٹنے ہی لگی تھی کہ.....

''اوہ نہیں!'' اس کے لبوں سے ایک اکتائی ہوئی کراہ نکلی۔

چوکھٹ پہ اس کے قدموں کے ساتھ سفید گلابوں کا بکے اور ایک بند لفافہ رکھا تھا۔ وہ جھکی، دونوں چیزیں اٹھائیں اور جارحانہ انداز میں لفافے کا منہ پھاڑا۔ اندر رکھا چوکور سفید کاغذ نکالا اور چہرے کے سامنے کیا۔

''ہیپی ویلنٹائن ڈے..... فرام یور ویلنٹائن۔''

اس نے لب بھینچ کر تنفر سے وہ تحریر پڑھی اور پھر بے حد غصے سے کاغذ مروڑ کر گلدستے سمیت پوری قوت سے راہداری میں دے مارا۔

''آ ؤچ!'' وہ واپس مڑنے ہی لگی تھی، جب کسی کی بوکھلائی ہوئی آواز سنی۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

گلدستہ اور کاغذ سیدھے ہاتھ والے کمرے سے نکلتے معتصم کو جا لگے تھے اور اس سے ٹکرا کر اب اس کے قدموں میں پڑے تھے۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔

''آئی ایم سوری معتصم!'' وہ شدید بے زاری سے بمشکل ضبط کر کے بولی۔ معتصم کو وضاحت دینے کا سوچ کر ہی اسے کوفت ہونے لگی تھی۔

''یہ میں نے تمہیں نہیں دیے بلکہ کسی فضول انسان نے مجھے بھیجے ہیں۔ تم برا مت ماننا اور ان کو ڈسٹ بن میں ڈال دینا۔'' وہ ایک ہاتھ دروازے پر رکھے، دوسرے میں کاجل پکڑے ذرا رکھائی سے بولی۔

معتصم نے جھک کر وہ کاغذ اٹھایا اور سیدھے ہوتے ہوئے اس کی شکنیں درست کر کے چہرے کے سامنے کیا۔ حیا کو کوفت ہونے لگی۔

''میں کہہ رہی ہوں نا، سوری۔'' وہ جو قدرے بھنویں سکیڑے کاغذ کو دیکھ رہا تھا، چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''نہیں، اٹس او کے۔ مگر یہ..... تمہیں کوئی سبا نجی میں تنگ کر رہا ہے؟'' وہ تحریر پہ نگاہیں دوڑاتے تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

''یہ بات نہیں ہے۔ یہ بہت پہلے سے میرے پیچھے پڑا ہے۔ لمبی کہانی ہے، جانے دو۔ اس کو کوڑے میں پھینک دینا۔ گڈ نائٹ۔''

وہ مزید مروت کا مظاہرہ کیے بغیر دروازے کا کواڑ بند کرنے ہی لگی تھی جب وہ ہولے سے بولا۔

''یہ گیلا کیوں ہے؟ تم روئی ہو؟''

کچھ تھا اس کی آواز میں کہ دروازہ بند کرتی حیا ٹھٹک کر رکی، پھر پٹ نیم وا کیا اور باہر بالکونی میں قدم رکھا۔

''میں کیوں روؤں گی؟'' وہ کاغذ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

معتصم کاغذ کے نچلے دائیں طرف کے کنارے پر انگلی پھیر رہا تھا۔

''پھر یہ گیلا کیوں ہے؟ شاید پھولوں پہ پانی تھا؟''

حیا نے میکانکی انداز میں نفی میں گردن ہلائی۔

''نہیں، یہ تو موٹے لفافے میں مہر بند تھا۔''

معتصم نے وہ نم حصہ ناک کے قریب لے جا کر آنکھیں موندے سانس اندر کو کھینچی۔

''سٹرس؟ لیموں؟ لائم؟'' وہ متذبذب سا حیا کو دیکھنے لگا۔

''کیا کہہ رہے ہو، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''کسی نے اس کے نچلے کنارے پہ لیموں کا رس لگایا ہے۔'' پھر اس نے ذرا چونک کر حیا کو دیکھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''تمہارے پاس ماچس ہے؟''

وہ جواب دیے بنا الٹے قدموں پیچھے آئی اور دروازہ پورا کھول کر ایک طرف ہوگئی۔ معتصم قدرے جھجکا، پھر کاغذ پکڑے اندر داخل ہوا۔

حیا نے اپنی اور ڈی جے کی میز کی کرسیاں کھینچ کر آمنے سامنے رکھیں اور پھر ٹالی کی میز پر چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگیں۔

''کیا تم بھی بچپن میں لیموں کے رس اور آگ والا کھیل کھیلتے تھے؟'' وہ اب میز کی دراز کھول کر کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

معتصم دھیرے سے ہنسا۔

''بہت کھیل کھیلے ہیں اور ان میں سے اکثر آگ والے ہوتے تھے۔ فلسطین میں بہت آگ ہے، شاید تم نہ سمجھ سکو۔''

''چلو، آج ان ترکوں کے کھیل اسرائیلی آگ سے کھیلتے ہیں۔'' وہ دراز سے ایک سگریٹ لائٹر نکال کر اس کے سامنے کرسی پر آ بیٹھی اور لائٹر اس کی طرف بڑھایا۔

معتصم نے لائٹر کا پہیہ انگوٹھے سے دبا کر گھمایا تو آگ کا نیلا زرد سا شعلہ جل اٹھا۔

''احتیاط سے۔'' وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

معتصم نے جواب نہیں دیا۔ وہ خط کے نم حصے کو، جو ابھی تک نہیں سوکھا تھا، شعلے کے قریب لایا۔ ذرا سی تپش ملی اور الفاظ ابھرنے لگے۔ بڑے بڑے کر کے لکھے انگریزی کے تین حروف۔ ''اے آر پی''

وہ حروف عین ''فرام یور ویلفائن'' کے نیچے لکھے تھے۔

وہ دونوں چند لمحے کاغذ کے ٹکڑے پہ ابھرے بھورے حروف کو تکتے رہے، پھر ایک ساتھ گردن اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''آر پ.....ایرپ؟ کیسا لفظ ہے یہ؟'' حیا نے ممکنہ ادائیگی کے دونوں طریقوں سے حروف کو ملا کر پڑھا۔

''شاید کوئی نام!''

''کیا آرپ کوئی ترک نام ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' معتصم نے شانے اچکا دیے۔

حیا سوچتی نگاہوں سے کاغذ کو تکتی رہی۔

''کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟''

اس نے ایک نظر معتصم کو دیکھا، پھر نرم سا مسکرائی۔

''تم کر چکے ہو۔''

وہ ہولے سے مسکرا کر کھڑا ہوا اور کاغذ میز پر رکھا۔

وہ جو بھی ہے، شاید تمہیں اپنا نام بتانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے، یہ تم بہتر سمجھ سکتی ہو گی۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔''

''ہوں۔ تھینک یو معتصم!''

معتصم نے ذرا سی سر کو جنبش دی اور باہر نکل گیا۔

دروازے کا کیچر سست روی سے واپس چوکھٹ تک جانے لگا۔

حیا چند لمحے میز پہ رکھے کنارے سے بھورے ہوئے کاغذ کو دیکھے گئی، پھر بے اختیار کسی میکانکی عمل کے تحت اس نے ہاتھ میں پکڑی کاجل کی سلائی کو سیدھا کیا اور بائیں ہتھیلی کی پشت پہ وہ تین حروف اتارے۔

''اے آر پی''

دروازہ چوکھٹ کے ساتھ لگنے ہی والا تھا۔ ذرا سی درز سے باہر راہداری میں گرا گلدستہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک دو پل مزید گزرے اور زوردار ''ٹھاہ'' کی آواز کے ساتھ دروازہ بند ہو گیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ اپنی ہتھیلی کی پشت پہ سیاہ رنگ میں لکھے وہ تین الفاظ دیکھ رہی تھی۔

''اے آر پی.....''

☆ ☆ ☆

اس نے اوپر بنے کیبنٹ کا دروازہ کھولا۔ چند ڈبے الٹ پلٹ کیے۔ نچلے خانے میں سرخ مرچوں کا ڈبا نہیں تھا۔ وہ ایڑیاں اٹھا کر ذرا سی اونچی ہوئی اور اوپر والے خانے میں جھانکا۔ وہاں سامنے ایک پلاسٹک کے بے رنگ ڈبے میں سرخ پاؤڈر رکھا نظر آ رہا تھا۔

اس نے ڈبا نکالا اور کاؤنٹر کی طرف آئی۔ وہاں ڈی جے کھڑی، سلیب پہ کٹنگ بورڈ کے اوپر پیاز رکھے کھٹا کھٹ کاٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

''بریانی کی مقدار زیادہ ہے، چار چمچ سرخ مرچ کے ڈال دیتی ہوں، شاید ذرا سا ذائقہ آ جائے۔ ٹھیک؟'' وہ خود کلامی کے انداز میں کہتی نوکری سے چھوٹا چمچ ڈھونڈنے لگی۔

''ہاں ٹھیک!'' ڈی جے نے بھیگی آنکھیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے رندھی آواز میں کہا اور آستین سے آنکھیں رگڑیں۔

حیا اب ڈبے سے چمچ بھر بھر کر دھوئیں اڑاتے پتیلے میں ڈال رہی تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا اس کے پیچھے گردن پہ جھول رہا تھا۔ سادہ شلوار قمیص پہ وہ ڈھیلا ڈھالا سا سبز سوئٹر پہنے ہوئے تھی، جس کی آستینیں اس نے کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں۔ دوپٹا ایک طرف دروازے پہ لٹکا تھا اور چند لٹیں جوڑے سے نکل کر چہرے کے اطراف میں لٹک رہی تھیں۔ گوشت میں چمچہ ہلاتی وہ بہت مصروف لگ رہی تھی۔

وہ دونوں اس وقت انجم باجی کے کچن میں موجود تھیں۔ صبح انجم باجی ڈی جے کو ڈائننگ ہال میں ملیں تو شام اپنے گھر کھانے کی دعوت دے ڈالی، جو کہ ڈی جے نے یہ کہہ کر قبول کر لی کہ وہ اور حیا مل کر بریانی بنائیں گی۔ اب سر شام ہی وہ دونوں ہالے کو لیے انجم باجی کے اپارٹمنٹ آ گئی تھیں۔

ایک بیڈ روم، لاؤنج اور کچن پہ مشتمل وہ چھوٹا مگر بے حد نفیس اور سلیقے سے سجا اپارٹمنٹ تھا۔ ہالے کو انہوں نے لاؤنج میں انجم باجی کے ساتھ بیٹھا رہنے دیا اور خود کچن میں آ کر کام میں مصروف ہو گئیں۔

''یہ پینٹنگ جوید جی لائے تھے انڈیا سے۔'' اندر لاؤنج میں انجم باجی کی ہالے کو مطلع کرتی آواز آ رہی تھی۔

''ڈی جے! یہ جوید جی کیا ہے؟'' اس نے قدرے الجھ کر پوچھا۔

''ان کا مطلب ہے، جاوید جی۔ ان کے ہزبینڈ!'' ڈی جے نے سرگوشی کی تو وہ 'اوہ' کہہ کر مسکراہٹ دباتی پلٹ کر ابلتے چاولوں کو دیکھنے لگی۔

جس وقت انجم باجی اور ہالے کچن میں داخل ہوئیں، حیا پتیلے کا ڈھکن احتیاط سے بند کر رہی تھی۔ آہٹ پہ پلٹی اور مسکرائی۔

''بس دم دے رہی ہوں۔''

''بہت خراب ہو تم دونوں، مجھے اٹھنے ہی نہیں دیا۔''

''بس اب آپ کو کھانے کے وقت ہی اٹھانا تھا۔ وہ جوید..... جاوید بھائی آ گئے؟'' وہ ہاتھ دھو کر تولیے سے صاف کرتی ڈی جے کے پاس آئی۔

ڈی جے کا سلاد ابھی تک مکمل نہیں ہوا تھا۔ اب کہیں جا کر وہ ٹماٹروں پہ پہنچی تھی۔

''بس آنے والے ہیں۔ لاؤ! یہ سلاد تو مجھے بنانے دو۔''

''نہیں! میں کر لوں گی۔ تھوڑا سا رہ گیا ہے۔'' ڈی جے نے بڑی بے فکری سے کہا تو اس نے اسے جتاتی نظروں سے گھورا۔

''آپ نے اس تھوڑے میں بھی صبح کر دینی ہے، لاؤ مجھے دو، اور پلیٹیں لگاؤ۔'' اس نے ٹماٹر اور چھری ڈی جے کے ہاتھ سے لے لی۔

ہالے از خود نہایت پھرتی سے سارا پھیلاوا سمیٹنے میں لگی تھی۔ وہ میلے برتن اب سنک میں جمع کر رہی تھی۔ وہ ان کبھی کبھی کام کرنے والی دونوں پاکستانی لڑکیوں کی نسبت بہت تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

ڈی جے کیبنٹ سے پلیٹیں نکالنے لگی اور انجم باجی رائتہ بنانے لگیں۔

حیا نے ٹماٹر کو کٹنگ بورڈ پہ بائیں ہاتھ سے پکڑ کر رکھا اور چھری رکھ کر دبائی۔ دو سرخ ٹکڑے الگ ہو گئے اور ذرا سا سرخ رس اس کی بائیں ہتھیلی کی پشت پہ بہہ گیا، جہاں کاجل سے لکھے تین مٹے مٹے سے حروف تھے۔

اے.....آر.....پی

وہ دو تین روز سے اسی ''اے آر پی'' کے متعلق سوچے جا رہی تھی، اب بھی کچھ سوچ کر اس نے گردن اٹھائی۔

''انجم باجی!''

وہی کو کانٹے سے پلیٹیں انجم باجی نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

''آپ نے کسی ''ایرپ'' کے متعلق سنا ہے؟''

''ایرپ؟'' انجم باجی نے حیرت بھری الجھن سے دوہرایا۔

''جی، ایرپ۔ اے آر پی۔'' اس نے وضاحت کے لیے ہجے کر کے بتایا۔

''اوہ ناٹ اگین حیا!'' ہالے جو سنک کے آگے کھڑی تھی، قدرے اکتا کر پلٹی۔ اس کے ہاتھ میں جھاگ بھرا اسفنج تھا جسے وہ پلیٹ پہ مل رہی تھی۔

''تم پھر وہی موضوع لے کر بیٹھ گئی ہو؟'' اس کے انداز میں خفگی بھرا احتجاج تھا۔

''مگر ہالے.....'' اب کے وہ الجھی تھی۔ یہ موضوع تو اس نے ابھی تک ہالے کے ساتھ ڈسکس نہیں کیا تھا، پھر.....؟

''میں نے کہا تھا نا، یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔''

''مگر میں نے پوچھا ہی کیا ہے؟''

''اے آر پی۔ عبدالرحمان پاشا اور کون؟ میں نے بتایا تھا نا کہ یہ گھریلو عورتوں کے افسانے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ استنبول ہے، یہاں قانون کا راج ہے، مافیا کا نہیں۔ اب اس کے بعد میں اس موضوع پہ کچھ نہیں سنوں گی۔''

ہالے اب پلٹ کر جھاگ سے بھری پلیٹ کو پانی سے کھنگال رہی تھی اور وہ.....وہ حیرتوں کے سمندر میں گھری کھڑی تھی۔

اے آر پی.....عبدالرحمان پاشا.....اوہ.....یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟

''او کے او کے!'' وہ بظاہر سر جھکائے ٹماٹر کاٹنے لگی مگر اس کے ذہن میں بہت سے خیال گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ہالے اور جہان دونوں ایک جیسے تھے اور اپنے استنبول کے دفاع کے علاوہ کبھی کچھ نہیں کہیں گے، اسے یقین تھا، مگر کسی کے پاس تو کچھ کہنے کے لیے ہوگا اور اسے اس ''کسی'' کو ڈھونڈنا تھا۔

وہ میز لگا رہی تھی جب جاوید بھائی آ گئے۔

وہ بھی پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور سبانجی میں پڑھاتے بھی تھے۔ بے حد ملنسار، سادہ اور خوش اخلاق سے دیسی مرد تھے۔ پرانے پاکستانی ڈراموں کے شوقین اور پرستار۔ ٹی وی کے ساتھ ریک میں ان کی، تنہائیاں، دھوپ کنارے، آنگن ٹیڑھا، الف نون سمیت بہت سے کلاسک ڈراموں کی ڈی وی ڈیز قطار میں سجی تھیں۔ ان دونوں میاں بیوی کا ایک دوسرے کے لیے طرز تخاطب بہت دلچسپ تھا۔ ''جوید جی'' اور ''انجو جی''۔ اسے بہت ہنسی آئی۔ باقی تینوں کچن میں تھیں، جب حیا پانی رکھنے میز پہ آئی تو جاوید بھائی کو تنہا بیٹھے پایا۔ وہ کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

''جوید.....جاوید بھائی!'' وہ گڑبڑا کر تصحیح کرتی ان کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھی اور محتاط نگاہوں سے کچن کے دروازے کو دیکھا۔

''ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔''

''جی جی۔ پوچھیے۔'' وہ فوراً کتاب رکھ کر سیدھے ہو بیٹھے۔

''استنبول میں ایک انڈین مسلم رہتا ہے عبدالرحمان پاشا نام کا۔ آپ اسے جانتے ہیں؟'' وہ محتاط سی کرسی کے کنارے ٹکی بولتے

Downloaded From http://paksociety.com

ہوئے بار بار کچن کے دروازے کو بھی دیکھ لیتی۔

کون پاشا؟ وہ بیوک اداوالا؟''

اور حیا کو لگا، اسے اس کے جواب ملنے والے ہیں۔

''جی جی وہی۔ وہ خاصا مشہور ہے۔''

''ہاں سنا تو میں نے بھی ہے۔ بیوک ادا میں اس کا کافی ہولڈ ہے۔ وہ مال امپورٹ ایکسپورٹ کرتا ہے۔''

''کیا وہ مافیا کا بندہ ہے؟ اسلحہ اسمگل کرتا ہے۔؟''

''ایک پروفیسر کو مافیا کے بارے میں کیا معلوم ہوگا حیا جی؟'' وہ کھسیاہٹ سے مسکرائے۔

''یعنی کہ وہ واقعی مافیا کا بندہ ہے اور آپ کو معلوم بھی ہے، مگر آپ اعتراف نہیں کرنا چاہ رہے۔'' اس نے اندھیرے میں تیر چلانا چاہا۔

''میں ٹھیک سے کچھ نہیں جانتا۔'' انہوں نے سادگی سے ہتھیار ڈال دیے۔

دفعتاً کچن سے انجم باجی کی چیخ بلند ہوئی۔ وہ جو کرسی کے کنارے پہ ٹکی تھی، گھبرا اٹھی اور کچن کی طرف لپکی۔

''کیا ہوا؟''

انجم باجی سرخ بھبھوکا چہرہ اور آنکھوں میں پانی لیے کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں خالی چمچہ تھا۔

''مرچیں..... اتنی مرچیں حیا!''

''نن نہیں۔ یہ ترکی کی مرچیں پھیکی ہوتی ہیں تو میں نے صرف چار چمچے.....''

''چار چمچے؟'' ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''یہ ترکی کی نہیں، خالص ممبئی کی مرچیں ہیں، میں سارے مسالے وہیں سے لاتی ہوں۔''

''اوہ نہیں!'' اس نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا، جبکہ ڈی جے ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

سردی کا زور پہلے سے ذرا ٹوٹا تھا۔ اس صبح بھی سنہری سی دھوپ ٹاقسم اسکوائر پہ بکھری تھی۔ مجسمہ آزادی کے گرد ہر سو سونے کے ذرات چمک رہے تھے۔ وہ دونوں سست رروی سے سڑک کے کنارے چل رہی تھیں جب ڈی جے نے پوچھا۔

''حیا..... یہ ٹاقسم، نام کتنے مزے کا ہے اس کا مطلب کیا ہوا بھلا؟''

''میں شہری کی میئر ہوں، جو مجھے پتا ہوگا؟''

''نہیں، وہ میری گائیڈ بک میں لکھا تھا کہ ٹاقسم عربی کا لفظ ہے اور اس کے معنی شاید بانٹنے کے ہیں، کیونکہ یہاں سے نہریں نکل کے سارے شہر میں بٹ جاتی تھیں۔ تمہیں عربی آتی ہے۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں۔''

''عربی میں تو ٹاقسم نام کا کوئی لفظ نہیں ہے، اور عربی میں بانٹنے کو تقسیم کہتے ہیں۔'' وہ ایک دم رکی اور بے اختیار سر پہ ہاتھ مارا۔

''اوہ ٹاقسم یعنی تقسیم۔ اگر گوروں کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے پڑھو تو تقسیم، تاقسم یا ٹاقسم بن جاتا ہے۔''

''ٹاقسم.....! واؤ۔'' وہ دونوں اس بات پہ خوب ہنستی ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ وہ شاپنگ کے ارادے سے آج استقلال اسٹریٹ کی طرف آئی تھیں۔

استقلال جدیسی Istiklal Caddesi (اسٹریٹ) ٹاقسم کے قریب سے نکلنے والی ایک لمبی سی گلی تھی۔ وہ اگلی دونوں اطراف سے قدیم آرکیٹیکچر والی اونچی عمارتوں سے گھری تھی۔ گلی بے حد لمبی تھی، وہاں انسانوں کا ایک رش ہمیشہ چلتا دکھائی دے رہا ہوتا۔ بہت سے سامنے جا رہے ہوتے اور بہت سے آپ کی طرف آ رہے ہوتے۔ ہر شخص اپنی دھن میں تیز تیز قدم اٹھا رہا ہوتا۔

گلی کے درمیان ایک پٹری بنی تھی، جس پہ ایک تاریخی سرخ رنگ کا چھوٹا سا ٹرام چلتا تھا۔ وہ پیدل انسان کی رفتار سے دگنی رفتار سے چلتا اور گلی کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچا دیتا۔ اس گلی کو ختم کرنے کے لیے بھی گھنٹہ تو چاہیے تھا۔

وہاں دونوں اطراف میں دکانوں کے چمکتے شوشے اور اوپر قمقمے لگے تھے۔ بازار، نائٹ کلبز، ریسٹورنٹس، کافی شاپس، ڈیزائنر وئیر،

Downloaded From http://paksociety.com

غرض ہر برانڈ کی دکانیں وہاں موجود تھیں۔ چند روز پہلے وہ ادھر آئیں تو صرف ونڈو شاپنگ میں ہی ڈھائی گھنٹے گزر گئے، اور تب بھی وہ استقلال جدیسی کے درمیان پہنچی تھیں، سو تھک کر واپس ہولیں۔

''حیا! تم نے دیکھا، استقلال اسٹریٹ جیسے ماڈرن علاقے میں بھی ہر تھوڑی دور بعد پرئیر ہال ضرور ہے۔''

''بڑے نیک ہیں بھئی ترک!'' وہ قدرے طنزیہ ہنسی اور پھر متلاشی نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ استقلال اسٹریٹ آنے کا اصل مقصد جہان سے ملنا تھا، اور وہ صرف اس لیے یہاں آئی تھی کہ برگر کنگ جائے اور ''میں یہاں سے گزر رہی تھی تو سوچا۔'' کہہ کر اس سے ملاقات کا بہانہ ڈھونڈ لے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے چل رہی تھیں۔ وہاں ہوا تیز تھی اور حیا کے کھلے بال اڑ اڑ کر اس کے چہرے پہ آ رہے تھے۔ وہ بار بار کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکالتی اور انہیں کانوں کے پیچھے اڑستی۔ تب ہی اس نے برگر کنگ کا بورڈ دیکھا تو ڈی جے کو بتائے بنا ریسٹورنٹ کے دروازے تک آئی اور اس سے پہلے کہ وہ دروازے پہ ہاتھ رکھتی، دروازہ اندر سے کھلا اور کوئی باہر نکلا۔ وہ بے اختیار ایک طرف ہوئی۔ وہ جہان تھا، وہ اسے پہچان گئی تھی مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔

وہ اس کے سامنے سے آتا ساتھ سے نکل کر گزر گیا تو وہ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ ڈی جی نے اسے رکتے نہیں دیکھا تھا، وہ اپنی دھن میں دکانوں کو دیکھتی چلتی گئی اور لوگوں کے ریلے میں آگے بہہ گئی۔

حیا یونہی اپنے گھٹنوں تک آتے سیاہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ ہوا کے رخ پہ کھڑی تھی، تو اس کے بال پیچھے کی طرف اڑنے لگے تھے۔

جہان اس سے دور جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دراز قد لڑکی بھی تھی۔ کوٹ اسکرٹ میں ملبوس اپنے سرخ بالوں کو اونچے جوڑے میں باندھے، وہ لڑکی ناگواری سے ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہی تھی۔

جہان نے اسے نہیں دیکھا، اسے یقین تھا۔ وہ دوڑ کر ان کے پیچھے گئی۔ وہ دونوں بہت تیز چل رہے تھے۔ ان کی رفتار سے ملنے کی سعی میں وہ ایشیائی لڑکی ہانپنے لگی تھی، بمشکل وہ ان کے عین عقب میں پہنچ پائی۔

لڑکی بلند آواز میں نفی میں سر ہلاتی کچھ کہہ رہی تھی۔ جہاں بھی خاصا جھنجلایا ہوا جواباً بحث کر رہا تھا۔ وہ ترک بول رہے تھے، یا کوئی دوسری زبان، وہ فیصلہ نہ کر پائی۔ شاید ترک نہیں تھی۔ وہ بہت لمبے لمبے فقرے بول رہے تھے اور جتنی ترک حیا نے اب تک سنی تھی، وہ ایسی نہیں تھی۔ ترک میں فقرے چھوٹے ہوتے تھے۔ بس فعل استعمال کیا اور اس کے آگے پیچھے سابقے لاحقے لگا لگا کر ایک بڑا لفظ بول دیا جو معنی میں کئی فقروں کے برابر ہوتا تھا۔

''جہان..... جہان.....'' وہ شور اور رش میں بمشکل اتنی آواز سے اسے پکار پائی کہ وہ سن سکے۔ اس کی تیسری پکار پہ وہ رکا۔ لڑکی بھی ساتھ ہی رکی۔ وہ دونوں ایک ساتھ پلٹے۔

''جہان.....'' اس کے ہونٹ جہان کو دیکھ کر ایک معصوم مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے تھے۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے سنجیدہ، اکھڑے اکھڑے انداز میں ابرو اٹھائے۔ اس کے چہرے پر اتنی سختی اور ناگواری تھی کہ حیا کے مسکراہٹ میں کھلتے لب بند ہو گئے۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

''میں..... حیا.....'' وہ بے یقینی سے بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے شک گزرا کہ جہان نے اسے نہیں پہچانا۔

''ہاں تو پھر؟'' وہ بھنویں سکیڑے بولا۔

وہ لڑکی کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی ناپسندیدگی سے حیا کو دیکھ رہی تھی۔

''پھر؟'' حیا نے بے یقینی سے زیر لب دہرایا۔ وہ ششدر سی جہان کو دیکھ رہی تھی۔

''کوئی کام ہے؟'' وہ بمشکل ضبط کر کے بولا۔

حیا نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس میں بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''تو میری شکل کیا دیکھ رہی ہو؟ جاؤ!'' وہ شانے جھٹک کر پلٹا۔ لڑکی بھی ایک اچٹتی نگاہ اس پہ ڈال کر مڑ گئی۔

استقلال اسٹریٹ پہ لوگوں کا ریلا آگے بڑھتا گیا۔ جہان سکندر اور اس لڑکی کے پیچھے بہت سے لوگ اس سمت جا رہے تھے۔ کتنی ہی دیر وہ ساکت کھڑی بہت سے سروں کی پشت کے درمیان اور ان دونوں کو دور جاتے دیکھتی رہی۔ اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔

ان دونوں کے سراپے ہجوم میں گم ہو رہے تھے۔ وہ دو نقطے بنتے جا رہے تھے۔ مدھم..... دور..... بہت دور.....

''حیا..... حیا.....'' ڈی جے کہیں دور اتھل پتھل سی سانسوں کے درمیان چلا رہی تھی، مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ اسی طرح بھیڑ کے درمیان پتھر ہوئی کھڑی اسی سمت دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت دور جا چکے تھے۔ ساکت پتلیوں میں اب درد ہونے لگا تھا۔ بالآخر بوجھ سے اس کی پلکیں گریں اور جھک کر اٹھیں تو منظر بھیگ چکا تھا۔ اس نے پھر سے پلکیں جھپکائیں تو بھیگی آنکھوں سے قطرے رخساروں پہ گرنے لگے۔ سامنے کا منظر قدرے واضح ہوا مگر.....

لمحے بھر کی تاخیر سے اس کا تعاقب ہار گیا تھا۔ وہ دونوں بھیڑ میں گم ہو گئے تھے۔ وہ اپنا منظر کھو چکی تھی۔

آنسو ٹپ ٹپ اس کی ٹھوڑی سے نیچے گردن پہ لڑھکتے گئے۔

''حیا..... کدھر رہ گئیں تھیں تم؟'' ڈی جے نے نڈھال سی آ کر اس کا شانہ جھنجھوڑا۔ اس کا سانس پھول چکا تھا اور وہ ہانپ رہی تھی۔

''میں کہیں بہت پیچھے رہ گئی ہوں ڈی جے!'' وہ اسی سمت دیکھتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے ایک ہاتھ سے اوون کا ڈھکن کھولا دوسرے ہاتھ سے گرم ٹرے باہر نکالی۔

ٹرے پہ بھوری، خستہ گرما گرم جنجر بریڈ تیار پڑی تھی۔ ادرک کی ہلکی سی خوشبو سارے کچن میں پھیلی تھی۔

وہ دوسرے ہاتھ سے جنجر بریڈ کو چیک کرتی سیدھی ہوئی اور ٹرے لا کر کاؤنٹر پہ رکھی۔ وہ سفید ڈھیلی سی آدھے بازوؤں والی ٹی شرٹ اور کھلے سیاہ ٹراؤزر میں ملبوس تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا گردن پہ پڑا تھا اور الجھی الجھی سی لٹیں گالوں کو چھو رہی تھیں۔ ٹی شرٹ کے اوپر پہنے ایپرن پہ جگہ جگہ چاکلیٹ اور کریم کے دھبے لگے تھے۔

معتصم کاؤنٹر کے ایک طرف کھڑا پیالے میں انڈے کی سفیدی پھینٹ رہا تھا۔ ڈی جے دوسری طرف کھڑی سجاوٹ کے لیے لی گئیں بنٹی bunties، جیلی اور رنگ برنگے بینز beans کے پیکٹ کھول کر پلیٹ میں انڈیل رہی تھی۔ ہر رنگ کے بینز، کینڈیز اور سرخ جیلی بینز کا ڈھیر لگ چکا تھا۔

آج حسین کی سالگرہ تھی۔ روایتی طریقے سے کیک بنانے کی بجائے حیا اس کے لیے جنجر بریڈ ہاؤس تیار کر رہی تھی۔ ایک فٹ اونچا جنجر بریڈ سے بنا گھر جو چاکلیٹ، کریم اور رنگ برنگی جیلیز سے سجانا تھا۔ وہ پچھلے چار گھنٹے سے لگی ہوئی تھی، اور اب بالآخر اس کی جنجر بریڈ کے چھ کے چھ ٹکڑے بیک ہو چکے تھے۔ چار دیواروں کے لیے اور دو مخروطی چھت کے لیے۔

''آؤ! اب اس کو جوڑتے ہیں۔'' اس نے کہا تو معتصم جو آئسنگ بنا چکا تھا، پیالہ رکھ کر اس کی طرف آیا۔ ڈی جے اب ایک دیوار اٹھا کر اس میں سے مستطیل دروازہ کاٹ رہی تھی۔

حیا اور معتصم نے احتیاط سے دو دیواریں متصل کھڑی کیں اور ان کے جوائنٹ پہ، بطور گم، مخصوص سیرپ لیپ دیا۔ پھر بہت آہستہ سے دونوں نے اپنے ہاتھ ہٹائے۔

دیواریں سیدھی کھڑی رہیں۔ سیرپ نے ان کو چپکا دیا تھا۔

''زبردست!'' وہ پرجوش سی ہو گئی۔ اس کا گھر بن رہا تھا، یہ خیال ہی اس کی ساری تھکاوٹ بھگا کر لے گیا۔

وہ دونوں اب اگلی دیوار جوڑنے لگے۔ حیا کے ماتھے سے جھولتی لٹ بار بار آنکھوں کے سامنے آتی، وہ بار بار ہاتھ سے اسے پیچھے ہٹاتی۔ پوروں پہ لگے چاکلیٹ سیرپ کے دھبے اس کے رخسار پہ لگ گئے مگر پروا کسے تھی۔

چار دیواری بن گئی تھی۔ اب انہوں نے دو مستطیل ٹکڑوں کو اوپر الٹے ''وی'' کی طرح رکھا اور جوڑ پر سیرپ لگایا۔ کافی دیر بعد

Downloaded From http://paksociety.com

انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے۔

چھت برقرار رہی۔ سیرپ سوکھنے لگا تھا۔ چھت مزید مضبوط ہوتی گئی۔

''حیا! تم گریٹ ہو۔'' وہ بھورا سا گھر بنا رنگ یا آرائش کے بھی اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ معتصم بے اختیار ستائش سے بولا۔

''مجھے پتا ہے۔'' وہ دھیرے سے ہنسی۔

وہ تینوں اب الابلا کینڈیز، بٹنیز، اور جیلیز سے دیواروں کی سجاوٹ کرنے لگے۔ وہ ہر ڈیکوریشن کے ٹکڑے کے پیچھے ذرا سا سیرپ لگا کر اسے دیوار سے چپکا دیتے۔ بھورے گھر پہ جگہ جگہ سرخ سبز اور نیلے بٹن کی مانند آنکھیں ابھرنے لگی تھیں۔ ذرا سی دیر میں گھر سج گیا تھا۔ ڈی جے نے سفید کریم سے کھڑکیوں کی چوکور چوکھٹیں بنائیں اور اندر نیلی کریم کا رنگ بھر دیا۔

''اب استنبول کی برف باری کا مزا اپنے گھر کو بھی چکھائیں۔''

حیا آئسنگ شوگر اور چھلنی لے آئی۔ اس نے سفید سوکھے آٹے کی شکل کی آئسنگ شوگر چھلنی میں ڈالی اور گھر کے اوپر کر کے چھلنی آہستہ آہستہ ہلانے لگی۔ چھلنی کے سوراخوں سے سفید ذرے نیچے گرنے لگے۔ بھورے گھر پہ برف باری ہونے لگی اور ایک ہلکی سی سفید تہہ چاکلیٹ سے ڈھکے گھر پہ بیٹھنے لگی۔

حیا کا ''جنجر بریڈ ہاؤس'' Ginger Bread House تیار تھا۔

اس نے احتیاط سے ٹرے اٹھائی۔ گھر برقرار رہا۔ وہ اس کی ساڑھے چار گھنٹوں کی محنت کا ثمر تھا۔ کسی سالگرہ کی تقریب سے پہلے حیا سلیمان نک سک سے تیار نہ ہو، حیرت انگیز بات تھی، مگر آج اس کی تیاری وہ گھر ہی تھا۔ اسے اپنے رف حلیے ایپرن اور چہرے پہ لگے دھبوں کی پروا نہیں تھی۔ اس کی ساری توجہ ٹرے میں رکھے جنجر بریڈ ہاؤس پہ تھی۔

وہ ڈی جے اور معتصم کے پیچھے چلتی کامن روم میں داخل ہوئی۔

وہاں فاصلے فاصلے پہ گول میزوں کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ درمیانی میز پہ گفٹس اور حسین کا لایا ہوا کیک رکھا تھا۔ بارہ ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس آ چکے تھے۔ وہ کوئی سرپرائز پارٹی نہ تھی۔ سو حسین بڑی میز کے پیچھے کھڑا ہنستا ہوا ٹالی کا گفٹ لینے کی کوشش کر رہا تھا، جسے ٹالی بار بار پیچھے کر رہی تھی۔

''سرپرائز!'' حیا نے پکارا تو سب نے ادھر دیکھا۔

معتصم اور ڈی جے کے پیچھے وہ چوکھٹ پہ کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں اٹھائی ٹرے میں وہ فیری ٹیل ہاؤس رکھا تھا، اور حیا کو پتا تھا، وہ ہنسل اور گریٹل کے جنجر بریڈ ہاؤس سے زیادہ خوب صورت تھا۔

''واؤ!'' بے اختیار بہت سے لبوں سے ستائش نکلی۔

''حیا..... تم نے میرے لیے اتنا کیا؟'' حسین بے حد متاثر ہوا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے۔

وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ دروازہ آدھا کھلا تھا اور سردی اندر آ رہی تھی۔

''آؤ حیا! اسے میز پہ لے آؤ۔'' معتصم بڑی میز پہ گفٹس، کیک اور دوسری ڈشز کے درمیان چیزیں ہٹا کر جگہ بنانے لگا۔

سردی کی لہر دروازے سے اندر گھس رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ٹرے پکڑے، دایاں ہاتھ بڑھا کر دروازہ دھکیلنا چاہا۔ وہ بدقسمتی کا لمحہ تھا۔

دروازے کے ناب کو اس نے چھوا ہی تھا کہ دروازہ زور سے پورا کھلا اور کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ کھلتے دروازے نے اس کا بڑھا ہاتھ پیچھے دھکیلا اور وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی اور تب ہی اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑی ٹرے ٹیڑھی ہوئی۔

''اوہ..... نو!'' بہت سی دلدوز چیخیں بلند ہوئیں اور ان میں سب سے دل خراش اس کی اپنی چیخ تھی۔

الٹی ہوئی ٹرے اس کے ہاتھ میں رہ گئی۔ ہلکی سی ٹھڈ کی آواز کے ساتھ جنجر بریڈ ہاؤس زمین پہ جا گرا۔ ہر دیوار ٹکڑوں میں بٹ

Downloaded From http://paksociety.com

گئی۔ بنٹیز اور جیلز اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔

فرش پہ بریڈ، چاکلیٹ، کریم اور رنگ برنگی ہنٹیوں کا ایک ملبہ پڑا تھا اور وہ سب سناٹے کے عالم میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھے۔

کتنے ہی پل وہ شاک کے عالم میں اس ملبے کو دیکھے گئی، پھر اس کے پار نظر آتے جوگرز کو دیکھا اور اپنی ششدر نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

وہ جہان سکندر تھا، اور اتنی ہی بے یقینی و شاک سے اس ملبے کو دیکھ رہا تھا۔ حیا کے دیکھنے پہ بے اختیار اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''حیا.....آئی ایم سوری۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم سامنے.....اوہ گاڈ.....'' تاسف، ملال کے مارے وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

وہ جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، ایک دم لب بھینچ گئی۔ اس کی آنکھوں میں تحیر کی جگہ غصے نے لے لی۔ خون کی سرخ لکیریں اس کی آنکھوں میں اترنے لگیں۔ وہ ایک دم جھکی، بریڈ کا ٹوٹا، کریم میں لتھڑا ٹکڑا اٹھایا اور سیدھے ہوتے ہوئے پوری قوت سے جہان کے منہ پہ دے مارا۔

وہ اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کریم میں لتھڑا ٹکڑا اس کی گردن پہ لگا تو وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹا۔ ٹکڑا اس کی شرٹ پر سے پھسلتا نیچے قدموں میں جا گرا۔

اس نے گردن پہ لگی کریم کو ہاتھ سے چھوا اور پھر انگلیوں کے پوروں کو بے یقینی سے دیکھا۔

''حیا! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔''

وہ سرخ آنکھوں سے لب بھینچے جہان کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے لب اتنی سختی سے بھینچ رکھے تھے کہ گردن کی رگیں ابھرنے لگی تھیں اور کنپٹی پہ نیلی لکیر نظر آ رہی تھی۔ وہ بالکل چپ کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

''حیا.....اٹس اوکے.....'' حسین پریشانی سے آگے بڑھا۔ ڈی جے اور معتصم اس کے ساتھ تھے۔

''حیا! میں نے واقعی نہیں دیکھا تھا کہ تم.....''

''شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ!'' وہ اتنی زور سے چلائی کہ آگے بڑھتا حسین وہیں رک گیا۔

''چلے جاؤ تم یہاں سے۔ کہیں بھی چلے جاؤ مگر میری زندگی سے نکل جاؤ۔ تم میرے لیے عذاب اور دکھ کے علاوہ کبھی کچھ نہیں لائے۔ نکل جاؤ اس کمرے سے۔'' اس نے اردو میں چلا کر کہا تھا۔ بارہ ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس میں سے اردو کوئی نہیں سمجھتا تھا سوائے ڈی جے کے، مگر وہ تمام متاسف کھڑے طلبا سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''حیا.....!'' جہان کی آنکھوں میں دکھ ابھرا۔

''میرا نام بھی مت لو۔'' اس نے گردن کے گرد بندھے ایپرن کی ڈوری ہاتھ سے نوچی، ایپرن ایک طرف اتار پھینکا اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

سیڑھیوں کے اوپر لگا بلب اس کے آتے ہی جل اٹھا تھا۔ وہ تیزی سے چکردار سیڑھیاں اترنے لگی۔ آنسو اس کے چہرے پہ بہہ رہے تھے۔ آخری سیڑھی پھلانگ کر وہ اتری اور برف سے ڈھکی گھاس پہ تیز تیز چلنے لگی۔

باہر تیز سرد ہوا تھی۔ ہلکا ہلکا سا کہر ہر سو چھایا تھا۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے، سر جھکائے روتی ہوئی چلتی جا رہی تھی اور اسے پتا تھا کہ وہ ایک جنجر بریڈ ہاؤس کے لیے نہیں رو رہی۔

پہاڑی کی ڈھلان اتر کر سامنے سبانجی کی مصنوعی جھیل تھی۔ جھیل اب خاصی پگھل چکی تھی، پھر بھی فاصلے فاصلے پہ بڑے بڑے برف کے ٹکڑے تیرتے نظر آ رہے تھے۔

وہ جھیل کے کنارے رک گئی۔ تیز دوڑنے سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ پتلی ٹی شرٹ میں سردی لگنے لگی تھی۔ ڈھیلا جوڑا آدھا کھل کر کمر پہ گر گیا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ تھکی ماندی سی گھاس پہ بیٹھ گئی اور سلیپرز سے پاؤں نکال کر ٹھنڈے پانی میں ڈال دیے۔ وہ خود اذیتی کی انتہا تھی۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر سر نیچے جھکا کر وہ ایک دم سے بہت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مصنوعی جھیل کا پانی رات کے اندھیرے میں چاند کی روشنی سے چمک رہا تھا، گویا چاندی کا ایک بڑا سا ورق سیاہ پانی پہ تیر رہا ہو۔ دور جنگل سے پرندوں کی آواز وقفے وقفے سے سنائی دیتی تھی۔ کئی لمحے ریت کی طرح پھسل کر جھیل کی چاندی میں گم ہو گئے تو اس نے قدموں کی چاپ سنی۔ کوئی اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا۔

اس نے بھیگا چہرہ اٹھا کر دیکھا۔

وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لب کاٹتا سنجیدہ سا اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

''سوری حیا! میں تو معذرت کرنے آیا تھا کہ اس روز کام کی پریشانی میں تم سے مس بی ہیو کر گیا مگر.....'' وہ چپ چاپ بے آواز روتی اسے دیکھے گئی۔

''آئی ایم رئیلی سوری..... میں نے تمہارا اتنا نقصان کر دیا۔ میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم دروازے کے پار کھڑی ہو۔ میں نے تمہارا بڑھا ہوا ہاتھ نہیں دیکھا تھا۔ اپنی دانست میں میں بہت تیز چل رہا تھا اور انجانے میں تمہارا ہاتھ دھکیل دیا۔ تمہاری ساری ریاضت ضائع کر دی۔''

شاید وہ صرف جنجر بریڈ ہاؤس کی بات کر رہا تھا، یا شاید ان کے تعلق کی۔ وہ ابھی کچھ بھی صحیح یا غلط سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

''مگر میں مداوا کر دوں گا۔''

''مداوا؟'' اس کے بہتے آنسو پل بھر کو تھمے۔

''ہاں! میں تمہیں بالکل ایسا جنجر بریڈ ہاؤس بنا کر لا دوں گا۔''

اور اس کا دل چاہا، وہ پھوٹ پھوٹ کر پھر سے رو دے۔

''مائی فٹ جہان سکندر!'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور گیلے پیر پانی سے نکال کر سلیپرز میں ڈالے۔ ''میری زندگی میں جنجر بریڈ ہاؤس سے بڑے مسائل ہیں۔''

وہ تیزی سے پلٹی تو ڈھیلے جوڑے کا آخری بل بھی کھل گیا اور سارے بل آبشار کی طرح کمر پہ سیدھے گرتے گئے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اوپر ڈھلان پہ چڑھنے لگی۔

جہان لب کاٹتا اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

وہ تکیے سے ٹیک لگائے، پاؤں لمبے کیے، کمبل میں لیٹی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے موبائل تھامے وہ گیم کھیل رہی تھی۔

ساتھ والے بینک پہ ٹالی منہ پہ تکیہ رکھے سو رہی تھی۔ چیری اسٹڈی روم میں تھی۔ خدیجہ نیچے اپنے بینک کی کرسی پر بیٹھے میز پہ رکھے لیپ ٹاپ کی کنجیوں پہ انگلیاں چلا رہی تھی۔

''حسین کا برتھ ڈے جنجر بریڈ ہاؤس ٹوٹنے سے خراب نہیں ہوا، اس کا برتھ ڈے تمہارے اوور ری ایکشن سے خراب ہوا ہے۔ تم نے اپنے کزن کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس کا قصور نہیں تھا۔ اس نے تمہیں واقعی نہیں دیکھا تھا۔ اگر تم تھوڑا سا ضبط کر لیتیں اور کھلے دل سے اپنے کزن کو ویلکم کرتیں تو ہم اسی ٹوٹے جنجر بریڈ ہاؤس کو یادگار بنا لیتے۔ اسے ایک دوسرے کے چہروں پہ ملتے، اس کے ساتھ تصویریں کھنچواتے اور کیا کچھ نہ کرتے۔ چیزیں وقتی ہوتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں۔ رویے دائمی ہوتے ہیں۔ صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور تم نے آج ایک ٹوٹے ہوئے جنجر بریڈ ہاؤس سے ہار مان لی۔''

لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ نگاہیں جمائے ڈی جے تیزی سے کچھ ٹائپ کرتی کہہ رہی تھی۔

حیا اسی طرح ببل چباتی موبائل کے بٹن دباتی رہی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''تمہارے جانے کے بعد سب اتنے شرمندہ تھے کہ مت پوچھو کس طرح میں نے بمشکل سب کو منا کر حسین سے کیک کٹوایا۔''

دفعتاً حیا کا موبائل بجا تو ڈی جے خاموش ہوگئی۔

حیا نے لب بھینچے اسکرین کو دیکھا۔ وہاں جہان کا موبائل نمبر لکھا آ رہا تھا۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ کال مسترد نہ کر سکی۔

''کیا ہے؟'' اس نے فون کان سے لگا کر بہت آہستہ سے کہا۔

''ابھی تک خفا ہو؟'' وہ ایک دم اتنی اپنائیت سے پوچھنے لگا کہ وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹکنے لگا۔

''خفا ہونے کا اختیار اپنوں کو ہوتا ہے، مجھے یہ اختیار کبھی کسی نے دیا ہی نہیں۔''

''اتنے لمبے مکالمے مت بولو۔ مجھ سے اب سردی میں نہیں کھڑا ہوا جا رہا۔ فوراً باہر آؤ۔''

وہ ایک دم آٹھ بیٹھی۔

''تم کہاں ہو؟'' آنسو غائب ہوگئے۔

''تمہارے ڈورم کے باہر بالکونی میں کھڑا ہوں۔''

''میرے اللہ! تم اب تک یہیں ہو۔'' وہ فون پھینک کر اٹھی، تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتری اور دوڑ کر دروازہ کھولا۔

وہ بالکونی کی ریلنگ سے ٹیک لگائے، سینے پہ بازو لپیٹے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''اُف جہان!'' حیا دروازہ بند کر کے اس تک آئی۔ اس نے ٹی شرٹ کے اوپر ایک کھلا سا سیاہ سوئیٹر پہن لیا تھا اور بالوں کا پھر سے ڈھیلا جوڑا باندھ لیا تھا۔ آنکھیں ہنوز متورم تھیں۔

''کب سے کھڑے ہو ادھر؟'' وہ فکرمندی سے کہتی اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔

''جب سے تم نے بتایا تھا کہ تمہاری زندگی میں جنجر بریڈ ہاؤس سے بڑے مسائل ہیں۔ میں نے سوچا ان کو حل کیے بغیر نہ جاؤں۔ چائے تو نہیں پلاؤ گی؟''

وہ کچھ ایسے ڈرتے ڈرتے بولا کہ وہ ساری تلخی بھلا کر ہنس دی۔

''آؤ! تمہیں ایپل ٹی پلاتی ہوں۔ تمہارے ترکی کی سوغات ہے ورنہ پاکستان میں تو ہم نے کبھی سیب والی چائے نہیں پی تھی۔'' وہ دونوں ساتھ ساتھ اندرونی سیڑھیاں اترنے لگے۔

''اور ہم یہی پی کر بڑے ہوئے ہیں۔ کتنا فرق ہے نا ہم میں۔'' وہ شاید یونہی بولا تھا۔ مگر کچن کا دروازہ کھولتی حیا نے مڑ کر اسے دیکھا ضرور تھا۔

''ہاں! بہت فرق ہے ہم میں۔'' اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ اس نے ہار مان لی تھی، اور انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود..... اف یہ ڈی جے کے سنہری اقوال بھی نا.....!

وہ سر جھٹک کر کچن میں داخل ہوئی۔

''ایپل ٹی تو ختم ہے، اب سادہ چائے پیو۔'' اس نے کیبنٹ کھول کر چند ڈبے آگے پیچھے کیے اور پھر مایوسی سے بتایا۔

''دودھ نکالو، میں چائے کا پانی چڑھاتا ہوں۔'' وہ آگے بڑھا، دیگچی ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالی، اس میں پانی اور پتی ڈال کر چولہے پہ چڑھائی اور چولہا جلا دیا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ فوراً سے کام کر دینے والا۔ اس کے ہاتھ بہت سخت اور مضبوط سے لگتے تھے۔ کام کے، محنت اور مشقت کے عادی۔ وہ استنبول کی ورکنگ کلاس کا نمائندہ تھا۔

اب وہ سلیب پہ رکھے برتن جمع کر کے سنک میں ڈال رہا تھا۔

''رہنے دو جہان! میں کر لوں گی۔''

''تم نے کرنے ہوتے تو اب تک کر چکی ہوتیں۔ اب اس سے پہلے کہ پانی سوکھ جائے، دودھ ڈال دو، بلکہ مجھے دو۔'' اس نے پلیٹ دھوتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے دودھ کا ڈبا اٹھایا اور خود ہی دیگچی میں انڈیل دیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ کھلے نل تلے پلیٹ کھنگال رہا تھا۔ جینز اور جوگرز پہنے، سویٹر کی آستینیں کہنیوں تک موڑے، وہ ٹاقسم اسکوائر کی میٹرو میں موجود اس ایگزیکٹو سے قطعاً مختلف لگ رہا تھا، جس سے چند ہفتے قبل حیا ملی تھی۔

''حیا.....حیا.....'' ڈی جے حواس باختہ سی چلاتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی۔

''تمہارا فون مر جائے گا بیچ بیچ کر۔ اوہ، السلام علیکم۔'' جہان کو دیکھ کر وہ گڑبڑا گئی۔

''وعلیکم السلام!'' جہان نے پلٹ کر اسے جواب دیا۔

''تمہارا فون!'' وہ حیا کو موبائل تھما کر واپس مڑ گئی۔

حیا نے موبائل پہ دیکھا۔ پانچ مسڈ کالز۔ ترکی کا کوئی غیر شناسا سا نمبر۔

اسی وقت اس کا موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے اسکرین کو دیکھا۔ وہی ترکی کا نمبر۔ اس نے کال وصول کر لی۔

''ہیلو؟'' جب وہ بولی تو اس کی آواز میں تذبذب تھا۔

''حیا سلیمان؟ بندے کو عبدالرحمان پاشا کہتے ہیں۔ اب تک تو آپ مجھے جان گئی ہوں گی۔'' وہ شستہ اردو میں کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز میں ممبئی کے باسیوں کا تیکھا پن تھا اور لہجہ بہت ٹھنڈا۔

حیا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے پلکیں اٹھا کر جہان کو دیکھا۔ وہ بہت غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔

''رانگ نمبر!'' اس نے کہہ کر فون رکھنا چاہا مگر وہ آگے بڑھا اور موبائل اس کے ہاتھ میں لے لیا۔

''کون؟'' وہ فون کان سے لگا کر بولا تو اس کے چہرے پہ بے پناہ سختی تھی۔

''کون؟'' اس نے دہرایا۔ شاید دوسری جانب سے کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔ جہان لب بھینچے چند لمحے انتظار کرتا رہا، پھر اس نے فون کان سے ہٹایا۔

''بند کر دیا ہے۔'' اس نے موبائل حیا کی طرف بڑھاتے ہوئے جانچتی، مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''کون تھا؟''

''تمہیں نہیں بتایا تو مجھے کیوں بتاتا۔ شاید رانگ نمبر تھا۔'' وہ اب سنبھل چکی تھی۔

''ہوں! تمہیں کوئی تنگ تو نہیں کر رہا؟'' پھر جیسے وہ چونکا۔ ''وہ پھول.....''

''پتا نہیں کون ہے۔'' اس نے شانے اچکا دیے۔ ''جانے دو۔''

''ہر اس منٹ ایک جرم ہے، ہم اس کے لیے پولیس کے پاس جا سکتے ہیں۔'' وہ کچھ سوچ کر بولا۔

کسی مسئلے کا حل جہاں سکندر کے پاس نہ ہو، یہ ممکن تھا بھلا؟

''جانے دو۔ میں اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ خود ہی تھک کر رک جائے گا۔'' گو کہ وہ مطمئن نہیں ہوا تھا، مگر سر ہلا کر پلٹ گیا اور نل پھر سے کھول دیا۔

حیا نے موبائل کو سائلنٹ پہ لگا کر جیب میں ڈال دیا۔ وہ اس نازک رشتے میں مزید بدگمانی کی متحمل نہ تھی۔

''چولہا کیوں بند کر دیا؟ ابھی پکنے دیتیں، میں زیادہ کڑھی ہوئی چائے پینے کا عادی ہوں۔'' اسی پل چولہا بند ہوا تو وہ چونکا۔

''میں نے نہیں بند کیا، یہ آٹومیٹک ہیں، ہر پندرہ منٹ بعد دس منٹ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ سو دس منٹ بعد خود ہی جل اٹھے گا۔''

''یہ اچھا کام ہے!'' اسے جیسے کوفت ہوئی، پھر آخری برتن کھنگالتے ہوئے وہ بار بار چولہے کو سوچتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ جب برتن ختم ہو گئے تو ہاتھ دھو کر چولہے کی طرف آیا۔

''برتن دھل گئے ہمارے، اب تمہاری زندگی کے اگلے مسئلے کو حل کرتے ہیں۔ اس کے بعد کون سا مسئلہ ہے، وہ بھی بتاؤ۔'' وہ چولہے کو پھر سے جلانے کی کوشش کرنے لگا۔

''میری زندگی کے مسئلے ٹوٹے کیبنٹ یا ٹھنڈے چولہے کی طرح نہیں ہیں، جو تم حل کر لو۔''

''اچھی بھلی زندگی ہے تمہاری، کیا مسئلہ ہے تمہیں، سوائے اس بے کار چولہے کے، کوئی تو حل ہو گا اس کا بھی۔'' وہ نچلا لب دبائے

Downloaded From http://paksociety.com

جھک کر سوئچ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔

''اس کا کوئی حل نہیں ہے۔''

''یہ ناممکن ہے کہ کسی مسئلے کا کوئی حل نہ ہو۔ ٹھہرو! میں کچھ کرتا ہوں۔'' وہ پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا اور جھک کر نیچے سے چولہے کا جائزہ لینے لگا۔

''جہان! رہنے دو!''

''میری کار سے میرا ٹول بکس لے آؤ۔ ڈیش بورڈ میں پڑا ہوگا۔ تب تک میں اسے دیکھتا ہوں۔'' وہ جینز کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر اس کی طرف بڑھائے، گردن نیچے جھکائے چولہے کے اردگرد جیسے کچھ تلاش کر رہا تھا۔

وہ جہان ہی کیا، جو کچھ کرنے کی ٹھان لے تو پھر کسی کی نہ سنے۔ اسے میٹرو میں اپنے جوتے کے تسمے کھولتا جہان یاد آیا تھا۔ اس نے مسکراہٹ دبا کر ہاتھ بڑھا کر چابی پکڑی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

جہان کی چھوٹی سفید سی کار ہاسٹل کی سڑھیوں کے آخری زینے کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ اس میں سے ٹول بکس نکالتے ہوئے حیا نے بے اختیار سوچا تھا کہ وہ اتنا امیر نہیں ہے جتنا وہ سمجھتی تھی، یا پھر شاید یورپ میں رہنے والے رشتہ داروں کے بارے میں عمومی تصور یہی ہوتا ہے کہ وہ خاصے دولت مند ہوں گے، جبکہ جہان اور سبین پھپھو اس کے برعکس محنت کش، ورکنگ کلاس کے افراد تھے۔

وہ واپس آئی تو وہ چھری سے ہی شروع ہو چکا تھا اور پائپ، ساکٹ اور پتا نہیں کیا کیا کھولے بیٹھا تھا۔

چند منٹ وہ خاموشی سے سلیب کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی اسے کام کرتے دیکھتی رہی۔ وہ دائیں گھٹنے اور بائیں پنجے کے بل زمین پر بیٹھا پائپ کے دہانے پہ پیچ کس سے کچھ کھول رہا تھا۔ ٹول بکس اس کے پاؤں کے ساتھ فرش پہ کھلا پڑا تھا۔

چند صبر آزما پل بیتے اور پھر وہ فاتحانہ انداز میں ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا۔

''یہ چوتھا چولہا جو کونے میں ہے، یہ فکس کر دیا ہے، اب یہ خود سے نہیں بجھے گا۔'' اس نے کہنے کے ساتھ ہی عملی مظاہرے کے طور پہ چوتھے چولہے کو جلا دیا اور پھر چاہے کی کیتلی اسی پہ رکھ دی۔

''یہ جو تم نے حرکت کی ہے نا جہان سکندر! یہ غیر قانونی ہے۔ اگر کسی کو پتا چل گیا تو.....؟''

''سبانجی میں اسموکنگ بھی غیر قانونی ہے، مگر اسٹوڈنٹس کرتے ہیں نا؟ ڈرنکنگ بھی غیر قانونی ہے، اسٹوڈنٹس وہ بھی کرتے ہیں اور کمروں میں چھوٹے چولہے اور مائیکرو ویو رکھنا بھی غیر قانونی ہے، وہ بھی رکھتے ہیں نا؟ سو تم بھی اپنی مرضی کرو!'' وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا بڑی لاپرواہی سے بولا تو وہ ہنس دی۔ اسے اپنا سروے فارم یاد آ گیا تھا۔

''تم سبانجی سے پڑھے ہو جو اتنی معلومات ہیں؟''

''سبانجی سے پڑھا ہوتا تو ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ نہ چلا رہا ہوتا۔ ہم تو عام سی سرکاری یونیورسٹیز میں پڑھنے والے مڈل کلاس لوگ ہیں مادام!'' وہ جب بھی اپنی کم آمدن یا کام کا ذکر کرتا، اس کے بظاہر مسکراتے لہجے کے پیچھے ایک تلخ اداسی سی ہوتی۔ ایک احساس کمتری، یا پھر شاید یہ اس کا وہم تھا۔

''خیر!'' حیا گہری سانس لے کر چولہے کی طرف آئی اور چائے کی کیتلی اٹھالی۔ ٹرے میں پیالیاں اس نے پہلے سیٹ کر رکھی تھیں، اب وہ چھلنی رکھ کر چائے انڈیلنے لگی۔

''اس ویک اینڈ پہ ڈنر کریں ساتھ؟''

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا، ذرا سی چائے چھلنی کے دہانے سے پھسل کر پیالی پکڑے اس کے ہاتھ پہ گری، مگر وہ بے حد حیرت و بے یقینی سے جہان کو دیکھے گئی۔

''اچھا..... اچھا..... نہیں کرتے۔ غلطی سے کہہ دیا۔'' وہ جیسے شرمندہ ہو گیا۔

''نہیں! نہیں، میرا مطلب ہے، ٹھیک ہے شیور، مگر کہاں؟'' وہ جلدی سے بولی مبادا وہ کچھ غلط نہ سمجھ لے، پھر اپنی جلد باز دمی پہ بھی

Downloaded From http://paksociety.com

خفت ہوئی۔

''استقلال جدیسی میں کہیں بھی۔ تمہیں بس ٹاقسم پہ اتارنی ہے نا؟'' حیا نے اس کی پیالی اٹھا کر اسے دی تو اس نے سر کے ذرا سے اثبات کے ساتھ تھام لی۔

''ہاں۔'' وہ اپنی پیالی لے کر اس کے بالمقابل سلیب سے ٹیک لگائے کھڑی ہوگئی اور چائے میں چمچ ہلانے لگی۔

''پھر میں تمہیں ٹاقسم سے پک کرلوں گا۔ ہفتے کی رات، آٹھ بجے ٹھیک؟''

''ٹھیک۔'' وہ گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرادی۔

جب وہ اسے واپس باہر تک چھوڑنے آئی تو دونوں کو اپنے نیچے پا کر بالکونی کی بتی خود سے جل اٹھی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ وہ ہولے سے کہہ اٹھی۔

''آئی ایم سوری، میں آج اوورری ایکٹ کرگئی تھی۔''

جہان نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''کچن کے سارے برتن دھلوا کر، چولہا ٹھیک کروا کر اور چائے کے دو کپ بنوا کر تم نے بالآخر مان ہی لیا۔ بہت شکریہ۔ اب میں سکون سے سو سکوں گا۔'' وہ گویا بہت تشکر اور احسان مندی سے بولا تھا۔

وہ خفت سے ہنس دی۔ ''کہا نا سوری۔''

''سوری مجھے بھی کرنی چاہیے، مگر وہ میں ڈنر پہ کردوں گا، ادھار رہا۔ ہفتے کی شام آٹھ بجے، شارپ!''

''مجھے یاد رہے گا۔'' وہ سیڑھیاں اترنے لگا اور حیا سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ جب اس کی کار نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو وہ کمرے کی طرف مڑگئی۔ بالکونی کی بتی بجھ گئی۔ سارے میں تاریکی چھا گئی۔ ڈی جے وہیں کرسی پہ بیٹھی لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کررہی تھی۔

وہ زیرلب کوئی دھن گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے بینک کے زینے چڑھنے لگی۔

''تمہارا کزن بڑا ہینڈسم ہے۔'' ڈی جے نے مصروف انداز میں تبصرہ کیا۔

''سو تو ہے۔'' اس نے بستر میں لیٹ کر ڈی جے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ وہی پھپھو کا بیٹا ہے نا؟'' ڈی جے اسکرین کو دیکھتی لیپ ٹیپ کی کنجیوں پہ انگلیوں چلا رہی تھی۔

''ہوں!''

''وہی شادی شدہ؟''

''ہاں۔'' اس کے لبوں پہ ایک دبی دبی مسکراہٹ در آئی۔

''اچھا!'' ڈی جے مایوسی سے خاموش ہوگئی۔

حیا زیرلب وہی دھن گنگنانے لگی۔

''بکومت۔ مجھے اسائنمنٹ بنانے دو۔'' کچھ دیر بعد ڈی جے جھنجھلا کر بولی مگر وہ مسکراتے ہوئے گنگنائے جارہی تھی۔ وہ خوش تھی، بہت خوش۔

☆ ☆ ☆

دروازہ کھلا تھا۔ اس نے دھکیلا تو وہ ایک ناگوار مگر آہستہ آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔

سامنے لاؤنج میں ابتری پھیلی تھی۔ چھوٹا سا کچن بھی ساتھ ہی تھا جس میں اس کی بیوی کام کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

ہاشم قدم قدم چلتا کچن کے دروازے پہ آ کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی اس کی جانب پشت کیے چولہا جلا رہی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح تھی۔ دراز قد، گھنگھریالے سیاہ بال اور اہل حبشہ کی سی مخصوص موٹی سیاہ آنکھیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ڈاکٹر کیا کہتا تھا؟''

وہ چونک کر پلٹی۔ پھر اسے دیکھ کر گہری سانس لی اور واپس چولہے کی طرف مڑ گئی۔

''سرجری ہوگی، اور اس کے لیے بہت سے پیسے چاہئیں۔''

وہ خاموشی سے کھڑا سنتا رہا۔

''پیسوں کا انتظام ہوا؟'' وہ کپڑے سے ہاتھ پونچھتی ہاشم تک آئی اور پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''نہیں۔'' ہاشم نے گردن دائیں سے بائیں ہلائی۔

''تو اب کیا ہوگا؟ ہمیں انہی چند ہفتوں میں ہزاروں لیرز جمع کرنے ہیں۔ تم نے پاشا سے بات کی؟''

''کی تھی۔''

''تو کیا کہتا ہے وہ؟'' وہ بے قرار ہوئی۔

''نہیں دے گا۔ جو کام میں کر رہا ہوں، بس اس کی قیمت دے گا۔ اوپر ایک کرش kurush بھی نہیں۔''

''کیوں؟ اتنا تو پیسہ ہے اس کے پاس۔ پورا محل تو کھڑا کر رکھا ہے بیوک ادا میں، پھر ہمیں کیوں نہیں دے گا؟''

''وہ کہتا ہے اس نے کوئی خیراتی ادارہ نہیں کھول رکھا اور پھر مزید کس کھاتے میں دے؟ میں نے ابھی تک اس کی پچھلی رقم نہیں لوٹائی۔''

''ہاں تو وہ حارث کے علاج پہ لگ گئے تھے، کوئی جوا تو نہیں کھیلتے ہم۔'' اس نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا کپڑا میز پہ دے مارا۔

''وہ نہیں دے گا، میں کیا کروں؟'' وہ بے حد مایوس تھا۔

''مجھے نہیں پتا ہاشم! کہیں سے بھی ہو، تم پیسوں کا بندوبست کرو، ورنہ حارث مر جائے گا۔''

ہاشم نے بے چارگی اور کرب سے سر جھٹکا۔

''ہاشم! کچھ کرو۔ ہمارے پاس دن بہت کم ہیں۔ ہمیں پیسے چاہئیں ہر حال میں۔''

''کرتا ہوں کچھ۔'' وہ جس شکستگی کے عالم میں آیا تھا، اسی طرح واپس پلٹ گیا۔ اس کی سیاہ پیشانی پہ تفکر کی لکیروں کا جال بچھا تھا اور چال میں واضح مایوسی تھی۔

وہ مضطرب سی انگلیاں مروڑتی کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی، پھر ایک نظر کمرے کے بند دروازے پہ ڈالی جہاں ان کا بیٹا سو رہا تھا اور سر جھٹک کر واپس سنگ کی طرف پلٹ گئی، جہاں بہت سے کام اس کے منتظر تھے۔

☆ ☆ ☆

ڈی جے نے دروازہ کھولا تو وہ اسے آئینے کے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ وہ دروازہ بند کر کے آگے آئی اور حیا کے سامنے کھڑے ہو کر پوری فرصت سے اور بہت مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس کے ہاتھ میں مسکارا برش تھا اور وہ آئینے میں دیکھتی، آنکھیں کھولے احتیاط سے پلکوں سے برش مس کر رہی تھی۔ گہرا کاجل، سیاہ سنہری سا آئی شیڈ اور لبوں پہ چمکتی گلابی لپ اسٹک وہ بہت محنت سے تیار ہو رہی تھی۔ بال یوں سیٹ کر رکھے تھے کہ اوپر سے سیدھے آتے بال کانوں کے نیچے سے مڑ کر گھنگریالے ہو جاتے تھے۔ بالوں پہ اس نے کچھ لگا رکھا تھا کہ وہ گیلے گیلے سے لگتے تھے اور جو فراک اس نے پہن رکھا تھا، اس کی اوپری پٹی قدیم طرز کے سنہری سکوں سے بھری تھی۔ آستین بہت چھوٹی تھیں اور ان پہ بھی سنہری سکے لٹک رہے تھے۔ نیچے لمبے فراک کی کلیاں سیاہ تھیں۔ ٹخنوں سے ذرا سا جھلکتا پاجامہ بھی سیاہ تھا۔

''کدھر کی تیاریاں ہیں؟'' ڈی جے نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔

''ڈنر کی!'' اس نے لپ گلوس کے چند قطرے لبوں پہ لگائے اور آئینے میں دیکھتے ہوئے ہونٹ آپس میں مس کر کے کھولے۔

''کس کے ساتھ؟''

''جہان کے ساتھ!'' بے ساختہ لبوں سے پھسلا، لمحے بھر کو وہ چپ ہو گئی، پھر لاپرواہی سے شانے اُچکائے۔ ''ویسے وہ شادی شدہ ہے۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''اچھا! وہ دو گھنٹے سردی میں بالکونی میں کھڑا رہتا ہے، چولہے کے تاروں میں ہاتھ ڈال کر اسے ٹھیک کر دیتا ہے، سارا کچن صاف کر کے جاتا ہے، پھر تمہیں ڈنر پہ بلاتا ہے اور تم اس ساری تیاری کے ساتھ جا رہی ہو۔ پھر سوچ لو، وہ اب بھی شادی شدہ ہے؟''

''بکومت!'' وہ ہنستے ہوئے کرسی پہ بیٹھی اور جھک کر اپنی سیاہ ہائی ہیلز پہننے لگی۔

''نہ بتاؤ، میں بھی پتا لگا کر رہوں گی۔'' ڈی جے منہ پہ ہاتھ پھیرتی اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

حیا نے گنگناتے ہوئے میز پہ رکھا اپنا چھوٹا سنہری کلچ اٹھایا۔ وہی دار بھائی کی مہندی والا کلچ جو اس نے جہاز میں بھی ساتھ اٹھا رکھا تھا۔ اسے وہ زیادہ استعمال نہیں کرتی تھی، اب بھی کھولا تو اندر ایک تہہ کیا ہوا وزیٹنگ کارڈ اور اتصالات کا کالنگ کارڈ بھی رکھا تھا جو انہوں نے ابوظہبی میں خریدا تھا۔ اس نے موبائل، پیسے اور سبانجی کا آئی ڈی کارڈ اندر رکھا۔ کلچ چھوٹا تھا، ہالے کا دیا گیا موٹا بھدا موبائل اس میں پورا نہیں آ رہا تھا، تو اس نے موبائل ہاتھ میں پکڑ لیا اور ''اچھا میں چلی'' کہہ کر ہینگر پہ لٹکا اپنا سفید ڈم کوٹ ایک ہاتھ سے کھینچ کر اتارا اور باہر لپکی۔

باریک لمبی ہیل سے پتھریلی سڑک پر چلتے ہوئے اس نے کوٹ سیدھا کیا اور پہنا، پھر چلتے چلتے سامنے سے بٹن بند کیے۔ گورسل کا اسٹاپ ذرا دور تھا۔ اسے وہاں تک پیدل جانا تھا۔ وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے تیز تیز سڑک پر چلتی جا رہی تھی۔ شام کی ٹھنڈی ہوا سے اس کے گیلے گھنگھریالے بال کمر پہ اڑ رہے تھے۔

جس لمحے وہ گورسل اسٹاپ کے قریب پہنچی، اسے گورسل دور سبانجی کے گیٹ سے باہر نکلتی دکھائی دی۔

ہالے نے کہا تھا، جس دن تمہاری گورسل چھوٹے گی اس دن تمہیں ہالے نور بہت یاد آئے گی۔ اور اس پل بے بسی و دکھ سے اس دور جاتی گورسل کو دیکھ کر اسے واقعی ہالے نور بہت یاد آئی تھی۔

اس نے جیب سے موبائل نکالا اور جہان کو پیغام لکھا۔

''میں گورسل چھوٹ گئی ہے مجھے تک کر لو، میں اسٹاپ پہ کھڑی ہوں۔''

وہ کتنی ہی دیر وہاں سڑک پہ ٹہلتی رہی، مگر اس کا جواب نہیں آیا۔ شاید اس غریب کے پاس جواب دینے کا بھی کریڈٹ نہیں تھا۔

ہارن کی آواز پر وہ اپنے حال میں لوٹ آئی جہاں ایک سیاہ چمکتی ہوئی کار اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔

ڈرائیور نے بٹن دبا کر اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا اور چہرہ ذرا سا موڑ کر اسے مخاطب کیا۔

''مادام سلیمان؟ ٹاقسم اسکوائر، جہان سکندر۔'' ترک لب و لہجے میں ڈرائیور نے چند الفاظ ادا کیے تو اس نے سر ہلا دیا اور دروازہ کھول کر پچھلی نشست پہ بیٹھ گئی۔ وہ یقیناً جہان کا ڈرائیور تھا، گو کہ اس نے مفلر چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور سر پہ ٹوپی بھی لے رکھی تھی۔ حیا بس اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائی تھی، پھر بھی اسے گمان گزرا کہ اس نے اس سیاہ فام حبشی کو کہیں دیکھ رکھا ہے۔ کہاں، یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے جہان کو ''بہت شکریہ۔ میں پہنچ رہی ہوں۔'' لکھنے لگی۔

ذرا کی ذرا اس نے نگاہ اٹھا کر بیک ویو مرر میں ایک دو بار دیکھا بھی، مگر ڈرائیور نے اسے کچھ یوں سیٹ کر رکھا تھا کہ وہ صرف اپنا چہرہ ہی دیکھ سکتی تھی۔

ٹاقسم اسکوائر پہ تاریکی کے پنچھی نے اپنے پر پھیلا رکھے تھے اور اسی مناسبت سے ہر سو بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ پورا اسکوائر ان مصنوعی روشنیوں سے چمک رہا تھا۔ مجسمہ آزادی کے اطراف سے مخالف سمتوں میں سڑکیں نکل رہی تھیں، وہاں ہر سو ٹریفک کا رش تھا۔

مجسمہ آزادی کو چاروں اطراف سے گھاس کے ایک گول قطعہ اراضی نے گھیر رکھا تھا، جیسے کسی پھول کی چار پتیاں ہوں اور ہر پتی کے کناروں کی لکیر پہ پتھریلی روش بنی تھی۔ وہاں لوگوں کی خوب چہل پہل تھی۔

ڈرائیور نے اسکوائر کے مقابل ایک عمارت کی بیرونی دیوار کے ساتھ گاڑی کھڑی کر دی۔

''جہان سکندر!'' اس نے انگلی سے اسی دیوار کے ساتھ ساتھ دور اشارہ کیا، جہاں جہان کی سفید کار کھڑی تھی یوں کہ وہ دیوار کے اس کنارے پہ تھی تو یہ سیاہ کار اس کنارے۔

اس نے دروازہ کھولا اور باریک ہیل احتیاط سے باہر سڑک پہ رکھی۔ ٹاقسم اسکوائر کو اس کی ہیلز پسند نہیں تھیں، اسے اندازہ تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ اپنی گاڑی کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ بونٹ کھول کر وہ جھکے ہوئے، کچھ تاریں جوڑ رہا تھا۔ سیاہ جیکٹ اور جینز میں ملبوس، ہمیشہ کی طرح عام سے حلیے میں۔

وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سہج سہج چلتی اس تک آئی۔ وہ کچھ گنگناتے ہوئے ایک تار کو دوسری کے ساتھ جوڑ رہا تھا۔ حیا کی ٹک ٹک پہ رکا اور گردن گھما کر دیکھا۔

''سلام علیکم!'' اسے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے سیدھا ہوا۔

''وعلیکم السلام! اس تاریک کونے میں کیا کر رہے ہو؟''

''میری کار ہر خاص موقع پر دغا دے جاتی ہے، اب بھی مسئلہ کر رہی ہے، خیر میں فکس کرلوں گا۔'' وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے لاپرواہی سے بولا۔

''وہ تو تم کرلو گے، مجھے پتا ہے۔ جہاں سکندر کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔'' وہ دلگیر سے ہنسی۔

''تم بتاؤ، پورے اسکوائر پہ مجھے تلاشتے تمہیں کتنی دیر لگی؟ اور بس پہ آئی ہو؟''

''نہیں، تمہاری بھیجی گئی شوفر ڈرون کار میں آئی ہوں۔''

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

''یہ طنز کرنا کہاں سے سیکھ لیے ہیں تم نے؟ میں اتنا غریب بھی نہیں ہوں کہ تم یوں مذاق اڑاؤ۔'' وہ ہنس کر سر جھٹکتا اب بونٹ بند کر رہا تھا۔

حیا نے گردن پھیر کر پیچھے دیکھا۔ طویل دیوار کے اس سرے پہ وہ سیاہ کار اسی طرح کھڑی تھی۔

''تمہیں میرا میسج نہیں ملا تھا؟'' وہ قدرے بے چینی سے بولی۔

''میسج؟'' جہان نے جب تھپتھپائی۔ ''میرا موبائل کہاں گیا؟'' اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا اسمارٹ فون نکالا، پھر اس کی اسکرین کو انگلی سے چھوا۔

''نہیں!'' اس نے اسکرین حیا کے چہرے کے سامنے کی۔ وہاں ان باکس کھلا تھا اور حیا کا کوئی پیغام نہ تھا۔ حیا نے بے اختیار اپنے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا۔ اس پہ پیغام رکنے کا نشان نظر آرہا تھا، اس نے جلدی سے بٹن دباتے ہوئے آؤٹ باکس کھولا۔ اس کے دونوں پیغام وہیں پھنسے ہوئے تھے۔ اوہ! بیلنس بالکل ختم تھا، ظاہر ہے پھر میسج کیسے جاتا؟

''کوئی خاص بات تھی کیا؟'' وہ کار کو لاک کر رہا تھا۔

''تم نے مجھے اس پارکنگ ایریا میں ڈنر کرانا ہے یا کسی مہذب جگہ پہ؟'' وہ بات بدل گئی۔ کنکھیوں سے اس نے اس لش پش چمکتی سیاہ کار کو دیکھا، جو دور کھڑی تھی۔ اسے کس نے بھیجا، وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

''اگر یہ کار میرا اتنا وقت ضائع نہ کراتی تو میں اب تک کسی ریسٹورنٹ میں جگہ ڈھونڈ بھی چکا ہوتا۔ لیکن اب بھی دیر نہیں ہوئی۔'' دونوں ساتھ ساتھ سڑک کے کنارے چلنے لگے۔

استقلال اسٹریٹ نامی وہ طویل گلی ٹاقسم اسکوائر کے ساتھ سے ہی نکلتی تھی۔ وہ ہفتے کی رات تھی، سو استقلال اسٹریٹ روشنیوں میں نہائی، رنگوں اور قمقموں سے سجی، رونق کے عروج پہ تھی۔ وہاں لوگ ہمیشہ کی طرح دونوں اطراف میں تیز تیز چلتے جا رہے تھے۔ گلی کی دونوں جانب چمکتے شیشوں والی شاپس اور ریسٹورنٹس میں خاصا رش تھا۔

وہ آغاز میں ہی دائیں ہاتھ کی قطار میں بنے ایک ریسٹورنٹ میں چلے آئے۔

زرد روشنیوں سے مزین چھت اور جگمگاتے فانوس نے ریسٹورنٹ کے ماحول کو ایک خواب ناک سا تاثر دے رکھا تھا۔ اس کونے والی خالی میز کے ساتھ رکھے اسٹینڈ پہ حیا نے کوٹ اتار کر لٹکایا اور جہان کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ زرد روشنیوں میں اس کے فراک کے سنہری سکے چمکنے لگے تھے۔ اس نے دائیں بازو میں ایک سنہری کڑا پہن رکھا تھا اور اب وہ کہنی میز پہ رکھ کر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کڑے کو

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

گھمارہی تھی۔سنہری کلچ اور موبائل اس نے میز پہ ہی رکھ دیا تھا۔

''آرڈر میں کروں یا تم؟''

''دعوت تمہاری طرف سے ہے،سو تم کرو۔''اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔جہان نے مسکرا کر سر کو خم دیا اور مینیو کارڈ کھول کر انہماک سے پڑھنے لگا۔اپنی عادت کے مطابق وہ پڑھتے ہوئے نچلے لب کو دانت سے دبائے ہوئے تھا۔

حیا نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔استقلال جدلیی میں کتنے ہی لوگوں نے مڑ مڑ کر اس قدیم یونانی دیویوں کے سے سنگھار والی لڑکی کو ستائش سے دیکھا تھا،مگر یہ عجیب شخص تھا۔کوئی تعریف نہیں،کوئی اظہار نہیں،اتنی لاتعلقی و بے خبری،وہ بھی اس شخص کی جو ایک نظر میں سارے منظر کا باریک بینی سے جائزہ لے لیا کرتا تھا؟

اسے اپنی ساری تیاری رائیگاں جاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

آرڈر کر چکنے کے بعد وہ میز پہ کہنیاں رکھے،دونوں ہاتھ آپس میں پھنسائے حیا کی طرف متوجہ ہوا اور ذرا سا مسکرایا۔

''تم نے مجھ سے اس روز پوچھا ہی نہیں کہ میں تمہارے ڈورم بلاک کیوں آیا تھا؟''

وہ مسکراتے ہوئے کتنا اچھا لگتا تھا۔اس کے ہلکے سے بھورے شیڈ لیے سیاہ بال نوعمر لڑکوں کی طرح ماتھے پہ سیدھے کٹے ہوئے تھے اور عموماً وہ ہلکے ہلکے گیلے ہوتے تھے۔پرکشش آنکھوں میں ایک نرم،دھیما سا تاثر لیے،وہ اب اتنا کم گو اور محتاط نہیں لگتا تھا جتنا پہلے دن لگا تھا۔

''ظاہر ہے،کسی کام سے ہی آئے ہوگے۔مجھ سے ملنے بالخصوص آؤ،یہ تو ذرا مشکل ہی ہے۔''

''تم سے ملنے بالخصوص ہی آیا تھا اور اس کے لیے ممی کو پاکستان فاطمہ آنٹی کو فون کر کے تمہارے ڈورم کا نمبر پوچھنا پڑا تھا،ورنہ تم نے تو ہمیں ایڈریس تک نہیں دے رکھا۔''

اور یہ بات تو اماں نے اسے کل ہی فون پہ بتادی تھی مگر لمحے بھر کو اس نے سوچا تھا کہ ڈھونڈنے والے تو بنا پتے کے بھی ڈھونڈ لیتے ہیں،جیسے وہ سفید گلاب اسے ہر جگہ تلاش کر لیتے تھے۔

''تو پھر آپ کیوں آئے تھے مجھ سے ملنے؟''

''بس یونہی۔مجھے لگا تھا کہ تم اس روز استقلال اسٹریٹ میں مجھ سے خفا ہوگئی تھیں۔''

''اچھا تو آپ نے مجھے اس دن پہچان لیا تھا،ہوسکتا ہے وہ میری شکل کی کوئی لڑکی ہو؟''وہ بہت جلدی بھلا دینے والوں میں سے نہیں تھی،سو بڑی حیرت سے کڑے کو انگلیوں میں گھماتے بولی تھی۔

''ایک بات ابھی کلیئر کر لیتے ہیں حیا!''وہ قدرے آگے کو ہوتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔''میں بہت ایکسپریسو نہیں ہوں،میں لمبی لمبی باتیں نہیں کر سکتا۔میں پریکٹیکل سا آدمی ہوں،ایسا آدمی جس کو فکر معاش ہمیشہ گھیرے رکھتی ہے۔میرے پاس بڑی یونیورسٹی کی ڈگری نہیں ہے،میں ایک ریسٹورانٹ چلاتا ہوں،جس کی ملکیت میری اپنی نہیں ہے،میں کئی سالوں سے اس ریسٹورنٹ کی قسطیں ادا کر رہا ہوں جو کہ پوری ہی نہیں ہو رہیں۔یہ چیز مجھے بہت پریشان رکھتی ہے۔وہ کرد لڑکی جو اس دن میرے ساتھ تھی،وہ میرے ریسٹورنٹ کی عمارت کی اونر ہے اور ہمارے درمیان اس وقت یہی مسئلہ زیر بحث تھا،جب تم وہاں آئیں۔حیا!میں اس دن اتنا پریشان تھا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔وہ میری پراپرٹی ضبط کرنے کی بات کر رہی تھی اور اگر میں اس کی رقم ادا نہ کر پایا تو وہ ایسا کر بھی گزرے گی۔اسی پریشانی میں مَیں تمہارے ساتھ بھی مس بی ہیو کر گیا۔آئی ایم سوری فار ڈیٹ۔مگر اپنی تمام پریشانیوں میں بھی مجھے اپنے سے جڑے رشتوں کا احساس ہے،اور میں ان کی پروا کرتا ہوں۔''

حیا نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب بھی خفا ہو اسی بات پہ؟''وہ قدرے توقف سے بولا۔

''نہیں،میں نے تمہیں تب ہی معاف کر دیا تھا جب تم نے کچن کے سارے برتن دھوئے تھے اور چولہا فکس کر کے دیا تھا۔''

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

''مگر وہ جنجر بریڈ ہاؤس مجھ پہ ادھار ہے۔''

Downloaded From http://paksociety.com

اس سے قبل کہ وہ جواباً کچھ کہتی، ایک ویٹر اس کی طرف آیا تھا۔

''میڈم سلیمان؟''

حیا نے چہرہ اٹھا کر دیکھا اور لمحے بھر کو پتھر کی ہو گئی۔

ویٹر ایک سفید گلابوں کا بوکے میز پر رکھ رہا تھا۔

''یہ آپ کے لیے۔'' ساتھ ہی اس نے ایک دورہ یہ تہہ کیا ہوا کاغذ حیا کی طرف بڑھایا۔

''لیجیے مادام!'' وہ جو ساکت نگاہوں سے گلدستے کو دیکھ رہی تھی، چونکی اور مضطرب سے انداز میں وہ کاغذ تھاما۔ اس کے قدموں سے جان نکل چکی تھی۔ مؤدب سا ویٹر واپس پلٹ گیا۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے کاغذ کی تہیں کھولیں۔

بے سطر کاغذ کے عین وسط میں انگریزی میں تین سطور لکھی تھیں۔

''میری کار میں سفر کر کے یہاں آنے کا شکریہ، لیکن اصولاً مجھ سے لفٹ لینے کے بعد آپ کو ڈنر میرے ساتھ کرنا چاہیے تھا، نا کہ اپنے کزن کے ساتھ۔

''فرام یور ویلفائن!''

جہان گلاس لبوں سے لگائے گھونٹ گھونٹ پانی پیتا پلکیں سکیڑے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

''کون بھیجتا ہے تمہیں یہ سفید پھول؟'' وہ خاصے سرد لہجے میں بولا تو حیا نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔ چند لمحے پیشتر کی گرم جوشی جہان کی آنکھوں میں مفقود تھی۔ اس کے چہرے پہ زمانوں کی اجنبیت اور رکھائی چھائی تھی۔

''پپ..... پتا نہیں۔''

''اور اسے کیسے علم ہوا کہ ہم ریسٹورنٹ میں ہیں؟''

اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ کوئی جواب بن ہی نہیں پڑ رہا تھا۔

''دکھاؤ!'' اس نے ہاتھ بڑھایا اور اب حیا کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے کمزور ہاتھوں سے وہ کاغذ جہان کے ہاتھ پہ رکھا۔

جیسے جیسے وہ تحریر پڑھتا گیا، اس کی پیشانی پہ شکنیں ابھرتی گئیں۔ رگیں تن گئیں اور لب بھینچ گئے۔

''تم کس کی گاڑی میں ناقسم آئی ہو؟'' اس نے نگاہ اٹھا کر حیا کو دیکھا اور وہ ایک نگاہ اسے سمجھا گئی تھی کہ وہ ایک مشرقی مرد تھا۔ تایا فرقان، ابا اور رویل کی طرح کا مشرقی مرد۔

''وہ..... میں سمجھی وہ تمہاری کار اور ڈرائیور ہے۔ میں سمجھی تم نے ڈرائیور بھیجا ہے۔''

''میرا ڈرائیور؟ کب دیکھا تم نے میرے پاس ڈرائیور؟'' اس نے تنفر سے کاغذ کو مٹھی میں مروڑ دیا۔

''میں سمجھی، اور اس نے کہا، تمہارا نام لیا تو.....''

''اس نے یہ کہا کہ اس کو میں نے بھیجا ہے؟'' اس نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

''ہاں..... نہیں۔''

''یعنی کہ نہیں۔'' اس نے نہیں بتایا کہ اسے کس نے بھیجا ہے اور تم اس کے ساتھ بیٹھ گئیں؟ حیا! تم یوں کسی کی گاڑی میں بھی بیٹھ سکتی ہو؟''

''میں نے کہا نا، میں سمجھی وہ تمہاری کار ہے۔'' بے بسی کے مارے اب اسے غصہ آنے لگا تھا۔ بے قصور ہوتے ہوئے بھی اسے اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔

''میرے پاس تم نے دوسری کار کب دیکھی؟ تم.....''

''اگر تمہیں مجھ پہ اتنی بے اعتباری ہے تو میں لعنت بھیجتی ہوں تم پہ۔'' اس نے نیپکن نوچ پھینکا اور کرسی دھکیل کر اٹھی۔ ''جو شخص یہ

Downloaded From http://paksociety.com

حرکت کرتا ہے، وہ مجھ سے پوچھ کر نہیں کرتا، نہ اس میں میرا کوئی قصور ہے۔ اگر تم مجھے اتنا ہی برا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے، یہاں اکیلے بیٹھو، اکیلے کھاؤ اور اکیلے رہو۔"

اس نے کچھ یوں ہاتھ مار کر اٹھایا کہ کرسٹل کا گلدان میز سے لڑھک کے نیچے جا گرا۔ چھناکے کی آواز آئی اور وہ کرچیوں میں بٹ گیا۔

جہان شاید اس کے لیے تیار نہیں تھا، مگر وہ اس کے تاثرات دیکھنے کے لیے نہیں رکی۔ وہ تیزی سے میز کے ایک طرف سے نکلی، اسٹینڈ پہ لٹکا کوٹ کالر سے پکڑ کر کھینچا اور تیز تیز چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اگر وہ اس کے پیچھے آنا بھی چاہتا، تو ابھی جو نقصان وہ کر کے گئی تھی، اسے پورا کر کے ہی آتا اور اس کارروائی میں اسے جتنے منٹ لگتے، اتنی دیر میں وہ دور جا چکی ہوتی۔

استقلال اسٹریٹ میں لوگ اسی طرح چل رہے تھے۔ وہ اس رش کے درمیان میں ہی کہیں تھی۔ اس نے کوٹ پہنا نہیں، بازو پہ ڈال دیا اور دونوں بازو سینے پہ لپیٹے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی چلتی جا رہی تھی۔ آنسو متواتر اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔

وہ اس کے پیچھے نہیں آیا، اور اگر آیا بھی تو وہ اس شور اور رش میں نہ اسے دیکھ پائی، نہ ہی اس کی آواز سن پائی۔ بس اسی طرح چلتی رہی۔ استقلال اسٹریٹ کا آخری کنارا مڑ کر وہ ٹاقسم اسکوائر میں داخل ہوئی اور بالکل سیدھ میں چلتی ہوئی ٹاقسم پارک کی طرف بڑھ گئی۔

تاریک پارک کے ایک گوشے میں وہ سنگی بنچ ویران پڑا تھا۔ وہ گرنے کے سے انداز میں اس پہ بیٹھی اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

انا، خودداری، عزت نفس، اور اپنی ذات کے وقار کے وہ سارے اسباق جو وہ ہمیشہ خود کو پڑھاتی اور یاد دلاتی رہی تھی، آج بہت ذلت کے ساتھ چکنا چور ہوئے تھے۔ وہ شخص کب اس کو یوں ذلیل نہیں کرتا تھا، یوں بے مول، بے وقعت نہیں کرتا تھا، اسے ایک موقع بھی یاد نہ آیا۔ ہمیشہ، ہر دفعہ وہ یہی کرتا تھا، یا پھر ایسا ہو جاتا تھا۔ آخر کب تک یوں چلے گا؟ بہت گرا لیا اس نے خود کو، بہت جھکا لیا، بہت بے مول کر لیا، اب وہ مزید نہیں جھکے گی۔ اب اسے جھکنا پڑے گا، بس آج یہ طے ہو گیا۔

اس نے بے دردی سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوچا، پھر اردگرد پھیلی رات کو دیکھا تو واپسی کا خیال آیا اس نے گود میں رکھا سنہری کلچ کھولا تاکہ موبائل نکال سکے، مگر..... اوہ، موبائل تو اس میں پورا ہی نہیں آتا تھا، وہ تو اس نے میز پہ رکھا تھا اور.....

وہ کوٹ اٹھائے باہر بھاگی۔ اپنا ترکی والا بھدا موبائل وہ اس ریسٹورنٹ میں چھوڑ آئی تھی۔ اسے ہر حالت میں موبائل واپس اٹھانا تھا، چاہے جہان سے سامنا ہو یا نہ ہو۔ چند منٹ بعد جب وہ ہانپتی ہوئی واپس استقلال اسٹریٹ میں اس ریسٹورنٹ کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو کونے والی میز خالی تھی۔ وہ دوڑ کر اس میز تک گئی اور اِدھر اُدھر چیزیں اٹھا اٹھا کر اپنا موبائل تلاشا، مگر وہ کہیں نہیں تھا۔ کرسٹل کے ٹوٹے گلدان کی کرچیاں بھی اب فرش سے اٹھا لی گئی تھیں۔

"پرابلم، میڈم؟"

وہ آواز پہ پلٹی تو وہی باوردی ویٹر جس کی ناک پہ موٹا سا تل تھا، متفکر سا کھڑا تھا۔ وہ بوکے اسی نے اسے لا کر دیا تھا۔

"میرا موبائل تھا اس میز پہ۔" وہ پریشانی سے گھنگھریالی لٹیں کانوں کے پیچھے اڑستی ہوئی میز پہ چیزیں پھر سے اِدھر اُدھر کرنے لگی۔

"جی ہاں پڑا تھا مگر جب آپ گلدان گرا کر گئیں تو آپ کے ساتھ جو صاحب تھے، انہوں نے وہ موبائل رکھ لیا اور مجھے کہا تھا کہ اگر آپ آئیں تو میں بتا دوں کہ وہ فون انہی کے پاس ہے۔" ویٹر نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا۔

"اوہ اچھا۔" اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ملنے کا ایک اور بہانہ۔ "وہ چلا گیا؟"

"جی! وہ بل پے کر کے فوراً آپ کے پیچھے باہر دوڑے تھے۔ آپ کو نہیں ملے؟"

"نہیں۔ شکریہ!" وہ پھولوں کے متعلق کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے باہر نکل آئی۔ استقلال اسٹریٹ پہ قدم رکھتے ہوئے اس نے کوٹ پہن لیا۔ اب اسے کافی دیر تک ٹاقسم اسکوائر پہ گورسل کے انتظار میں بیٹھنا تھا۔

☆ ☆ ☆

Downloaded From http://paksociety.com

ڈی جے خاموشی سے موبائل کے بٹن دباتی نمبر ملا رہی تھی۔ بٹنوں کی ٹوں ٹوں نے ڈورم کی خاموشی میں ذرا سا ارتعاش پیدا کیا تھا۔ کال کا سبز بٹن دبانے سے پہلے اس نے نظر اٹھا کر اپنے مقابل کرسی پہ بیٹھی حیا کو دیکھا جو پوری سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ تھی۔

''مگر حیا! میں اسے کہوں گی کیا؟''

''یہی کہ حیا کو اپنا موبائل چاہیے اور وہ اسے واپس کرے۔''

''مگر وہ واپس کیسے کرے گا؟''

''یہ اس کا مسئلہ ہے، تم کال ملاؤ۔'' وہ جھنجھلا کر بولی۔

ڈی جے نے سر ہلا کر سبز بٹن دبایا، اسپیکر آن کر دیا اور فون اپنے لبوں کے قریب لے آئی۔

دوسری جانب طویل گھنٹیاں جا رہی تھیں۔ وہ دونوں دم سادھے گھنٹیاں سنتی گئیں۔

''پتا نہیں، تمہارا موبائل کدھر پڑا ہو، اسی کے نمبر پہ کر لیتے ہیں، شاید اس پہ وہ اٹھائے ہی.....'' تب ہی کال اٹھا لی گئی۔

''ہیلو؟'' وہ جہان ہی تھا۔ ازلی مصروف انداز۔

''السلام علیکم! میں ڈی..... خدیجہ بول رہی ہوں۔''

''دس از جہان۔ خدیجہ! ایسا ہے کہ یہ فون میرے پاس ہے، حیا ریسٹورنٹ میں بھول گئی تھی۔'' وہ مصروف سا لگ رہا تھا۔ پیچھے بہت سے لوگوں کی بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید وہ ریسٹورنٹ میں تھا۔

''مجھے پتا ہے، اسی لیے تو کال کی ہے۔''

''او کے!'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''حیا کدھر ہے؟''

''وہ..... وہ ذرا مصروف تھی تو میں نے سوچا، میں آپ سے بات کر لوں۔'' بات کرتے ہوئے ڈی جے نے ایک نظر حیا پہ ڈالی جو دم سادھے، کرسی کے کنارے پہ آگے ہو کر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

''جی..... کہیے۔''

''بات یہ تھی کہ میں اور حیا کل پرنسز آئی لینڈز (شہزادوں کے جزیروں) پہ جانے کا سوچ رہے تھے، ان فیکٹ ہم پرنسز آئی لینڈز کے سب سے بڑے جزیرے بیوک ادا Buyuk Ada جائیں گے۔''

حیا نے ناسمجھی سے الجھ کر اسے دیکھا، پھر نفی میں سر ہلا کر روکا، مگر وہ مزے سے کہے جا رہی تھی۔

''او کے تو آپ کو فون چاہیے؟''

''نہیں! فون آپ اپنے پاس رکھیں، عیش کریں، ہمیں بس کمپنی چاہیے۔''

''ڈی جے، ذلیل!'' وہ بنا آواز کے لب ہلا کر چلائی اور ڈی جے کی کہنی مروڑی، مگر ڈی جے ہاتھ چھڑا کر اٹھی اور دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

''کل؟ کل تو میں ذرا مصروف ہوں۔ آپ کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔''

''تو پرسوں صبح چلتے ہیں۔''

''شش..... نہیں۔'' وہ ہاتھ سے اشارے کرتی اسے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''پرسوں تو مجھے شہر سے باہر جانا ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''پھر جمعے کو؟''

''جمعے کو میری ایک اہم میٹنگ ہے اور بیوک ادا میں تو پورا دن لگ جاتا ہے۔''

''پھر تو آپ ہفتے کو بھی مصروف ہوں گے؟'' ڈی جے نے مایوسی سے کہا تو دوسری جانب چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔

''ان فیکٹ ہفتے کو میں واقعی فارغ ہوں۔ ٹھیک ہے، ہفتے کو میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔'' وہ جیسے بہت بادل نخواستہ تیار ہوا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''بس پھر ٹھیک ہے، ہم صبح والی گورسل سے کدی کوئے کی بندرگاہ پہ پہنچ جائیں گے۔ آپ بھی سات بجے سے پہلے پہلے ادھر ہمارا انتظار کیجیے گا۔ وہاں سے ہم پھر اکٹھے فیری میں سوار ہوں گے، ٹھیک؟''

''ٹھیک میڈم!''

''اور ہاں، تب تک آپ ہمارا فون استعمال کر سکتے ہیں۔''

''میں آپ کا احسان تاعمر یاد رکھوں گا۔'' وہ ذرا سا ہنس کر بولا۔

وہ فون بند کر کے واپس آئی تو حیا خاموشی سے اسے گھور رہی تھی۔ ڈی جے واپس کرسی پہ بیٹھی اور بڑے لاپروا انداز میں میز سے میگزین اٹھا کر صفحے پلٹنے لگی۔

''کیا ضرورت تھی اسے ساتھ چلنے کا کہنے کی؟ ہم اکیلے بھی تو جا سکتے تھے۔''

''کیونکہ مجھے اس کے شادی شدہ ہونے میں بھی ابھی تک شک ہے۔'' وہ اب ایک صفحے پہ رک کر بغور کوئی تصویر دیکھ رہی تھی۔ ''ویسے اس کی بیوی کہاں ہوتی ہے؟''

''یہیں، استنبول میں۔'' وہ بددلی سے پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

''اس کی کیا اپنی بیوی سے کوئی لڑائی ہے؟ کبھی ذکر نہیں کرتا اس کا۔''

''شاید..... میں نے اس موضوع پہ کبھی بات نہیں کی۔ ویسے بھی جہان کا نکاح بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ اب پتا نہیں اس کو خود اپنے نکاح کا علم ہے بھی یا نہیں کیونکہ وہ کبھی ذکر نہیں کرتا، شاید پھپھو نے اس سے چھپا رکھا ہو۔''

''بچوں والی باتیں کرتی ہو تم بھی۔'' ڈی جے چہرہ اٹھا کر خفگی سے اسے دیکھا۔ ''آج کے دور میں ایسا کہاں ممکن ہے کہ کسی کا نکاح ہوا ہو اور اسے علم بھی نہ ہو۔ یقیناً اسے پتا ہو گا۔ مگر یہاں سوال یہ ہے کہ نکاح اس کا جس سے بھی ہو، تم اس کی اتنی کیئر کیوں کرتی ہو؟''

ڈی جے پھر مسکراہٹ دبائے رسالے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''کیونکہ اس کا نکاح مجھ سے ہوا تھا۔'' وہ آہستہ سے بولی تو ڈی جے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

''یعنی، یعنی اوہ گاڈ..... تمہارا اس سے نکاح ہوا تھا تو..... تو وہ تمہارا کیا لگا؟''

''سوتیلا ماموں لگا۔'' وہ بگڑ کر بولی اور اپنے بینک کی طرف بڑھ گئی۔

''اوہ مائی گاڈ..... تم نے مجھے اتنی بڑی بات نہیں بتائی!'' ڈی جے ابھی تک بے یقین تھی۔

''اب بتا تو دی ہے نا۔ اب جاؤ کلاس کا ٹائم ہونے والا ہے اور میں آج کیمپس نہیں جاؤں گی۔'' وہ اوپر اپنے بستر میں پھر سے لیٹ گئی اور کمبل منہ پہ ڈال لیا۔

''بہت ذلیل ہو تم حیا! اوہ گاڈ، وہ تمہارا ہزبینڈ ہے...'' ڈی جے ابھی ٹھیک سے حیران ہی نہیں ہو پائی تھی کہ گھڑی پہ نگاہ پڑی۔

ارے آٹھ بج گئے۔'' وہ میگزین پھینک کر اٹھی اور کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی، پھر سلائیڈ کھول کر، چہرہ باہر نکالے لبوں کے گرد دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنائے با آواز بلند چلائی۔

''گڈ مارننگ..... ڈی جے۔''

''نی نی نی..... نے ے ے.....'' دور نیچے سے کسی لڑکے نے جوابی ہانک لگائی تھی۔

''ذا..... لیل۔'' وہ جل کر اور زور سے چلائی۔

''چپ کرو، مجھے سونے دو۔'' حیا نے تکیہ کھینچ کر اسے دے مارا، مگر وہ اسی کھڑکی کے پاس کھڑی صدائیں لگاتی رہی۔

☆ ☆ ☆

وہ یونیورسٹی کی عمارت کی بیرونی سیڑھیاں اتر رہی تھی، جب اس کا موبائل بجا۔ وہ وہیں تیسری سیڑھی پہ رکی، فائل اور کتابیں دوسرے ہاتھ میں منتقل کیں اور باری باری کوٹ کی دونوں جیبیں کھنگالیں، پھر اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چنگھاڑتا ہوا موبائل باہر نکالا۔

Downloaded From http://paksociety.com

یہ اس کا پاکستانی سم والا فون تھا۔ دوسرا موبائل جہان کے پاس ہونے کے باعث وہ آج کل اسے ہی استعمال کر رہی تھی۔
چمکتی اسکرین پہ ترکی کا کوئی غیر شناسا نمبر لکھا آ رہا تھا۔ نمبر کس کا تھا، اسے قطعاً یاد نہ آیا۔ نمبر یاد رکھنے کے معاملے وہ بہت چور تھی۔ اسے اپنے پاکستانی موبائل نمبر تک کے آخری دو ہندسے بھولتے تھے اور ترکی والا تو خیر سرے سے یاد نہ تھا۔
''ہیلو؟'' وہ فون کان سے لگائے ہوئے وہیں سیڑھی پہ بیٹھ گئی۔ کندھے سے بیگ اتار کر ایک طرف رکھا اور فائلیں گود میں۔

''جہاں تیرا نقش قدم رکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں''

آواز اجنبی تھی بھی اور نہیں بھی، مگر اس کا لوچ، اتار چڑھاؤ اور انداز..... سب شناسا تھا۔ وہ لب بھینچ گئی۔
''عبدالرحمٰن بات کر رہا ہوں اور بات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔'' گو کہ وہ پڑھا لکھا لگتا تھا مگر انداز سے کہیں نہ کہیں ممبئی کے کسی نچلے طبقے کے شہری کی جھلک آتی تھی۔
''کیا بات کرنی ہے آپ کو؟ آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟''
''ملنا چاہتا ہوں۔ بتایئے کیا یہ ممکن ہے؟''
اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ ہتھیلیاں بے اختیار پسینے میں بھیگ گئیں۔
''میں نہیں مل سکتی۔''
''کیوں؟ جس فون کال میں آپ کی دوست نے آپ کے کزن کو اپنے ساتھ چلنے کی آفر کی تھی، اس میں غالباً انہوں نے بیوک ادا کا ذکر کیا تھا۔ پرنسز آئی لینڈز..... شہزادوں کے جزیرے..... کیا آپ ادھر نہیں آ رہیں؟''
تو وہ اس کی کالز ٹیپ کر رہا تھا اور تب ہی اس نے پاکستان والے موبائل پہ کال کی تھی کیونکہ وہ ترکی والے فون کے جہان کی تحویل میں ہونے کے بارے میں جانتا تھا۔
''میں بیوک ادا نہیں جا رہی۔ آئندہ آپ نہ تو میرا پیچھا کریں گے، نہ ہی میری کالز ٹیپ کریں گے۔ ورنہ میں آپ کی جان لے لوں گی سمجھے!'' اس نے جھلا کر فون کاٹ سے ہٹایا اور سرخ بٹن زور سے دبایا۔ موبائل آف ہو گیا۔
وہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے کب یہ شخص اس کا پیچھا چھوڑے گا۔

☆ ☆ ☆

سمندر کی جھاگ بھری نیلی لہروں پر سے ہوا سرسراتے ہوئے گزر رہی تھی۔ وہ دونوں فیری کی بالکونی میں کھڑے سامنے سمندر کو دیکھ رہے تھے۔ جہان قدرے جھک کر ریلنگ پکڑے کھڑا تھا اور حیا گردن سیدھی اٹھائے لب بھینچے سامنے افق پہ دیکھ رہی تھی۔
ڈی جے ابھی ابھی کیمرا لیے بالکونی کے دوسرے سرے تک گئی تھی، سو ان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔
وہ جب سے کدی کوئے کی بندرگاہ پہ فیری میں سوار ہوئے تھے، تب سے آپس میں بات نہیں کر رہے تھے۔ فیری ویسے بھی کھچا کھچ بھرا تھا۔ جگہ ڈھونڈنے میں ہی اتنا وقت صرف ہو گیا۔ فیری کی نچلی منزل جو چاروں طرف سے شیشوں سے بند تھی، پر جڑے تمام صوفے اور کرسیاں بھرے تھے، سو وہ بالائی منزل پہ آ گئے جو اوپن ایئر تھی۔ کھلا سا وسیع احاطہ جہاں ہر طرف صوفے اور کرسیاں تھیں، مگر ایک نشست بھی خالی نہ تھی۔ ان کو بالآخر فیری کے کنارے پہ بنی تنگ سی بالکونی میں کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ وہ اتنی تنگ تھی کہ سمندر کی جانب رخ کر کے ایک وقت میں ایک بندہ ہی ریلنگ کے ساتھ کھڑا ہو سکتا تھا۔ بالکونی کی گیلری لمبی تھی اور لوگوں کی ایک طویل قطار وہاں کھڑی تھی۔
وہ دونوں بالکل دائیں طرف کے کونے میں تھے۔ ہوا بے حد سرد تھی، پھر بھی جہان سیاہ سوئیٹر کی آستین کہنیوں تک موڑے ہوئے تھا۔ مگر اسے بے حد سردی لگ رہی تھی کہ اس نے سیاہ لمبے اسکرٹ کے اوپر صرف سرمئی سوئیٹر ہی پہن رکھا تھا، سو اب سیاہ اسٹول کو سختی سے کندھوں کے گرد لپیٹ کر بازو سینے پہ باندھ رکھے تھے۔
''گیومی سم سن شائن..... گیومی سم رین.....''

Downloaded From http://paksociety.com

حیا کے بائیں جانب ریلنگ پکڑے انڈین لڑکیوں کا ایک گروپ کھڑا تھا۔ وہ لڑکیاں بہت سی تھیں وہ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی تھیں، اور ان کی قطار بالکونی کے دوسرے سرے تک جاتی تھی۔ وہ کسی اسٹڈی ٹور پہ استنبول آئی ہوئی تھیں اور اب چہرے کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بنائے با آواز بلند لہک لہک کر گیت گا رہی تھی۔

''تم اس روز بغیر بتائے اٹھ کر چلی گئیں۔ تمہیں پتا ہے میں کتنی دیر استقلال اسٹریٹ میں تمہیں ڈھونڈتا رہا؟'' وہ ریلنگ پہ جھکا سمندر کی لہروں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''تو نہ ڈھونڈتے۔'' حیا نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ ہوا سے اس کے بال اڑ اڑ کر جہان کے کندھے کو چھو رہے تھے مگر وہ انہیں سمیٹنے کا تکلف بھی نہیں کر رہی تھی۔

''اتنا غصہ؟'' جہان نے گردن موڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ تنے ہوئے نقوش کے ساتھ سامنے دیکھتی رہی۔

''ایسا بھی کچھ نہیں کہا تھا میں نے۔''

''اگر تمہیں خود شرمندگی نہیں ہے تو میں کیوں دلاؤں؟''

''میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی پوچھتا۔''

''مجھے کسی اور سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

Sea gulls کا ایک غول پر پھڑ پھڑاتا ان کے سامنے سے گزرا تھا۔ جہان سیدھا ہوا اور ہاتھ میں پکڑی روٹی کا ٹکڑا توڑ کر فضا میں اچھالا۔ ایک بڑے سے sea gull (سمندری بگلے) نے فضا میں ہی غوطہ لگا کر اسے اپنی چونچ میں دبا لیا۔

وہ خاموشی سے پانی کی نیلی سطح کو دیکھتی رہی جہاں گلابی جیلی فش تیر رہی تھی، ان کے سر پانی کے اندر ہی تھے مگر وہ اتنا شفاف تھا کہ وہ واضح دکھائی دیتی تھیں۔

''کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے حیا! کہ میں پوچھ سکوں کہ وہ شخص کیوں تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے؟''

''پوچھو، ضرور پوچھو، مگر اسی سے جا کر پوچھو۔''

''مگر میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے؟''

''میں بھی نہیں جانتی کہ وہ کون ہے۔''

آج وہ جہان کے لیے وہی حیا سلیمان بن گئی تھی، جو وہ ہر ایک کے لیے تھی۔ خود کو جس شخص کے سامنے جھکا لیا تھا، اب اسی کے سامنے اٹھانا بھی تھا۔

''جینے دو..... کچھ پل تو..... جینے دو۔''

وہ لڑکیاں ابھی تک لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ ڈی جے بھی کہیں ان کے ساتھ تھی۔

''اچھا آئی ایم سوری۔'' وہ رخ موڑ کر اس کے بالکل مقابل آ کھڑا ہوا اور روٹی کا بچا ہوا ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا۔

حیا نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ ذرا سا مسکرایا۔ ایک لمحہ لگا تھا اسے پگھلنے میں اور وہ پگھلی ہوئی موم کا ڈھیر بن گئی۔ بہت دھیرے سے وہ مسکرا دی۔ خود سے کیے سارے وعدے بھول گئے۔

''او کے!'' اس نے روٹی کا ٹکڑا کھینچ کر توڑا اور اڑتے ہوئے بگلے کی سمت پھینکا۔ اس نے اسے فضا میں ہی پکڑ لیا۔

''تمہارا ترکی بہت خوب صورت ہے جہان! مگر یہاں کے لوگ اچھے نہیں ہیں۔'' اب وہ روٹی کے ٹکڑے کر کے فضا میں اچھا رہی تھی۔

''اچھا..... کیسے ہیں وہ؟''

''اکھڑ، بدلحاظ، مغرور، بدتمیز، بدتہذیب، بے مروت، الٹے دماغ کے لوگ ہیں یہاں کے۔''

Downloaded From http://paksociety.com

وہ کہتی گئی اور وہ بے اختیار ہنستا چلا گیا۔

''اور پاکستان کے لوگ کیسے ہوتے ہیں حیا سلیمان؟'' خوب ہنس کر وہ بولا تھا۔

''کم از کم ترکوں سے تو بہتر ہوتے ہیں۔'' اس نے روٹی کا آخری ٹکڑا بھی دور اچھال دیا۔

جہان ابھی تک ہنس رہا تھا۔

Give me some sunshine

Give me some rain.....

Give me another chance

To grow up again.....

لڑکیاں اسی طرح مگن سی گا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ تینوں ساتھ ساتھ بیوک ادا کی اس پل کھاتی سڑک پر نیچے اتر رہے تھے۔ حیا ایک ہاتھ سے اسٹول اور دوسرے سے اڑتے بالوں کو سمیٹ کر پکڑے ہوئے چل رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ پرانے زمانوں میں واپس چلی گئی ہے۔ ایک قدیم جزیرے پہ جو ساری دنیا سے الگ تھلگ سمندر کے درمیان واقع تھا۔ وہ صدیوں پرانے شہزادوں کے جزیرے تھے اور وہ خود کوئی امر ہوئی شہزادی تھی۔

''شہزادوں کے جزیرے یا پرنسز آئی لینڈز' Princes Islands ترک میں 'ادالار' (ادا یعنی جزیرے، اور لار یعنی شہزادوں کے) مرمرا کے سمندر میں قریب قریب واقع نو جزیروں کے گروہ کو کہا جاتا تھا۔ گئے وقتوں میں سلاطین اپنے تخت و تاج کے لیے خطرناک لگتے شہزادوں کو جلاوطن کر کے ان نو جزیروں پہ بھیجا کرتے تھے، جس سے ان کا نام پرنسز آئی لینڈز پڑ گیا تھا۔ ''بیوک ادا'' ان میں سب سے بڑا جزیرہ تھا۔ بیوک یعنی بڑا۔ ''ادا'' یعنی جزیرہ۔ بیوک ادا دنیا کے ٹریفک، شور اور ہنگامے سے دور ایک پرسکون چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ وہاں گاڑیاں بسیں اور دوسری آوازیں نہیں ہوتی تھیں۔ سفر کرنے کے لیے قدیم وقتوں کی طرح گھوڑا گاڑیاں، رگھیاں تھیں یا پھر بائی سائیکل۔

ڈی جے اور جہان اس سے چند قدم آگے نکل گئے تھے اور وہ قدیم زمانوں کے رومانس میں کھوئی ذرا پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ دونوں باتیں بھی کر رہے تھے، ان میں اب تک خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ جہان اسے ریسٹورنٹس کے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔

''یہاں بہت زیادہ اقسام کے کباب ملتے ہیں، غالباً ڈیڑھ سو اقسام کے، اور ہر ریستوران یا تو سوپ فری دیتا ہے، یا ایپل ٹی۔''

وہ بے توجہی سے ان کی باتیں سنتی قدم اٹھا رہی تھی۔

اس جگہ سڑک دونوں اطراف سے ریسٹورنٹس میں گھری تھی۔ ان کے دروازے کھلے تھے اور سامنے برآمدوں میں شیڈ تلے کرسیاں میزیں بچھی تھیں۔ سیاحوں کا ایک ہجوم ہر سو پھیلا تھا۔

سڑک کے وسط میں ایک جگہ مجمع سا لگا تھا۔ وہ تینوں بھی بے اختیار دیکھنے کے لیے رک گئے۔

سیاحوں کے ہجوم کے درمیان گھری وہ ایک خوب صورت سی ترک بچی تھی۔ وہ گہرے جامنی بغیر آستین فراک میں ملبوس تھی، اور گھنگھریالے بال کندھے پہ آگے کو ڈالے ہوئے تھے۔ وہ ریڈ کارپٹ پہ کھڑی کسی اداکارہ کی طرح کمر پہ ہاتھ رکھے ایک معصوم سا پوز بنائے کھڑی تھی اور ارد گرد دائرے میں کھڑے سیاح کھٹا کھٹ اپنے کیمروں میں اس کی تصویریں مقید کر رہے تھے۔

وہ ہر تصویر کے بعد ذرا مختلف انداز سے کھڑی ہو جاتی اور چہرے پہ معصومیت طاری کیے کبھی آنکھیں پٹپٹاتی، کبھی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھتی، کبھی مسکراتی، کبھی ناک سکوڑتی، شاید ایک دو سیاح اس کی تصویر بنانے رکے ہوں گے تو دیکھا دیکھی..... مجمع لگ گیا ہوگا۔

وہ اور ڈی جے بھی فوراً اپنے کیمرے نکال کر تصویریں بنانے کھڑی ہو گئیں۔ اس بچی کے پوز اتنے پیارے تھے کہ تصویر بنا بنا کر بھی ان کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حیا نے لمحے بھر کا توقف کرتے ہوئے چہرہ اٹھایا تو دیکھا، جہان ساتھ ہی کھڑا لب بھینچے قدرے ناگواری سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ شانے اچکائے پھر سے سیاحوں کے جمگھٹے میں گھڑی بچی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''یار! عمر دیکھو اس کی، اور ایکشن کیسے مار رہی ہے۔'' ڈی جے ہنستے ہوئے تصویریں کھینچ رہی تھی۔

دفعتاً مجمع کو چیر کر ایک لڑکی تیزی سے آگے بڑھتی دکھائی دی۔ اس نے لمبے اسکرٹ اور کھلے سے سوئیٹر کے اوپر بھورا سادہ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی رنگت سنہری تھی اور آنکھیں بھوری سبز۔ وہ سولہ سترہ برس کی لگتی تھی۔ بائیں کہنی پہ اس نے ٹوکری ڈال رکھی تھی جس میں جنگلی پھول تھے۔

وہ ماتھے پہ تیوریاں لیے آگے بڑھی اور سختی سے اس بچی کا بازو پکڑا۔ بچی گھبرا کر پلٹی اور جیسے ہی اس لڑکی کو دیکھا، اس کے لبوں سے ہولے سے نکلا ''عائشے گل!''

''جواباً وہ بھوری سبز آنکھوں والی لڑکی ترک میں غصے سے کچھ کہتی ہوئی اس کا بازو پکڑ کر مجمع میں سے راستہ بنا کر اسے لے جانے لگی۔ وہ ترک میں جو کہہ رہی تھی، وہ ایسا تھا کہ سیاح فوراً پیچھے ہٹنے لگے۔ ریڈ کارپٹ شوخت ہو گیا تھا۔

بچی اب مزاحمت کرتی، چڑچڑے پن سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ لڑکی، جس کا نام شاید عائشے گل تھا، مسلسل بولتی ہوئی اسے لے کر جا رہی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں غصہ بھی تھا اور دکھ بھی اور شاید نمی بھی۔

حیا گردن موڑ کر ان کو جاتے دیکھتی رہی۔

''آؤ! تمہیں اپنا بیوک ادا دکھاتا ہوں۔'' جہان کی آواز پہ وہ چونکی، پھر خفیف سا سر جھٹک کر اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

جہان نے ایک بگھی روک دی تھی۔ ڈی جے نے البتہ چار لیرا زنی گھنٹہ کے حساب سے سائیکل کرائے پر لے لی تھی اور اب وہ اسی پہ سوار ہو رہی تھی۔ حیا بگھی کے قریب آئی تو جہان نے ایک طرف ہو کر راستہ دیا۔

وہ شاہانہ سی بگھی اوپر سے کھلی تھی۔ آگے ایک گھوڑا جتا تھا، اس کے ساتھ بگھی بان لگام تھامے بیٹھا تھا۔ پیچھے ایک خوبصورت سی دو افراد کے بیٹھنے کے لیے نشست بنی تھی، جس پہ سنہری نقش و نگار بنے تھے۔

وہ احتیاط سے اوپر چڑھی۔ مخملیں، شاہی نشست نہایت گداز تھی۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی اس پہ بیٹھے۔

بگھی بان نے گھوڑے کو ذرا سی چاک لگائی تو وہ چل دیا۔ پتھریلی سڑک پر اس کے ٹاپوں کی آواز گونجنے لگی۔

''تو پھر پاکستان کے اچھے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟''

حیا نے گردن اس کی طرف پھیری۔ وہ ہاتھ میں پکڑے اسمارٹ فون پر نگاہیں جمائے پوچھ رہا تھا۔ وہ اسے کبھی بھی مکمل توجہ نہیں دے گا، یہ تو طے تھا۔

''پاکستان اور پاکستان کے اچھے لوگ!'' حیا گہری سانس لے کر سامنے کو دیکھنے لگی۔

سڑک دو رویہ سبز درختوں کی قطار سے گھری تھی۔ چند پیلے زرد پتے سڑک کے کناروں پہ بکھرے پڑے تھے۔ درختوں کی دونوں قطاروں کے درمیان بگھی سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

''ہم بہت ترقی یافتہ نہیں ہیں، بہت پڑھے لکھے بھی نہیں ہیں۔ دھوکہ دہی، رشوت زنی، قتل و غارت اور بہت سی برائیوں میں بھی ملوث ہیں۔ ہمارے ہاں ظلم کھلے عام کیا جاتا ہے اور مظلوم بھی ہم ہی ہوتے ہیں۔ ہم پسماندہ بھی ہیں اور پست ذہن کے بھی، مگر اس سب کے باوجود جہان سکندر! ہم دل کے برے نہیں ہیں۔ ہمارے دل بہت سادہ، بہت معصوم، بہت پیارے ہوتے ہیں۔''

پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔

''کیا تم نے واقعی ابا سے پوچھا تھا کہ پاکستان میں ہر روز بم بلاسٹ ہوتے ہیں؟''

''میں نے؟'' موبائل کی اسکرین کو انگلیوں میں پکڑے وہ ذرا سا چونکا، پھر زیر لب مسکرا دیا۔ ''شاید..... کیا نہیں ہوتے؟''

''ہوتے تو ہیں۔ ہماری انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے کیفے میں بھی بلاسٹ ہوا تھا۔ اس دن ہماری ایک فیئر ویل پارٹی تھی اور ہم فرینڈز بلاسٹ سے دس منٹ پہلے کیفے سے نکلی تھیں۔ جب دوبارہ آئے تو بہت برا منظر تھا وہ... خون، ٹوٹا کانچ، جلی ہوئی دیواریں.....''

Downloaded From http://paksociety.com

اس نے یاد کر کے جیسے جھرجھری لی۔

''تو سکیورٹی ادارے کیا کرتے ہیں؟''

''لگتا تو نہیں کہ کچھ کرتے ہیں۔ خیر! ترکی کے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟''

''میں تو ایک غریب سا ریسٹورنٹ اونر ہوں۔ ورکنگ کلاس کا ایک مزدور صفت شخص، جس کو مصروفیت کے باعث گھومنے پھرنے کا وقت بھی نہیں ملتا اور باوجود اس کے کہ میرے گھر سے بیوک ادا قریباً دو گھنٹے کی مسافت پہ ہوگا، میں تین سال بعد ادھر آ رہا ہوں۔''

''واقعی؟'' اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ جہان نے شانے اچکا دیئے۔

''وقت ہی نہیں ملتا۔ میں نے بچت کے لیے ریسٹورنٹ میں ورکرز کم سے کم رکھے ہوئے ہیں، سو کام کا بوجھ بہت بڑھ جاتا ہے۔'' وہ اسی طرح اسکرین کو دباتا مسلسل کام کر رہا تھا۔

بگھی سڑک کی ڈھلان سے نیچے اتر رہی تھی۔ بل کھاتی سڑک کے دونوں اطراف میں خوب صورت بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ سڑک کے کنارے کتے ٹہلتے پھر رہے تھے۔

''یہ تختہ کمزور ہے۔'' دفعتاً جہان نے اپنے جوگر سے نیچے موجود تختہ تھپتھپایا اور پھر جھکا۔

''پلیز جہان! ساری دنیا کی ٹوٹی چیزیں تمہارا ہیڈک نہیں ہیں۔''

''اچھا!'' وہ جو جھک رہا تھا، قدرے خفگی سے سیدھا ہوا۔ وہ پھر سے موبائل پہ کچھ لکھنے لگا۔

''فون رکھ بھی دو۔''

''مادام! آپ یہ مت بھولا کریں کہ آپ ایک غریب ورکر کے ساتھ ہیں جو اگر ایک دن کا آف لے گا تو سارے آرڈرز میں ہیر پھیر ہو جائے گی، سو اس بے چارے کو بہت سے کام یونہی آن دی موو بھگتانے پڑتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان تمام محنتوں کے باوجود وہ اگلے دس سال تک بھی بیوک ادا کے ان بنگلوں جیسا آدھا بنگلہ بھی نہیں بنا سکتا۔''

اس کے کہنے پہ حیا نے لاشعوری طور پر سڑک کے دونوں اطراف بنے بنگلوں پہ نگاہ دوڑائی اور ایک لمحے کو ٹھٹک کر رہ گئی۔

دائیں طرف جہان کے اس جانب جس بنگلے کے سامنے سے بگھی گزر رہی تھی، وہ اتنا عالیشان اور خوب صورت تھا کہ نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔

چار منزلہ، سفید اونچے ستونوں پہ وہ محل یوں شاہانہ انداز میں کھڑا تھا جیسے کوئی ببر شیر اپنے پنجوں پہ بیٹھا ہوتا ہے۔ اس کے چھوٹے سے باغیچے کے آگے ایک لکڑی کا سفید گیٹ تھا۔

بگھی آگے بڑھ گئی تو وہ گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔

سفید محل کے لکڑی کے گیٹ پہ نام کی ایک تختی لگی تھی جس پہ قدیم لاطینی ہجوں کے انداز میں ترچھا کر کے انگریزی میں لکھا تھا۔

''اے آر پاشا''

اس کے دل کی دھڑکن لمحے بھر کو رکی تھی۔ اس کے انداز پہ جہان نے پلٹ کر اس گھر کو دیکھا تھا۔

''اب کیا تم ابھی سے میری جیب کا مقابلہ ان بنگلوں کے ساتھ کرنے لگی ہو؟''

وہ چونکی، پھر دوبارہ اس گیٹ کو دیکھا جو اب دور ہوتا جا رہا تھا۔

''نہیں تو۔'' وہ سر جھٹک کر آگے دیکھنے لگی۔

پھر کتنی ہی گلیوں سے وہ خاموشی سے گزرے، یہاں تک کہ ایک جگہ جہان نے ترک میں کچھ کہہ کر کوچوان سے بگھی رکوا دی۔

''ہم نے پورے جزیرے کا چکر لگانا تھا، پھر ابھی سے کیوں رک گئے؟'' وہ اترنے لگا تو حیا بول اٹھی۔

''نماز!'' جہان نے سامنے مسجد کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

''اچھا!'' وہ سر ہلا کر اٹھی، ایک ہاتھ راڈ پہ رکھا اور احتیاط سے پاؤں نیچے پیڈل پہ رکھ کر اتری۔ جہان پہلے ہی اتر کر مسجد کے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

مسجد چھوٹی مگر صاف ستھری سی تھی۔ جہاں مردوں والے حصے میں چلا گیا تو وہ وضو کر کے عورتوں کے پریئر ہال میں آ گئی۔ وہ ظہر کا وقت تھا، مگر سورج بہت ٹھنڈا لگ رہا تھا۔

ہال کے ایک کونے میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک بچی اسی کے انداز میں بیٹھی دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی۔

حیا گیلے بازوؤں کی آستین نیچے کرتے ہوئے بغور ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ یہ وہی دونوں لڑکیاں تھیں جو ابھی دو گلیاں چھوڑ کر سڑک پہ اسے نظر آئی تھیں۔ جامنی فراک والی چھوٹی بچی اور دوسری بھورے اسکارف والی سنجیدہ سی لڑکی۔

بچی منت بھرے شکایتی انداز میں اس لڑکی کے گھٹنے کو جھنجھوڑتی کچھ کہے جا رہی تھی، مگر وہ لڑکی جس کا نام شاید عائشے گل تھا، نفی میں سر ہلاتی گویا مسلسل اس کی تردید کیے جا رہی تھی۔ وہ دونوں بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہی تھیں، حیا اسٹول کو چہرے کے گرد لپیٹے ہوئے ان دونوں کو دیکھے گئی۔ انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا شاید، وہ آپس میں مشغول تھیں۔

وہ جب نماز پڑھ کر اٹھی تو دیکھا، وہ بچی ابھی تک اس لڑکی کو منا رہی تھی اور شاید اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی آواز دھیمی اور زبان انجان تھی، مگر کبھی کبھی وہ بے بسی بھرے انداز میں چیخ کر ذرا زور سے ''عائشے گل..... پلیز!'' کہہ اٹھتی تو حیا کو سنائی دے دیتا۔

ایک آخری نگاہ ان دونوں پہ ڈال کر وہ باہر آ گئی۔

مسجد کے برآمدے میں وہ تنہا نماز پڑھ رہا تھا۔ حیا ننگے پاؤں چلتی ہوئی برآمدے تک آئی اور ایک ستون سے ٹیک لگا کے کھڑی ہو گئی۔ ہوا سے اس کا سر پہ لیا اسٹول سر کی پشت تک پھسل گیا تھا۔

سامنے چند قدم کے فاصلے پر وہ سجدے میں جھکا تھا۔ نیلی جینز اور اوپر سیاہ سوئیٹر جہان سکندر کا مخصوص لاپرواہ سا حلیہ۔ وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ سر ستون سے ٹکائے اسے دیکھے گئی۔

وہ اب سجدے سے اٹھ کر تشہد میں بیٹھ رہا تھا۔ ہر کام بہت پھرتی سے کرنے والا جہان سکندر کی نماز بہت ٹھہری ہوئی اور پرسکون تھی۔ وہ چونکہ اس سے ذرا پیچھے کھڑی تھی۔ تو یہاں سے اس کا صرف ہلکا رخ ہی نظر آتا تھا۔ گردن کی پشت اور چہرے کا ذرا سا دایاں حصہ۔ وہ گردن جھکائے پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے دائیں رخ سلام کے لیے گردن موڑی تو حیا کو بالآخر اس کا چہرہ نظر آیا۔ وہ زیر لب مسکراتے اسے دیکھے گئی۔

دوسری جانب سلام پھیر کر اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے۔ چند لمحے وہ یونہی بیٹھا دعا مانگتا رہا، پھر ایک گہری سانس لے کر ہاتھ چہرے پر پھیرتا وہ کھڑا ہوا اور واپس مڑا تو اسے ستون کے ساتھ کھڑے دیکھ کر مسکرایا۔

''تم انتظار کر رہی تھیں؟'' وہ ذرا مسکرا کر کہتا ہوا اس کی طرف آیا تو حیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں ساتھ ہی باہر آئے تھے۔

''جہان!'' چوکھٹ پر جب وہ جھک کر کھڑا جوگر پہن رہا تھا تو حیا نے اسے پکارا۔

''ہوں؟''

''تم مذہبی ہو؟''

''تھوڑا بہت۔'' وہ تسمہ باندھ رہا تھا۔

''لگتے نہیں ہو۔''

تسمے کی گرہ لگاتی اس کی انگلیاں تھمیں، اس نے سر اٹھا کر قدرے ناسمجھی سے حیا کو دیکھا۔

''میں کیا کرتا تو مذہبی لگتا؟''

''یہ تو مجھے نہیں پتا۔ ویسے تم نے دعا میں کیا مانگا؟''

''میں نے زندگی مانگی!'' وہ تسمہ بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''زندگی؟'' حیا نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے دہرایا۔ وہ اب عادتاً سوئیٹر کی آستینیں موڑ رہا تھا۔

''انسان وہی چیز مانگتا ہے جس کی اسے کمی لگتی ہے، سو میں ہمیشہ زندگی مانگتا ہوں۔ اگر زندگی ہے تو سب خوب صورت ہے، نہیں

Downloaded From http://paksociety.com

ہے تو سب اندھیر ہے۔'' وہ دونوں سڑک کے کنارے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

''خوب صورتی کیا ہوتی ہے جہان؟''

بیوک ادا کی سرد ہوا اس کے بال پھر سے اڑانے لگی تھی۔ شال سر سے پھسل کر اب گردن کے پیچھے اٹک گئی تھی اور جب اپنے بکھرتے بال دونوں ہاتھوں میں سمیٹتے ہوئے اس نے یہ سوال پوچھا تھا تو شدید خواہش کے باوجود وہ جانتی تھی کہ ''وہ خوب صورتی حیا سلیمان کی آنکھیں ہیں'' جیسی کوئی بات نہیں کہے گا، مگر جواس نے کہا، وہ حیا سلیمان کے لیے قطعاً غیر متوقع تھا۔

''علی کرامت کی ماں!''

''کیا؟'' اس نے ناسمجھی سے جہان کو دیکھا۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے قدم اٹھا رہا تھا۔

''میرے لیے خوب صورتی علی کرامت کی ماں پہ ختم ہو جاتی ہے۔ علی کرامت میرا ایک اسکول فیلو تھا۔ ایک دفعہ میں اس کے گھر گیا تھا، تب میں نے اس کی ماں کو دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت خاتون تھیں۔ وہ ڈاکٹر تھیں اور اس وقت ہسپتال سے آئی تھیں۔ وہ تھکی ہوئی تھیں اور تب کچن میں کھڑی ٹشو سے اپنا چہرہ تھپتھپا رہی تھیں۔ حیا! وہ چہرہ اتنا مقدس، اتنا خوب صورت تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔'' اس کی بات پہ وہ چند لمحے کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

''وہ..... ترک تھیں یا پاکستانی؟'' بہت دیر بعد بولی۔

''وہ سیاہ فام تھیں۔ خالص سیاہ فام۔''

اور حیا کے حلق تک میں کڑواہٹ گھل گئی، تاہم وہ لب بھینچے خاموشی سے اس کے ساتھ قدم اٹھاتی رہی۔

یہ وہ واحد شخص تھا جس کے سامنے وہ جھک جاتی تھی، خاموش ہو جاتی تھی، کڑوے گھونٹ پی لیتی تھی اور پھر بھی موم بن جاتی تھی۔ اگر یہی بات کسی اور نے کہی ہوتی تو وہ اپنے ازلی طنطنے سے اس کو اتنی سناتی کہ ایسی بات کرنے کی وہ شخص دوبارہ کبھی ہمت نہ کرتا۔ حد ہو گئی، بھلا سیاہ فام کہاں اتنے حسین ہو سکتے ہیں۔ یا پھر شاید جہان کا مطلب یہ تھا کہ اسے حیا سلیمان کے مقابلے میں ایک بدصورت ترین سیاہ فام عورت بھی خوب صورت لگتی ہے۔

وہ زندگی میں پہلی دفعہ کسی بدصورت عورت کو سوچ کر حسد کا شکار ہوئی تھی مگر چپ رہی۔

سہ پہر ڈھلنے لگی تو وہ واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ بیوک ادا جزیرے کی گلیوں میں چل چل کر اب اس کے پاؤں دکھنے لگے تھے۔ ڈی جے واپسی پہ پھر سے بالکونی میں کھڑے ہونے کے لیے قطعی راضی نہ تھی اور اس کا پورا ارادہ فیری میں گھس کر چاہے پیار سے، چاہے لڑ جھگڑ کر، مگر بیٹھنے کے لیے نشست ڈھونڈنے کا تھا۔ جہان کو ٹکٹ لینے میں خاصی دیر لگ گئی۔ پانچ بجے والی فیری شام کی آخری فیری تھی، سو سیاحوں کا سارا ہجوم ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے آگے موجود تھا۔ اب اس کے بعد اگلا جہاز رات آٹھ بجے چلنا تھا اور پھر اگلی صبح تک کوئی جہاز نہیں آتا تھا۔ جو رہ گیا، وہ جزیرے پر رات بسر کرے یا تیر کر واپس جائے۔

''اگر تم دونوں اسی رفتار سے چلتی رہیں تو فیری نکل جائے گی اور تمہیں واقعی تیر کر واپس جانا پڑے گا۔'' وہ ان دونوں کی سست روی پہ خاصا جھنجھلا کر بولا تھا۔ جواباً وہ قدرے خفت سے ذرا تیز چلنے لگیں۔

بندرگاہ کھچا کھچ سیاحوں سے بھری تھی۔ وہ تینوں اس رش میں سے بمشکل راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔ جہان آگے تھا اور وہ دونوں پیچھے۔ اسے اب اپنے ریسٹورنٹ کی فکر ہونے لگی تھیں۔ پراپرٹی کی مالکہ نے آ کر پھر سے کوئی ہنگامہ کیا تھا۔ جہان اسے اس سارے معاملے پہ قدرے پریشان و متاسف لگا تھا، گو کہ وہ اپنے تاثرات چھپانے کی مکمل کوشش کر رہا تھا، مگر وہ اس کا ہر رنگ اب پہچاننے لگی تھی۔

وہ تینوں فیری کی طرف جاتے بورڈ کی جانب بڑھ رہے تھے جب کسی نے حیا کی کہنی کو ذرا سا چھوا۔

''ماڈم..... ماڈم!''

وہ ٹھٹک کر رکی اور گردن موڑی۔

اس کے عقب میں ایک بارہ تیرہ برس کا ایک ترک لڑکا کھڑا تھا۔ وہ کوئی ٹھیلے والا تھا، اس نے گردن کے گرد اور دونوں ہاتھوں میں

Downloaded From http://paksociety.com

بہت سے ہار اور موتیوں کی لڑیاں ڈوریوں میں باندھ کر اٹھائی ہوئی تھیں اور اب وہ لڑیوں کا ایک گچھا حیا کے چہرے کے سامنے کر کے دکھاتا، ترغیب دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ کبھی نہ رکتی مگر وہ موتی اور ان کی چمک اتنی خوبصورت تھی کہ اسے ٹھہرنا ہی پڑا۔ وہ بے اختیار وہ لڑیاں انگلیوں میں اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ بالوں میں پرونے والی لڑیاں تھیں اور اتنی حسین تھیں کہ چند لمحے کے لیے وہ لمبے بالوں کی دیوانی لڑکی اردگرد کو فراموش کر بیٹھی۔

''حیا.....حیا!''

جہان دور سے اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جہان اور ڈی جے فیری کے تختے پہ چڑھ چکے تھے اور اب جھنجھلاہٹ بھری کوفت سے اسے بلا رہے تھے۔

''ایک منٹ!'' وہ انگشت شہادت اٹھا کر ان کو روکنے کا اشارہ کرتی پلٹ کر جلدی جلدی لڑیاں دیکھنے لگی۔

''ہاؤ مچ؟'' اس نے دو لڑیاں الگ کر کے پوچھا۔

''ٹین لیرا.....ٹین لیرا۔''

''یہ تو بہت زیادہ ہیں۔'' اس نے خفگی سے بچے کو دیکھا۔ پیچھے جہان اسے ناگواری بھرے انداز میں پھر سے آواز دے رہا تھا۔

''تم جاؤ جگہ تلاش کرو میں دو منٹ میں آ رہی ہوں!'' اس نے ان کو مطمئن کرنے کے لیے جانے کا اشارہ کیا۔ ان تک ان کی آواز شاید پہنچ گئی تھی، تب ہی وہ دونوں سر ہلا کر مڑے اور فیری کے اندرونی راستے کی جانب بڑھ گئے۔

فیری نکلنے میں ابھی تین منٹ تھے اور وہ ان تین منٹوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''سیون لیرا۔'' اس نے حتمی انداز میں لڑکے کو کہا اور پیسے نکالنے کے لیے سنہری کلچ کھولا، اس سے قبل کہ وہ نوٹ نکالتی، لڑکے نے ایک دم پرس جھپٹا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

لمحے بھر کو اسے سمجھ نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے اور جب سمجھ آیا تو وہ۔

''رکو.....رکو.....میرا پرس!'' وہ چلاتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی۔ جہان، ڈی جے، فیری اس افتاد میں اسے سب بھول گیا۔

لڑکا پھرتی سے بھاگتا جا رہا تھا۔ سیاح افراتفری میں فیری کی طرف بڑھ رہے تھے، کسی کے پاس توجہ کرنے کو وقت نہ تھا۔ وہ تیز قدموں سے دوڑتی اس لڑکے کے پیچھے آئی۔ وہ بازار کی طرف مڑ گیا تھا اور اب ایک گلی کے عین وسط میں کھڑا تھا، حیا جیسے ہی بھاگتی ہوئی اس گلی میں داخل ہوئی، لڑکے نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر بھاگ کھڑا ہوا۔

''رکو.....رکو!'' وہ غصے سے چلاتی اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ لڑکا خاصا پھرتیلا لگ رہا تھا، مگر وہ اتنا تیز نہیں بھاگتا تھا۔ تین گلیاں عبور کر کے وہ اس رہائشی علاقے میں داخل ہوا اور سرپٹ دوڑتا ہوا دائیں طرف کی قطار کے بنگلوں میں سے ایک کا گیٹ عبور کر گیا۔ وہ ہانپتی ہوئی اس گیٹ تک آئی۔ گیٹ نیم وا تھا۔ لڑکا اندر ہی کہیں گیا تھا۔

دور کہیں فیری نکل چکی ہے۔ ڈی جے اور جہان جزیرے سے چلے گئے تھے اور وہ ادھر تنہا رہ گئی تھی۔ لیکن یہ وقت وہ سب سوچنے کا نہیں تھا۔ اسے اپنا پرس اور پاسپورٹ واپس لینا تھا۔ ہر صورت۔

اس نے ایک لمحے کو اس نیم وا گیٹ کو دیکھا اور پھر اس کے پیچھے کھڑے اس عالیشان سفید محل کو اور پھر تیزی سے اندر آئی۔ یہ وہی سفید محل تھا جو اس نے دوپہر میں دیکھا تھا۔

چھوٹے سے باغیچے میں خاموشی چھائی تھی۔ شام کے پردے اب نیلے پڑ رہے تھے۔ وہ پھولتے سانس کو ہموار کرتی متذبذب سی چلتی بنگلے کے داخلی دروازے تک آئی اور بیل کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

لکڑی کا اونچا منقش دروازہ قدیم طرز کا بنا تھا۔ اس کے آس پاس بیل نامی کوئی شے نہ تھی۔ وہ کیا کرے؟ یوں منہ اٹھا کر کسی کے گھر میں کیسے گھس جائے؟ مگر وہ بھی تو اسی گھر میں چھپنے کی نیت سے داخل ہوا تھا، اسے بہرحال اندر جانا تھا۔

ایک مصمم ارادہ کر کے اس نے کندھے پہ پھسلتی شال درست کی اور دروازے کا سنہری ناب گھمایا۔ وہ قدیم وقتوں کی کوئی امر ہوئی

Downloaded From http://paksociety.com

شہزادی تھی جو راستہ بھٹک کر اس جزیرے پہ آنکلی تھی اور اب سلطان کے محل کے سامنے کھڑی تھی۔

دروازہ چرر کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ اندر ہر سو اندھیرا تھا۔ اس نے چوکھٹ پہ قدم دھرا۔

''ہیلو؟'' وہ دو قدم مزید آگے آئی اور پکارا اس کی آواز کی گونج در و دیوار سے ٹکرا کر پلٹ آئی۔

وہ کسی لابی میں کھڑی تھی۔ وہاں نیم تاریکی سی چھائی تھی۔ صرف کھلے دروازے سے آتی شام کی نیلگوں روشنی میں آگے جاتی راہداری سی نظر آرہی تھی۔ اس کا دل عجیب سی بے چینی و خوف میں گھرنے لگا۔

''کوئی ہے؟'' اب کے اس نے پکارا تو آواز میں ذرا ارتعاش تھا۔ ایک دم اس کے عقب میں ٹھاہ کے ساتھ دروازہ بند ہوا اور کلک کے ساتھ لاک لگنے کی آواز آئی۔

وہ گھبرا کر پلٹی اور دروازے کی طرف لپکی۔ ڈور ناب تاریکی میں بمشکل اس کے ہاتھ لگا۔ اس نے زور سے ناب کھینچا، پھر گھمایا، مگر بے سود۔ دروازہ باہر سے بند کیا جا چکا تھا۔

''اوپن! اوپن دی ڈور!'' وہ دونوں ہتھیلیوں سے لکڑی کا دروازہ پیٹنے لگی۔ ساتھ ہی وہ خوفزدہ سی دبی دبی آواز میں چلا بھی رہی تھی۔

''شہزادوں کے جزیروں پہ خوش آمدید!''

کسی نے بہت دھیرے سے اس کے عقب میں کہا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

باب 4

''شہزادوں کے جزیرے پہ خوش آمدید۔''

کسی نے بہت آہستہ سے اس کے عقب میں کہا تھا۔ وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔

لابی تاریک تھی۔ البتہ اندر کی سمت مڑتی راہداری کے آخری سرے پہ کوئی ٹمٹماتی سی زرد روشنی دکھائی دے تھی۔ وہ آواز بھی وہیں سے آئی تھی۔

اس نے پلٹ کر آخری بار دروازے کی ناب کو گھمایا۔ وہ جامد رہا۔ اب اسے اس محل سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا تھا۔ جو بے وقوفی وہ کر چکی تھی، اسے انجام تک پہنچانا ہی تھا۔

وہ آنکھیں سکیڑ کر اندھیرے میں دیکھتی آگے بڑھی۔ تاریک راہداری کے اس پار کوئی بڑا سا کمرا تھا۔ شاید لونگ روم۔ گھپ اندھیرے میں وہ زردی موم بتیوں کی روشنیاں وہیں اسے آ رہی تھیں۔

''کون؟'' اس نے چوکنے انداز میں پکارا۔

وہ لونگ روم کی چوکھٹ پہ آن کھڑی ہوئی تھی اور اس کو خوش آمدید کہنے والی عورت وہیں سامنے ہی تھی۔ لمبے اسکرٹ اور سوئیٹر میں ملبوس، اسکارف چہرے کے گرد لپیٹے، وہ جھریوں زردہ چہرے والی ایک معمر خاتون تھیں۔ وہ لونگ روم کے دوسرے سرے پہ کھڑی، ہاتھ میں پکڑی موم بتی سے اسٹینڈ پہ رکھی موم بتیوں کو جلا رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے سرد پڑی موم بتیاں جلنے لگی تھیں۔

آ جاؤ..... اندر آ جاؤ.....'' لمبی موم بتی سے اوپر نیچے انکی موم بتیاں جلاتے ہوئے انہوں نے اسی نرمی سے کہا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی، بس بنا پلک جھپکے اس پرتعیش لونگ روم کے وسط میں رکھی میز کو دیکھے گئی، جس پہ رکھا سنہری ستاروں والا کلچ موم بتیوں کی ہلکی زرد روشنی میں چمک رہا تھا۔

''یہ تمہارا پرس ہے، تم اسے لے سکتی ہو۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم میرے پاس صرف میرے بلاوے پہ آ جاؤ گی، تو میں اس بچے کو نہ بھیجتی۔ اسے معاف کر دینا، اس کی مجبوری تھی۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ کھڑی کیوں ہو؟''

وہ ہاتھ میں پکڑی موم بتی لیے اب سامنے رکھی ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئیں۔ وہاں بھی ایک بڑا سا کینڈل اسٹینڈ رکھا نظر آ رہا تھا، جس کے اوپر جگہ جگہ موم بتیاں سیدھی کھڑی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے ان موم بتیوں کو بھی روشن کرنے لگیں۔

حیا کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی آگے بڑھی اور بڑے صوفے کے کنارے کی نشست پہ جا ٹکی۔ اس کی نگاہیں ابھی تک قریب رکھی میز پہ دھرے اپنے سنہری کلچ پہ تھیں۔

''کچھ کھاؤ گی؟''

''اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔ بہت ساری ہمت مجتمع کر کے وہ بمشکل کہہ پائی۔

''آپ نے مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے؟''

''مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے اور پھر تمہیں کچھ بتانا ہے۔ عبدالرحمٰن آج صبح کی فلائٹ سے انڈیا چلا گیا ہے مگر جاتے جاتے اس نے یہ کام میرے ذمے لگایا تھا۔'' وہ اب اس کی جانب پشت کیے آخری موم بتی جلا رہی تھیں۔

وہ عبدالرحمٰن کے نام پہ حیران نہیں ہوئی۔ اس نے دوپہر میں ہی اس گھر کے باہر گیٹ پہ لگی تختی دیکھ لی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ بچہ اس گھر میں داخل ہوا تو وہ بھی پیچھے چلی گئی۔ وہ صرف اپنے پرس کے لیے آئی تھی یا کسی معمے کے حل کے لیے وہ کسی نتیجے پہ پہنچنے سے قاصر تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''آپ کا عبدالرحمٰن پاشا سے کیا رشتہ ہے؟'' وہ بولی تو اس کی آواز زرد روشنی کی مانند مدھم تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا خوف زائل ہو رہا تھا۔

''میں عبدالرحمٰن کی ماں ہوں۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی موم بتی میز پر رکھی اور انگلی کی پوروں پہ لگی موم کھرچی، پھر پلٹ کر اس کی طرف آئیں۔

''عبدالرحمٰن نے تمہیں ملنے کا کہا تھا، لیکن جب تم نے انکار کیا تو بھلے وہ ہاتھوں اور دامن کا صاف نہ ہو، دل کا اتنا صاف ہے کہ وہ رکا نہیں۔ البتہ جاتے جاتے اس نے میرے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ میں تم سے مل لوں اور تمہیں ان سوالوں کے جواب دے دوں جو تمہارے ذہن میں کلبلاتے رہتے ہیں۔''

وہ دم سادھے خاموشی سے اس معمر عورت کو دیکھے گئی، جو ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان رکھی کارنر ٹیبل پہ ایک فوٹو فریم رکھا تھا۔ اس میں دو چہرے مسکرا رہے تھے۔ ایک وہی معمر خاتون اور دوسرا ان کے ساتھ ایک پینتیس، چھتیس برس کا مرد، جس کے بال گھنگھریالے اور لمبے تھے۔ آنکھوں پہ فریم لیس چشمہ تھا۔ چہرے پہ چھوٹی سی داڑھی جس میں جگہ جگہ سفید بال جھلکتے تھے۔ نہایت گہری سانولی رنگت کا وہ شخص بہت ہی عام سا، قبول صورت مرد تھا۔

''اس سے پہلے کہ میں کچھ بتاؤں، تم اگر کچھ پوچھنا چاہتی ہو تو پوچھ لو۔'' حیا نے فوٹو فریم سے نگاہ ہٹا کر ان کو دیکھا، جو مسکراتی پر شفقت نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ دروازہ بند ہو جانے پہ ڈر گئی تھی مگر اب اس ڈر کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''عبدالرحمٰن پاشا مجھے پھول کیوں بھیجتا ہے؟ سفید پھول، جو شاید دشمنی کی علامت ہوتے ہیں۔'' اس کے سوال پہ وہ ہولے سے مسکرائیں۔

''ہر شخص کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے، شاید وہ اس طرح پھول اس لیے بھیجتا ہے تاکہ تمہیں چونکائے، تمہاری توجہ حاصل کرے۔''

''مگر وہ مجھے کیسے جانتا ہے؟'' اس نے وہ الجھن سامنے رکھی، جو اس کو مسلسل پریشان کیے ہوئے تھی۔

''میں تمہیں یہی بتانا چاہتی تھی۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

''دسمبر میں تم نے کسی چیریٹی ایونٹ میں شرکت کی تھی۔ وہ اسلام آباد میں اس وقت اسی ہوٹل میں تھا۔ وہاں اس نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا اور اسی رات پہلی دفعہ پھول بھیجے تھے۔''

ایک دم سے اس کی اس دو ڈھائی ماہ کی بے چینی کا اختتام ہو گیا۔ اسے فوراً سے یاد آ گیا۔ جس رات اسے سہانجی کی طرف سے سلیکشن کی میل آئی تھی، اسی دوپہر اس نے وہ چیریٹی لنچ اٹینڈ کیا تھا، جو زار کی کزن کی کسی اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے تعاون سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں شہر کے کئی بزنس مین اور دیگر بااثر شخصیات نے شرکت کی تھی۔ وہ اور زار بھی یونہی چلی گئی تھیں، یقیناً اسے عبدالرحمٰن پاشا نے وہیں دیکھا تھا۔ یہ ممکن تھا۔

''تمہیں وہ ڈولی نامی خواجہ سرا تو یاد ہوگا۔ اسے عبدالرحمٰن نے ہی تمہارے تعاقب پہ لگایا تھا۔ ڈولی اس کے آبائی گھر کا پرانا خادم ہے۔ برسوں سے ہمارے ساتھ ہے اور وہ صرف تمہاری مدد کے لیے تمہارے پیچھے آتا تھا۔ جہاں تک تعلق ہے اس میجر کا، جس کو تم نے اس کی ماں اور بہن کے سامنے بے عزت کیا تھا، اس کی مدد بھی عبدالرحمٰن نے تمہاری ویڈیو ہٹوانے کے لیے ہی لی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ میجر کرنل گیلانی کا بیٹا ہے۔ کرنل گیلانی جانتی ہو، کون ہیں؟''

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

''کرنل گیلانی وہ تھے جن کو تمہارے پھوپھا نے ملک چھوڑتے ہوئے اپنے کیے میں پھنسا دیا تھا۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی کرنل گیلانی نے کئی سال سزا کاٹی اور گو کہ وہ بعد میں رہا ہو گئے تھے۔ انہوں نے قید کی صعوبتوں میں لگنے والی بیماریوں کے ہاتھوں زندگی ہار دی۔ اس میجر کی شادی ہونے والی ہے۔ اس نے تمہیں صرف اپنے کسی ذاتی منصوبے کے لیے پھنسانا چاہا تھا مگر تم بے فکر رہو، وہ اب تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔''

تو یہ تھا سارا کھیل۔ ایک بااثر شخص کے اپنی محبت کو پا لینے کے لیے استعمال کردہ کچھ مہروں کی کہانی۔ ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟'' وہ ذرا سرد لہجے میں بولی۔

''تم یہ گھر دیکھ رہی ہو؟ بیوک ادا میں اس وقت بجلی کا کوئی پول مرمت کے باعث کام نہیں کر رہا، سو اس علاقے میں بجلی بند ہے، ورنہ تم دیکھتیں کہ جس گھر میں تم بیٹھی ہو، وہ بیوک ادا کا سب سے خوبصورت، سب سے عالیشان محل ہے۔ یہ دولت، یہ شان و شوکت، یہ طاقت، یہ سب کچھ اور ایک ایسا شخص جو تم سے واقعتاً محبت کرتا ہے، یہ سب تمہارا ہو سکتا ہے اگر تم اسے قبول کر لو۔ اگر تم عبدالرحمٰن سے شادی کر لو۔ میں نے یہی کہنے کے لیے تمہیں ادھر بلایا ہے۔''

حیا نے ایک گہری سانس اندر کھینچی۔

''آپ کو پتا ہے جب کوئی شخص کسی عورت کو اذیت دیتا ہے اور اس کی بے عزتی کا باعث بنتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ وہ عورت اس شخص کی عزت کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ میں نے بھی عبدالرحمٰن پاشا کی عزت کرنا چھوڑ دی ہے۔ میں شادی شدہ ہوں، اس لیے میرا جواب صاف انکار ہے۔''

''کیا ہے، اس ایک معمولی سے ریسٹورنٹ اونر کے پاس جو عبدالرحمٰن کے پاس نہیں ہے؟'' وہ ذرا حیران ہوئی تھیں۔

''اس کے پاس حیا سلیمان ہے اور عبدالرحمٰن پاشا کے پاس حیا سلیمان نہیں ہے۔'' وہ بہت استہزاء سے چبا چبا کر بولی تھی۔

وہ خاتون لاجواب سی خاموش ہو گئیں۔

''اور اگر وہ نہ رہے، تب بھی تمہارا جواب انکار ہوگا؟'' وہ ایک دم اندر تک کانپ گئی۔

''یہ دھمکی ہے؟''

''نہیں، محض ایک سوال ہے۔''

''میرا جواب پھر بھی انکار ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، پھر تم بے فکر ہو جاؤ۔ عبدالرحمٰن زبردستی کا قائل نہیں ہے۔ نہ وہ عشق میں جوگ لینے والا شخص ہے۔ وہ آج کے بعد نہ تمہیں فون کرے گا، نہ تمہارا پیچھا کروائے گا، نہ ہی تمہارے راستے میں آئے گا۔ ویسے بھی وہ دو ڈھائی ماہ سے قبل انڈیا سے واپس نہیں آ پائے گا اور اس کے آنے تک تم جا چکی ہوگی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر تمہارا جواب انکار ہو میں تو میں تمہیں اس چیز کی گارنٹی دے دوں کہ وہ تمہیں اب کبھی پریشان نہیں کرے گا۔ تم جا سکتی ہو۔ آخری فیری آٹھ بجے نکلے گی، اگر تم چاہو تو ٹکٹ کے پیسے.....''

''بہت شکریہ۔ میرے پاس پیسے ہیں۔'' اس نے اپنا کلچ اٹھایا اور تیزی سے اٹھی۔

''سنو! تم اچھی لڑکی ہو۔ کبھی دوبارہ بیوک ادا آنا ہو تو ادھر ضرور آنا، مجھے تم سے مل کر خوشی ہوگی۔''

''مگر مجھے نہیں ہوگی۔'' وہ واپس پلٹ گئی۔

نیم تاریک راہداری کے دوسرے سرے پہ بنے دروازے کا ناب اس نے گھمایا تو وہ کھل گیا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ پتھر بن جانے کے خوف سے اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

باہر شام کی نیلگوں روشنی ڈوب رہی تھی۔ ہر سو اندھیرے اچھانے لگا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے آگے روش پہ آئی۔ اسی پل باہر سے کسی نے سفید گیٹ کھولا۔ نیم اندھیرے میں بھی اسے وہ دونوں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ ترک میں باتیں کرتیں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلی آ رہی تھیں۔ وہی گہرے جامنی فراک والی بچی اور بھورے اسکارف والی بڑی لڑکی جس کے بازو میں جنگلی پھولوں سے بھری ٹوکری تھی۔

وہ مگن سی بچی کا ہاتھ تھامے چلی آ رہی تھی۔ اسے سامنے سے آتا دیکھ کر ٹھٹھک کر رکی۔ حیا تیز قدموں سے چلتی آگے بڑھ گئی۔ بھورے اسکارف والی لڑکی رک کر گردن موڑے اسے جاتے دیکھے گئی۔

بچی نے اسے جھنجھوڑا، تو وہ چونکی، پھر سر جھٹک کر اندر کی طرف جاتے آبنوسی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

حیا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ سمندر کی طرف سے آتی ہوا مزید سرد ہو چلی تھی۔ نیلگوں سیاہ پڑتی شام دم توڑ رہی تھی۔ جب تک وہ واپس بندرگاہ پہ پہنچی، شام اندھیرے میں بدل چکی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

تاریک رات، ویران سمندر، پراسرار جزیرہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی محفوظ جگہ ملے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ ابھی تو وہ رونے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

''رات کو فیری کتنے بجے آئے گی؟'' اس نے ٹکٹ کی کھڑکی سے جھانکتے آفیسر سے پوچھا۔ اس کا موبائل جہان ساتھ لایا تھا، مگر وہ واپس نہیں لے سکی تھی اور جہان اور ڈی جے کے موبائل نمبرز اسے زبانی یاد نہیں تھے۔ ورنہ کہیں سے کال کر لیتی۔ وہ چلے گئے ہوں گے اور کتنے پریشان ہوں گے۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی۔

''آٹھ بجے۔'' ٹکٹ چیکر نے جواب دیتے ہوئے بغور اسے دیکھا، پھر ساتھ رکھا کاغذ اٹھا کر دیکھا۔

''آر یو حیا سلیمان؟ پاکستانی تورست؟ (ٹورسٹ؟)'' اس نے کہنے کے ساتھ وہ پرنٹ آؤٹ اس کے سامنے کیا، جس میں اس کی اور ڈے جے کی آج دوپہر کی کھینچی تصویر پرنٹ کی گئی۔

''یس..... آئی ایم..... میری فیری نکل گئی تھی، کیا میرے فرینڈز ادھر ہی ہیں؟'' فرط جذبات سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ اس نے سوچ بھی کیسے لیا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے؟

''پولیس اسٹیشن..... کم ٹو پولیس اسٹیشن۔''

اور جب وہ پولیس آفیسرز کے ہمراہ پولیس اسٹیشن پہنچی تو اندرونی کمرے میں اسے وہ دونوں نظر آ گئے۔

ڈی جے کرسی پہ سر دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھی تھی جبکہ جہان اگلی اٹھائے درشتی سے سامنے بیٹھے آفیسر سے کچھ کہہ رہا تھا۔

آفیسر جواباً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہنے کی سعی کر رہا تھا مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

چوکھٹ پہ آہٹ ہوئی تو وہ بولتے بولتے رکا اور گردن موڑی۔ وہ بھیگی آنکھوں سے دروازے میں کھڑی تھی۔

اس کی اٹھی انگلی نیچے گر گئی، لب بھینچ گئے۔ ایک دم ہی وہ کرسی کے پیچھے سے نکل کر اس کی جانب آیا۔

''کدھر تھیں تم؟''

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ''میں کھو گئی تھی۔ وہ بچہ میرا پرس لے کر بھاگا تو.....''

''تو آدھے بیوک ادا نے تمہیں اس کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ عقل نام کی چیز ہے بھی تم میں یا نہیں؟ ایک پرس کے لیے تم اس کے پیچھے بھاگ گیں؟ فیری چھوٹ جائے گی یا وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے، تمہیں اس بات کا کوئی خیال تھا؟'' وہ غصے سے چلایا۔

''کیوں نہ بھاگتی میں اس کے پیچھے؟ پرس میں میرا پاسپورٹ تھا، سبانجی کا آئی ڈی کارڈ تھا، پھر بعد میں پریشانی ہوتی کہ.....''

''اور جو پریشانی ہمیں ہوئی وہ..... ہم اس ڈیڑھ گھنٹے میں پاگلوں کی طرح تمہیں پورے جزیرے پہ ڈھونڈ رہے تھے۔ جانتی ہو ہماری کیا حالت تھی؟''

ڈی جے جو اس کے چلانے کے باعث رک گئی تھیں۔ اب آگے بڑھی اور اس کے گلے لگ گئی۔

''حیا! تم بالکل پاگل ہو۔'' اس کی آنکھیں رونے سے متورم تھیں وہ دونوں پھر رونے لگی تھیں۔

''حد ہوتی ہے غیر ذمہ داری کی۔ آئندہ میں تم دونوں کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔'' وہ بھنا کر کہتا واپس پولیس آفیسر کی جانب پلٹ گیا۔ وہ ابھی تک روئے جا رہی تھی۔ اسے پتا تھا اسے واپسی پہ جہان کی بہت سی باتیں سننی پڑیں گی۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں لکڑی کا دروازہ دھکیل کر اندر آئیں تو ہر سو اندھیرا چھایا تھا۔ لونگ روم سے ٹمٹماتی زرد روشنی جھانک رہی تھی۔

''آنے!'' اس نے جنگلی پھولوں کی ٹوکری لابی میں رکھے اسٹینڈ پہ دھری اور بچی کا ہاتھ تھامے لونگ روم کی طرف آئی۔

صوفے پہ وہ معمر خاتون اسی طرح بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں چند نوٹ تھے۔ جو وہ گن کر علیحدہ کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی وہ لڑکا کھڑا ان نوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

''سلام علیکم آنے! کیسے ہو عبداللہ؟'' اس نے بچی کی انگلی چھوڑ دی اور کندھے سے پرس کی اسٹریپ اتارتے ہوئے بڑی میز کی

Downloaded From http://paksociety.com

طرف آئی۔

''میں ٹھیک ہوں عائشے!'' لڑکے نے معمر خاتون کے بڑھائے گئے نوٹ پکڑے، گنے اور باہر بھاگ گیا۔ وہ بقیہ نوٹ واپس بٹوے میں رکھنے لگیں۔

''بجلی والا پول ٹھیک ہوا؟'' بٹوہ بند کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''وہاں بندے کام کر تو رہے ہیں۔ ابھی گلی میں داخل ہوتے ہوئے ہم نے دیکھا تھا۔ عبداللہ کیوں آیا تھا؟'' وہ میز کے ساتھ کھڑی اپنا پرس کھولتی کہہ رہی تھی۔

''میرا کام تھا۔'' انہوں نے بچی کا ہاتھ تھامتے ہوئے سرسری سا جواب دیا۔ جواب ان کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھی تھی۔

''کام بھی تھا اور آنے نے اسے پیسے بھی دیے عائشے گل! تم نے دیکھا، وہ صبح قرآن پڑھنے کب سے نہیں آیا، روز بہانے بنا دیتا ہے۔'' بچی ناک سکوڑتی کہہ رہی تھی۔

اپنے پرس کو کھنگالتی عائشے نے پلٹ کر خفگی سے اسے دیکھا۔

''بری بات ہے بہارے! کسی کے پیچھے اس کا یوں ذکر نہیں کرتے۔'' وہ ایک نظر اس پہ ڈال کر واپس اپنے پرس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔

''اور یہ وہی لڑکی تھی نا؟'' چند لمحے موم کی طرح پگھل کر گر گئے تو اس نے پرس کی چیزیں ہاتھ سے الٹ پلٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ادھر کیوں آئی تھی؟''

''یہ عبدالرحمٰن کے مسئلے ہیں، وہ خود ہی نپٹا لے گا۔'' انہوں نے ٹالنا چاہا۔

''اچھا۔'' وہ اداسی سے ہنسی۔ ''یعنی مسئلہ ابھی تک نپٹا نہیں ہے، کیا کہہ رہی تھی؟''

''صاف انکار۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔

''عبدالرحمٰن چلا گیا؟'' اس نے بات پلٹ دی۔

''ہاں، آج صبح کی فلائٹ تھی نا۔''

''واپسی کا نہیں بتایا؟''

''کہہ رہا تھا، دو سے تین ماہ لگ جائیں گے اور شاید اس دفعہ وہ واپس نہ آئے۔''

''جانے دو آنے! وہ ہر دفعہ یہی کہتا ہے۔'' وہ اداسی سے مسکرا کر بولی۔ ایک ہاتھ سے ابھی تک وہ پرس کے اندر کچھ تلاش کر رہی تھی۔

''آنے! تمہیں پتا ہے، عائشے گل مجھ سے ناراض ہے۔'' بہارے اپنے ننھے ننھے سے جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے بتانے لگی۔

آنے نے حیرت سے میز کے سامنے کھڑی عائشے کو دیکھا، جس کی ان کی طرف پشت تھی۔

''کیوں؟''

''کیونکہ سات دن کی تربیت کے بعد آپ کی چہیتی پہ یہ اثر ہوا ہے کہ آج یہ بازار میں عین سڑک کے وسط میں کھڑی اپنا پونچو کہیں گرا کر، سیاحوں کے کیمروں میں تصویریں بنوا رہی تھی۔''

''ارے! تو تم اسے سمجھا دو نا، یوں ناراض تو نہ ہو۔''

''کس کس کو سمجھاؤں؟ سفیر کہتا ہے اس کے ماں، باپ کو سمجھاؤں۔ اس کے ماں باپ کہتے ہیں سفیر کو سمجھاؤں۔ آپ کہتی ہیں بہارے کو سمجھاؤں، بہارے کہتی ہے میں خود کو سمجھاؤں اور عبدالرحمٰن کہتا ہے.....'' وہ لمحے بھر کو رکی، پھر سر جھٹک کر پرس کی چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنے لگی۔

''عبدالرحمٰن کیا کہتا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر ذرا سی گردن موڑ کر بہارے کو دیکھا، جو چہرہ ہتھیلیوں پہ گرائے آنے کے ساتھ بیٹھی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''آج تم نے مجھے بہت خفا کیا ہے بہارے! میں نے کہا تھا نا کہ اچھی لڑکیاں ایسے نہیں کرتیں۔''

''تو اچھی لڑکیاں کیسے کرتی ہیں عائشے گل؟'' بہارے نے منہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری۔

''اچھی لڑکیاں اللہ تعالیٰ کی بات مانتی ہیں۔ وہ ہر جگہ نہیں چلی جاتیں، وہ ہر کسی سے نہیں مل لیتیں، وہ ہر بات نہیں کر لیتیں۔''

اس نے پرس میز پہ الٹ کر جھاڑا۔

''تو پھر میں بری لڑکی ہوں؟'' بہارے پل بھر میں رونکھی ہو گئی۔

''نہیں..... کوئی لڑکی بری نہیں ہوتی۔ بس اس سے کبھی کبھی کچھ ایسا ہو جاتا ہے، جو برا ہوتا ہے، جس پہ اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ اور جانتی ہو جب اللہ ناراض ہوتا ہے تو وہ کیا کرتا ہے؟''

''کیا؟''

''جب وہ ناراض ہوتا ہے تو انسان کو اکیلا چھوڑ دیتا ہے اور جانتی ہو کہ اکیلا چھوڑنا کیا ہوتا ہے؟ جب بندہ دعا مانگتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتی۔ وہ مدد مانگتا ہے تو مدد نہیں آتی۔ وہ راستہ تلاشتا ہے تو راستہ نہیں ملتا۔'' وہ اب میز پہ نکلی اشیا الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ خالی پرس ساتھ ہی اوندھا رکھا تھا۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہو؟''

''سفیر نے اپنی ممی کو چابیاں دینے کے لیے کہا تھا۔ یہیں پرس میں رکھی تھیں۔ پتا نہیں کہاں چلی گئیں۔ عبدالرحمٰن ٹھیک کہتا ہے، عائشے گل کبھی کچھ نہیں کر سکتی۔''

''وہ یہ اس لیے کہتا ہے تاکہ عائشے گل سب ہی کچھ کرنا سیکھ جائے۔''

ان کی بات پہ اس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا اور چیزیں واپس پرس میں ڈالنے لگی۔ وہ چابی یقیناً کہیں اور رکھ کر بھول گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آنے والے چند دنوں میں پڑھائی کا بوجھ ذرا بڑھ گیا اور کلاسز کا شیڈول پہلے سے سخت ہو گیا تو وہ دونوں ٹیسٹ تیار کرنے اور دینے میں ایسی مصروف ہوئی کہ کہیں آ، جا نہیں سکیں۔

وہ وسط مارچ کے دن تھے۔ استنبول پہ چھایا کہر ٹوٹ رہا تھا اور بہار کی رسیلی ہوا ہر سو گلاب اور ٹیولپس کھلا رہی تھی۔ اب صبح سویرے گھاس پہ برف کی جمی سفید تہہ نہیں نظر آتی تھی اور سبانجی کا سبزہ اپنے اصل رنگ میں لوٹ رہا تھا۔ ایسے ہی ایک دن ان دونوں نے ٹاپ قپی پیلس (میوزیم) جانے کا پروگرام بنایا، مگر اسی وقت ہالے آ گئی۔ اس کے پاس کوئی دوسرا پروگرام تھا۔

''میلو کینٹ میں میلاد ہو رہا ہے، چلو گی؟''

''کیوں نہیں، اس بہانے تھوڑا سا ثواب ہی کما لیں گے، ورنہ میں نے اور حیا نے ایسے تو کوئی نیکی کرنی نہیں ہے۔'' ڈی جے اپنا بیگ بند کرتے ہوئے بولی۔

''ویسے ربیع الاول ختم ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے؟''

''ہو چکا ہے، مگر یہ اسٹوڈنٹس کا میلاد ہے اور پڑھائی کے باعث ملتوی ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے اناؤنس کیا ہے، اب چلو۔''

میلاد میں درس دینے والی لڑکی اونچی چوکی پہ بیٹھی تھی۔ سامنے رکھی چھوٹی میز پر کھلی کتاب سے پڑھ کر وہ ترک میں درس دے رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ ایک شرمندہ نگاہ سامنے دیگر لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی حیا اور خدیجہ پہ بھی ڈال لیتی جو سروں پہ دوپٹے لپیٹے بہت توجہ سے درس سن رہی تھی۔ مدرس لڑکی سخت شرمندہ تھی۔ حاضرین کی انگریزی اچھی نہیں تھی۔ اس لیے اس کی مجبوری تھی کہ اسے ترک میں درس دینا پڑ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ بظاہر بہت توجہ اور غور سے سنتی پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کو سمجھ کچھ نہیں آ رہا۔

درس ختم ہوا تو وہ لڑکی ان کی طرف آئی اور بہت معذرت خواہانہ انداز میں ان کو دیکھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''آپ کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا ہوگا؟''

''لیں! سمجھ کیوں نہیں آیا۔'' ڈی جے نے ناک سے مکھی اڑائی۔ ''پہلے آپ نے حجر اسود کو چادر پہ رکھنے والا واقعہ بتایا، پھر غار حرا، وحی، مسلمانوں کی ابتدائی تکالیف، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قربانیاں، ابوجہل بن ہشام کی گستاخیاں، حضرت عمرؓ کا قبول اسلام، ہجرت مدینہ، پھر غزوہ بدر.....''

لڑکی نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔

''آپ کو ترک آتی ہے؟''

''ترک نہیں آتی، مگر اپنی ہسٹری ساری سمجھ آتی ہے۔'' وہ جواباً ہنس کر بولی۔ ترک، اردو جیسی ہی لگتی تھی اور واقعتاً وہ صحابہ کرامؓ کے اسماء کے باعث سب سمجھ پا رہی تھیں۔

''شکریہ.....شکریہ!'' وہ اتنی خوش ہوئی کہ اس کا چہرہ گلابی پڑ گیا۔

میلاد ختم ہوا تو ہالے کی امی کا فون آ گیا۔ انہیں کوئی ضروری کام تھا۔ سو ہالے نے ان کے ساتھ آگے جانے سے معذرت کر لی۔ اب انہیں ٹاپ قپی پیلس اکیلے جانا تھا۔

''دو لوگ اکیلے تو نہیں ہوتے۔'' وہ ٹاقسم اسکوائر پہ بس سے اتریں تو حیا نے اسے تسلی دی۔ ڈی جے ہنس دی۔

''پھر بھی تیسرے کو ساتھ لینے میں کیا حرج ہے؟''

وہ استقلال سٹریٹ کی جانب مڑیں تو قدم خود بخود برگر کنگ کی جانب اٹھنے لگے۔

''وہ چلے گا ہمارے ساتھ؟ اس روز کتنا غصہ کیا تھا اس نے، یاد ہے؟''

''وہ اس لیے کہ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے وہ بہت فکرمند اور پریشان ہو گیا تھا مگر اب تھوڑا سا اصرار کریں گے تو ضرور چلے گا۔''

استقلال سٹریٹ ویسے ہی رش سے بھری تھی۔ وہ دونوں بازو میں بازو ڈالے تیز تیز چل رہی تھیں۔ یہ ان کی دوستی کی علامت ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ اسٹریٹ کے جیب کتروں سے بچاؤ کے لیے وہ اپنے ملے ہوئے کندھوں سے پرس لٹکاتی تھیں تاکہ چھینے نہ جا سکیں۔ حیا تو اس واقعے کے بعد بہت محتاط ہو گئی تھی۔ اب بھی اس نے اپنے سفید کوٹ کے اوپر پرس یوں ڈال رکھا تھا کہ بائیں کندھے سے اسٹریپ گزار کر دائیں پہلو سے پرس لٹک رہا تھا۔ بال کھلے تھے اور دوپٹا گردن کے گرد لپٹا تھا۔ ڈی جے نے بھی اسی کی طرح شلوار قمیص پہ سیاہ لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔

برگر کنگ میں خوب گہما گہمی تھی۔ اشتہا انگیز سی مہک سارے ماحول میں پھیلی تھی۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کچن کی طرف کھلتے دروازے کی طرف آئیں۔ سامنے طویل سا کچن تھا۔ اِدھر اُدھر ایپرن اور ٹوپیاں پہنے دو، چار افراد آ، جا رہے تھے۔ ایک سلیب کے ساتھ وہ بھی کھڑا تھا۔ جینز اور شرٹ پہ سفید ایپرن پہنے، ہاتھ میں بڑا ٹوکا لیے وہ کٹنگ بورڈ پہ رکھے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو کھٹا کھٹ کاٹ رہا تھا۔

''گڈ مآ آ آرننگ منیجر!''

دونوں نے چوکھٹ میں کھڑے ہو کر با آواز بلند پکارا تو اس کا تیزی سے چلتا ہاتھ رکا۔ اس نے گردن اٹھا کر انہیں دیکھا، پھر سر سے پاؤں تک ان کا جائزہ لیا۔ دونوں جوگرز پہنے پھولے ہوئے ہینڈ بیگز اٹھائے ہوئے تھیں۔ حیا کے ہاتھ میں رول کیا ہوا استنبول کا نقشہ تھا اور ڈی جے کے ہاتھ میں ایک گائیڈ بک۔ گویا وہ پوری پوری تیاری سے آئی تھیں۔

''گڈ مارننگ!'' وہ واپس گوشت کی طرف متوجہ ہوا اور دوسرے ہاتھ سے ایک چھوٹی سی اسٹینڈ پہ لگی تختی اٹھا کر سامنے کاؤنٹر پر پٹخ کر رکھی۔ اس پر لکھا تھا۔ ''آئی ایم بزی، ڈونٹ ڈسٹرب۔''

حیا اور خدیجہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر حیا وہیں چوکھٹ کے ساتھ ٹیک لگائے بازو سینے پہ لپیٹ زیر لب مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی، جبکہ ڈی جے مسکراہٹ دبائے آگے بڑھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ہم ٹاپ قپی پیلس جارہے ہیں!'' خدیجہ نے کاؤنٹر کے سامنے آکر اطلاع دی۔

''استقلال اسٹریٹ سے باہر نکلو، ٹاقسم سے میونسپلٹی بس پکڑو، وہ پہنچا دے گی۔'' وہ سر جھکائے ایک ہاتھ سے گوشت کا ٹکڑا پکڑے، دوسرے سے کھٹ کھٹ چھرا چلا رہا تھا۔

''مگر ہمیں ایک ہینڈسم گائیڈ بھی چاہیے۔''

''ہینڈسم گائیڈ ابھی مصروف ہے۔ کسی غیر ہینڈسم گائیڈ سے رابطہ کرو۔''

ڈی جے نے پلٹ کر حیا کو دیکھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے شانے اچکا دیے۔ وہ واپس جہان کی طرف گھومی۔

''تو آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے؟''

''بالکل بھی نہیں۔ تم میں سے کوئی پھر ٹاپ قپی کے قلعے میں گم ہو جائے گی اور میرا پورا دن برباد ہوگا۔''

''ایک دفعہ پھر سوچ لیں۔''

''لکھ کر دے دوں؟'' وہ کہتے ہوئے ٹکڑوں کو ایک طرف ٹوکری میں رکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

''اچھا..... ایک بات بتائیں، استقلال اسٹریٹ میں جیب کترے ہوتے ہیں نا؟'' ڈی جی نے اس کے سلور اسمارٹ فون کو دیکھتے ہوئے کہا جو قریب ہی چارجنگ پہ لگا تھا۔

''ہاں!''

''تو سمجھیں آپ کی جیب کٹ گئی۔'' ڈی جے نے ہاتھ بڑھا کر فون اچکا، تار نکالی اور حیا کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ فون والا ہاتھ اس نے کمر کے پیچھے کر لیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' اسے شدید قسم کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ہمارے ساتھ ٹاپ قپی پیلس نہیں چلیں گے تو ہم اس موبائل کو بیچ کر آدھا جواہر تو خرید ہی لیں گے۔ ویسے فون اچھا رکھا ہوا ہے آپ نے۔'' وہ الٹ پلٹ کر کے موبائل دیکھنے لگی۔ ''پاکستانی روپوں میں دو، ڈھائی لاکھ سے کم کا تو نہیں ہوگا۔''

''وہ چھرا رکھ کر ان کے سر پہ آ پہنچا۔

''میرا فون واپس کرو۔'' کڑی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھایا۔

''ٹاپ قپی سے واپسی پہ دے دوں گی۔ وعدہ!''

''مطلب تم لوگ مجھے یرغمال بنا کر لے جاؤ گی؟''

''کوئی شک!'' وہ پہلی دفعہ بولی۔

''ٹھیک ہے، مگر یہ آخری بار ہے، پھر میں کبھی تم دونوں نکمی لڑکیوں کے ساتھ اپنا دن برباد نہیں کروں گا۔'' وہ ایپرن گردن سے اتارتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ ''اور اگر آج تم دونوں میں سے کوئی کھوئی تو میں بہت برا پیش آؤں گا۔'' ہاتھ دھو کر جیکٹ پہنتا وہ ان کے ساتھ باہر نکلا۔

ٹاپ قپی سرائے کے سامنے وہ سبزہ زار پہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ حیا درمیان میں تھی اور وہ دونوں اس کے اطراف میں۔

''جہان! یہ ٹاپ قپی سرائے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟''

''میں ایک یرغمال شدہ گائیڈ ہوں اور یرغمالی عموماً خاموش رہتے ہیں۔'' وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چیونگم چباتا شانے اچکا کر بولا۔

''میں بتاتی ہوں، ٹاپ قپی کا توپ دراصل اردو والا توپ ہی ہے، جیسے۔ تقسیم ٹاقسم بنا، ویسے ہی توپ ٹاپ بن گیا۔ قپی کہتے ہیں گیٹ کو اور سرائے ہو گیا محل، سو توپ قپی سرائے بنا ''Canon Gate Palace'' آئی ایم اے جینیئس۔ ہے نا جہان؟''

''میں نہیں بول رہا۔'' وہ سخت خفا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

ٹاپ قپی پیلس چار سو سال تک سلاطین کا محل رہا تھا۔ سرمئی عظیم الشان قلعہ نما محل جہاں خاص کمروں کے پہرے دار گونگے، بہرے ہوا کرتے تھے، تاکہ راز دیواروں کے باہر نہ نکلیں۔ اور جس کے کون نما مینار شاہانہ انداز میں اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ سلطان کا عظیم ورثہ اور اثاثے۔ چینی پورسلین کے نیلے اور سفید رنگ کے ایسے برتن جن میں اگر زہر ملا کھانا ڈالا جاتا تو برتن کا رنگ بدل جاتا۔ چھپا سی قیراط کے جواہرات سے مزین سلطان کے شاہی لباس نگاہوں کو خیرہ کرتے تھے۔

''یہ منحوس گارڈ ہمارے سر پہ نہ کھڑا ہوتا تو میں کسی طرح دو، چار ہیرے تو توڑ ہی لیتی۔'' ڈی جے ان آنکھیں چندھیا دینے والے قیمتی پتھروں کو دیکھ کر سخت ملال میں گھر چکی تھی۔

پویلین آف ہولی مینٹل کے حصے میں دینی متبرکات تھے۔

وہ ایک اونچا ہال تھا۔ منقش در و دیوار، رنگ برنگی ٹائلز سے سجے چمکتے فرش، بلند و بالا ستون۔ حیارد گرد نگاہیں دوڑاتی شیشے کی دیواروں میں مقید تاریخی اشیاء کو دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً ایک جگہ رکی اور شوکیس میں سجے ایک تبرک کو دیکھا۔ وہ ایک ٹیڑھی رکھی ہوئی چھڑی تھی۔ بھوری سی چھڑی جو شیشے میں مقید تھی۔ وہ گردن ترچھی کر کے اس کو دیکھنے لگی، پھر ادھر ادھر نگاہیں دوڑائی۔ کیپشن سامنے ہی لگا تھا۔

''اسٹاف آف موسیٰ۔''

(حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا۔)

اس کی سیکٹر کر پڑھتی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ لب بھی نیم وا ہو گئے۔ لمحے بھر بعد وہ دور کھڑی ڈی جے کا بازو قریباً دبوچ کر اسے ادھر لائی۔

''ڈی جے..... یہ حضرت موسیٰ علیہ اسلام کا عصا ہے۔''

''رئیلی؟'' اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکیں۔ ''مگر یہ ان کے پاس کیسے پہنچا؟''

وہ دونوں گھوم پھر کر ہر زاویے سے اس کو دیکھنے لگیں۔ جہان بھی جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے چلتا ان کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے لیے تو سب پرانا تھا، مگر وہ دونوں تو مارے جوش کے راہداری میں آگے پیچھے ایک ایک تبرک کی طرف لپک رہی تھیں۔ ان کے دوپٹے سروں پہ آ گئے تھے۔

کعبہ کا تالا، حضرت داؤد علیہ السلام کی تلوار، حضرت یوسف علیہ السلام کا صافہ، ابراہیم علیہ السلام کا برتن، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے نشان، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس، دانت مبارک، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اور بہت سے صحابہؓ کی تلوار۔

''ڈی جے! کیا یہ شیشے کی دیوار غائب نہیں ہو سکتی؟ اور ہم اس تلوار کو چھو نہیں سکتے؟'' وہ دونوں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کے سامنے کھڑی تھیں۔ کوئی ایسا مقناطیسی اثر تھا اس تلوار میں کہ مقابل کو باندھ دیتا تھا۔

''مگر ہم اس قابل کہاں ہیں حیا؟'' خدیجہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

وہ ابھی تک یوں ہی اس تلوار کو دیکھ رہی تھیں۔

''اگر ہم اس کو چھو سکتے تو جانتی ہو کیا ہوتا؟ چودہ صدیوں کا فاصلہ ایک لمس میں طے ہو جاتا مگر ہمارے ایسے نصیب کہاں؟''

''جہان! یہ سب تبرکات اصلی ہیں نا؟''

جہان نے دھیرے سے شانے اچکائے۔

''میں نے کبھی نہ ان پہ ریسرچ کی، نہ کوئی ریسرچ پڑھا۔ قوی امکان ہے کہ یہ سب اصلی ہیں۔ کہنے والے کہتے تو ہیں کہ مسلمانوں کے ریلکس (تبرکات) بھی اتنے ہی نقلی ہیں جتنے عیسائیوں کے، مگر اللہ بہتر جانتا ہے۔''

''یہ اصلی ہیں، میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ سب ہمارے انبیاء سے وابستہ رہنے والی اشیا ہیں۔ تحریک خلافت انہی متبرکات اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کے لیے ہی تو چلائی گئی تھی۔'' ڈی جے کو معاشرتی علوم کا بھولا بسرا سبق یاد آ گیا۔

ٹاپ قپی پیلس میں خوب گھوم پھر کر جب وہ باہر نکلے تو جہان نے اپنا موبائل واپس مانگا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''یہ لیں! کیا یاد کریں گے اور فکر نہ کریں، ہم نے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ سکیورٹی لاک کوئی پاس ورڈ ہوتا تو میں کھولنے کی ضرور کوشش کرتی مگر آپ نے تو فنگر پرنٹ انٹری لگا رکھی ہے۔'' ڈی جے کے ہاتھ سے فون لیتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

ٹاپ قپی کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ سے جہان نے ان کو بہت اچھا سا کھانا کھلایا۔ ترکی کا اب تک کا بہترین کھانا اور کھانے کے دوران ہی خدیجہ سر درد کی شکایت کرنے لگی۔ جب تک کھانا ختم ہوا، وہ بہت پژمردہ سی لگنے لگی تھی۔ اس کا سر ایک دم ہی درد سے پھٹنے لگا تھا۔

''میرا خیال ہے میں واپس ڈورم میں جا کر ریسٹ کروں، تم لوگ اکیلے گھومو پھرو۔'' اس کی طبیعت واقعی خراب لگ رہی تھی۔ سو انہوں نے اسے جانے دیا۔ وہ چلی گئی تو وہ دونوں ٹاپ قپی کی پچھلی طرف آ گئے۔

وہاں ایک وسیع و عریض سفید سنگ مرمر کے چمکتے فرش والا برآمدہ تھا، جسے سفید ستونوں نے تھام رکھا تھا۔ برآمدے کے آگے فاصلے فاصلے پر چوکور چبوترے سے بنے تھے جن کے سامنے ٹیرس کی طرح چند گز چوڑا کھلا احاطہ تھا۔ اس کے آگے اونچی سفید منڈیر بنی تھی۔ وہاں کھڑے ہو کر منڈیر پہ کہنیاں رکھ کر دیکھو تو نیچے بہتا مرمر کا جھاگ اڑاتا سمندر دکھائی دیتا تھا۔ وہ جگہ اتنی خوب صورت تھی کہ دل چاہتا انسان صدیوں وہاں بیٹھا سمندر دیکھتا رہے۔

''تھک گئے ہو؟'' وہ دونوں ستون کے ساتھ ٹیک لگائے چبوترے کے کنارے پہ بیٹھے تھے۔ جب حیا نے پوچھا۔ اسے جہان ذرا تھکا تھکا لگا تھا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ ذرا سا بخار ہے شاید۔'' اس نے خود ہی اپنا ماتھا چھوا، پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جیکٹ کی جیب سے گولیوں کی ڈبی نکالی۔ ڈھکن کھول کر ڈبی ہتھیلی پہ الٹی، دو گولیاں علیحدہ کیں اور ڈبی بند کرتے ہوئے دونوں گولیاں منہ میں ڈالی، پھر نگل گیا۔

''میرے پاس پانی تھا۔'' وہ اپنا پرس کھنگالنے لگی، لیکن تب تک وہ نگل چکا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' وہ تشویش سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ صبح ریسٹورنٹ سے نکلتے ہوئے اسے یوں ہی جہان کی آواز ذرا دھیمی لگی تھی مگر اس نے پوچھا نہیں اب شاید اس کا بخار شدید ہو گیا تھا۔ کیونکہ چہرے پہ اثرات آنے لگے تھے۔ سرخ پڑتی آنکھیں اور نڈھال سا چہرہ۔

''بس میں نے دیکھ لیا سمندر، اب واپس چلتے ہیں، تمہیں گھر جا کر ریسٹ کرنا چاہیے۔''

''گھر جاتے جاتے گھنٹہ لگ جائے گا۔ میں نے ابھی دوائی لی ہے، اس کا اثر ہونے میں ذرا وقت لگے گا۔ ابھی یہیں بیٹھتے ہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے تکان سے کہہ رہا تھا۔

چند لمحے خاموشی سے بیت گئے۔ ان چبوتروں پہ دور، دور تک ٹولیوں کی صورت میں سیاح بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ بہت سے لوگ آگے منڈیر کے ساتھ کھڑے ہوئے سمندر کو دیکھ رہے تھے۔

''میں تھوڑی دیر یہاں لیٹ جاؤں، تم اکیلی بور تو نہیں ہو گی؟ ابھی میں واپس نہیں جانا چاہتا۔ میری لینڈ لیڈی شاید آج آئے جھگڑا کرنے میں فی الحال اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔''

''نہیں، نہیں، تم لیٹ جاؤ۔ یہ شال لے لو۔'' اس نے بیگ سے شال نکال کر اسے تھمائی۔ وہاں ٹھنڈی ہوا بہت تیز تھی۔ یہ شال وہ اور ڈی جے بطور پکنک میٹ کے استعمال کرتی تھیں۔

''تھینکس!'' وہ ستون کے ساتھ فرش پہ لیٹ گیا۔ آنکھوں پہ بازو رکھے، وہ گردن تک شال کمبل کی طرح ڈالے، کب سو گیا اسے پتا نہیں چلا۔ اسے یقیناً بہت سردی لگ رہی تھی۔

وہ اس سے ایک زینہ نیچے آ بیٹھی تھی۔ ہر چند لمحے بعد وہ گردن موڑ کر اوپر لیٹے جہان کو دیکھ لیتی تھی۔ وہ سو چکا تھا۔

سمندر کی لہروں کا شور وہاں تک سنائی دے رہا تھا۔ وہ اپنا ترکی والا موبائل نکال کر یوں ہی ان باکس نیچے کرنے لگی۔ وہاں چند دن پہلے کا ایک ایس ایم ایس ابھی تک پڑا تھا۔ اس نے اس کا جواب نہیں دیا تھا اور کئی دفعہ پڑھ لینے کے باوجود مٹایا نہیں تھا۔ وہ بیوک ادا سے واپسی کے اگلے روز انڈیا کے ایک غیر شناسا موبائل نمبر سے آیا تھا۔

''مجھے آپ کے جواب سے خوشی نہیں ہوئی، مگر میں آپ کی رائے کا احترام کرتا ہوں۔ آج کے بعد آپ سے کبھی رابطہ نہیں کروں

Downloaded From http://paksociety.com

گا۔ جو تکلیف میں نے آپ کو پہنچائی، اس کے بدلے میں اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو یہ آپ کی بڑائی ہوگی اور اگر کبھی آپ کو استنبول میں کوئی مسئلہ ہو، سرکاری کام ہو یا غیر سرکاری، قانونی یا غیر قانونی، مجھے صرف ایک ایس ایم ایس کر دیجیے گا، آپ کا کام ہو جائے گا، اے آر پی۔''

اس پیغام کے بعد اس شخص نے واقعتاً کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ اب استنبول میں بہت آزادی سے، بہت مطمئن دل و دماغ کے ساتھ گھومتی تھی۔ اسے پہلے کی نسبت اب اے آر پی سے ڈر نہیں لگتا تھا مگر اس وقت وہ پیغام دوبارہ پڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا تھا۔

اس نے پلٹ کر احتیاط سے جہان کو دیکھا۔ وہ آنکھوں پہ بازو رکھے سو رہا تھا۔ وہ واپس سیدھی ہوئی اور ریپلائی کا بٹن دبایا۔ اس پیغام کا جواب اسے کبھی نہ کبھی تو دینا ہی تھا۔ اس نے سوچا کہ خوب غور و فکر کر کے کچھ ایسا لکھ کر بھیجے گی کہ وہ بھڑ کے بھی نہیں اور دوبارہ اس کا پیچھا بھی نہ کرے، سو اچانک اسے ایک عجیب سا خیال آیا تھا۔

جہان کو صرف بخار نہیں تھا۔ وہ پریشان بھی تھا۔ اسے وہ بیوک ادا والے ٹرپ کے مقابلے میں ذرا کمزور لگا تھا۔ گردش معاش کے جھمیلوں میں پھنسے اس انسان کی اگر وہ ایک مدد کر سکتی تھی تو اس میں آخر حرج ہی کیا تھا۔

وہ کافی دیر سوچتی رہی، پھر اس نے جواب ٹائپ کرنا شروع کیا۔

''آپ کی وسیع النظری کا شکریہ۔ مجھے واقعتاً استنبول میں ایک کام درپیش ہے۔ اگر آپ میری مدد کریں تو میں اسے آپ کی طرف سے پہنچائی جانے والی اذیت کا مداوا سمجھوں گی۔''

اس نے پیغام بھیج دیا۔ اب وہ خاموشی سے بیٹھی سمندر کی لہریں دیکھنے لگی۔ وہ بیوک ادا اس کے گھر بھی تو چلی گئی تھی اور جب دروازہ بند ہوا تھا تو اسے لگا تھا وہ ایک سنگین غلطی کر چکی ہے۔ مگر اس غلطی کا نتیجہ بہت اچھا اور اطمینان بخش نکلا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اب بھی اس نے غلطی کی ہے اور اس کا نتیجہ.....؟

ایک دم فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ چونکی اور موبائل سامنے کیا۔ وہی انڈیا کا غیر شناسا سا نمبر تھا، وہ تو سمجھی تھی کہ ٹیکسٹ پہ بات ہو جائے، بہت ہے مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ فون کر لے گا۔

وہ موبائل سنبھالتی اٹھ کر سامنے منڈیر کے پاس چلی آئی۔ اگر وہ یہاں کھڑے ہو کر بات کرے گی تو جہان تک آواز نہیں پہنچے گی۔

''ہیلو؟'' اس نے فون اٹھا لیا۔

''زہے نصیب.....زہے نصیب.....آج آپ نے ہمیں کیسے یاد کر لیا؟'' وہی عامیانہ سا، مسکراتا لب و لہجہ اسے اپنی حرکت پہ شدید پشیمانی ہوئی تھی۔

''مجھے ایک کام تھا۔'' وہ احتیاط سے نپے تلے لہجے میں کہنے لگی۔ ''اور بہتر ہوگا کہ ہم کوئی بے کار کی بات کرنے کی بجائے کام کی بات کریں۔''

''آپ کی مرضی ہے حیا جی! رابطہ بھی تو آپ نے ہی کیا ہے، ورنہ عبدالرحمٰن پاشا اپنے قول کا بہت پکا ہے۔'' شاید وہ طنز کر گیا تھا، مگر وہ پی گئی۔

''میرے کزن کا ریسٹورنٹ ہے استقلال اسٹریٹ پر، برگر کنگ، اس کی شاپ کی قسطیں ادا نہیں ہوئیں۔ ریسٹورنٹ کی مالکہ آج کل میرے کزن کو تنگ کر رہی ہے۔ کیا وہ اسے سال، دو سال کی مہلت نہیں دے سکتی؟''

''کون سا کزن؟'' وہ جیسے چونکا تھا۔

''جج.....جہان سکندر۔'' وہ ہکلائی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ ٹھیک کر رہی ہے یا غلط، مگر وہ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھی اسے اس پریشانی سے تھکتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''اچھا.....تو آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے کزن کا یہ مسئلہ حل کر دوں اور یہ کہ اس کی مالکہ پھر اسے تنگ نہ کرے؟''

''جی!''

Downloaded From http://paksociety.com

وہ ہولے سے ہنس دیا۔

''میں کچھ کرتا ہوں، آپ فکر نہ کریں۔''

اس نے فون رکھ دیا اور سوچنے لگی کہ وہ ہنسا کیوں تھا؟

وہ واپس آ کر جہان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ چند لمحے لگے تھے اسے نارمل ہونے میں۔ اس نے وہی کیا، جو اسے ٹھیک لگا تھا اور اب وہ ذرا مطمئن تھی۔

کافی دیر وہ وہیں ستون کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ اس کے عقب میں ٹاپ قپی کا عظیم محل تھا اور سامنے مرمرا کا سمندر۔ سمندر کے اس پار ایشیائی استنبول (پرانا شہر) تھا۔ بہت سے لمحے محل کی دیواروں سے رینگتے مرمرا کے پانیوں میں گھل گئے تو ایک دم جہان کا موبائل بجا۔

وہ جیسے ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ شال ہٹائی اور جیب سے موبائل نکالا۔ تب تک کال کرنے والا شاید کال کاٹ چکا تھا۔

''ریسٹورنٹ سے آ رہی تھی کال، میرا خیال ہے واپس چلتے ہیں، وہ چالاک لومڑی نہ آئی ہو کہیں۔'' وہ پریشانی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا تم کیوں فکر کرتے ہو؟'' وہ بڑے اطمینان سے کہتے ہوئے اس کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ جہان نے اس کی بات پہ تھکے تھکے سے انداز میں نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ کافی دیر بعد جب وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے استقلال اسٹریٹ میں داخل ہوئے تو حیا نے کہا۔

''آج میں تمہارا برگر کھا کر جاؤں گی، کیونکہ ڈی جے اور تم نے اپنی اپنی بیماری میں مجھے بالکل اگنور کر دیا ہے۔''

''کھا لینا۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا مگر اگلے ہی پل ٹھٹھک کر رکا۔ مسکراہٹ چہرے سے غائب ہو گئی۔ حیا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

سامنے برگر کنگ تھا۔ اس کی شیشے کی دیوار میں بڑا سا سوراخ تھا اور سوراخ کے گرد مکڑی کے جالے کی مانند دراڑیں پڑی تھیں۔

وہ ایک دم تیزی سے دوڑتا ریسٹورنٹ کی طرف لپکا، جبکہ وہ وہیں ششدر سی کھڑی رہ گئی۔ اس کی سماعتوں میں ایک قہقہہ گونجا تھا۔

دوسرے ہی پل وہ بھاگ کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔

کھڑکیوں کے ٹوٹے شیشے، الٹا بکھرا ٹوٹا فرنیچر، اوندھی میزیں، ٹکڑے ٹکڑے ہوئے برتن، ہر جگہ توڑ پھوڑ کے آثار تھے۔ عملے کے ایک شخص کے ساتھ دو پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک آفیسر ہاتھ میں پکڑے کلپ بورڈ پہ لگے کاغذ پہ کچھ لکھ رہا تھا۔

جہان تحیر سے وہ سب کچھ دیکھتا ان پولیس آفیسرز کی طرف آیا۔ وہ اس سے کچھ پوچھ رہے تھے اور وہ صدمے اور شاک سے گنگ نفی میں سر ہلاتا کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے قریب سے گزرتے شیف کو روک کر پوچھا۔ جواباً اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

''وہ گینگسٹرز تھے، ان کے پاس اسلحہ تھا۔ وہ اندر آئے اور پورا ریسٹورنٹ الٹ دیا۔ عملے کو زدوکوب بھی کیا۔ پولیس بھی بہت دیر سے پہنچی۔'' وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور اس کا دل چاہ رہا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ یہ اس نے کیا کر دیا؟ کس شخص پہ بھروسا کر لیا؟ اوہ خدایا.....

پولیس آفیسر کی کسی بات کے جواب میں کچھ کہتے جہان کی نگاہ اس پہ پڑی۔ جو بمشکل آنسو روکے کھڑی تھی۔ اس نے اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔ وہ اس کی طرف آیا۔

''تم جاؤ، ٹاقسم سے بس پکڑ لینا، ابھی جاؤ، میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔'' وہ تھکا تھکا سا کہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پژمردہ اور تھکن زدہ لگ رہا تھا۔ وہ سر ہلا کر، آنسو پیتی پلٹ گئی۔

''یہ تم نے کیا کر دیا حیا! جو اس کے پاس تھا، اسے بھی ضائع کرا دیا؟ آئی ہیٹ یو حیا..... آئی ہیٹ یو.....''

خود کو ملامت کرتی، وہ خاموش آنسوؤں سے روتی واپس ٹاقسم جا رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا تھا کہ وہ فون کر کے اس شخص

Downloaded From http://paksociety.com

کو بے نقط سنائے، مگر شاید وہ یہی چاہتا تھا۔ رابطہ رکھنے کا کوئی بہانا۔ اس نے آنسو رگڑتے ہوئے سر جھٹکا۔

''نہیں۔ اب وہ اسے کبھی فون نہیں کرے گی۔''

☆ ☆ ☆

وہ گہری نیند میں تھی۔ سیاہ گھپ اندھیرے میں جب دور ایک چیختی ہوئی آواز نے سماعت کو چیرا۔ اندھیرے میں دراڑ پڑی۔ دور سے آتی آواز قریب ہوتی گئی۔ اس نے پلکیں جدا کرنی چاہیں تو جیسے ان پہ بہت بوجھ تھا۔

بمشکل آنکھیں کھلیں تو چند لمحے اسے حواس بحال کرنے میں لگے۔ اس نے اردگرد دیکھا۔

ڈورم میں پرسکون سی نیم تاریکی چھائی تھی، کونے میں مدھم سا نائٹ بلب جل رہا تھا۔ ڈی جے، ٹالی اور چیری اپنے اپنے بستروں میں کمبل ڈالے سو رہی تھیں۔ دیوار پہ آویزاں بڑے کلاک کی چمکتی سوئیاں رات کے ایک بجنے کا پتا دے رہی تھیں۔

وہ چنگھاڑتی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ اس نے نیند سے بوجھل ہوتا سر دائیں جانب گھمایا، کہنی کے بل ذرا اوپر ہوئی اور تکیے تلے ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا۔ اس کا ترکی والا موبائل بج بج کر اسی پل خاموش ہوا تھا۔ دو مسڈ کالز، اس نے تفصیل کھولی تو چمکتی اسکرین سے آنکھیں پل بھر کو چندھیائیں۔ حیا نے پلکیں سکیڑے ہاتھ سے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے اسکرین کو دیکھا۔ ''تایا فرقان موبائل'' ساتھ بریکٹ میں دو کا ہندسہ تھا۔ حیا نے اسکرین کے کونے پہ لکھے ٹائم کو دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ یہاں ایک بجا تھا تو پاکستان میں تین بجے ہوں گے۔

آدھی رات کو آنے والا فون اور مہمان کبھی اچھی خبر نہیں لاتے، اور نہ ریسیو کر سکنے والی کال اس برچھی کی مانند ہوتی ہے جو کوئی گھونپ کر نکالنا بھول گیا ہو۔

اس کی ساری نیند اور سستی پل بھر میں بھاگ گئی۔ تایا اس وقت کیوں کال کر رہے تھے؟ وہ ٹھیک تو تھے؟ اماں، ابا، روحیل، سب ٹھیک تو تھے؟ پتا نہیں کیا مسئلہ تھا۔ وہ تڑپ کر واپس کال ملانے لگی، پھر یاد آیا کہ اس میں بیلنس نہیں تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے پاکستانی موبائل کو دیکھا جو تکیے کے اس طرف رکھا تھا۔ اس میں بھی بیلنس ختم تھا بلکہ اس فون میں تو ترکی آنے کے بعد بیلنس ہی نہیں ڈلوایا تھا۔

اس نے کمبل پھینکا اور سیڑھیاں پھیلانگ کر نیچے اتری۔ وہ اپنے نائٹ سوٹ میں ملبوس تھی۔ گلابی چیک والا ٹراؤزر اور کھلا لمبا کرتا۔

''ڈی جے..... ڈی جے..... موبائل دو اپنا۔'' اس نے ڈی جے کے بینک پہ چڑھ کر اس کو جھنجھوڑا۔ وہ بمشکل ہلی۔

''نیند مت خراب کرو میری۔ سیدھی جہنم میں جاؤ گی تم۔'' بند آنکھوں سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے کروٹ بدل لی۔ اس کا موبائل وہیں تکیے کے ساتھ رکھا تھا۔ حیا نے موبائل جھپٹا اور نیچے اتری۔ ٹالی کے بینک کی کرسی کھینچ کر بیٹھی اور اپنے موبائل سے تایا کا نمبر دیکھ کر ڈی جے کے فون پہ ملانے لگی۔ فون نمبرز حیا سلیمان کو کبھی زبانی یاد نہیں رہے تھے۔

نمبر ملا کر اس نے فون کان سے لگایا۔ لمحے بھر کی خاموشی کے بعد وہ مشینی نسوانی آواز ترک میں کچھ بکنے لگی جس کا مطلب یہ تھا کہ ڈی جے ذلیل کا بیلنس بھی ختم تھا۔ اس نے جھنجھلا کر فون کان سے ہٹایا۔ یورپی یونین کا سارا اسکالرشپ استقلال اسٹریٹ اور جواہر میں شاپنگ پہ اڑا دینے والیوں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔

اسی پل فون پھر سے بجا۔ تایا فرقان کالنگ۔ اس نے جھٹ سے کال اٹھائی۔

''ہیلو.....؟''

''حیا..... تمہارے پاس اس نمبر کے علاوہ کون سا دوسرا نمبر ہے؟'' وہ تایا فرقان ہی تھے اور اتنے غصے سے بولے تھے کہ وہ کانپ گئی۔

''جی..... کیا؟''

''حیا! میرے ساتھ بکواس مت کرو، مجھے بتاؤ تمہارے پاس دوسرا کوئی نمبر ہے؟'' وہ نیند سے جاگی تھی اور کبھی بھی اتنی حاضر دماغ نہیں رہی تھی۔ مگر ساری بات سمجھنے میں اسے لمحہ لگا تھا۔

ارم پکڑی گئی تھی۔ ارم آدھی رات کو کسی سے فون پہ بات کرتی پکڑی گئی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''نہیں تایا ابا! میرے پاس یہی ایک نمبر ہے اور دوسرا یفون کا جو آپ کے پاس آل ریڈی ہے۔''

''تمہارے پاس موبی لنک کا کوئی نمبر نہیں ہے؟''

''نہیں تایا ابا! آپ بے شک ابا سے پوچھ لیں۔ یہ نمبر ان کے نام ہے اور میں نے دوسرا نمبر رکھ کر کیا کرنا ہے؟''

''اچھا.....ٹھیک ہے۔'' انہوں نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

اس نے گہری سانس لے کر موبائل کان سے ہٹایا اور دوسرے ہاتھ سے چہرے پہ آئے بال سمیٹ کر پیچھے کیے۔

تو ارم فرقان اصغر پکڑی گئی تھی۔

''میری ارم بھی تو ہے، مجال ہے جو بنا سر ڈھکے کبھی گھر سے نکلی ہو۔''

وہ ارم کے لیے متاسف بھی تھی اور فکر مند بھی، مگر دور اندر دل کے اس پوشیدہ خانے میں جو کوئی شخص دنیا کو نہیں دکھاتا، اسے تھوڑی سی کمینی سی خوشی بھی ہوئی تھی۔

''بہت اچھا ہوا تایا ابا!'' اس دور کے خانے میں کسی نے کہا تھا۔ ''اب تو آپ کو بھی معلوم ہو گیا کہ دوسروں کی بیٹیوں پہ انگلیاں اٹھانے والے لوگوں کے اپنے گھروں پہ وہ انگلیاں لوٹ کر آتی ہیں۔ بہت اچھا ہوا تایا ابا!''

صبح سویرے اٹھتے ہی وہ اسی کرتے، ٹراؤزر پہ ایک ڈھیلا ڈھالا سا سویٹر اور شال لپیٹ کر ''دیا'' اسٹور آ گئی۔ بال اس نے اب کیچر میں باندھ لیے تھے اور اپنے گلابی قینچی چپل پہن لیے تھے۔

اسٹور سے اس نے کارڈ خریدا، ری چارج کیا اور موبائل پہ اماں کا نمبر ملاتی باہر کیفے کے برآمدے میں بچھی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ وہاں فاصلے فاصلے پہ گول میزوں کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ اسٹوڈنٹس صبح صبح ادھر ناشتا کرنے آتے تھے۔ سامنے سبانجی کا خوب صورت فوارہ نصب تھا۔ گول چکر میں مقید فوارہ جس کی پانی کی دھار بہت اوپر جا کر نیچے گرتی تھی۔

''اتنی صبح صبح فون کیسے کیا، خیریت؟'' فاطمہ ذرا فکر مند ہو گئیں۔

''تو کیا میں آپ کو ایسے یاد نہیں کر سکتی؟'' وہ آرام دہ انداز میں ٹیک لگا کر ٹانگ پہ ٹانگ رکھتی ذرا خفگی سے بولی۔

''ہماری پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ ہمیں عموماً مسڈ بیل دیا کرتی ہیں یا پھر کسی ایس ایم ایس ویب سائٹ سے مفت کا ایس ایم ایس کر کے کال کرنے کا کہتی ہیں تو ہم کال بیک کرتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ علی الصبح خود فون کریں گی تو حیرت تو ہو گی نا!''

''بس اماں! غربت ہی اتنی ہے، کیا کریں۔'' وہ قینچی چپلوں میں مقید پیر جھلاتے ہنس کر بولی۔

''ہاں یورپی یونین نے وہ ہزاروں یوروز کا اسکالر شپ تو کسی اور کو دیا تھا نا۔'' فاطمہ کی تشویش ختم ہو چکی تھی اور وہ اسی کے انداز میں بات کر رہی تھیں۔

وہ تو رینی ڈیز کے لیے سنبھال کر رکھا ہے۔''

''کون سے رینی ڈیز؟''

''اسپرنگ بریک اماں، اور یہاں اسپرنگ بریک کے دنوں میں خوب بارش ہوتی ہے۔ اس لیے میں اور ڈی جے اسپرنگ بریک میں پورا ٹرپ کی گھومنے کا سوچ رہے ہیں اور لگتا ہے آج کل آپ صائمہ تائی کی کمپنی میں رہ رہی ہیں، صبح ہی صبح طنز کیے جا رہی ہیں.....اچھا سب کچھ چھوڑیں، یہ بتائیں گھر میں سب خیریت ہے؟''

''ہاں سب ٹھیک ہے۔''

''تایا فرقان کی طرف بھی؟'' اس نے ہاتھ سے ویٹر کو اشارہ کیا۔ وہ قریب آیا تو اس نے مینیو کارڈ پہ بنے ڈونٹ پہ انگلی رکھی، پھر انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا تو وہ سمجھ کر واپس مڑ گیا۔

''ہاں کیوں؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں، مگر رات تایا کا فون آیا تھا۔ اچھا آپ جا کر ان کو کہہ مت آیئے گا۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''لو، میں کیوں کہوں گی؟'' فاطمہ الٹا خفا ہوئیں، مگر وہ جانتی تھی کہ ماؤں کا بھروسا نہیں ہوتا۔ لاکھ کہو کہ نہ بتایئے گا پھر بھی اپنے اگلے پچھلے حساب چکاتے وقت کسی نہ کسی موقع پہ اس بات کو استعمال کر ہی لیتی تھیں، مگر ایک اچھی بیٹی کی طرح سے پوری بات ماں کے گوش گزار کیے بغیر ڈونٹس کہاں ہضم ہونے تھے۔ سو ساری بات دہرادی، بس ارم کا میسج پڑھنے والا قصہ گول کر گئی۔

''اچھا، پتا نہیں، ہمیں تو کچھ نہیں پتا چلا۔'' وہ کچھ دیر اسی بات پہ تبصرہ کرتی رہیں، پھر ایک دم یاد آنے پہ بولیں۔ ''لو، میں بتانا ہی بھول گئی، مہوش کی شادی طے ہوگئی ہے۔'' انہوں نے زاہد چچا کی بیٹی کا نام لیا، جس کی نسبت کافی عرصے سے اپنے ماموں زاد سے طے تھی۔

''اچھا، کب؟'' اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔ ترکی آتے وقت سنا تو تھا کہ اپریل کی کوئی تاریخ رکھیں گے، مگر اسے بھول گیا تھا۔

''ہفتہ ہوگیا ہے رکھے ہوئے، جب بھی بات ہوتی ہے، بتانا بھول جاتی ہوں۔'' پھر انہوں نے جو تاریخ بتائی وہ اپریل میں ان کے اسپرنگ بریک کے درمیان آتی تھی۔

''تب تو ڈی جے اور میں عظیم سلطنتِ ترکیہ کی سیر کر رہے ہوں گے۔''

''سبین کو بلایا تو ہے، مگر کہہ رہی تھی کہ سکندر بھائی کی طبیعت آج کل خراب رہتی ہے، وہ نہیں آسکے گی، میں نے کہا جہان کو بھیج دو، اچھا ہے ساتھ حیا بھی آجائے گی، دونوں شادی اٹینڈ کرلیں گے، مگر وہ کہہ رہی تھی کہ مشکل ہے۔''

اس نے فون کو کان سے ہٹا کر گھورا، اور پھر ہنس دی۔ اماں بھی کبھی کبھی لطیفے سناتی تھیں۔ وہ انتہائی غیر رومانٹک سے ماں، بیٹا کہاں مانتے ایسے رومانٹک ٹرپ کے لیے؟

اس نے سر جھٹک کر موبائل کان سے لگایا۔ فاطمہ کہہ رہی تھیں۔ ''ایک تو تمہاری پھپھو بھی کوئی بات غیر مبہم نہیں کرتیں۔''

''بالکل!'' اس نے تائید کی۔

ویٹر نے چاکلیٹ اور رنگ برنگے دانوں سے سجے دو ڈونٹس پلیٹ میں میز پہ رکھے تو وہ الوداعی کلمات کہنے لگی۔ ارم کے متعلق مزید جاننے کی فی الحال اسے طلب نہیں رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''بیوک ادا؟ پھر بیوک ادا؟''

اس روز وہ شام میں جلدی سوگئی تھی، سو عشاء کے بعد آنکھ کھلی۔ کچھ دیر پڑھتی رہی، پھر روحیل سے اسکائیپ پہ گھنٹہ بھر باتیں کیں اور اسے ترکی کا سفرنامہ سنا کر خوب بور کیا اور اب بھوک لگی تو کچن میں آئی تھی۔ ڈی جے نے آلو، مٹر بنایا تھا جو سالن کم اور کوئی گدلا پانی زیادہ لگ رہا تھا، جس میں مٹر، آلو اور پیاز تیر رہے تھے۔ وہ ناک چڑھاتے ہوئے اس ملغوبے کو گرم کرنے کے لیے پلیٹ میں ڈال ہی رہی تھی کہ ڈی جے نے پیچھے سے آکر بتایا کہ اس نے، ہالے اور انجم باجی کے ساتھ بیوک ادا جانے کا پروگرام بنالیا اور کل صبح چھ بجے کی گورسل شٹل پکڑنی ہے۔

''بیوک ادا؟ پھر بیوک ادا؟'' وہ اوون کا دروازہ بند کرتی چونک کر پلٹی۔ پل بھر میں اس کی آنکھوں میں ناگواری سمٹ آئی تھی۔

''ہالے اور انجم باجی نے پروگرام بنا کر مجھ سے پوچھا تو میں نے ہامی بھرلی۔'' پانی کی بوتل کو کھڑے کھڑے منہ سے لگاتے ہوئے ڈی جے نے شانے اچکائے۔

''اور یقیناً میری طرف سے بھی بھرلی ہوگی۔''

''بالکل!''

''میں کوئی نہیں جارہی بیوک ادا، میری طرف سے انجم باجی کو انکار کردو۔'' وہ پلٹ کر چیزیں اٹھا پٹخ کرنے لگی۔ انداز میں واضح جھنجھلاہٹ تھی۔

''کیوں؟ اتنا تو خوب صورت جزیرہ ہے۔''

''مجھے نہیں جانا ادھر، بس کہہ دیا نا۔'' وہ یفریجریٹر کا اوپر والا فریزر کھولے چند پیکٹ ادھر ادھر کرنے لگی۔ بالوں کا ڈھیلا جوڑا اس کی گردن کی پشت پہ جھول رہا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''مگر کیوں؟''

''وہ عبدالرحمٰن پاشا کا جزیرہ ہے اور میں اس آدمی کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔'' اس نے روٹیوں کا پیکٹ نکال کر فریزر کا دروازہ زور سے بند کیا۔ پیکٹ میز پہ رکھا۔ جمی ہوئی دو روٹیاں نکالیں، اور پلیٹ میں رکھیں۔ ان میدے کی بنی ترک روٹیوں کا نام انہیں معلوم نہیں تھا۔ بس ''دیا'' اسٹور پہ وہ فریزر میں نظر آئی تھیں اور اتنی سمجھ تو انہیں تھی کہ انہیں مائیکرو ویو میں گرم کر کے کھاتے ہیں۔ تب سے وہ یہی روٹیاں کھا رہی تھیں۔

ڈی جے اس کے روٹی اوون میں رکھنے تک سکتے سے باہر آ چکی تھی۔

''عبدالرحمٰن پاشا؟ وہ جس کا ذکر ہماری ہوسٹ آنٹی نے کیا تھا؟''

''ہاں وہی، کرمنل، اسمگلر!''

''مگر اس کا کیا ذکر؟ ہالے نے کہا تھا کہ....''

''ہالے کو چھوڑو، میں سب بتاتی ہوں، پہلے کیپ لاؤ، پھر انجم باجی کو کال کر کے پروگرام کینسل کرو۔''

کھانا کھا کر وہ دونوں باہر آ گئیں۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ دونوں نے اونی سوئیٹر پہن رکھے تھے۔ وہ ڈورم سے بلاک سے نکل کر باتیں کرتے سبزہ زار پہ چلتی گئیں۔ پہلے ڈی جے نے انجم باجی کو فون کر کے معذرت کی اور جب اسے لگا کہ وہ ذرا ناراض ہو گئی ہیں، کیونکہ ان دونوں نے خاصی پاکستانی حرکت کی تھی اور ترکی میں کمٹمنٹ توڑنا بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ سو اس پاکستانی حرکت کو سنبھالنے کے لیے حیا نے فون لے لیا اور انہیں بتایا کہ اس کی پھپھو نے کل اسے اور اس کی فرینڈز کو اپنے گھر انوائٹ کیا ہے۔ سو انجم باجی اس کی دعوت قبول کر کے ان کے ساتھ چلیں، بیوک ادا پھر کسی روز چلے جائیں گے۔ یوں انجم باجی مان گئیں اور اب وہ دونوں چلتے چلتے ''دیا'' اسٹور کے سامنے والے فوارے کی منڈیر پہ آ بیٹھیں۔ فوارے کا پانی چھینٹے اڑاتا ہوا نیچے گر رہا تھا اور اس پانی میں بنتے مٹتے بلبلوں کو دیکھتے ہوئے حیا نے ساری کہانی الف تا یے اس کو سنا ڈالی۔

ڈی جے کتنی دیر تو چپ بیٹھی رہی، پھر آہستہ آہستہ سوچ کر کہنے لگی۔

''تو وہ پنکی میجر احمد تھا، جو ہمیں مارکیٹ میں ملا تھا؟''

''بالکل!''

''اور ڈولی اصلی خواجہ سرا تھا؟''

''شاید، وہ ان کا پرانا ملازم ہے۔''

''اور تم منہ اٹھا کر اس کے گھر میں چلی گئیں؟''

''منہ اٹھا کر کیا! میرا پاسپورٹ تھا اس پرس میں اور اچھا ہی ہوا، ساری بات تو کلیئر ہو گئی۔'' وہ اپنی غلطی مانتی، یہ ناممکن تھا۔

''مگر تم نے اسے فون کر کے بہت غلطی کی۔''

''تو بھگت رہی ہوں نا وہ غلطی۔ اس ظالم شخص نے یہ نہیں سوچا کہ جہان کے پاس اس ریسٹورنٹ کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس نے اسی کو ایسے تباہ برباد کر دیا۔ اب یقیناً وہ اس کی لینڈ لیڈی کو شہہ دے گا کہ وہ ریسٹورنٹ واپس حاصل کر لے۔'' وہ سخت نادم تھی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے، وہ تم سے واقعی محبت کرتا ہے؟''

''کسی کو اذیت پہنچانا محبت نہیں ہوتی۔''

کچھ دیر وہ یوں ہی اسی بات کو ہر پہلو سے ڈسکس کرتی رہیں، پھر ڈی جے نے ہاتھ اٹھا کر حتمی انداز میں کہا۔

''ایک بات تو طے ہے، اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ تمہارے پیچھے نہیں آئے گا۔''

''ہوں!'' وہ سر ہلا کر اٹھ گئی۔ رات بہت بیت چکی تھی، اب ان کو واپس جانا تھا۔

سبزہ زار پہ چلتے ڈورم بلاک کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اپنے مسئلے کسی کو بتانے سے وہ حل نہیں ہوتے۔ دل کا بوجھ کسی کے سامنے ہلکا کرتے کرتے بعض دفعہ ہم اپنی ذات کو ہی دوسرے کے سامنے ہلکا کر دیتے ہیں۔ پریشانیاں بتانے سے کم ہو سکتی ہیں،

Downloaded From http://paksociety.com

ختم نہیں، جیسے اس کی پریشانی ابھی تک اس کے ساتھ تھی۔

☆ ☆ ☆

کلاس روم کی کھڑکیوں سے سورج کی روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔ صبح کی نم ہوا بار بار شیشوں سے ٹکرا کر پلٹ جاتی، جیوانفارمیشن سسٹم کے پروفیسر اپنے مخصوص انداز میں لیکچر لے رہے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھی ڈی جے بظاہر بہت توجہ سے لیکچر سنتی رجسٹر پہ لکھ رہی تھی۔ وہ ہر چند لفظ لکھ کر سر اٹھا کر پروفیسر کو دیکھتی، ذرا غور سے ان کے اگلے الفاظ سنتی اور پھر سمجھ کر سر ہلاتی دوبارہ لکھنے لگ جاتی۔

حیا نے ایک نگاہ اس کے رجسٹر پہ ڈالی۔ وہاں اس کا چلتا قلم لکھ رہا تھا۔

''تم لوگوں کا اسپرنگ بریک کا کیا پروگرام ہے؟ کدھر جاؤ گے اور کون کون تمہارے ساتھ جا رہا ہے؟'' آخری لفظ لکھ کر اس نے گردن سیدھی کر کے پورے اعتماد سے پروفیسر کو دیکھتے ہوئے رجسٹر دائیں جانب بیٹھے معتصم کو پاس کر دیا۔ یہ ان کی اور فلسطینیوں کی واحد مشترکہ کلاس تھی۔

معتصم نے ایک نگاہ کھلے رجسٹر پہ ڈالی، اور پھر سر جھکا کر کچھ لکھنے لگا۔ جب رجسٹر واپس ملا تو اس پہ انگریزی میں لکھا تھا۔

''ہم ٹرکی کے ٹور پہ جا رہے ہیں۔ سات دن میں سات شہر۔ ہم پانچوں اور ٹالی۔ اور تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟''

''اف پھر یہ ٹالی!'' ڈی جے کوفت سے جواب لکھنے لگی۔

''ہم بھی سات دنوں میں سات شہر گھومنے کا سوچ رہے ہیں۔''

اس نے رجسٹر آگے پاس کر دیا اور پھر ذرا ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

معتصم اب صفحے پہ چند الفاظ گھسیٹ رہا تھا۔

''تو ہمارے ساتھ چلو نا۔''

''تم لوگوں کو کب نکلنا ہے؟''

''پہلی چھٹی والے دن۔'' معتصم نے اپنا پروگرام بتایا۔

''ہم نے دوسری چھٹی پہ نکلنا ہے، سو تمہارے ساتھ مشکل ہوگا۔ چلو پھر چھٹیوں کے بعد ملیں گے۔''

''نو پرابلم!'' ساتھ میں معتصم نے ایک مسکراتا ہوا چہرہ بنایا۔

حیا دانت پہ دانت جمائے بمشکل جمائیاں روکنے کی سعی کر رہی تھی۔ اسے اس کلاس سے زیادہ بورنگ کوئی کلاس نہیں لگتی تھی۔

دفعتاً معتصم نے رجسٹر ڈی جے کی جانب بڑھایا تو اس پہ لکھے الفاظ کو پڑھ کر ڈی جے نے رجسٹر حیا کے سامنے رکھ دیا۔ حیا نے ذرا سی گردن جھکا کر دیکھا۔ اوپر اس نے انگریزی میں لکھا تھا۔ ''ٹرانسلیٹ اِن اردو پلیز۔'' اس کے نیچے عربی عبارت لکھی تھی۔ ''کَیفَ حَالُکَ؟''

حیا نے قلم انگلیوں کے درمیان پکڑا اور اردو ہجوں میں لکھا۔

''آپ کا کیا حال ہے؟'' اور رجسٹر واپس کر دیا۔ معتصم اور حسین کو آج کل ڈی جے سے اردو الفاظ سیکھنے کا شوق چڑھا ہوا تھا۔ اس کلاس میں وہ یوں سارا وقت عربی الفاظ لکھ کر ان کو دیتے تھے۔

چند لمحوں بعد اس نے پھر صفحہ حیا کے سامنے کیا۔ اب کے اس پہ لکھا تھا ''حالی بخیر''

حیا نے جیسے چڑ کر نیچے لکھا۔

''میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ کی خیریت ٹھیک چاہتی ہوں۔''

''اتنا لمبا کیوں لکھا؟'' ڈی جے نے حیرت سے سرگوشی کی۔

''اگر چھوٹا لکھتی تو یہ فوراً ہی اسے سیکھ کر مجھ سے آج ہی کی تاریخ میں پوری فیروز اللغات لکھواتا۔ اب اچھا ہے نا، پورا دن ''ٹھیک'' پڑھنے میں گزار دے گا۔''

Downloaded From http://paksociety.com

اور معتصم سے کلاس کے اختتام تک ''ٹھیک'' ٹھیک سے نہیں پڑھا گیا۔

کلاس ختم ہوئی تو وہ واپس ڈورم میں آئیں۔ منہ ہاتھ دھو کر تیار ہونے میں بھی کافی وقت لگ گیا۔ اس نے ایک مور پنکھ کے سبز رنگ کا پاؤں کو چھوتا فراک پہنا۔ فراک کی آستین تنگ چوڑی دار تھی اور نیچے پاجامہ تھا۔ پورا لباس بالکل سادہ تھا۔ بال اس نے کھلے چھوڑ دیے اور کاجل اور نیچرل پنک لپ اسٹک لگا کر ڈی جے کی طرف پلٹی۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟''

ڈی جے، جو بالوں میں برش کر رہی تھی، رک کر اسے دیکھنے لگی۔

''بالکل پاکستان کا جھنڈا لگ رہی ہو۔''

''دفع ہو جاؤ۔''

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ دونوں انجم باجی اور ہالے کے ساتھ جہانگیر میں واقع پھپھو کے گھر کے سامنے کھڑی تھیں۔

''پھپھو کو بتا تو دیا تھا نا؟ یہ نہ ہو کہ وہ کہیں، میں نے تو انوائٹ ہی نہیں کیا تھا۔'' ڈی جے نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں ہاں، بتا دیا تھا۔'' اس نے سرگوشی میں ڈی جے کو جواب دیتے ہوئے ڈور بیل بجائی۔

پھپھو ان سے بہت تپاک سے ملیں۔ لونگ روم میں بیٹھنے تک ہی تعارف کا مرحلہ تمام ہو گیا۔

''حیا! آج تو تم نے گھر میں رونق کر دی ہے۔'' وہ واقعتاً بہت خوش تھیں۔ حیا ان کے گھر کو اپنا سمجھ کر دوستوں کو ساتھ لائی ہے، یہ خیال ہی ان کو بے حد مسرت بخش رہا تھا۔

وہ ان دو ماہ میں چند ایک بار ہی پھپھو کے گھر آئی تھی اور پہلی دو دفعہ کے بعد جہاں کبھی گھر نہیں ملا تھا، نہ ہی وہ اسے بتا کر آتی تھی۔ اس دفعہ تو اس نے بالکل بھی نہیں بتایا۔ وہ اندر ہی اندر خود کو اس کا مجرم سمجھ رہی تھی، اس کے ٹوٹے بکھرے ریسٹورنٹ کو یاد کر کے وہ اکثر خود کو ملامت کرتی تھی۔

''آپ کا گھر بہت پیارا ہے آنٹی!'' انجم باجی نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے ستائشی انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اور یہ رگز تو بہت ہی پیارے ہیں۔'' ہالے نے فرش پہ بچھے رگز کی جانب اشارہ کیا۔

''اور میری پھپھو بھی بہت پیاری ہیں۔'' وہ پھپھو کے شانوں کے گرد بازو حمائل کیے مزے سے بولی تو پھپھو ہنس دیں۔ ڈی جے نے آہستہ سے سرگوشی کی۔ ''اور پھپھو کا بیٹا بھی بہت پیارا ہے۔''

حیا نے زور سے اس کا پاؤں دبایا۔ وہ بس ''سی'' کر کے رہ گئی۔

''چلو تم لوگ ادھر بیٹھو، میں بس ابھی آئی۔'' اچھے میزبانوں کی طرح پھپھو مسکرا کر کہتے ہوئے راہداری کی طرف مڑ گئیں جس کے دوسرے سرے پہ کچن تھا۔ کچن کا دروازہ کھلا تھا سو صوفوں پہ بیٹھے ہوئے انہیں کچن کا آدھا حصہ نظر آتا تھا۔

''پھپھو!'' وہ ان کے پیچھے ہی چلی آئی۔

''ارے! تم کیوں آ گئیں؟ ان کو کمپنی دو نا۔'' وہ فریزر سے کچھ جمے ہوئے پیکٹ نکال رہی تھیں۔

''وہ ایک دوسرے کو کافی ہیں۔ آپ سنائیں! انکل اوپر ہیں؟ میں نے سوچا ان سے مل لوں۔ جب بھی آتی ہوں، عموماً ان کے سونے کا وقت ہوتا ہے۔ ملاقات ہی نہیں ہو پاتی۔'' وہ یہ تو نہیں کہہ پائی کہ جب بھی وہ آتی تھی، پھپھو ان کو دوا دے کر سلا دیتی تھیں تاکہ کوئی بدمزگی نہ ہو۔

''ہاں! شاید جاگے ہوئے ہوں۔ تم اوپر دیکھ لو۔''

''اچھا۔ اور..... جہان کے ریسٹورنٹ کا کیا بنا؟ کچھ لوگوں نے نقصان کر دیا تھا شاید۔'' ذرا سرسری انداز میں پوچھا۔

''ہاں! اچھا خاصا نقصان ہو گیا ہے اس کا۔ کافی چڑ چڑا رہنے لگا ہے اس دن سے..... بس دعا کرنا۔'' وہ پُرملال لہجے میں کہتے ہوئے کیبنٹ سے کچھ نکال رہی تھیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ واپس آئی تو ڈی جے اور ہالے پھپھو کے گھر کی آرائش پہ تبصرہ کر رہی تھیں، جبکہ انجم باجی بہت غور سے ٹی وی پہ کارٹون نیٹ ورک دیکھ رہی تھیں۔ جس کے کارٹون ترک میں ڈب کیے گئے تھے۔ سبانجی میں جو واحد شے دیکھنے کا موقع نہیں ملتا تھا، وہ ٹی وی تھا۔

ان کو مصروف پا کر وہ زینہ چڑھنے لگی۔ کندھے سے لٹکتے شیفون کے سبز ڈوپٹے کا کنارہ زینوں پہ پھسلتا اس کے پیچھے اوپر آ رہا تھا۔

سکندر انکل کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ہولے سے انگلی کی پشت سے دستک دی، پھر ڈورناب گھما کر دروازہ دھکیلا۔

کمرے میں نیم تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ باہر دھوپ تھی، مگر بھاری پردوں نے اس کا راستہ روک رکھا تھا۔ سکندر انکل بستر پہ لیٹے تھے، گردن تک کمبل ڈالا تھا، اور آنکھیں بند تھیں۔

''انکل؟'' اس نے ہولے سے پکارا۔ وہ ہنوز بے حس و حرکت پڑے رہے۔ وہ چند لمحے تاسف سے ان کا پژمردہ، بیمار وجود دیکھتی رہی، پھر ہولے سے دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔

وہ سیڑھیوں کے وسط میں تھی، جب بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ وہیں ریلنگ پہ ہاتھ رکھے، رک کر دیکھنے لگی۔ صوفوں پہ آرام سے بیٹھی لڑکیاں بھی تیر کی طرح سیدھی ہوئی تھیں۔

دروازہ کھول کر جہان اندر داخل ہو رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس، دوسرے بازو پہ کوٹ ڈالے، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے، ہلکی گرے شرٹ کی آستین کہنیوں تک موڑے وہ بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ پہلے سے کمزور، اور مرجھائی ہوئی رنگت۔ دروازہ بند کر کے وہ پلٹا تو ایک دم ٹھٹک کر رکا۔

''السلام علیکم'' وہ جو سیڑھیوں کے وسط میں کھڑی تھی، سلام کر کے زینے اترنے لگی۔ جہان نے چونک کر سر اٹھایا، پھر اسے دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔

''پھپھو سے ملوانا تھا اپنی فرینڈز کو۔''

''نائس ٹو میٹ یو۔'' بغیر کسی مسکراہٹ کے اس نے کھڑے کھڑے مروتاً کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر ان ہی سنجیدہ تاثرات کے ساتھ کچن کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ؟'' انجم باجی نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''پھپھو کا بیٹا جہان۔'' وہ قدرے خفت سے تعارف کرواتے ہوئے آخری زینہ اتر کر صوفے پہ آ بیٹھی۔

وہاں سے کچن کا آدھا منظر دکھائی دیتا تھا۔ جہان کاکوٹ راہداری میں لگے اسٹینڈ پہ لٹکا تھا، اور بریف کیس کاؤنٹر پہ۔ وہ خود بھی کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا پانی کی بوتل منہ سے لگائے گھونٹ بھر رہا تھا۔ ساتھ ہی پھپھو کیبنٹ سے کچھ نکالتی دکھائی دے رہی تھیں۔ گھر چھوٹا تھا اور راہداری مختصر، سو کچن میں گفتگو کرتے افراد کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔

''نے ضمن جلدی؟'' وہ بوتل رکھ کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''حمن سمدی۔''

جواباً وہ ذرا اکھڑے انداز میں درشتی سے ترک میں کچھ بولا تو ڈی جے سے کچھ کہتی ہالے نے چونک کر کچن کی طرف دیکھا۔

''جہان!'' پھپھو نے تنبیہی نگاہوں سے اسے گھورا۔ اس نے جواب میں خاصی تلخی سے کچھ کہتے ہوئے بوتل میز پہ رکھی۔

ہالے نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔ حیا اس کے چہرے کے الجھے تاثرات بغور دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہالے ذرا سوچ کر بولی۔

''حیا! استقلال اسٹریٹ میں آج Levi's پہ سیل لگی ہے، وہ چیک نہ کر لیں؟''

اٹھنے کا ایک بہانہ۔ حیا گہری سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔ ڈی جے اور انجم باجی بھی کچھ کچھ سمجھ پا رہی تھیں۔

''ہاں! چلو میں ذرا پھپھو کو بتا دوں۔'' وہ کچن کی طرف آ گئی۔ باقی لڑکیاں صوفوں سے اپنے اپنے بیگ اٹھانے لگیں۔

''اچھا پھپھو! ہم لوگ چلتے ہیں۔ ہمیں آگے شاپنگ پہ جانا ہے۔'' کچن کی چوکھٹ میں کھڑے ہو کر اس نے جہان سکندر کو قطعاً

Downloaded From http://paksociety.com

نظر انداز کرتے ہوئے بتایا۔ وہ فریج کا دروازہ کھولے کھڑا کچھ نکال رہا تھا۔

''ارے! ابھی تو آئی تھیں۔ ابھی سے جا رہی ہو؟'' پھپھو ایک ملامت زدہ نگاہ جہان پہ ڈال کر تیزی سے اس کی طرف آئیں۔ وہ بے نیازی سے کھڑا پانی پیتا رہا۔ پھر وہ اصرار کرتی رہیں، مگر وہ نہیں رکی۔ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہ بظاہر بہت خوش دلی سے ان کو خدا حافظ کر کے باہر نکلی۔

ڈور میٹ پہ رکھے اپنے جوتوں میں پاؤں ڈالنے تک اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ سپاٹ سی سختی لے لی تھی۔ وہ ان چاروں کے آگے خاموشی سے سڑک کے کنارے چلنے لگی۔ جب وہ کالونی کا موڑ مڑ کر دوسری گلی میں داخل ہوئیں تو وہ تیزی سے ہالے کی جانب گھومی۔

''ہالے.....! جہان نے پھپھو سے کیا کہا تھا؟''

''جانے دو حیا!'' ہالے نے نگاہیں چرائیں۔ اسکارف میں لپٹا اس کا چہرہ قدرے پھیکا سا تھا۔

''ہالے! مجھے بتاؤ، اس نے کیا کہا تھا۔''

''حیا! وہ کسی اور بات پہ اپ سیٹ ہوگا۔ تم چھوڑ دو اس قصے کو۔''

''ہالے نور چولغ لو! میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔'' اس نے کندھوں سے پکڑ کر ہالے کو جھنجھوڑتے ہوئے اس کا پورا نام لیا۔ (چولغ لو یعنی کہ اس گاؤں کی ہالے نور)

''اچھا! ٹھیک ہے پھر سنو۔ اس نے پہلے پوچھا کہ یہ کب آئی ہیں، پھر کہا کہ ان کے لیے اتنا پھیلاوا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر اس نے کہا کہ میں سارا دن کتوں کی طرح اس لیے نہیں کماتا کہ آپ یوں ضائع کر دیں۔''

اس کے کندھوں پہ رکھے حیا کے ہاتھ نیچے جا گرے۔ بہت آہستہ سے وہ پلٹ گئی۔

''حیا..... چھوڑ دو!'' انجم باجی نے پیچھے سے کندھا تھپتھپا کر اسے تسلی دی۔

''چھوڑ ہی تو دیا ہے۔ آج کے بعد میں کبھی پھپھو کے گھر قدم نہیں رکھوں گی۔ میں اتنی ارزاں تو نہیں ہوں کہ میرے مغرور رشتہ دار میری یوں توہین کریں۔''

وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سیدھ میں دیکھتے ہوئے ان کے آگے چلتی جا رہی تھی۔ آج اسکا دل بہت بری طرح دکھا تھا۔ اس نے واقعی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ دوبارہ پھپھو کے گھر نہیں جائے گی۔

☆ ☆ ☆

رات سبانجی کے گرد و نواح پہ اپنے پر پھیلائے ہوئے تھی۔ سبزہ زاروں پر جمی برف اب پانی بن کر جھیل میں بہتی تھی۔ بہار کی تازہ ہوا ہر سو پھول کھلا رہی تھی۔ ڈورم بلاکس کی چوکور کھڑکیاں باہر سے روشن دکھائی دیتی تھیں۔ رات بیت چکی تھی، مگر ہاسٹل جاگ رہا تھا۔ اسپرنگ بریک شروع ہونے میں چند دن ہی تھے، اور چھٹیوں سے پہلے یہ ان کی ڈورم میں آخری راتیں تھیں۔ پھر باری باری سب کو اپنے اپنے ٹور پہ نکل جانا تھا۔

خدیجہ، حیا، ٹالی اور چیری کے ڈورم میں رونق اپنے عروج پہ تھی۔ حیا کی کرسی پہ سوئٹرز لینڈز کی سارہ ایکسٹینشن کارڈ سور کان سے لگائے بیٹھی تھی۔ مسکراہٹ دبائے، انگلی پہ سنہری بالوں کی لٹ لپیٹتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

''میرا فیورٹ کلر تو بلیو ہے۔ اوہ! تمہارا بھی یہی ہے مومن؟'' وہ کہنے کے ساتھ بمشکل ہنسی روکے ہوئے تھی۔ مومن کافی دنوں سے اس کی توجہ لینے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ اس کو دکھانے کے لیے ہالینڈ کے لطیف کے ساتھ نظر آتی تھی۔ لطیف خالص ڈچ اور کیتھولک تھا، مگر افغانستان میں پیدا ہونے کے سبب اس کے ماں باپ نے اس کا نام اپنے کسی افغان دوست لطیف کے نام پہ رکھا تھا۔ یوں وہ تمام فلسطینیوں کا بہت اچھا دوست بن چکا تھا، سوائے مومن کے۔

سامنے ڈی جے کی کرسی پہ ہالے بیٹھی تھی اور اس کے مقابل کاؤچ پہ اسپین کی سینڈرا تھی۔ وہ دونوں اپنے درمیان ایک میگزین

Downloaded From http://paksociety.com

کھولے تبصرہ کر رہی تھیں۔

''اس تھیم کے ساتھ یہ کنٹراسٹ کچھ اوور لگے گا.....نہیں؟'' ہالے متذبذب سی سینڈرا سے پوچھ رہی تھی۔

چیری اپنے بینک کی سیڑھی کے ساتھ کھڑی اپنے Kipoa آئل کی آدھی شیشی ان کو دکھاتے ہوئے بار بار نفی میں سر ہلاتے ہوئے ''آئی ڈونٹ بلیوو دس!'' کہے جا رہی تھی۔ کسی لڑکی نے کچن میں رکھا اس کا تیل استعمال کر کے اوپر چٹ لگا کر معذرت کر لی تھی کہ ''چونکہ میں جلدی میں ہوں، سو پوچھ نہیں سکی۔'' اور چیری کو جب سے ان چند بوندوں کا غم کھائے جا رہا تھا۔

''ان چینیوں کے دل بھی اپنے قد کی طرح ہوتے ہیں۔ چھوٹے اور پست۔''

ٹالی جو اوپر اپنے بینک پہ بیٹھی حیا کو اسرائیلی نامہ سنا رہی تھی، لمحہ بھر کو بات روک کر چیری کو دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر سر جھٹک کر بات کا وہیں سے آغاز کیا جہاں چھوڑی تھی۔

''You know, in Israel, we have such citrus that..

ٹالی کے نزدیک دنیا کا سب سے رسیلا پھل اسرائیل کا تھا، سب سے میٹھا پانی، سب سے خالص شہد، سب سے خوشبودار پھل، اور سب سے سہانا موسم اسرائیل کا تھا۔ وہ کہتی تھی ''اسرائیل جنت ہے، مقدس اور بابرکت سرزمین ہے۔'' اور اس کے جاتے ہی حیا اور ڈی جے اس کے فقرے میں یوں ترمیم کر لیتیں کہ ''فلسطین جنت ہے۔ مقدس اور بابرکت سرزمین ہے۔''

اب بھی حیا بہت انہماک سے دونوں ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ جو بھی تھا اسرائیل نامہ سننے میں مزا بہت آتا تھا۔

دھیمی آواز میں بات کرنے کے باوجود ان سب کی آوازوں نے مل کر شور کر رکھا تھا اور اس سارے شور میں ڈی جے اپنے بینک کے اوپر بستر میں لیٹی تکیہ منہ پہ رکھے ہوئے تھی۔

ان کی آوازیں بلند ہوتی گئیں تو اس نے منہ سے تکیہ ہٹایا اور چہرہ اوپر کر کے بے زاری سے ان کو مخاطب کیا۔

''پلیز! شور مت کرو۔ میرے سر میں درد ہے۔ مجھے سونے دو۔''

''او کے او کے۔'' ہالے نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ سب نے ''شش شش'' کر کے ایک دوسرے کو چپ کروایا اور دھیمی دھیمی بڑبڑاہٹوں میں بولنے لگیں۔

ڈی جے واپس لیٹ گئی اور تکیہ منہ پہ رکھ لیا۔

''ہاں چاند.....میں چاند کو ہی دیکھ رہی تھی۔'' سارہ جو اپنی لٹ کو انگلی پہ مروڑتے، مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی، دوسری طرف کچھ سن کر ذرا گڑبڑائی۔ ''اچھا! آج چاند نہیں نکلا؟ اوہ.....! میں نے شاید پھر اپنے تصور میں دیکھا تھا۔''

''مجھے یہی کلر اسکیم چاہیے اور اگر اس کے ساتھ ہم یہ پھول کر لیں تو وہ میچ کر جائیں گے، پھر یہ رنگ۔''

سینڈرا میگزین کے صفحے کو پلٹ کر پیچھے سے کوئی دوسرا صفحہ نکال کر ہالے کو دکھانے لگی۔ آہستہ آہستہ ان کی آوازیں پھر سے بلند ہونے لگیں۔

چند ثانیے بعد ڈورم میں پھر سے شور مچا تھا۔

''کین سم ون پلیز شٹ اپ؟'' ڈی جے ضبط کھو کر اٹھی اور زور سے چلائی۔ وہ پچھلے دو گھنٹوں میں کئی دفعہ ان کو خاموش ہونے کو کہہ چکی تھی، مگر بار بار لڑکیوں کی آوازیں بلند ہو جاتی تھیں۔ لیکن اس کے یوں چلانے پر ایک دم سے ڈورم میں آوازیں فوراً بند ہو گئیں۔

''بس! تم آرام کرو۔ ہم چپ ہیں۔ اب سب آہستہ بولو، اچھا!'' حیا نے جلدی سے مسکرا کر اسے تسلی دی۔ وہ کچھ بڑبڑاتے ہوئے واپس لیٹ گئی اور کمرے میں سب مدھم سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔

چند پل مزید سرکے، پھر.....

''اسرائیل میں ہمارا مقدس درخت.....'' سب سے پہلے ٹالی کی آواز بلند ہوئی تھی، پھر سارہ، پھر ہالے اور پھر چیری جو ابھی تک

Downloaded From http://paksociety.com

سب کو متوجہ کرنے کی سعی کرتے ہوئے انہیں بوتل دکھا رہی تھی۔

''مطلب، یہ کہاں کی اخلاقیات ہیں کہ کسی کا تیل اس سے پوچھے بغیر استعمال کرلیا جائے۔'' شور واپس لوٹ رہا تھا۔

ڈی جے ایک دم اٹھی، کمبل اتار کر پھینکا، بینک کی سڑھیاں پھلانگ کر اتری۔ اپنی میز پہ رکھا سوئیٹر گردن میں ڈالا، ساتھ رکھی تین کتابیں اٹھائیں، تہہ کردہ عینک کھول کر آنکھوں پہ لگائی اور خاموشی سے کسی کی طرف بھی دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔

اس نے اپنے پیچھے دھڑام سے دروازہ بند کیا تھا۔

ڈورم میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

سارہ نے بنا کچھ کہے ریسور کریڈل پہ رکھ دیا۔ چیری نے خفت سے اپنی بوتل واپس بیگ میں رکھی۔ ہالے اور سینڈرا نے میگزین بند کردیا۔ بہت سی نادم نگاہوں کے تبادلے ہوئے۔

''وہ ناراض ہوگئی ہے، اب کیا کریں؟'' ہالے بہت آہستہ سے بولی۔

''ٹھہرو! میں اسے مناتی ہوں۔'' حیا نے کمبل پرے ہٹایا اور بینک کی سڑھیاں اتر کر نیچے آئی۔ میز پہ رکھا اپنا دوپٹا اٹھایا اور چپل پہنتے ہوئے باہر نکل گئی۔ پیچھے کمرے میں ابھی تک سناٹا چھایا تھا۔

اسٹڈی ساتھ ہی تھی۔ اسے پتا تھا، ڈی جے وہی ہوگی۔ اس نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ سامنے رائٹنگ ٹیبل پہ کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ چوکھٹ سے اس کا نیم رخ ہی نظر آتا تھا، پھر بھی وہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ رو رہی ہے۔

اس کا دل ایک دم بہت زیادہ دکھا۔ وہ دبے قدموں چلتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

''ڈی جے!''

خدیجہ بائیں کنپٹی کو انگلی سے مسلتے، چہرہ کتاب پہ جھکائے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ڈی جی! وی آر رئیلی سوری۔'' وہ کرسی کھینچ کر اس کے ساتھ بیٹھی اور اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ ڈی جے نے سختی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اسے بے حد ملال ہوا۔

''سوری یار! ہم نے تمہارا خیال نہیں کیا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

وہ جواب دیے بنا یوں ہی کنپٹی کو انگلی سے مسلتی کتاب پہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''سر میں درد ہے؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔ ڈی جے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹیبلٹ لی ہے کوئی؟''

''ہاں!'' وہ ہتھیلی کی پشت سے گیلے رخسار گڑتے ہوئے بولی تو آواز بھاری تھی۔

''صرف یہ ہی بات ہے؟ اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''مجھے گھر یاد آرہا ہے۔''

''تو رو کیوں رہی ہو؟ سمسٹر ختم ہونے کے بعد ہم نے گھر تو چلے جانا ہے نا۔''

''سمسٹر ختم ہونے میں بہت دیر ہے۔'' اس نے چہرہ اٹھا کر بے چارگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

''دیر کہاں؟ فروری میں ہم ادھر آئے تھے، مارچ گزر گیا، اپریل گزر رہا ہے، مئی آنے والا ہے، جون میں ایگزامز ہوں گے اور جولائی میں ہم پاکستان ہوں گے۔ پانچ ماہ تو ختم بھی ہوگئے۔'' ڈی جے بھیگی آنکھوں سے مسکرادی۔

''کیا زندگی اتنی جلدی گزر جاتی ہے؟''

''اس سے بھی جلدی گزر جاتی ہے۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور ہمارا وقت ختم ہوجاتا ہے..... اختتام..... دی اینڈ..... خلاص!'' اس نے ہاتھ جھاڑ کر جیسے بات ختم کی۔

Downloaded From http://paksociety.com

ڈی جے چند لمحے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

''حیا! میں نے کل اپنی امی کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ بہت بری طرح رو رہی تھیں۔ اتنی بری طرح کہ میرا دل ڈر رہا ہے۔ پتا نہیں، گھر میں سب ٹھیک بھی ہیں یا نہیں۔ میں گھر کا آخری بچہ ہوں اور آخری بچوں کے حصے میں ہمیشہ بوڑھے ماں باپ آتے ہیں۔ میرا دل ان کے لیے دکھتا ہے حیا!''

''میں سمجھ سکتی ہوں، مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تین ماہ تو ہم نے یہاں گزارنے ہیں نا۔''

''ہم پاکستان چلے جائیں؟''

''تم جانتی ہو یہ ناممکن ہے۔ ہم نے کانٹریکٹ سائن کیا ہے۔ ہم پانچ ماہ ختم ہونے تک ترکی نہیں چھوڑ سکتے۔''

''میں مستقل جانے کی بات نہیں کر رہی۔ بس چند دن کے لیے۔ اسپرنگ بریک میں ہم اسلام آباد چلے جائیں۔''

حیا نے گہری سانس لی۔

''میری بھی کزن کی شادی ہے، مگر میں اسے قربان کر رہی ہوں۔ صرف اس لیے کہ اگر ہم ابھی پاکستان گئے تو واپس آتے ہوئے ہمارا دل خراب ہوگا اور پھر یوں ترکی میں اکیلے گھومنے پھرنے کا موقع ہمیں کبھی نہیں ملے گا۔''

''اکیلے!'' ڈی جے نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ ''تمہیں پتا ہے، ہم دونوں نے یہ اسکالرشپ پروگرام کیوں اپلائی کیا تھا؟ کیونکہ ہم دونوں کو اکیلے آزادی سے وقت گزارنے کا شوق تھا۔ ایسی آزادی جس میں ابو اور بھائیوں کی روک ٹوک نہ ہو۔ مگر انسان آزاد تب ہی ہوتا ہے جب وہ تنہا ہوتا ہے اور یہ وہی تنہائی قید کر لیتی ہے۔ ہر آزادی میں قید چھپی ہوتی ہے، جیسے اب ہم ترکی میں قید ہیں اور مجھے لگتا ہے ہم کبھی پاکستان واپس نہیں جا سکیں گے۔''

حیا نے جیسے تاسف سے نفی میں گردن ہلائی، پھر نگاہ میز پہ رکھی ڈی جے کی موٹی سی فلسفے کی کتاب پہ پڑی جس کے سرورق پہ سقراط کی تصویر بنی تھیں۔ اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

''پرے ہٹاؤ ان بوڑھے انکل کو۔ انہی کو پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہوا ہے۔''

''سقراط کو کچھ مت کہو۔'' ڈی جے نے تڑپ کر کتاب پیچھے کی۔ ''افلاطون گواہ ہے کہ سقراط نے کس عظمت و بہادری سے زہر کا پیالا پیا تھا۔''

''میری تو سات نسلوں پہ احسان کیا تھا۔'' وہ تنک کر کہتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ ''اور ہم کوئی پاکستان نہیں جا رہے۔ سات دن اور ترکی کے سات شہر۔ یہ پروگرام ہے ہمارا، ڈن؟''

''ڈن!'' ڈی جے مسکرا دی۔

''اور سنو! آج ٹائم چینج ہوگیا ہے۔ گھڑی ایک گھنٹہ آگے کر لو۔''

وہ ڈی جے کو نارمل ہوتا دیکھ کر ٹالی کا اسرائیل نامہ سننے واپس چلی گئی۔

''اوہ! نہیں، یہاں بھی وہی مشرف والا نیا ٹائم، پرانا ٹائم!'' ڈی جے نے جھنجھلاتے ہوئے کتاب کھول لی۔ اسے نئے ٹائم، پرانے ٹائم سے زیادہ کوفت کسی شے سے نہیں ہوتی تھی۔

☆ ☆ ☆

تاقسم اسکوائر کا مجسمہ آزادی بہار کے پھولوں کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور مجسمے کے گرد دائرے میں اگی گھاس پہ سرخ، زرد اور سفید ٹیولپس کھلے تھے۔ فضا میں تازہ پکے پھلوں کی رسیلی مہک تھی۔

وہ دونوں اس ٹھنڈی، میٹھی ہوا میں ساتھ ساتھ چلتی، استقلال اسٹریٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ دونوں نے سیاہ کوٹ پہن رکھے تھے اور بازو میں بازو ڈال رکھا تھا۔ وہ اتنی دفعہ استقلال اسٹریٹ آ چکی تھیں کہ بہت سی دکانیں تو انہیں حفظ ہو چکی تھیں۔ اس کے باوجود وہ آج تک اس طویل ترین گلی کے اختتام تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

ان کے تمام دوست اور ڈورم فیلوز کل ہی اپنے ٹورز پہ نکل چکے تھے۔ انہوں نے آج سارا دن استقلال اسٹریٹ میں شاپنگ کر کے کل صبح بس سے Cappadocia جانا تھا۔ آج وہ خوب بھاؤ تاؤ کر کے شاپنگ کرنے کا پروگرام بنا کر آئی تھیں، کیونکہ ویسے بھی پاکستانی سیاحوں کے لیے ترک فوراً نرخ کم کر دیتے تھے۔

''سات دن..... سات شہر! کتنا مزا آئے گا نا!'' ڈی جے نے چشم تصور سے خوب صورت ترکی کو دیکھتے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔

''مزا تو چھوٹا لفظ ہے ڈی جے! مجھے تو خود پہ رشک آنے لگا ہے۔ کیا زندگی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔؟''

وہ دونوں استقلال اسٹریٹ میں داخل ہو گئی تھیں۔ وہاں ہمیشہ کی طرح رش تھا۔ دونوں اطراف میں بنے ریسٹورنٹس اور دکانوں کی رونق عروج پہ تھی۔

''ترکی کا نقشہ ہمارے پاس ہے۔ ہم روز ایک شہر جائیں گے۔ ایک رات ادھر قیام کریں گے اور پھر وہاں سے قریبی شہر کی بس پکڑ کر آگے چلے جائیں گے۔ یوں سات دنوں میں ہمارے سات شہر ہو جائیں گے۔''

''اور کپادوکیہ میں ہاٹ ایر بیلون کی فلائٹ بھی لیں گے۔ کتنا مزا آئے گا حیا! جب ہم بیلون کی ٹوکری میں بیٹھے اوپر فضا میں تیر رہے ہوں گے اور پورا ترکی ہمارے قدموں تلے ہو گا۔''

وہ دونوں بہت جوش و جذبے سے منصوبے بناتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک طرف برگر کنگ کا بورڈ جگمگا رہا تھا۔ ڈی جے نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''سنو حیا.....! جہان کو بھی ساتھ چلنے کو کہیں؟''

''اس کا تو نام بھی مت لو۔'' وہ سیدھ میں دیکھتے ہوئے آگے چلتی گئی۔ ابھی وہ اس کے ریسٹورنٹ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

''یار.....! معاف کر دو نا، وہ کسی اور بات پہ اپ سیٹ ہو گا۔''

''مگر میں اسی بات پہ اپ سیٹ ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے ملنے کی۔'' وہ اسے بازو سے ذرا کھینچ کر آگے لے گئی۔

''میرا میگرین سا راٹرپ خراب کرائے گا۔ ٹیبلٹ لی تھی، مگر کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔'' ڈی جے کو پھر سے سر میں درد ہونے لگا۔

''اور میرا ٹرپ میرا غیر رجسٹرڈ فون خراب کرائے گا۔'' اس نے کوٹ کی جیب سے ہالے کا بھدا ترک فون نکال کر مایوسی سے اسے دیکھا۔ ''اس کی بیٹری جلد ختم ہو جاتی ہے، وہاں دوسرے شہروں میں پتا نہیں کیا حالات ہوں۔ میں اپنے پاکستانی فون کو رجسٹر کروا ہی لیتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے! مگر پہلے جوتے دیکھ لیں۔'' وہ دونوں ایک شو اسٹور کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ دروازہ ذرا بھاری تھا، مشکل سے کھلا۔ حیا اچنبھے سے دروازے کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ عجیب بات تھی کہ جس اگلی دکان پہ وہ گئیں اس کا دروازہ بھی زور لگا کر دھکیلنے پہ پیچھے ہوا۔

آج استقلال جدیسی کے دروازوں کو کیا ہوا ہے؟ ڈی جے بھی محسوس کر کے ذرا حیرت سے بولی۔

Avea کی دکان استقلال اسٹریٹ میں ذرا آگے جا کر ملی۔ وہ دونوں اکٹھی چوکھٹ تک آئیں اور لاشعوری طور پر ایک دم بہت زور سے دروازے کو دھکا دیا۔ وہ گلاس ڈور بے حد باریک اور نازک شیشے کا بنا تھا۔ وہ گویا اڑتا ہوا جا کر مخالف سمت میں کھڑے اسٹینڈ سے ٹکرایا اور زوردار چھناکے کی آواز آئی۔ لوہے کے اسٹینڈ کا کوئی ہک نکلا ہوا تھا، اس کی ضرب زور سے لگی اور دروازے کے اوپری حصے سے شیشے کے ٹکڑے چھن چھن کرتے فرش پہ آ گرے۔

وہ دونوں ایک دم ساکت سی، آدھے ٹوٹے دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔

کاؤنٹر کے نچلے دراز سے کچھ نکالتے سیلز مین نے چونک کر سر اونچا کیا۔ ٹوٹے دروازے کو دیکھ کر اس کا منہ پورا کھل گیا۔ وہ ہکا بکا سا اٹھ کھڑا ہوا۔

''کا پتے کر دی؟'' اس نے انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

ڈی جے کا سکتہ پہلے ٹوٹا۔ وہ حیا کے قریب کھسکی اور ہولے سے سرگوشی کی۔

''حیا! اس نے ہمیں دروازہ توڑتے نہیں دیکھا۔''

''بس! ٹھیک ہے، ہم مکر جاتے ہیں۔''

وہ گلا کھنکھارتے، خود کو نارمل کرتے ہوئے آگے بڑھی اور اپنا پاکستانی فون اس کی طرف بڑھایا۔ ''فون رجسٹر کروانا ہے۔''

''کاپے کردی مادم؟'' وہ فون کو دیکھے بنا ابھی تک دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''مجھے فون رجسٹر کروانا ہے۔''

''کاپے کردی؟''

''ڈی جے! یہ کیا بک رہا ہے؟'' وہ کوفت سے ڈی جے کی طرف پلٹی۔

''اسے غالباً انگلش نہیں آتی اور یہ دروازے کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔''

''دیکھو بھائی!'' وہ آگے آئی اور کاؤنٹر پہ کہنی رکھے بڑے اعتماد سے بولی۔ ''ہم نے کوئی دروازہ نہیں توڑا اور ہم نے تو تمہارا دروازہ دیکھا ہی نہیں تھا۔''

''بالکل! ہم نے تو کبھی زندگی میں دروازے نہیں دیکھے۔ ہمارے ہاں گھروں میں دروازے ہوتے ہی نہیں ہیں۔ لوگ کھڑکیوں سے اندر پھلانگتے ہیں۔''

مگر ان کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ اب صدمے اور دکھ سے سینے پہ ہاتھ مارتے، دروازے کو دیکھتے ہوئے ''اللہ اللہ'' کہنے لگا۔ ترک شدید غم میں یہی کرتے تھے۔

''اچھا! میرا فون رجسٹر کردو۔''

لڑکا چند لمحے غمگین و کینہ پرور نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا، پھر ہاتھ آگے بڑھایا۔

''پسپورت؟'' (پاسپورٹ؟)

ان دونوں نے ایک دوسرے کو ذرا تشویش سے دیکھا۔

''یہ پاسپورٹ صرف فون کے لیے مانگ رہا ہے؟''

''نہیں! یہ ہمیں اندر کروائے گا۔ ڈی جے! اسے پاسپورٹ نہیں دینا ورنہ اس نے اتنا لمبا جرمانہ کروانا ہے کہ ہمارا ٹرپ کینسل ہو جائے گا۔''

''پاسپورٹ نہیں ہے ہمارے پاس!'' ڈی جے نے ہاتھ ہلا کر زور سے کہا۔ وہ حیا سے چند قدم پیچھے تھی۔

''پسپورت؟'' اس نے بازو بڑھائے پھر سے پاسپورٹ مانگا۔

''کہا نا، نہیں ہے ہمارے پاس پاسپورٹ!'' حیا جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''پاسپورٹ کے بغیر رجسٹر نہیں کر سکتے؟ دیکھو! ہم تمہیں کچھ پیسے اوپر دے دیں گے۔''

''ایمبولنس..... ایمبولنس۔'' وہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی جب لڑکا ایک دم گھبرا کر چلا اٹھا۔ اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا، پھر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گردن موڑی۔

''حیا..... حیا!'' پیچھے کھڑی خدیجہ سر دونوں ہاتھوں میں تھامے اوندھی گرتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور وہ تکلیف کی شدت سے دبے دبے انداز میں چلا رہی تھی۔

لڑکا بھاگ کر کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا۔

''ڈی جے..... ڈی جے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے اس کی طرف لپکی۔

اس کی عینک پھسل کر فرش پہ جا گری۔ تیزی سے اس کی طرف بڑھتے لڑکے کا جوگر اس پہ آیا۔ کڑچ کی آواز آئی اور ایک شیشہ دو

Downloaded From http://paksociety.com

حصوں میں بٹ گیا۔

''ڈی جے.....ڈی جے.....!'' وہ اس پہ جھکی دیوانہ وار اسے پکار رہی تھی۔ ڈی جے کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ساری دنیا اندھیرے میں ڈوب رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہسپتال کا وہ کاریڈور سرد اور ویران تھا۔ سنگ مرمر کا فرش کسی مردے کی طرح تھا۔ سفید، بے جان، ٹھنڈا۔ وہ بنچ پہ بالکل سیدھی بیٹھی تھی۔ ساکت، جامد، سیدھ میں کسی غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں مرکوز کیے اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ جب سے ڈی جے آپریشن تھیٹر میں تھی، وہ یوں ہی ادھر بیٹھی تھی۔ آن ڈیوٹی ڈاکٹر نے کچھ بتایا تھا کہ خدیجہ کے برین میں Berry annuerysm تھی۔ ایک پھولی ہوئی اینورزم جو پھٹ گئی تھی۔ سب ارکنائڈ ہیمرج۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بیری اینورزم پھٹنے والے مریضوں میں سے اسی سے نوے فیصد کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کم سے کم بھی دس فیصد کی امید تھی اور وہ اسی دس فیصد امید کو تھامے وہاں بنچ پہ بیٹھی تھی۔

اس کا ذہن بالکل مفلوج ہو چکا تھا، جیسے بھاری سل سے سر کو کچل دیا گیا ہو۔ پھر بھی اس نے کہیں سے ہمت مجتمع کر کے ڈی جے کے گھر والوں کو پاکستان فون کر دیا تھا۔ اس کے باپ بھائیوں کی پریشانی، ماں کے آنسو، وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اس کے ابو ترکی آنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کا بھائی جو فرانس میں مقیم تھا، وہ بھی رات تک پہنچ جائے گا۔ بس اس کی سمجھ میں یہ ہی بات آئی تھی۔ بار بار کوئی نہ کوئی اسے فون کرتا اور وہ ہر بات کے جواب میں بھیگی آواز سے اتنا ہی کہہ پاتی۔

''مجھے نہیں پتا۔ ڈاکٹر باہر نہیں آئے۔''

اب وہ یوں ہی نڈھال سی بنچ پہ بیٹھی تھی۔ آنسو لڑیوں کی صورت اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔

دس فیصد کی امید.....

اس نے گود میں رکھے موبائل کو دیکھا، پھر اٹھا کر کپکپاتے ہاتھوں سے پیغام لکھنے لگی۔

''میں ٹاقسم فرسٹ ایڈ ہاسپٹل میں ہوں۔ ڈی جے کو برین ہیمرج ہوا ہے، تم فوراً آ جاؤ'' اور جہان کو بھیج دیا۔

ان کے درمیان اگر کوئی تلخی تھی بھی تو اسے یاد نہیں تھی۔ اگر یاد تھی تو صرف اور صرف خدیجہ۔

اذان کا وقت ہوا تو وہ اٹھی اور وضو کر کے واپس ادھر آئی۔ کوٹ اس نے وہیں بینچ پہ چھوڑ دیا دیا تھا اور اب نیلی قمیص کی آستینیں گیلے بازوؤں پہ نیچے کر رہی تھی۔ چہرہ، ہاتھ اور ماتھے سے بال بھی ویسے ہی گیلے تھے۔

''کیا زندگی اتنی جلدی گزر جاتی ہے؟''

''اس سے بھی جلدی گزر جاتی ہے.....'' چند روز قبل کی دو لڑکیوں کی گفتگو اسے یاد آئی تھی۔

وہ سلام پھیر کر تشہد کی حالت میں بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ مکمل طور پہ بھیگا ہوا تھا اور یہ وضو کا پانی نہیں تھا۔ وہ دونوں ہتھیلیاں ملائے انہیں ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

''میرے اللہ.....'' وہ بے آواز رو رہی تھی۔ ''آپ کو پتا ہے، ڈی جے میری بیسٹ فرینڈ ہے۔ میری سب سے اچھی دوست۔ ارم، زارا، ان سب سے اچھی دوست۔ آپ اسے ہم سے مت چھینیں۔ اس کے ماں باپ.....وہ بوڑھے ہیں، وہ مر جائیں گے۔ آپ ہمیں ایسے مت آزمائیں۔ آپ ہمیں ڈی جے واپس کر دیں۔ میری دس فیصد کی امید کو ہارنے مت دیں۔'' وہ ہتھیلیوں پہ چہرہ جھکائے ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ شیفون کا نیلا دوپٹا سر سے پھسل کر گردن کی پشت تک جا گرا تھا۔

''میں بہت اکیلی ہوں۔ میرے پاس ابھی کوئی نہیں ہے سوائے آپ کے۔ میرے پاس بجانے کے لیے کوئی گھنٹی نہیں ہے، کھٹکھٹانے کے لیے کوئی دروازہ نہیں ہے، ہلانے کے لیے کوئی زنجیر نہیں ہے۔ میری پہلی امید بھی آپ ہیں، آخری بھی آپ ہیں۔ اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو کوئی میری مدد نہیں کر سکے گا۔ اگر آپ نے چھین لیا تو کوئی دے نہیں سکے گا اور اگر آپ دے دیں تو کوئی روک نہیں سکے گا۔ آپ ہمیں ڈی جے کی زندگی واپس لوٹا دیں۔ آپ ڈی جے کو ٹھیک کر دیں۔''

Downloaded From http://paksociety.com

اس کے دل پہ گرتا ہر آنسو اندر ہی اندر داغ لگا رہا تھا۔ جلتا، سلگتا ہوا داغ۔ اس کا دل ہر پل زخمی ہوتا جا رہا تھا۔

''اللہ تعالیٰ! میرے پاس کوئی نہیں ہے جس سے میں مانگ سکوں اور آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو مجھے کچھ دے سکے۔ میری ایک دعا مان لیں، میں زندگی بھر کچھ نہیں مانگوں گی۔ کبھی کوئی خواہش نہیں کروں گی۔ آپ ہمیں ڈی جے کی زندگی واپس لوٹا دیں۔ میں ہر وہ کام کروں گی جو آپ کو راضی کرے اور راضی رکھے۔ میں آپ کو کبھی ناراض نہیں کروں گی۔ آپ ڈی جے کو ٹھیک کر دیں پلیز۔''

وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وہ زندگی میں کبھی اتنی اکیلی نہیں ہوئی تھی، جتنی آج تھی۔ وہ کبھی اتنی بے بس، اتنی لاچار بھی نہیں رہی تھی، جتنی اس وقت تھی۔

کتنے گھنٹے گزرے، کتنی گھڑیاں بیتیں، اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ بس اندھیرا چھا رہا تھا، جب اس نے جہان کو تیز تیز قدموں سے چلتے اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ کھڑی بھی نہیں ہوئی، بس بینچ پہ بیٹھی گردن اٹھائے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اب کیسی ہے وہ؟ ہوا کیا تھا؟'' وہ پھولی سانسوں کے درمیان کہتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھا۔ وہ اتنا ہی پریشان تھا، جتنی وہ۔

''بیری اینورزم پھٹ گیا تھا، جس کے نتیجے میں سب ارکنائڈ ہیمرج.....'' اسے خود جو سمجھ میں آیا تھا، وہ بتانے لگی۔ بتا کر وہ پھر سے دونوں ہاتھوں سے سر دبے رونے لگی۔

''وہ ٹھیک ہو جائے گی، تم ایسے مت روؤ۔ تم نے کچھ کھایا ہے؟ تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ میں کچھ لاتا ہوں۔'' پھر وہ رکا نہیں۔ تیزی سے اٹھ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو ہاتھ میں سینڈوچز کا پیکٹ اور جوس کی بوتل تھی۔

''کچھ کھا لو۔'' اس نے سینڈوچ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔

''مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔'' وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ اسی پل آپریشن تھیٹر کے دروازے کھلے۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' اسے وہیں رکنے کا کہہ کر وہ آگے گیا اور باہر آنے والے سرجن سے ترک میں بات کرنے لگا۔ وہ بے قراری سے کھڑی ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھے گئی۔

''اوکے اوکے!'' سر ہلا کر بات ختم کر کے وہ واپس اس کی طرف آیا۔

''کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر؟ کیسی ہے ڈی جے؟''

''وہ آرام سے ہے۔ ابھی اسے شفٹ کر دیں گے مگر تم ٹھیک نہیں ہو، ادھر بیٹھو۔'' اسے واپس بینچ پہ بٹھا کر اس نے سینڈوچ اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ کھاؤ۔''

''اوہ جہان! وہ ٹھیک ہے۔ میری دعا قبول ہو گئی۔'' اس نے نڈھال سے انداز میں سر دیوار سے ٹکا دیا۔

''کچھ کھا لو حیا.....!'' اس کے اصرار پہ اس نے بمشکل آدھا سینڈوچ کھایا اور تھوڑا سا جوس پیا، پھر بوتل پرے ہٹا دی۔

''جہان! میری دعا رد نہیں ہوئی..... میں نے اتنی دعا کی تھی..... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اتنی دعا کرے اور وہ پوری نہ ہو؟'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''حیا! تھوڑا سا اور کھا لو، ورنہ تمہاری طبیعت بگڑ جائے گی۔''

''نہیں..... تمہیں پتا ہے، میں نے کبھی اتنے دل سے دعا نہیں مانگی جتنی آج مانگی تھی، پھر یہ کیسے ہوتا کہ وہ پوری نہ ہوتی؟'' اس کی آنکھوں سے پھر سے آنسو بہنے لگے۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ اب وہ مزید کچھ نہیں کھائے گی، اسے اندازہ ہو چکا تھا۔

وہ اب سامنے دیوار کو دیکھتے ہوئے بہتے آنسوؤں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

''تمہیں پتا ہے، انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور میں نے آج امید نہیں ہاری تھی جہان۔''

''مگر بعض دفعہ قسمت ہرا دیا کرتی ہے۔''

Downloaded From http://paksociety.com

وہ بہت دھیرے سے بولا تو وہ چونکی۔ جہان اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک دم اس کا دل ڈوب کر ابھرا۔

''جہان؟''

''حیا..... ڈی جے کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔'' کار یڈور کا سناٹا یکدم سے ٹوٹا۔ پیچھے کہیں کسی اسٹریچر کے پہیوں کے چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔

وہ بنا پلک جھپکے جہان کو دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی ٹوٹی عینک پہ اس کی گرفت سخت ہوگئی تھی۔ پسینے میں بھیگی ہتھیلی سے عینک کے شیشے پہ دھند چھاتی جا رہی تھی۔

ٹھنڈی، گیلی دھند۔

☆ ☆ ☆

''میری فرینڈز مجھے ڈی جے کہتی ہیں، لیکن چونکہ آپ میری فرینڈ نہیں ہیں، اس لیے مجھے خدیجہ ہی کہیں۔''

شام کی دھندلی سی چادر نے پورے استنبول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دوپہر میں خوب بارش ہوئی تھی اور آسمان اتنا کھل کر برسا تھا کہ لگتا تھا ساری دنیا بہہ جائے گی، سب ڈوب جائے گا۔ وہ تب سے اسی طرح پھپھو کے لاؤنج کے صوفے پہ پاؤں اوپر کر کے بیٹھی، گھٹنوں پہ سر رکھے روئے جا رہی تھی۔

''ایویں ہی سامان گم ہو جائے؟ ہم نے ہینڈ کیری میں اتنا بوجھ نہیں اٹھانا۔''

اس کی آنکھوں کے سامنے ڈی جے کا آخری چہرہ جیسے ثبت ہوگیا تھا۔ وہ منظر یوں ہر جگہ چھایا تھا کہ اور کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ بے جان چہرہ جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو، بند آنکھیں، اسٹریچر پہ ڈالا بے حس و حرکت وجود..... وہ اس منظر میں مقید ہوگئی تھی۔

''ایویں برف نہ پڑے، خود تو برف باری دیکھ دیکھ کر اکتا چکے ہیں، ہمیں تو دیکھنے دیں۔''

اسی رات ڈی جے کا بھائی پہنچ گیا تھا اور دو دن تک کلیئرنس مل گئی تھی۔ آج دوپہر وہ اس کی میت لے کر پاکستان روانہ ہوگئے تھے۔ تب اسے جہان اور پھپھو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ وہ اس وقت سے یوں ہی بیٹھی تھی۔ نہ کھاتی تھی، نہ کوئی بات کرتی تھی، بس روئے چلی جا رہی تھی۔ اس کا غم بہت بڑا تھا۔

''سامنے والے کمرے میں بڑے ہینڈسم سے لڑکے رہتے ہیں۔ میں نے انہیں کمرے میں جاتے دیکھا ہے۔''

سارے دن میں اگر اس نے کوئی بات کی بھی تو یہ ہی تھی کہ مجھے پاکستان جانا ہے۔ میری سیٹ بک کروا دیں۔ میں نے ادھر نہیں رہنا۔''

کچن میں جہان اور پھپھو کھڑے یہ ہی بات کر رہے تھے۔ ان کی دبی دبی آوازیں اس تک پہنچ رہی تھیں، مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ اس کی دلچسپی ہر شے سے ختم ہوگئی تھی۔

''مگر میں کیسے جا سکتا ہوں اس کے ساتھ؟''

''اور وہ اکیلی کیسے جا سکتی ہے؟ اسے کل سے بخار ہے۔ حالت دیکھی ہے تم نے اس کی؟ میں اسے اکیلا بھیجوں تو اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گی؟''

''مگر ممی! آپ کو ابا کا پتا ہے نا؟ انہیں علم ہوا تو؟''

''انہیں یہ بتائیں گے کہ تم انقرہ تک گئے ہو۔''

''مگر ممی! میرا جانا ضروری تو.....''

''جہان سکندر! جو میں نے کہا وہ تم نے سن لیا؟ تم کل صبح کی فلائیٹ سے حیا کے ساتھ جا رہے ہو۔''

وہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔ اردگرد کیا ہو رہا ہے، اسے نہیں پتا تھا۔ اس کا دل ایسے بری طرح ٹوٹا تھا کہ ہر شے سے دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔

''پاک ٹاورز، ایشیا کا سب سے بڑا شاپنگ مال..... اس نے کون سا جا کر چیک کر لینا ہے، تھوڑا سا شو مارنے میں حرج ہی کیا ہے؟''

Downloaded From http://paksociety.com

جب پھپھو نے آ کر یہ بتایا کہ جہان اس کے ساتھ جائے گا، چاہے جتنے دن بھی لگیں، تو بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اسے فی الحال جہان سکندر سے کوئی سروکار نہ تھا۔

''ویسے تمہاری پھپھو کا کوئی ہینڈسم بیٹا ویٹا ہے؟ تمہاری چمک دمک دیکھ کر یہ خیال آیا۔''

ہر چیز جیسے سلوموشن میں ہو رہی تھی۔ آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ صرف حرکات دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اتاترک ایرپورٹ پہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چل رہی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی چل رہا تھا مگر وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔

''رہنے دو حیا! مجھے ابھی ورلڈ کپ کا غم نہیں بھولا۔''

جہاز دھیرے دھیرے محوِ پرواز تھا۔ کھڑکی کے پار مرمرا کے سمندر پہ بادل تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔ نرم روئی کے گالوں کی طرح سرمئی بادل۔ ان میں اتنا پانی لدا تھا جتنا اس کی آنکھوں میں تھا، یا شاید اس کے آنسو زیادہ تھے۔

''اتنے ہینڈسم لڑکوں کی بہن بننے پہ کم از کم میں تیار نہیں ہوں، یہ بھائی چارہ تمہیں ہی مبارک ہو۔''

اس نے خود کو ایئرپورٹ پہ ابا کے سینے سے لگتے، بے تحاشا روتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ اس کا سر تھپکتے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔ کچھ ایسا کہ بس اب وہ ان کے پاس رہے گی، اب وہ اس کو واپس نہیں بھیجیں گے۔

''چیزیں وقتی ہوتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں، رویے دائمی ہوتے ہیں، صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور تم نے آج ایک ٹوٹے ہوئے جنجر بریڈ ہاؤس سے ہار مان لی؟''

وہ اماں کے ساتھ ڈی جے کے گھر میں تھی۔ وہاں ہر طرف کہرام مچا تھا۔ اس کی امی اور بہنوں کا بلک بلک کر رونا، ماتم، بین، سسکیوں کی آوازیں چیخیں..... جوان موت تھی اور گویا پوری دنیا ادھر اکٹھی ہو گئی تھی، وہ کسی کو دلاسا نہ دے سکی، بس ایک کونے میں بیٹھی بے آواز روتی گئی۔

''اچھا پھر سوچ لو..... وہ اب بھی شادی شدہ ہے؟''

نماز جنازہ پچھلے روز ہی ادا کی جا چکی تھی مگر غم ابھی پرانا نہیں ہوا تھا۔ خدیجہ کی بہنیں اس سے اس کے بارے میں پوچھتی تھیں، مگر وہ کسی کو کچھ بتا نہیں پا رہی تھی۔ ساری باتیں ختم ہو گئی تھیں۔ دنیا برف کا ڈھیر بن گئی تھی۔ مرمرا کے سمندر پہ تیرتی برف کا ڈھیر۔

''کیا زندگی اتنی جلدی گزر جاتی ہے؟''

''اس سے بھی جلدی گزر جاتی ہے۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور ہمارا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اختتام..... دی اینڈ.....!''

Downloaded From http://paksociety.com

باب 5

سرخ صنوبر کے اونچے درختوں کے درمیان ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ وہاں ہر سو گھنا جنگل تھا۔ اونچے درختوں کے پتے سنہری دھوپ کو مٹی تک پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ دوپہر کے وقت بھی ادھر ٹھنڈی بیٹھی سی چھایا تھی۔

بہارے اسی چھایا میں ادھر ادھر بھاگتی ببول کے سفید پھول توڑ توڑ کر ٹوکری میں بھر رہی تھی۔ عائشے گل ایک درخت تلے زمین پہ بیٹھی سامنے پھیلے کپڑے پہ رکھے بہت سے سرخ جنگلی پھولوں کو دھاگے میں پرو رہی تھی۔ قریب ہی ایک کٹا ہوا تنا گرا پڑا تھا۔

جب بہت سے پھول جمع ہو گئے تو وہ عائشے کے پاس آئی۔

''عائشے.....'' سفید پھولوں سے بھری ٹوکری اس کپڑے پہ ایک طرف انڈیلتے ہوئے اس نے پکارا۔

''ہوں'' اس نے جواباً کہتے ہوئے ہاتھ سے سفید پھولوں کا ڈھیر بنتے پھولوں سے ایک طرف سمیٹ دیا۔

''سفیر تم سے لڑ کیوں رہا تھا؟'' وہ خالی ٹوکری رکھ کر اس کے سامنے آلتی پالتی مار کے یوں بیٹھ گئی کہ اب دونوں کے درمیان پھولوں والا کپڑا بچھا تھا۔

''لڑ نہیں رہا تھا، اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''مگر وہ اونچا اونچا کیوں بول رہا تھا؟'' بہارے دونوں ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے الجھی الجھی سی پوچھ رہی تھی۔ گردن جھکا کر سوئی پھول میں ڈالتی عائشے نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

''جب انسان دوسرے کی بات نہیں سمجھنا چاہتا تو وہ یونہی اونچا اونچا بولتا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا، اس کے پیرنٹس نے اس کی شادی اس کی پاکستانی کزن سے طے کر دی ہے اور وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

''کیوں نہیں کرنا چاہتا؟''

''اس کی مرضی نہیں ہوگی!'' اس نے سوئی کو پھول کی دوسری طرف سے نکال کر کھینچا۔ دھاگا کھنچتا چلا آیا۔ پھولوں کی لڑی لمبی ہوتی جا رہی تھی۔

''شادی مرضی سے ہوتی ہے نا؟''

''ہاں!'' وہ اب بہارے کے سفید پھولوں کے ہاتھ سے ادھر ادھر ٹٹول رہی تھی۔

''پھر جب میں بڑی ہوں گی تو میں عبدالرحمٰن سے شادی کروں گی۔''

پھولوں کو سمیٹتا اس کا ہاتھ رکا۔ اس نے ایک خفا سی نگاہ بہارے پہ ڈالی۔

''بری بات بہارے گل! اچھی لڑکیاں یوں ہر بات نہیں کر لیتیں۔''

''مگر میں نے عبدالرحمٰن کو کہہ دیا تھا۔''

وہ ایک دم ٹھٹک کر رک گئی اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''کیا کہا تم نے اسے؟''

''یہی کہ جب میں بڑی ہوں گی تو کیا وہ مجھ سے شادی کرے گا؟''

''تو اس نے کیا کہا؟''

''اس نے کہا، تمہیں ایسی باتیں کس نے سکھائی؟''

Downloaded From http://paksociety.com

''پھر؟'' وہ سانس روکے سن رہی تھی۔

''میں نے کہا.....عا.....عائشے گل نے!'' روانی سے بولتی بہارے یک لخت اٹکی۔

''کیا؟'' وہ ششدر رہ گئی۔''تم نے اس سے جھوٹ بولا؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ اب تم جھوٹ نہیں بولو گی۔ خدایا! وہ کیا سوچتا ہوگا میرے بارے میں۔'' اس نے تاسف سے ماتھے کو چھوا۔ بہارے نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

''مگر اسے پتا چل گیا تھا۔ اس نے کہا، عائشے گل اچھی لڑکی ہے اور مجھے پتا ہے، اس نے ایسا کچھ نہیں کہا ہوگا۔''

اس کی بات پہ عائشے کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ایک بے اختیار سی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ بکھر گئی۔ وہ ہولے سے سر جھٹک کر پھول اٹھانے لگی۔

''مگر تم نے جھوٹ نہیں چھوڑا ناں۔''

''وعدہ، اب نہیں بولوں گی۔''

''ہر دفعہ اللہ سے وعدہ کرتی ہو۔ وہ ہر دفعہ تمہیں ایک اور موقع دے دیتا ہے، مگر تم پھر وعدہ توڑ دیتی ہو۔ اتنی دفعہ وعدہ توڑو گی تو وہ تمہارے وعدوں کا اعتبار کرنا چھوڑ دے گا۔''

''آئندہ میں سچ بولوں گی، اب کی بار مضبوط والا وعدہ۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' وہ مسکرادی۔''اب تم نے ہمیشہ سچ بولنا ہے، کیونکہ جب انسان بہت زیادہ جھوٹ بولتا ہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسے خود اپنے سچ کا بھی اعتبار نہیں رہتا۔''

Seagulls کا غول پھڑ پھڑاتا ہوا ان کے اوپر سے گزرا۔ عائشے نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ پرندے یقیناً پورے بیوک ادا کا چکر کاٹ کر اب سمندر کی طرف محو پرواز تھے۔

''عائشے گل!'' چند لمحے ان پرندوں کے پنکھ کی مانند اڑ کر بادلوں میں گم ہو گئے تو بہارے نے پکارا۔

''بولو۔'' وہ گردن جھکائے اپنی لڑی میں اب سرخ پھولوں کے آگے سفید پھول پرو رہی تھی۔

''تم تو ہمیشہ سچ بولتی ہو نا۔ ایک بات بتاؤ گی۔'' بہارے ذرا ڈرتے ڈرتے کہہ رہی تھی۔

''پوچھو۔''

''عبداللہ کی بہن کسی کو کہہ رہی تھی کہ بیوک ادا کی پولیس بہت بری ہے۔ وہ عبدالرحمٰن پاشا کو کچھ نہیں کہتی اور یہ کہ وہ جزیرے کا سب سے برا آدمی ہے۔ عائشے! کیا عبدالرحمٰن واقعی برا آدمی ہے؟'' وہ رک رک کر تذبذب سے پوچھ رہی تھی۔

عائشے سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ بہارے خاموش ہوئی تو اس نے ذرا خفگی سے سر جھٹکا۔

''نہیں، وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ عبداللہ کی بہن کو کیا پتا؟ اور تم نے کسی سے جا کر عبدالرحمٰن کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی۔ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟'' بہارے نے گردن اثبات میں ہلادی۔

''مجھے یاد ہے۔''

عائشے دھاگا دانت سے توڑ کر لڑی کے دونوں سروں کی آپس میں گرہ لگانے لگی۔ اس کے چہرے پہ واضح اداسی بکھری تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ سہ پہر میں خدیجہ کے گھر سے واپس آئی تھی۔ کچھ دیر کمرے میں لیٹی رہی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا، بخار بھی ہو رہا تھا اور نیند تھی کہ آ ہی نہیں رہی تھی۔ بند کمرے میں گھٹن ہونے لگی تو وہ گھبرا کر اٹھی اور کھڑکیوں کے پردے دونوں ہاتھوں سے ہٹائے۔

سامنے لان میں کرسیوں پر ابا اور اماں کے ساتھ تایا فرقان اور صائمہ تائی چائے پیتے نظر آ رہے تھے۔ میز پہ اسنیکس اور دیگر لوازمات رکھے تھے اور وہ لوگ باتوں میں مگن تھے۔ صائمہ تائی بہت سلیقے سے سر پہ دوپٹا جمائے فاطمہ کی طرف چہرہ کیے کچھ کہہ رہی تھیں۔ فاطمہ، تایا فرقان کے سامنے سر پہ دوپٹا لے لیتی تھیں جو پیچھے کچھ تک ڈھلک جاتا تھا۔ ان کی آنکھیں حیا جیسی تھیں اور لوگ کہتے تھے کہ بیس

Downloaded From http://paksociety.com

سال بعد حیا ایسی ہی ہوگی اور اب وہ سوچتی تھی کہ پتا نہیں بیس سال بعد وہ ہوگی بھی یا نہیں۔

وہ شاور لے کر، سادہ سفید ٹراؤزر پہ ٹخنوں کو چھوتی سفید لمبی قمیص پہنے، ہم رنگ دوپٹہ سر پہ لپیٹے باہر آئی۔ پہلے عصر کی نماز پڑھی کہ نمازیں ان تین دنوں میں وہ قریباً ساری پڑھ رہی تھی۔ خدیجہ کے لیے بہت ڈھیر ساری دعائیں کر کے وہ اٹھی اور پھر دوپٹا شانوں پہ پھیلائے، بالوں کو کھلا چھوڑے کچن کی طرف آ گئی۔

فاطمہ فریج سے کچھ نکال رہی تھی۔ اسے آتے دیکھا تو فریج کا دروازہ بند کر کے مسکراتی ہوئی اس کی طرف آئیں۔ شانوں تک آتے بالوں کو کیچر میں باندھے، وہ عام حلیے میں بھی بہت جاذب نظر لگتی تھیں۔

''میرا بیٹا اٹھ گیا؟'' انہوں نے اسے گلے لگایا، پھر ماتھا چوما۔

''جی!'' وہ مسکرانا چاہتی تھی مگر آنکھیں بھیگ گئیں۔

''بس صبر کرو۔ اللہ کی چیز تھی، اللہ نے لے لی۔''

''صبر اتنا آسان ہوتا تو کوئی دوسرے کو کرنے کو نہ کہتا اماں! ہر شخص خود ہی کر لیتا۔ مگر میں کوشش کروں گی۔''

''گڈ! اچھا باہر آ جاؤ، تایا تائی ملنے آئے ہیں۔''

''مجھ سے؟''

''ہاں اور جہان سے بھی۔''

''اوہ ہاں، کدھر ہے وہ؟'' اسے یاد آیا کہ وہ بھی ساتھ آیا تھا۔

''بس کھانا کھا کر سو گیا تھا، ظاہر ہے تھکا ہوا تھا، ابھی میں نے دیکھا تو اٹھ چکا تھا، کہہ رہا تھا بس آ رہا ہوں۔ ویسے سین کا بیٹا ذرا.....'' وہ کہتے ہوئے جھجکیں۔ ''ذرا پراؤڈ سا ہے، نہیں؟''

''نہیں، وہ شروع میں یونہی ریزرو سا رہتا ہے۔''

''اور بعد میں؟''

حیا نے گہری سانس لی۔

''بعد میں بھی ایسا رہتا ہے۔ اس شروع اور بعد کے درمیان کبھی کبھی نارمل ہو جاتا ہے۔''

وہ باہر آئی تو اسے دیکھ کر تایا فرقان مسکرائے۔ وہ جھک کر ان دونوں سے ملی۔

''اتنے عرصے بعد ملا ہوں اپنی بیٹی سے اور وہ بھی ایسے موقع پر۔ تمہاری دوست کا سن کر بہت افسوس ہوا، اللہ اس کی مغفرت کرے۔''

''آمین!'' وہ سر کے اثبات کے ساتھ تعزیت وصول کرتی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔

''ہوا کیا تھا اسے؟'' صائمہ تائی نے ازراہِ ہمدردی پوچھا۔

''برین ہیمبرج۔''

چند لمحے کے لیے ملال زدہ خاموشی چھا گئی، جسے برآمدے کا دروازہ کھلنے کی آواز نے چیرا۔ وہاں سے فاطمہ باہر آئی تھیں اور ان کے عقب میں جہان بھی تھا۔

اس نے سیاہ ٹراؤزر جس کے دونوں پہلوؤں پہ لمبی سفید دھاری تھی، کے اوپر آدھے بازوؤں والی سرمئی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھیں خمار آلود تھیں، جیسے ابھی سو کر اٹھا ہو۔ چہرہ اور سامنے کے بال گیلے تھے وہ شاید پانی کے چھینٹے مار کر تولیے سے منہ خشک کیے بغیر ہی باہر آ گیا تھا۔

اسے آتے دیکھ کر سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ لان کے دہانے پہ پہنچا تو لمحے بھر کے لیے ذرا تذبذب سے گھاس کو دیکھا، پھر ایک نگاہ سامنے بیٹھے افراد کے قدموں پر ڈالی جو جوتوں میں مقید تھے، پھر ذرا جھجک کر گھاس پہ چلتا ہوا ان تک آیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

حیا جانتی تھی کہ وہ کیوں جھجکا ہے۔ ترکی میں گھاس پہ جوتوں سے چلنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا اور موقع ملنے پہ وہ اور ڈی جے اپنی دلی تسکین کے لیے گھاس پہ ضرور جوتوں سے چل کر دیکھتی تھیں۔

''شکر ہے تمہاری شکل تو دیکھی ہم نے۔'' اس سے مل کر، رسمی انداز میں سب کا حال احوال پوچھ کر تایا فرقان نے گھنی مونچھوں تلے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''تھینکس!'' وہ رسماً کبھی نہیں مسکرایا اور اسی سرد انداز میں کہتا حیا کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ وہ یہاں آنے پہ قطعاً راضی نہ تھا، وہ جانتی تھی۔

''سین نے تو گویا قسم کھا رکھی کہ ہمیں اپنے بیٹے کی شکل نہیں دیکھنے دے گی۔ اسے کیسے خیال آیا تمہیں بھیجنے کا؟'' اس کے لیے دیے سے انداز کا اثر تھا کہ تایا فرقان کے مسکراتے لہجے کے پیچھے ذرا سی چبھن در آئی۔

''ممی کو اپنی بھتیجی کو اکیلے بھیجنا آکورڈ لگ رہا تھا، سو مجھے آنا پڑا۔'' بغیر کسی لگی لپٹی کے اس نے کہہ ڈالا۔ منگیتر، منکوحہ کے الفاظ تو دور کی بات، اس نے تو میری کزن تک نہیں کہا تھا، گویا رشتوں کی حدود واضح کیں۔

سلیمان صاحب کے ماتھے پہ ذرا سی شکن ابھر آئی، اور صائمہ تائی کے لبوں کو ایک معنی خیز مسکراہٹ نے چھولیا۔ حیا بالکل لاتعلق سی لان کی کیاریوں میں اگے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ وہ اور ڈی جے ہمیشہ ناقسم پارک سے پھول چرانے کی کوشش کرتے تھے مگر پارک کا کیئر ٹیکر ان پہ بڑی سخت نگاہ رکھتا تھا۔

''اور تمہاری ممی کب آئیں گی؟'' سلیمان صاحب نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''ممی کی بھتیجی'' اور ''تمہاری ممی۔'' اس کے گھر کے مرد آج بہت تول تول کر الفاظ ادا کر رہے تھے۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' اس نے شانے اچکا دیے۔

''جہان! جوس لو گے یا چائے، یا پھر کافی؟'' فاطمہ نے چائے کے خالی کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے اس کو مخاطب کیا۔ وہ مردوں کی بہ نسبت اس کو داماد والا پروٹوکول دے رہی تھیں۔

''بس ایپل ٹی بہت ہے۔'' اس نے روانی میں کہہ دیا، مگر فاطمہ کی آنکھوں میں ابھرتی ناسمجھی دیکھ کر لمحے بھر کو متذبذب ہوا، پھر فوراً تصحیح کی۔

''بس چائے!''

فاطمہ نے مسکرا کر سر ہلایا اور ٹرے اٹھائے اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

''تو بیٹا! آپ کی اسٹڈیز کمپلیٹ ہوگئیں؟'' صائمہ تائی اب بہت میٹھے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ وہ ہر کسی کے لیے اتنی میٹھی نہیں ہوتی تھیں، کچھ تھا جو اسے چونکا گیا۔

''جی، اب تو کافی عرصہ ہوگیا۔''

''پھر کیا کر رہے ہو آپ؟''

''میرا استقلال اسٹریٹ پہ ایک ریسٹورنٹ ہے وہی دیکھتا ہوں۔''

جواباً صائمہ تائی ذرا حیران ہوئیں، البتہ تایا فرقان نے متانت سے سر ہلاتے اپنے تاثرات چھپا لیے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ لوگ استقلال اسٹریٹ کی قیمتی زمین کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، اس لیے متاثر نہیں ہوئے اور گو کہ وہ اپنی لاتعلقی توڑنا نہیں چاہتی تھی، پھر بھی دھیرے سے بولی تھی۔

''استقلال اسٹریٹ پہ ایک ریسٹورنٹ کا مطلب ہے، لاہور کی ایم ایم عالم روڈ پہ دو ریسٹورنٹس۔'' وہ کہہ کر کیاریوں کو دیکھنے لگی۔

''اوہ اچھا..... گڈ!'' ان کے تاثرات فوراً ہی بدلے تھے۔

''والد صاحب کی طبیعت کیسی ہے اب؟''

Downloaded From http://paksociety.com

''جی ٹھیک ہیں۔'' وہ مختصر جواب دے رہا تھا۔ تب ہی فاطمہ اس کی چائے کا مگ ٹرے میں لیے چلی آئیں۔

''کچھ لو نا بیٹا! تم نے کچھ نہیں لیا۔''

''جی، میں لیتا ہوں۔'' اس نے مگ اٹھالیا مگر دوسری کسی شے کو چھوا تک نہیں۔

تایا فرقان اور صائمہ تائی ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے جلد ہی اٹھ کر چلے گئے۔ البتہ جاتے وقت وہ جہان کے لیے دیے جانے والے آج رات کے ڈنر پہ سب کو مدعو کر کے گئے تھے۔

''تمہاری چھٹی کب تک ہے پھر؟'' ان کے جانے کے بعد سلیمان صاحب جہان سے پوچھنے لگے۔

''بس یہی چار دن۔''

پھر تم اپنی فلائٹ بک کروانا تو حیا کی مت کروانا۔ وہ واپس نہیں جائے گی۔''

حیا نے چونک کر ابا کو دیکھا۔

''او کے!'' جہان نے ایک سرسری نظر اس پہ ڈالتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

''مگر ابا..... ہمارا کانٹریکٹ۔'' وہ ایک دم بہت پریشان ہو گئی تھی۔

''میں تمہارا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوا دوں گا۔ کانٹریکٹ کی فکر چھوڑ دو۔ اب میرا مزید حوصلہ نہیں ہے تمہیں باہر بھیجنے کا۔ اس بچی کا جنازہ بھگتایا ہے میں نے۔ اتنی دور اکیلی بچیاں بھیجنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ کل کو کچھ ہوا تو۔''

''مگر ابا! اس کے برین میں اندر بہت پہلے سے.....''

''حیا! جو میں نے کہا، وہ تم نے سن لیا؟'' ان کا انداز ہ اتنا دوٹوک اور سخت تھا کہ اس نے سر جھکا دیا۔

''جی ابا!''

جہان لاتعلق سا بیٹھا چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ ان دونوں نے ایک دفعہ بھی نگاہیں نہیں ملائی تھیں۔ پتا نہیں کیوں!

☆ ☆ ☆

تایا فرقان کے پورچ کی بتیاں رات کی تاریکی میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ اور جہان، فاطمہ کے ہمراہ چلتے ہوئے برآمد کے دروازے تک آئے تھے۔ سلیمان صاحب کا کوئی آفیشل ڈنر تھا، سو انہوں نے معذرت کر لی تھی۔

دروازے کے قریب جہان رکا اور جھک کر بوٹ کا تسمہ کھولنے لگا۔ فاطمہ نے رُک کر اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''پاکستان میں جوتے پہن کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔'' وہ اتنی کبیدہ خاطر اور بے زار تھی کہ جہان سے مخاطب ہونے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، پھر بھی کہہ اٹھی۔

''اوہ سوری!'' وہ ذرا چونکا، پھر جلدی سے تسمے کی گرہ لگا کر سیدھا ہوا۔ یہ وہ پہلی باضابطہ گفتگو تھی، جو پاکستان آ کر ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی۔

''ترکی میں جوتے گھر کے باہر اتارتے ہیں، اس لیے وہ رکا تھا۔'' اس نے الجھی سی کھڑی فاطمہ کے قریب سرگوشی کر کے وجہ بتائی۔ فاطمہ نے سمجھ کر ''اوہ!'' کہا اور آگے بڑھ گئیں۔

ڈائننگ ہال میں بہت پرتکلف سا کھانا سجا تھا۔ صائمہ تائی نے خوب اہتمام کر رکھا تھا۔ جہان بہت مختصر گفتگو کر رہا تھا۔ کوئی کچھ پوچھتا تو جواب دیتا اور پھر خاموشی سے کھانے لگ جاتا۔

ارم، سونیا بھابھی اور داور بھائی کے اس طرف بیٹھی تھی۔ فرخ کی کال تھی سو وہ ہسپتال میں تھا۔ ارم حیا سے ذرا رکھائی سے ملی تھی۔ اس کا کھچا کھچا اور خاموش سا انداز حیا کو ساری وجہ سمجھا گیا۔ اس رات وہ یقیناً پکڑی گئی تھی، مگر حیا نے اسے نہیں بچایا تھا سو تایا کے سامنے اس کا پول کھل گیا ہوگا، اسی لیے وہ حیا کو اس سب کا ذمہ دار سمجھتی تھی، مگر اس نے اثر نہیں لیا۔ وہ ڈی جے کا صدمہ اتنا گہرا لیے ہوئی تھی کہ اسے اب ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

داور بھائی اور تایا فرقان، جہان سے ترکی کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں یونہی برسبیل تذکرہ پوچھ رہے تھے اور وہ نپے تلے جواب دے رہا تھا۔

''کبھی ترکی آئے تو تمہاری طرف ضرور آئیں گے!'' داور بھائی نے سونیا کی طرف ابرو سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سونیا مسکرائی۔ تائی نے فوراً داور بھائی کو دیکھا۔

''میرا مطلب ہے، ہم سب!'' داور بھائی نے جلدی سے تصحیح کی۔ سونیا نے سر جھکا دیا۔

''شیور!'' جہان نے شانے اچکا دیے، جیسے آپ آئیں یا نہیں، مجھے فرق نہیں پڑتا۔

''آگے کا کیا ارادہ ہے تمہارا؟'' کھانا درمیان میں تھا، جب تایا فرقان نے بہت سرسری سے انداز میں کہتے ہوئے گویا پہلا پتا پھینکا۔ حیا نے ذرا چونک کر انہیں دیکھا اور پھر فاطمہ کو، جو حیا کی طرح ہی چوکنی تھیں۔ جو بات ان دو ماہ میں وہ خود، اور اتنے عرصے سے اس کے ماں باپ، سین پھپھو یا جہان سے نہیں پوچھ سکے تھے، وہ تایا فرقان نے بڑے آرام سے پوچھ لی تھی۔

''کچھ سرمایہ جمع ہوا تو جواہر مال میں ایک ریسٹورنٹ کھول لوں گا۔'' چمچے اور کانٹے سے چاول پلیٹ سے اٹھاتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

''تم داور سے سال بھر ہی چھوٹے ہو نا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بھئی داور میاں تو اب مزید اسٹیبلش ہونے کے حق میں بالکل نہیں تھے اور صاحبزادے کا خیال یہ تھا کہ اس عمر میں فیملی شروع کر دینی چاہیے، سو ہم نے ان کی شادی کر دی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

تایا فرقان چاولوں کی پلیٹ میں رائتہ ڈالتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ حیا کے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا، اس نے جھکا سر مزید جھکا دیا۔ جہان نے ذرا سے کندھے اچکائے۔

''داور کے پاس اس کے والد کا اسٹیبلشڈ بزنس تھا، سو وہ اس پوائنٹ پہ شادی افورڈ کر سکتا تھا۔'' اس نے سلاد کی پلیٹ سے کھیرے کا ایک ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بے پروائی سے جواب دیا۔

''کام تو خیر تمہارا بھی اسٹیبلشڈ ہو گیا ہے۔''

''میرے اوپر ابھی کافی قرض ہے، وہ ذرا ہلکا ہو جائے تو ہی کچھ سوچوں گا۔''

حیا نے گردن مزید جھکا لی۔ کیا تھا اگر وہ اپنی لینڈ لیڈی کے قرضے کا ذکر نہ کرتا، کچھ بھرم تو رہنے دیتا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے، انسان اس وقت ہی شادی کرے، جب وہ اس ذمہ داری کو نبھا سکے۔ ذمہ داری نبھانا بھی مشکل کام ہوتا ہے۔ ہاں اگر والدین ساتھ دیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے، مگر یہاں پاکستان میں تو اب اکثر شادیوں پہ والدین ناخوش ہوتے ہیں، کیونکہ آج کل کے بچے ان کی پسند کی اہمیت نہیں دیتے اور اپنی مرضی کرتے ہوئے ان کے طے کردہ رشتوں کو ریجیکٹ کر دیتے ہیں۔ یہ تو میرے بچے ہیں کہ جو ماں باپ نے کہا، اس پہ راضی ہو گئے، ورنہ تو.....'' انہوں نے معاشرے پہ ایک تبصرہ کرتے ہوئے تاسف سے سر جھٹکا۔

سونیا بھابھی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگوار سی شکنیں ابھر آئی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔ تایا بڑے تھے۔ ان کے سامنے کوئی نہیں بول سکتا تھا۔

''ویل..... یہ ڈیپنڈ کرتا ہے۔'' جہان نے کولڈ ڈرنک کے گلاس سے چھوٹا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے، ماں باپ اگر اپنی مرضی مسلط نہ کریں تو چیزیں ٹھیک رہتی ہیں۔''

صائمہ تائی کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ فاطمہ کے چہرے پہ ایک تاریک سایہ لہرایا اور حیا کی گردن مزید جھک گئی۔ بھرے پنڈال میں گویا اس کی بے عزتی کر دی گئی تھی۔

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' تایا فرقان نے سر ہلا کر تائید کی۔ ''تمہاری واپسی کب ہے؟'' جواب مل گیا تھا، سو بات بدل دی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''سوموار کی صبح کی فلائٹ ہے۔''

''حیا تو نہیں جا رہی نا۔ ویسے میرا بھائی میری طرح بزدل نہیں ہے بلکہ کافی بہادر ہے۔ میری بیٹی نے بھی آکر اسی اسکالرشپ کا کہا تھا، مگر میں نے اس کی ماں سے کہا کہ اسے سمجھاؤ اکیلی لڑکی جب دوسرے ملک یوں تن تنہا جاتی ہے تو پورا خاندان انگلیاں اٹھاتا ہے۔ بھئی بچی جتنی احتیاط کرے، لوگ تو باتیں بناتے ہیں کہ کوایجوکیشن میں پتا نہیں کیسے رہتی ہے، وہاں اکیلے باہر آنا جانا ہوگا، کس سے ملتی ہے، کس سے نہیں، پھر کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو ماں باپ تو ہو گئے بدنام۔ خیر! ویسے ترکی تو اچھا مسلمان ملک ہے اور تمہاری فیملی ساتھ تھی تو ہمیں اپنی بیٹی کی طرف سے بے فکری رہتی تھی۔''

انہوں نے کہتے ہوئے مسکرا کر حیا کو دیکھا جو خاموشی سے پلیٹ میں دھرے چاول کانٹے سے ادھر ادھر کر رہی تھی۔ وہ کھا نہیں رہی، کسی نے محسوس نہیں کیا۔

''حیا! تم نے شادی کے کپڑے بنوا لیے؟'' صائمہ تائی نے گفتگو کا رخ اس کی طرف موڑا۔ اس نے ذرا سی نفی میں گردن ہلائی۔

''ابھی دیکھوں گی۔'' اسے علم نہیں تھا کہ اماں نے کپڑے بنوائے یا نہیں۔

''چلو تم تو ریڈی میڈ بھی لے سکتی ہو، آسانی ہو جائے گی۔ سارا مسئلہ میری ارم کا ہوتا ہے۔ دوپٹا شیفون کا نہ ہو، پتلا ڈوپٹا سر پہ ہی نہیں ٹکتا، آستین باریک نہ ہو اور پھر جو اچھا جوڑا لگتا ہے اس کی آستینیں ہی غائب ہوتی ہیں۔ تمہاری تو خیر ہے، تم سب ہی کچھ پہن لیتی ہو، ساری مصیبت تو میری آئی رہتی ہے۔ بار بار درزی کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔'' بات ختم کر کے انہوں نے ایک نظر جہان پر ڈالی۔ وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

''بس کیوں کر دی بیٹا؟ اور لو نا، کھانا ٹھیک لگا تمہیں؟''

''جی! مامی! کھانا تو بہت اچھا تھا، بس ذرا مرچ زیادہ تھی۔'' وہ پہلی دفعہ قدرے مسکرا کر بولا۔

جہاں تائی کی مسکان پھیکی ہوئی، وہاں سونیا بھابھی نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے چہرہ جھکا دیا۔

☆ ☆ ☆

رات دیر تک جاگنے کے باعث وہ صبح دن چڑھے تک سوتی رہی اور آنکھ کھلی بھی تو موبائل کی آواز سے۔

اس نے مندی مندی سی آنکھیں کھولیں اور سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اپنا پاکستان موبائل اٹھا کر دیکھا۔ وہاں ''پرائیوٹ نمبر کالنگ'' جلتا بجھتا دکھائی دے رہا تھا۔

''اُف..... یہ پھر پیچھے پڑ گیا۔'' اور اسے پتا تھا کہ جب تک اٹھائے گی نہیں وہ کال کرتا رہے گا۔

''ہیلو؟'' اس نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

''ویلکم بیک۔ کیسی ہیں آپ؟'' وہی دھیما، خوب صورت، گمبھیر لہجہ۔ اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

''کیوں فون کیا ہے آپ نے؟''

''آپ کی دوست کا سنا تھا، بہت افسوس ہوا۔''

''آئندہ آپ کو کبھی افسوس ہو یا خوشی ہو، مجھے فون مت کیجیے گا۔''

''آپ اتنی بدگمان کیوں رہتی ہیں؟ آپ اگلے بندے کی پوری بات کیوں نہیں سنتیں؟ مجھے کہنے تو دیں جو مجھے کہنا ہے!'' اسے جیسے غصہ آیا تھا۔

''دیکھیں! میں جانتی ہوں کہ آپ کون ہیں، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کس کے بیٹے ہیں اور یہ بھی کہ آپ کا میرے خاندان سے کیا ایشو ہے، مگر بات جو بھی ہے، اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ آپ آئندہ فون کریں گے بھی تو میں نہیں اٹھاؤں گی۔ خدا حافظ۔''

اس نے زور سے بٹن دبا کر فون بند کیا اور تکیے پہ اچھال دیا۔ پتا نہیں کون سا گناہ تھا اس کا، جو وہ شخص اس کے پیچھے پڑ گیا اور اپنے ساتھ بہت سے مسئلے اس کے پیچھے لگا دیے۔

Downloaded From http://paksociety.com

شام میں فاطمہ کے بے حد اصرار اور پھر ناراض ہونے کی دھمکی کے بعد حیا وہ کامدار انارکلی فراک پہننے پہ راضی ہوئی جو رنگ کے فرق کے ساتھ تمام لڑکیوں نے مہندی کے لیے بنوائے تھے۔ اس کا قطعاً تیار ہونے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، مگر فاطمہ نے اس کی ایک نہیں سنی۔

''جو ہو چکا ہے، ہم اسے بدل تو نہیں سکتے۔ پھر لوگوں کو خود پہ تمسخر کرنے کا موقع کیوں دیں؟ فریش ہو کر جاؤ ورنہ تمہاری تائی کوئی نہ کوئی قصہ بنا دیں گی۔''

لمبا انارکلی فراک گہرے سبز رنگ کا تھا اور اس پہ دبکے کا سلور کام تھا۔ ساتھ میں سونیا بھابھی نے اس کو اپنا سبز اور سلور پراندہ باندھ دیا کہ سب لڑکیاں پراندے پہن رہی تھیں۔ سلور ٹیکا بھی سونیا نے ہی اس کی پیشانی پہ سجایا، مگر کسی بھی قسم کے سنگھار کے لیے وہ قطعاً راضی نہ تھی۔

''اچھا کاجل تو ڈال لو۔'' سونیا اس کے ساتھ سیڑھیوں کے اوپر کھڑی، اسے کاجل تھمانا چاہ رہی تھی مگر اس نے چہرہ پیچھے کر لیا۔ وہ اس وقت تایا فرقان کے گھر میں تھیں۔ سیڑھیوں سے نیچے لاؤنج میں ہر طرف رشتہ داروں کی چہل پہل تھی۔ مہوش اور سحرش کی چھوٹی بہن ثنا کیمرا لیے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی۔ اس کا فراک سرخ کلر کا تھا۔ سونیا کا اپنی بری کا تھا، ہلکا گلابی۔

''نہیں رہنے دیں بھابھی!'' اس نے بددلی سے چہرہ پیچھے ہٹایا۔ چاندی کے گول ٹیکے نے دھلے دھلائے چہرے کو سجا دیا تھا۔

سونیا تاسف سے سر جھٹک کر گویا اس پہ ماتم کرتی، سیڑھیاں اتر گئی۔ اس نے ایک آخری نگاہ دیوار پہ آویزاں آئینے پہ ڈالی، کامدار سبز دوپٹا کندھے پہ ڈالا۔ اور دوسرا پلو بائیں بازو سے آگے کو نکال لیا اور پلٹ کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ تب ہی اس نے جہان کو دیکھا۔ وہ سب سے لاتعلق سا اپنے موبائل پہ کچھ پڑھتا سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ فاطمہ اس کے لیے دو تین کرتے لے آئی تھیں اور اس وقت اس نے ان میں سے ایک سیاہ والا کرتا زیب تن کر رکھا تھا، جس کے گلے پہ سنہرے دھاگے کا کام تھا۔ آستین کہنیوں تک موڑے وہ شاید کوئی میسج لکھ رہا تھا۔

وہ سج سج کر باریک ہیل سے زینے اترنے لگی۔ ٹاقسم والا واقعہ اسے نہیں بھولتا تھا۔ وہ آخری سیڑھی پہ تھی، جب جہان نے سر اٹھایا، ایک لمحے کے لیے رک کر اسے دیکھا، پھر اس کی طرف آیا۔

''حیا.....!'' وہ آخری زینے پہ ایک ہاتھ ریلنگ پہ رکھے ٹھہر سی گئی۔

''میں نے سوموار کی فلائٹ بک کروائی ہے۔ تمہاری بک تو نہیں کروانی نا؟ تم واپس نہیں جا رہیں رائٹ!'' لاتعلق سے انداز میں وہ محض کام کی بات پوچھ رہا تھا۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ اٹکنے لگا۔

''نہیں، میں واپس نہیں جا رہی۔ ابا ایک دفعہ فیصلہ کر لیں تو پھر وہ اسے نہیں بدلتے۔'' وہ آخری زینہ اتر کر اس سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی ہوئی۔

''اوکے!'' وہ شانے اچکاتے ہوئے پلٹنے ہی لگا تھا کہ ثنا اسی پل کیمرا لیے ان کے سامنے آئی۔

''ایک منٹ جہان بھائی! یہیں کھڑے رہیں، میں آپ دونوں کی پکچر لے لوں۔'' خوش دلی سے کہتے ہوئے اس نے کیمرا اپنے چہرے کے سامنے کیا۔

جہان نے ذرا چونک کر ساتھ کھڑی حیا کو دیکھا اور پھر قدرے ناگواری سے وہ چند قدم آگے کو آیا۔ ثنا جو فوکس کر رہی تھی، نے ذرا حیران ہو کر کیمرا چہرے سے نیچے کیا۔

''کسی کی پکچر بنانے سے پہلے اس سے پوچھ لینا چاہیے۔'' لب بھینچے، ذرا درشتی سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

ثنا کا رنگ ماند پڑ گیا۔ اس کا کیمرے والا ہاتھ ڈھیلا ہو کر پہلو میں آ گرا۔ اس نے پلٹ کر راہداری کی سمت دیکھا، جہاں وہ جاتا دکھائی دے رہا تھا، پھر دبے دبے غصے سے سر جھٹکا۔

''میری توبہ جو کبھی ان کی تصویر بناؤں یا ان سے بات بھی کروں۔'' وہ خفگی سے بڑبڑاتے ہوئے آگے چلی گئی۔

حیا نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا بھیگا گوشہ صاف کیا اور سر کو خفیف سی جنبش دے کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے پاس رونے کے لیے بہت سے غم تھے۔

مہندی کا فنکشن زاہد چچا کے لان میں ہی منعقد کیا گیا تھا۔ لان کافی کھلا اور وسیع تھا، سو قناتوں سے صرف اوپر کی چھت بنا

Downloaded From http://paksociety.com

گئی، باقی اطراف کھلی رکھی گئیں۔ جہاں ہر سو دیواروں پر لڑیوں کی صورت بتیاں جگمگا رہی تھیں۔

اسٹیج پر رکھے لکڑی کے جھولے کو گیندے کے پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا اور مہوش اس پہ کسی ملکہ کی شان سے بیٹھی تھی۔ اس کا انارکلی فراک باقی لڑکیوں کے برعکس دو رنگا تھا۔ سرخ اور زرد۔ ان ہی دو رنگوں کا پراندہ آگے کندھے پر ڈالے دوپٹا سر پر ٹکائے وہ مسکرا کر بہت اعتماد طریقے سے سب سے باتیں کر رہی تھی۔ اس اعتماد میں غرور کی جھلک بھی تھی۔ وہ خوب صورت نہیں تھی، مگر خوب سارا پیسہ اپنی تراش خراش پر لٹانے کے بعد اب بے حد پرکشش لگ رہی تھی۔

پہلو میں بیٹھا اس کا ماموں زاد عفان عام سی شکل کا کینیڈین نیشنل تھا مگر سننے میں آیا تھا کہ تازہ تازہ بے حد امیر ہوا تھا۔ ابھی یہ کہانی حیا نے پوری سنی نہیں تھی۔

وہ بالکل کونے میں رکھی ایک میز کے گرد کرسی پہ بیٹھی تھی۔ وہاں جگہ جگہ ایسے ہی میزوں کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ بھی اپنے سبز فراک میں ادھر ادھر خوش باش پھیر رہی ہوتی مگر آج وہ اندر سے اتنی بے زار اور اداس تھی کہ وہیں بیٹھی سب کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھے گئی۔

ہر طرف لڑکیاں، لڑکے آجا رہے تھے۔ ثنا اپنا کیمرا اٹھائے، ماتھے پہ جھولتا ٹیکا سنبھالتی، ادھر ادھر اٹھلاتی تصویریں کھینچتی پھر رہی تھی۔ اسٹیج پہ صائمہ تائی مہوش کو مہندی لگانے کے بعد اب مٹھائی کھلا رہی تھیں۔ ارم بھی وہیں تھی۔ اس کا انارکلی فراک ہلکا فیروزی تھا اور کبھی وہ دوپٹا گردن میں ڈال لیتی، تو کبھی سر پہ کر لیتی کہ خواتین اور مردوں کا ایک ہی جگہ انتظام تھا اور تایا فرقان بھی آس پاس ہی تھے۔

زاہد چچا روشن خیال تھے تو مہوش کے ماموں کا خاندان بھی آزاد خیال تھا، سو مہندی کا فنکشن مشترکہ رکھا گیا تھا۔ البتہ ان کے خاندان کے لڑکے اور مرد ذرا الگ تھلک چند میزوں پر براجمان تھے تاکہ برائے نام ہی سہی، مگر پارٹیشن ہو جائے۔ تایا فرقان اور سلیمان صاحب، سب وہیں ہی تھے۔

وہ اسی طرح بیٹھی، پراندہ آگے کو ڈالے، غیر دلچسپی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک سرسری سی نگاہ میں گرد و پیش کا جائزہ لے کر جہان کو ڈھونڈنا چاہا تھا اور وہ اسے نظر آ بھی گیا تھا۔ دور، مردوں کی طرف، تایا فرقان اور سلیمان صاحب کے ساتھ کرسی پہ بیٹھا آستین عادتاً کہنیوں تک موڑے وہ خاصا لاتعلق سا بیٹھا تھا۔ یقیناً وہ جی بھر کر بور ہو رہا تھا۔

وہ تلخی سے سر جھٹک کر واپس اسٹیج کو دیکھنے لگی، جہاں اب فاطمہ، مہوش کو مٹھائی کھلا رہی تھیں۔ ساتھ ہی اس کی جڑواں بہن سحرش بیٹھی مسکرا کر کیمرے کو دیکھتی تصویر بنوا رہی تھی۔ اس کا انارکلی فراک پستئی رنگ کا تھا۔ دونوں بہنوں کی شکل و صورت سمیت سب مختلف تھا۔ مگر بدلے بدلے یہ مغرورانہ انداز یکساں تھے۔ ثنا چونکہ چھوٹی تھی یا فطرتاً مختلف تھی، سو اس نے یہ اثر قبول نہیں کیا تھا۔ اب ایسا بھی کیا ہوا تھا کہ وہ دونوں اتنی اکڑی پھر رہی تھیں۔ کس سے پوچھے! اس کے اندر فطری تجسس جنم لینے لگا تھا۔

''حیا..... ادھر بیٹھی ہو؟'' ارم اپنا فیروزی کامدار دوپٹا سر پہ ٹھیک سے جماتے ہوئے اس کے ساتھ کرسی پہ آ بیٹھی۔ کل کی نسبت اس کا رویہ قدرے دوستانہ تھا۔

''ہاں، تم سناؤ! تھک گئی ہو؟'' وہ بھی جواباً نرمی سے بولی۔

''ہاں بس، تھوڑی بہت۔ اچھا وہ.....'' لہجہ ذرا سرسری بنا کر وہ بولی ''فون فارغ ہوگا تمہارا؟'' مجھے ذرا فضہ کو کال کرنی تھی، کچھ نوٹس کا کہنا تھا۔ میرا فون خراب ہے آج کل۔''

حیا نے گہری سانس اندر کو کھینچ کر خارج کی۔ (تو ارم سے اس کا فون بھی لے لیا گیا تھا۔)

''ہاں! فون فارغ ہے، جب چاہے لے لو، مگر کریڈٹ ختم ہے، جب سے آئی ہوں، ڈلوایا ہی نہیں ہے۔ دوپہر سے ظفر کو ڈھونڈ رہی تھی کہ وہ ملے تو اس کو بھیج کر کارڈ منگواؤں۔''

اس نے تایا فرقان کے کل وقتی ٹک کا نام لیا۔ گو کہ یہ سچ نہیں تھا اور کریڈٹ اس نے صبح ہی ڈلوا لیا تھا مگر وہ ارم کو فون نہیں دینا چاہتی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اچھا.....'' ارم کے چہرے پہ واضح مایوسی پھیلی تھی۔

''اماں کا فون فارغ ہوگا، لے آؤں؟'' وہ اٹھنے لگی تو اس کی توقع کے عین مطابق ارم نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔

''رہنے دو، میں بعد میں ابا سے لے لوں گی۔ میرا فون ریپئرنگ کے لیے نہ گیا ہوتا تو۔ خیر تم سناؤ ترکی میں سب ٹھیک تھا؟'' وہ بات کا رخ پلٹ گئی۔

''بس.....وہاں کی تو اب دنیا ہی بدل گئی ہے، مگر اسے چھوڑو، یہ بتاؤ، مہوش، سحرش کے انداز اتنے بدلے بدلے کیوں لگ رہے ہیں؟'' اس نے پراندے کو ہاتھ سے پیچھے کمر پہ ڈالتے ہوئے حیرت کا اظہار کر ہی دیا۔ آخر دونوں کزنز تھیں اور کبھی بہت اچھی دوستیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے ان دونوں کا۔'' ارم سرگوشی میں کہتے ہوئے ذرا قریب کھسک آئی۔ ''یہ جو عفان صاحب ہیں نا، جن کو میں اپنا ڈرائیور بھی نہ رکھوں۔ انہوں نے کینیڈا میں کسی ریئلیٹی ٹی وی شو میں حصہ لے کر ڈیڑھ ملین ڈالرز جیتے ہیں اور ان سب کی جون ہی بدل گئی ہے۔ سنا ہے دونوں ہنی مون پہ یورپ کے ٹور پہ جا رہے ہیں۔'' ارم کے لہجے میں نہ حسد تھا، نہ رشک۔ بس وہ اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''تب ہی میں کہوں!'' اس نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ ارم کچھ دیر مزید بیٹھی، پھر اٹھ کر چلی گئی۔ حیا کو اگر کسی نے اسٹیج کی طرف بلایا تو بھی وہ نہیں گئی اور اصرار بھی کسی نے نہیں کیا۔ اس کے صدمے سے سب واقف تھے، مگر اس کی دوست کے غم میں کسی نے اپنا کام نہیں چھوڑا تھا اور وہ کسی سے ایسی توقع کر بھی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی دل پہ ایک بوجھ سا تھا۔ کتنی بے حس تھی یہ دنیا۔ کیسے لمحوں میں لوگ ختم ہو جاتے ہیں اور یہاں کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ سب کام جاری و ساری تھے اور.....

ایک دم سے بجلی غائب ہوگئی۔

ساری بتیاں گل ہوگئیں۔

ہر طرف اندھیرا اور سناٹا چھا گیا۔

صرف کیمرامین کے کیمروں کی فلیش لائٹس کی روشنی رہ گئی۔

پھر مایوسی، غصہ بھری مضمحل سی آوازیں بلند ہوئیں۔ موبائل کی ٹارچز آن ہوئی، کسی نے بھاگ کر برآمدے کی یو پی ایس کی نیوب لائٹ جلائی تو مدھم سفید روشنی برآمدے میں پھیل گئی۔

رضا، فرخ، داور وغیرہ کو ان کی ماؤں نے آوازیں دیں۔ جنریٹر آٹو میٹک تھا، پھر کیوں نہیں چلا؟

''کوئی تو جنریٹر چلائے۔'' ہر طرف اکتاہٹ بھری آوازیں سنائی دینے لگیں۔

لڑکے بھاگ کر برآمدے میں آئے اور فرخ نے جلدی سے آگے بڑھ کر جنریٹر چلانے کی کوشش کی مگر اس کا انجن مردہ پڑا رہا۔ اچھے بھلے فنکشن میں بدمزگی سی ہوگئی۔ ہر طرف بے چینی اور اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر میز پہ ایک ٹمٹماتی موبائل کی ٹارچ جگمگا رہی تھی۔

''پتا نہیں ابا! نہیں چل رہا۔'' داور بھائی نے بھی دو چار دفعہ کوشش کی، مگر بے سود۔ وہ ہاتھ جوڑ کر مایوسی سے کہتے ہوئے کھڑے ہوئے۔

ابا اور تایا فرقان بھی برآمدے کے ستونوں کے پاس آن کھڑے ہوئے تھے۔ حیا کی میز چونکہ برآمدے سے بہت قریب تھی، سو وہ گردن موڑ کر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

''جاؤ، مکینک کو بلا کر لاؤ یا دوسرے جنریٹر کا بندوبست کرو۔ جلدی۔'' تایا فرقان برہمی سے ڈانٹتے اپنے بیٹوں کو دوڑا رہے تھے۔ کوئی ادھر بھاگا، تو کوئی ادھر۔ ہر طرف ایک شرمندگی اور بے زاری پھیل گئی تھی۔

وہ ایک کہنی میز پر ٹکائے، ٹھوڑی ہتھیلی پہ رکھے گردن ترچھی کر کے برآمدے کو دیکھے گئی، جہاں مدھم سی روشنی میں رکھا جنریٹر دکھائی دے رہا تھا۔ قریب ہی تایا فرقان اور سلیمان صاحب کھڑے قدرے متاسف سے آپس میں کچھ کہہ رہے تھے۔

دفعتاً وہ ذرا چونکی۔ اس نے جہان کو برآمدے کے زینے چڑھتے ہوئے دیکھا۔ تایا فرقان اور ابا نے اسے نہیں دیکھا تھا، وہ آپس

Downloaded From http://paksociety.com

میں مصروف تھے۔

وہ خاموشی سے آستینیں مزید پیچھے موڑتے ہوئے آگے بڑھا اور جنریٹر کے سامنے ایک پنجے اور ایک گھٹنے کے بل بیٹھا۔ نچلا لب دانتوں سے دبائے، وہ اب گردن جھکائے جائزہ لینے لگا تھا۔

پھر سر اٹھایا اور متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ قریب سے افراتفری کے عالم میں ثنا اندر جاتی دکھائی دی۔ اس نے ثناء کو آواز دی۔ وہ ٹھٹھک کر رکی۔ اس نے کچھ کہا تو ثناء نے ذرا اچھنبے سے اثبات میں سر ہلایا اور اندر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد اس کی واپسی ہوئی تو چھری، پیچ کس اور ایسی چند چیزیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ جہان کے ساتھ وہ سب رکھ کر وہ خود بھی وہیں کھڑی ہو گئی۔

وہ جنریٹر کا کور اتار رہا تھا۔ تب ہی تایا فرقان کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ چونکے۔ وہ بغیر اپنے کرتے کی پروا کیے، زمین پہ بیٹھا جنریٹر میں ہاتھ ڈال کر کچھ دیکھ رہا تھا۔ تایا فرقان کی نگاہوں کے تعاقب میں سلیمان صاحب نے بھی اس طرف دیکھا۔

''فیول والو میں کچھ پھنس گیا ہے، ابھی صاف ہو جائے گا۔'' اس کی آواز مدھم مدھم سی حیا تک پہنچی تھی۔ ثنا بہت حیرت، بہت متاثر سی اس کے ساتھ کھڑی اس کو کام کرتے دیکھ رہی تھی، جو بالکل کسی ماہر مکینک کے انداز میں بہت مہارت سے تاریں ادھر ادھر کر رہا تھا۔

چونکہ ہر سو اندھیرا تھا اور روشنی صرف برآمدے میں تھی، سو برآمدے کا منظر سارے منظر پہ چھانے لگا۔ لڑکیاں اور رشتہ دار خواتین مڑ مڑ کر اسی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ماحول پہ چھائی بے چینی ذرا کم ہوئی۔

اس نے کور واپس ڈالا۔ اس کے ہاتھوں پہ کالک لگ گئی تھی۔ پھر اس نے جنریٹر کا لیور کھینچا اور پیچھے کو ہٹا تو ساتھ ہی ایک جھماکے سے ساری بتیاں روشن ہو گئیں۔ اتنی تیز روشنی سے حیا کی آنکھیں لمحے بھر کو چندھیائیں اس نے بے اختیار انہیں میچ کر دھیرے دھیرے کھولا۔

ثنا خوشی اور تشکر سے کچھ کہتے ہوئے چیزیں اٹھا رہی تھی۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ رہا تھا۔ ثنا نے اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا تو وہ اسی سنجیدگی سے سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ ثنا بھاگ کر اس کے پیچھے گئی۔

سلیمان صاحب جو قدرے دم بخود سے دیکھ رہے تھے، ذرا سنبھل کر واپس مڑ گئے۔ وہ متاثر ہوئے تھے اور وہ اس تاثر کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ حیا مسکراہٹ دبائے واپس سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

جس شخص نے اندھیروں میں روشنیاں بکھیری تھیں، اس سے سب ہی متاثر تھے۔ البتہ وہ جانتی تھی کہ ابا نے کبھی یہ توقع نہیں کی ہو گی کہ جہان یوں زمین پہ بیٹھ کر جنریٹر کھولنے لگ جائے گا۔ اس کے دل میں ایک بے پایاں سا فخر جاگا۔ اس کی اور یقیناً ثنا کی بھی خود ساختہ سی خفگی اب کہیں نہیں تھی۔

مہمانوں کے لیے ریفریشمنٹ تھی اور ان کے جانے کے بعد گھر والوں کے لیے کھانے کا انتظام تھا۔ جب مہمان چلے گئے اور صرف وہی اپنے لوگ رہ گئے تو لان میں خواتین کا کھانا لگا دیا گیا جبکہ مردوں کا انتظام اندر تھا۔ مرد حضرات اور لڑکے وغیرہ اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔ لان اب خالی خالی سا ہو گیا تھا۔

وہ پانچوں کزنز اس وقت اسٹیج پہ جھولے اور ساتھ رکھی کرسیوں پہ آ بیٹھی تھیں۔ مہوش تھوڑی دیر بیٹھی، پھر ''میں اب آرام کروں گی'' کہہ کر نزاکت سے اپنا فراک سنبھالے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''جہان بھائی تو بڑے کمال کے ہیں۔'' ثنا اپنی ہیلز اتار کر دکھتے پیروں کو ہاتھ سے سہلا رہی تھی۔ ''میں نے تو ان سے کہہ بھی دیا کہ جہان بھائی! میں نے آپ کو پاس کر دیا''۔ پہلے تو حیران ہوئے، پھر ہنس پڑے۔ سچ حیا آپی، آپ کے فیانسی ہیں بڑے اسمارٹ۔''

''اچھا۔'' وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

''ان فیانسی صاحب کو تو شاید خود بھی اپنی منگنی کا علم نہیں ہے۔ سلوک دیکھا ہے ان کا حیا کے ساتھ؟''

ارم جو قدرے بے زاری سی بیٹھی تھیں، تنک کر بولی ''اور جب فرخ بھائی مکینک کو لا ہی رہے تھے تو کیا ضرورت تھی بھرے مجمع میں الیکٹریشن بننے کی؟ لوگ بھی کیا سوچتے ہوں گے، ترکی سے یہی سیکھ کر آئے ہیں۔''

ثنا کے تو تلووں پہ لگی، سر پہ بجھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ارم آپی! بات سنیں، سمیع بھائی کو الیکٹریشن لانے میں پون گھنٹہ تو لگ ہی جانا تھا، جبکہ جہان بھائی نے چھ، سات منٹ میں سارا مسئلہ حل کر دیا اور امیج کی کیا بات ہے، لوگ تو امپریس ہی ہوئے ہوں گے۔''

''ہاں، بہت امپریس ہوئے ہوں گے کہ ہمارا ٹرکش کزن باورچی ہونے کے ساتھ ساتھ مکینک بھی ہے۔''

ارم بڑے تمسخر سے ہنس کر اٹھ گئی۔ ثنا نے غصے بھری نگاہوں سے گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھا۔

''ارم آپی بھی نا، ہر وقت مرچیں ہی چباتی رہتی ہیں۔''

''اچھا جانے دو۔ اس کی تو عادت ہے۔ تم مجھے آن لائن پکچرز دکھاؤ، اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔'' اس نے کہا تو ثنا سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی اندر آئی تھیں۔

لاؤنج میں سارے مرد حضرات بیٹھے تھے۔ جہان بھی ادھر ہی تھا۔ ایک سنگل صوفے پہ بیٹھا وہ غور سے داور بھائی کی باتیں سن رہا تھا جو وہ اپنے مخصوص انداز میں با آواز بلند کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ دونوں تیز تیز چلتی لاؤنج کے سرے پہ بنے دروازے تک آئیں۔ وہ باہر کھڑی رہ گئی جبکہ ثنا نے دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ مہوش کا کمرا تھا، جس کے اندر ثنا کا کیمرا رکھا تھا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں بیڈ پہ لیٹی، آنکھوں پہ بازو رکھے مہوش نظر آ رہی تھی۔ ثنا دبے قدموں اندر گئی اور ڈریسنگ ٹیبل سے کیمرا اٹھایا۔ آہٹ پہ مہوش نے بازو ہٹایا۔

''کیا ہے ثنا! سونے دو نا مجھے۔'' وہ تنک کر بولی۔

''سوری آپی! بس جا رہی ہوں۔'' ثنا کیمرا اٹھا کر جلدی سے باہر آئی اور دروازہ بند کیا۔

''ایک تو مہوش آپی بھی نا۔'' وہ ذرا خفگی سے کہتی اس کے ساتھ کچن کی جانب بڑھ گئی۔ ایک دفعہ پھر لاؤنج سے گزر کر وہ دونوں کچن میں آئی تھیں اور حیا جانتی تھی کہ وہ بنا میک اپ کے بھی اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ اس کے بہت سے کزنز نے نگاہوں کا زاویہ موڑ کر اسے دیکھا ضرور تھا، البتہ وہ جس کے دیکھنے سے فرق پڑتا تھا، ویسے ہی داور بھائی کی جانب متوجہ تھا۔

وہ دونوں اب کچن میں کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی، ثنا کے ہاتھ میں پکڑے کیمرے کی چمکتی اسکرین پہ گزرتی تصاویر دیکھ رہی تھیں۔ جنہیں ثنا انگوٹھے سے بٹن دباتی آگے کرتی جا رہی تھی۔ تب ہی دھاڑ سے دروازہ کھل کر بند ہونے کی آواز آئی۔ ان دونوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

''داور بھائی! یہ کیا تماشا ہے؟'' وہ ضبط کھو کر چلانے والی مہوش تھی۔

لمحے بھر کو تو وہ دونوں ساکت رہ گئیں، پھر ایک دم سے دوڑ کر چوکھٹ تک آئیں۔

لاؤنج میں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ سب ششدر سے مہوش کو دیکھ رہے تھے جو اپنے کمرے کے دروازے کے آگے کھڑی کمر پہ ہاتھ رکھے، چلا رہی تھی۔

''یہ کون سی جگہ ہے تقریریں کرنے کی؟ کسی کو میرا احساس ہی نہیں ہے کہ میں نے آرام بھی کرنا ہے، کل سارا دن میرا پارلر میں گزرے گا، مگر آپ تو میرے سر پہ چیخ رہے ہیں۔ آپ کو آہستہ بولنا نہیں آتا؟ حد ہو گئی۔'' وہ پیر پٹخ کر واپس مڑی اور اپنے پیچھے اسی دھاڑ سے دروازہ بند کیا۔

لاؤنج میں یک دم موت کا سناٹا چھایا تھا۔ سب کو ایسا جھٹکا لگا تھا کہ بیان سے باہر تھا۔ پھر ایک دم سے جہان اٹھا۔

''داور! فرخ! مجھے گھر ڈراپ کر دو گے یا میں تم میں سے کسی کی کار لے جاؤں؟''

وہ تنے ہوئے نقوش کے ساتھ بہت قطعیت سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے سوال پہ سلیمان صاحب، تایا فرقان اور ان کے تینوں بیٹے ایک جھٹکے سے اٹھے۔ وہ جواب سننے کے لیے نہیں رکا۔ تیزی سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ وہ سب اس کی معیت میں باہر نکل گئے۔ ذرا پریشان سے زاہد چچا اور رضا بھی ان کے پیچھے لپکے۔

''مہوش آپی..... آئی کانٹ بلیو دس!'' ثنا نے بے حد تحیر سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ حیا نے افسوس سے اسے دیکھا اور پھر خالی پڑے لاؤنج کو۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ابا لوگ بہت غصے میں گئے ہیں، مجھے لگتا ہے وہ ابھی ہمیں چلنے کا کہیں گے۔'' اسی پل اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے موبائل سامنے کیا۔ ''ابا کالنگ'' باہر پہنچنے کا بلاوا آ گیا تھا۔

''سوری شانا!'' اس نے بے بسی سے شانے اچکائے، پھر اس کا کندھا تھپتھپایا۔

''کل شادی کے فنکشن تک سب کا غصہ اتر چکا ہوگا۔ فکر نہ کرنا، اچھا!'' کہہ کر وہ تیزی سے باہر لپکی۔

☆ ☆ ☆

سب سونے جا چکے تھے اور وہ اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی پراندے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ سونیا نے کافی سخت باندھا تھا، گرہ کھل کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ بالآخر پراندہ چھوڑ کر اس نے پیشانی پہ جھولتے ٹیکے کو کھینچنے کے لیے چھوا ہی تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

اس نے ٹیکا چھوڑا اور پھر حیرت سے دروازے کو دیکھتی اس تک آئی۔ اماں، ابا تو سونے چلے گئے تھے پھر.....

اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے جہان کھڑا تھا۔

''سوری! تم سوتو نہیں گئی تھیں؟'' وہ قدرے جھجک کر بولا۔ سیاہ ٹراؤزر کے اوپر آدھی آستین والی سفید ٹی شرٹ پہنے وہ وہی ترکی والا جہان لگ رہا تھا۔

''نہیں، تم بتاؤ خیریت؟''

''ہاں، ابھی میں لاؤنج میں بیٹھا تھا تو وہ فرقان ماموں کی بیٹی آئی تھی۔''

''ارم؟'' اس نے ذرا حیرت سے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

''ہاں وہی۔ تمہارا فون اور پرس میز پہ رکھا تھا، اس نے فون اٹھا کر مجھ سے کہا کہ اسے ایک کال کرنی ہے، ابھی پانچ منٹ میں فون لا دے گی، مگر اب.....'' اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ''اب بیس منٹ ہونے کو آئے ہیں مگر وہ واپس نہیں آئی۔ میں نے سوچا تمہیں بتا دوں۔''

''اُف! تم نے اسے میرا فون کیوں لے جانے دیا؟''

جواباً جہان نے بے چارگی سے شانے اچکائے۔

''اس نے مجھ سے اجازت نہیں مانگی تھی اور میں اسے کیسے روک سکتا تھا؟ مجھے تو فرقان ماموں کی فیملی سے ویسے ہی بہت ڈر لگتا ہے۔''

''کیوں؟'' وہ چونکی۔

''کیونکہ وہ سرخ مرچ کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا تو وہ بے اختیار ہنس دی اور یہ ترکی سے آنے کے بعد پہلی دفعہ تھا، جب وہ یوں پورے دل سے ہنسی تھی۔

''سرخ مرچ کا استعمال ہمیں بھی آتا ہے۔ تم ادھر ہی ٹھہرو، میں ذرا ارم سے فون لے آؤں۔'' اور آج تو ویسے ہی ارم کی طرف سے اس کے بہت سے حساب اکٹھے ہو گئے تھے۔

''اچھا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ مسکرا کر کہتا صوفے پہ بیٹھ گیا اور وہ باہر چلی آئی۔

تایا فرقان کے لاؤنج میں سب ہی موجود تھے سوائے ارم اور سونیا کے۔ تایا ابا بہت پرملال انداز سے نفی میں سر ہلاتے کچھ کہہ رہے تھے، شاید آج والے واقعے کا تذکرہ، جب حیا کو آتے دیکھا۔

''آؤ آؤ بیٹا۔'' انہوں نے مسکرا کر اپنے ساتھ صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر سونیا کو آواز دی۔

''سونیا! حیا کی چائے بھی لے آنا۔''

''جی! اچھا ابا!'' سونیا نے جواباً کچن سے آواز لگائی۔

''نہیں تایا ابا! میں چائے نہیں پیوں گی، بس اب سونے ہی جا رہی تھی۔'' وہ بے تکلفی سے کہتی تایا ابا کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

ان کی گھریلو سیاستیں اور وقتی تند و تیکھی باتیں ایک طرف، تایا فرقان اس سے پیار بھی بہت کرتے تھے اور آج مہوش کی بدتمیزی پہ جہاں وہ دکھی تھے، وہاں انہیں حیا کی قدر بھی آئی تھی۔

''ابا سو گئے تمہارے؟''

''جی، کب کے۔ میں بس ذرا ارم سے فون لینے آئی تھی۔''

''فون، کیوں؟'' تایا ابا بری طرح چونکے۔ صائمہ تائی بھی ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگیں۔

''ارم کو کوئی کال کرنی تھی تو وہ میرا فون لے کر گئی تھی، مگر ابھی مجھے اپنی فرینڈ کو میسج کرنا ہے، سوسوچا فون لے لوں۔'' وہ بہت سادگی سے کہہ رہی تھی۔

تایا کے چہرے کا رنگ فوراً ہی بدل گیا تھا۔ نرمی کی جگہ سختی نے لے لی۔

''ارم..... ارم۔'' انہوں نے بلند آواز میں پکارا۔

''جی ابا!'' وہ دوپٹا سنبھالتی، بھاگتی ہوئی آئی، مگر حیا کو بیٹھے دیکھ کر اس کا رنگ ایک دم سے فق ہوا۔

''حیا کا فون اسے واپس دو۔'' تایا نے اسے کڑی نگاہوں سے گھورتے ہوئے، بڑے ضبط سے کہا۔

''جج..... جی وہ فضہ کو میسج کرنا تھا تو.....'' وہ ہکلا گئی۔ تایا اتنی شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے کہ وہ رکی نہیں۔ الٹے قدموں واپس مڑی، اور چند ہی لمحوں بعد فون لا کر حیا کو تھمایا اور ساتھ ہی ایک کینہ توز نگاہ اس پہ ڈالی تھی، گویا کچا چبا جانا چاہتی ہو۔ وہ جواباً سادگی سے مسکرا دی۔

''تھینک یو، میں چلتی ہوں، آپ لوگ چائے انجوائے کریں۔'' وہ فون لے کر وہاں سے اٹھ آئی اور وہ جانتی تھی کہ اب چائے انہوں نے خاک انجوائے کرنی تھی۔

واپس لاؤنج میں آتے ہوئے اس نے سوبائل کا Log چیک کیا۔ میسج اور کال لاگ بالکل کلیئر تھا۔ سارا کال ریکارڈ غائب۔

''ارم کی بچی!'' اسے ارم پہ بے طرح سے غصہ آیا۔ کال ریکارڈز میں موجود تمام نمبرز اس کے پاس محفوظ ہی تھے، البتہ جب وہ ترک فون ریسٹورنٹ میں چھوڑ آئی تھی، بیوک اداجانے سے قبل، تو اس کے اسی پاکستانی موبائل پہ عبدالرحمٰن پاشا کا فون آیا تھا۔ اس کا نمبر اس نے محفوظ نہیں کیا۔ وہ بس کال لاگ میں پڑا رہ گیا تھا۔ اب وہ مٹ گیا تھا۔ چلو خیر، اس نے کون سا کبھی اے آر پی کو کال کرنی تھی۔

جہان صوفے پہ اسی طرح بیٹھا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیسے ملا؟ مرچوں کے استعمال سے؟'' اس کی نگاہیں حیا کے ہاتھ میں پکڑے موبائل پہ تھیں۔

''نہیں، جہاں شکر کے استعمال سے بات بن جائے ہم وہاں مرچیں ضائع نہیں کرتے۔''

''ویسے پاکستان کے لوگ دل کے بہت ہی اچھے ہیں۔ ایک کزن بغیر پوچھے فون اٹھا لیتی ہے، ایک بہت عزت سے بغیر کھانا کھلائے گھر سے نکالتی ہے اور ایک کھانا بھی نہیں پوچھتی۔''

''اوہ خدایا!'' اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ ''تم نے کھانا نہیں کھایا۔''

''کہاں کھاتا، وہاں تو ابھی لگا ہی نہیں تھا اور یہاں گھر کی دونوں خواتین نے پوچھا ہی نہیں۔'' وہ اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی بھاگ کر جلدی سے کچن کی طرف آئی اور فریج کھولا۔

''آج وہاں کھانا تھا تو کچھ بنایا ہی نہیں۔ ہمارے ہاں رات کا سالن اگلے دن کوئی نہیں کھاتا۔ ٹھہرو! میں انڈے بنا لیتی ہوں۔'' سے یاد آیا۔ کھانا تو اس نے بھی نہیں کھایا تھا مگر اسے اتنی بھوک نہیں تھی۔ انڈوں کا خانہ کھولا تو اندر دو ہی انڈے رکھے تھے۔ اسے بے پناہ شرمندگی ہوئی۔

''ان دو انڈوں سے تو کچھ نہیں بنے گا۔'' اس نے خفت سے کہتے ہوئے فریج کا دروازہ بند کیا۔

جہان نے جیسے اس پر افسوس کرتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''تمہیں شاید بھول گیا ہے کہ تم استنبول کے بہترین شیفس میں سے ایک سے بات کر رہی ہو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ ادھر کرسی پہ..... میں خود بنالوں گا سب کچھ۔''

اس نے اپنا سلور اسمارٹ فون میز پہ رکھا اور پھر آگے بڑھ کر فریج، فریزر، کیبنیٹس، ہر چیز کھول کھول کر الا بلا باہر نکالنے لگا۔ فروزن قیمہ، پاستا کا پیکٹ، جمے مٹروں کا لفافہ، ساسز، سبزیوں کے خانے سے چند سبزیاں چن لیں۔ وہ تمام چیزیں کاؤنٹر پہ جمع کرتا جا رہا تھا۔

''تم اس وقت پاستا بناؤ گے؟'' وہ متعجب سی کرسی پہ بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سبز فراک پر اندے اور ٹیکے سمیت بیٹھی تھی اور اسے کپڑے تبدیل کرنا بالکل بھول گیا تھا۔

''ہاں اور مجھے کوکنگ کے درمیان ٹوکنا مت۔ میں بہت برا مانتا ہوں۔'' مسکراتے ہوئے وہ سبزیاں دھو رہا تھا۔ ''اور تمہارا بخار کیسا ہے؟''

''اب ٹھیک ہے۔'' اس نے خود ہی اپنا ماتھا چھوا۔ وہ کل کی نسبت قدرے ٹھنڈا تھا۔

''ویسے مجھے حیرت زاہد ماموں اور ان کے بیٹے پہ ہے۔ اس لڑکی نے اتنی بدتمیزی کی اور انہوں نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔'' وہ واقعتاً حیرت سے کہتا سبزیاں کٹنگ بورڈ پہ رکھ کر کھٹا کھٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

''اس کی ایک دن کے بعد رخصتی ہے۔ شاید وہ اس کا دل برا نہیں کرنا چاہتے ہوں گے۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''مگر اس نے بہت مس بی ہیو کیا۔'' وہ افسوس سے کہتا پانی ابلنے کے لیے رکھ رہا تھا۔ دوسری جانب اس نے فرائنگ پین میں ذرا سا تیل گرم ہونے رکھ دیا تھا۔

''اصل میں اس کے فیانسی نے کسی کینیڈین رئیلیٹی شو میں ایک ڈیڑھ ملین ڈالر جیتے ہیں، اسی پہ اس کا دماغ ساتویں آسمان پہ ہے اور وہ زمین پہ بغیر دماغ کے گھوم رہی ہے۔'' وہ ٹیک لگائے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی بتا رہی تھی۔

''کینیڈین شو میں ڈیڑھ ملین ڈالر؟ بہت اچھی کور اسٹوری ہے۔'' اس نے ذرا سا ہنس کر سر جھٹکا۔ ساتھ ہی وہ فرائنگ پین میں فرائی ہوتی سبزیوں کو بجائے کفگیر سے ہلانے کے، فرائنگ پین کا ہینڈل پکڑے دائیں بائیں تو کبھی اوپر نیچے ہلا رہا تھا۔ سبزیاں چند انچ اوپر کو اڑتیں اور پھر واپس پین میں آگرتیں۔

''کیا مطلب؟'' اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''اگر کسی پاکستانی نے کینیڈین شو میں اتنی خطیر رقم جیتی ہوتی تو میڈیا پہ ہر جگہ آچکا ہوتا۔ مجھے تو وہ لڑکا شکل سے ہی کریمنل لگ رہا تھا۔ تازہ تازہ آئی بلیک منی کو وائٹ کرنے کے لیے کور بنایا ہے، اور کیا۔''

''اچھا!'' اسے تعجب ہوا۔ اس نہج پہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا، البتہ کریمنل سے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

''جہان! تمہارے ریسٹورنٹ پہ جو حملہ ہوا تھا، اس کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔'' وہ گردن ترچھی کیے، ساس کی بوتل پین میں انڈیل رہا تھا۔ ''حالانکہ میری استنبول میں کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ قوی امکان ہے کہ کسی اور کے دھوکے میں ان لوگوں نے میرا ریسٹورنٹ الٹ دیا۔''

ایک دشمنی تو خیر اب اس کی بن چکی تھی، مگر وہ تو خود بھی اس سے واقف نہیں تھا۔

''تم تو کہتے تھے کہ استنبول میں ایسا کوئی کرائم سین نہیں ہے۔''

''خیر، اب اتنے بھی برے حالات نہیں ہیں اور ڈارک سائیڈ تو ہر بڑے شہر کی ہوتی ہے۔''

وہ چولہے کے سامنے کھڑا، اس کی طرف پشت کیے، پین میں قیمہ بھون رہا تھا۔ قیمے اور شملہ مرچ کی بھینی بھینی، اشتہا انگیز سی مہک سارے کچن میں پھیلنے لگی تھی۔ اس کی گم گشتہ بھوک ایک دم سے جاگ اٹھی۔

''تمہیں پاکستان آکر کیسا لگا جہان!'' وہ ٹھوڑی تلے مٹھی رکھے اسے دیکھتی سادگی سے پوچھنے لگی۔ یہ یہاں آنے کے بعد ان کی پہلی باقاعدہ گفتگو تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اچھا لگا بلکہ بہت اچھا لگا، مگر فرقان ماموں کی باتیں..... میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرے رشتے دار اتنی تیکھی باتیں بھی کر لیتے ہوں گے۔'' اس نے جیسے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔ آج وہ سارا دن تایا فرقان کی کمپنی میں رہا تھا تو یہ ردعمل فطری تھا۔

''وہ اتنے تیکھے نہیں ہیں، اور بہت پیار کرتے ہیں ہم لوگوں سے بس ان کے اپنے نظریات ہیں جو اتنے سخت ہیں کہ اگر کوئی ان پر پورا نہ اترے تو وہ اس کی گریڈنگ بہت نیچے کر دیتے ہیں۔''

''واٹ ایور!'' وہ اب پاستا کے پتیلے میں قیمہ اور ساس انڈیل رہا تھا۔ پھر ان کو اچھی طرح مکس کر کے اس نے اسے دم پہ رکھ دیا اور سنک کی ٹونٹی کھول کر ہاتھ دھونے لگا۔ وہ سمجھی اب وہ اس کے پاس آ کر بیٹھے گا، مگر وہ ہاتھ دھو کر اب سارا پھیلاوا سمیٹنے لگا تھا۔ جھوٹے برتن، سبزیوں کے چھلکے، خالی شاپر۔ وہ جلدی سے اٹھی۔

''میں کر دیتی ہوں۔''

''پلیز تم بیٹھی رہو، جتنی پھوہڑ تم ہو، میں جانتا ہوں۔ اگر تم نے میری مدد کروائی تو دو گھنٹے لگ جائیں گے، جبکہ میں اکیلا کروں تو دو منٹ میں ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، خود ہی کرو۔'' وہ قدرے خفگی سے کہتی دوبارہ بیٹھ گئی۔

اور واقعی، اس نے دو، تین منٹ میں ہر چیز اپنی جگہ پہ رکھ دی۔ چند ایک برتن جو پکانے کے دوران میلے ہوئے تھے، وہ دھل کر اسٹینڈ میں لگ گئے اور سلیب چمکا دیے گئے۔ وہ بندہ کمال کا تھا۔

''تم کب سے ریسٹورنٹ چلا رہے ہو؟''

''اب تو بہت عرصہ ہو گیا۔ اچھا۔ میں برتن لگاتا ہوں، تم سلیمان ماموں کو بلا لاؤ، انہوں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔

''ارے ہاں!'' وہ ماتھے پہ ہاتھ مارتی اٹھی، پھر نگاہ اس کے سلور اسمارٹ فون پہ پڑی جو میز پہ رکھا تھا۔

''تمہیں پتا ہے۔ ڈی جے کو تمہارا فون بہت پسند تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ جہان سے کہنا، جب اپنا یہ ایک دو لاکھ کا فون پھینکنا ہو تو سبانجی کے باہر ہی پھینکے۔'' وہ اداسی سے مسکرا کر بولی تو وہ ہنس دیا۔

''ویسے یہ اس کو لگائے گئے تخمینے سے کہیں زیادہ مہنگا ہے۔''

''اچھا۔'' اسے ذرا حیرت ہوئی۔ ''اتنا قیمتی فون کیوں خریدا تم نے؟''

''خریدا نہیں تھا، گفٹ ملا تھا۔ اسپیشل گفٹ'' وہ مسکرا کر جیسے کچھ یاد کر کے بولا۔

''کس نے دیا تھا؟''

''سم ون اسپیشل! اچھا جاؤ۔ ابھی ماموں کو بلا لاؤ!'' وہ ٹال گیا تو وہ شانے اچکاتی وہاں سے چلی آئی۔ ابا کا دروازہ بجا کر، وہیں سے بلا کر وہ واپس لاؤنج میں آئی تو وہ وہاں میز پہ پلیٹیں اور گلاس رکھ رہا تھا۔ وہ بڑے صوفے پہ بیٹھی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی چلا دیا۔

جس وقت ابا ذرا حیران سے باہر آئے، جہان پاستا کی ڈش اٹھائے کچن سے نکل رہا تھا اور وہ مزے سے اپنے کامدار جوڑے میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی چینل بدل رہی تھی۔

''ابا!'' ان کو دیکھ کر جلدی سے اٹھی اور جہان کے ہاتھ سے ٹرے لی۔

''سوری ماموں! ہم نے آپ کو اٹھا دیا۔ آپ نے کھانا نہیں کھایا تھا سو..... ادھورا چھوڑ کر اس نے ان کی طرف پلیٹ بڑھائی۔

''تھینک یو۔'' ابا نے قدرے ناسمجھی سے کھانے کو دیکھا اور پھر حیا کو ''یہ تم نے بنایا ہے؟''

''نہیں، جہان نے!'' وہ مسکراہٹ دبا گئی۔

''ویسے ماموں! یہ اٹالین ریسپی نہیں ہے۔ ذرا دیسی اسٹائل میں بنایا ہے جیسے ممی بناتی ہیں، آپ کو پاستا میں قیمہ پسند ہے نا، ممی نے بتایا تھا مجھے۔''

سلیمان صاحب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ اس کو دل توڑنے کا فن آتا تھا تو ٹوٹے ہوئے دلوں کو دوبارہ جوڑ کر انہیں جیتنے کا فن

Downloaded From http://paksociety.com

بھی آتا تھا۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ اسے اب احساس ہوا تھا کہ وہ رف اور لف سا بندہ تو بھوکا بھی سو جاتا مگر رات کے ایک بجے اگر اس نے اتنا اہتمام کیا تھا تو صرف اور صرف ابا کے لیے، کیونکہ اسے یاد تھا کہ ابا نے کھانا نہیں کھایا اور اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس سے ذرا کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ اور حیا کو خود اب یاد آیا تھا کہ قیمہ والا پاستا ابا کا پسندیدہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس عمل سے جہان نے اپنے اور ابا کے درمیان حائل برف کو پگھلانے کی کوشش کی تھی۔

پاستا بہت مزے کا تھا۔ منہ میں جاتے ہی گھل جانے والا۔ سلیمان صاحب نے تعریف نہیں کی، مگر ان کے چہرے سے ظاہر تھا کہ انہیں اپنا یوں خیال کیا جانا اچھا لگا تھا۔ وہ خود بھی بہت شوق سے کھا رہی تھی۔ ڈی جے کے بعد یہ پہلا کھانا تھا، جو اس نے دل سے کھایا تھا۔

''قونیا میں دو لڑکیوں کا اغوا۔''

ٹی وی اسکرین پہ بی بی سی چل رہا تھا، اور جو خبر نیوز کاسٹر نے پڑھی، اس پہ ان تینوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ کونیا ترکی کا شہر تھا۔ جلال الدین رومی کا شہر۔

جہان نے بجلی کی تیزی سے ریموٹ اٹھایا اور چینل بدل دیا۔

''کیا کہا اس نے.....کونیا؟'' ابا جو ہاتھ روک کر اسکرین کو دیکھنے لگے تھے، چینل تبدیل ہونے پہ الجھ کر جہان کو دیکھا۔ وہ سادگی سے مسکرا دیا۔

''نہیں، کونیا نہیں، اس نے کہا تھا کینیا.....اور لیں نا!''

وہ ریموٹ ایک طرف رکھ کر انہیں پھر سے سرو کرنے لگا۔ ابا نے ذرا تذبذب سے سر ہلایا، گویا وہ اپنی سماعت کے دھوکا دینے پہ الجھے ہوئے تھے۔ حیا نے جہان کو دیکھا اور جہان نے اسے، پھر دونوں زیر لب مسکرا دیے۔

ابھی وہ ابا کے سامنے ترکی کا امیج سبوتاژ ہوتا دیکھنے کے متحمل نہیں تھے۔

☆ ☆ ☆

بارات کے لیے وہ میرج ہال کے جانب رواں دواں تھے۔ ابا ڈرائیو کر رہے تھے اور آج وہ خاموش نہیں تھے بلکہ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھے جہان کو سڑک کے اطراف میں گزرتی جگہوں کے بارے میں مختصر فقروں میں آگاہی دے رہے تھے۔ وہ بھی جواباً کوئی مختصر سا جواب دے دیتا تھا۔ وہ آج بھی اتنا ہی کم گو تھا، جتنا دو روز قبل، مگر وہ برف کی دیوار پگھل گئی تھی۔

وہ پچھلی نشست پہ بیٹھی لاتعلق سی باہر دیکھ رہی تھی۔ اسے ڈی جے کے بغیر یوں ان خوشی کی تقاریب میں شرکت کرنا سخت برا لگ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر احساس جرم کا شکار تھی۔ ابھی اسے بچھڑے دن ہی کتنے ہوئے تھے، مگر مجبوری تھی۔ جانا تو تھا۔ وہ آج بھی خاص تیار نہیں ہوئی تھی۔

کاجل اور نیچرل لپ اسٹک کے علاوہ کوئی میک اپ نہیں کیا، بال یونہی کھلے چھوڑ دیے۔ جیولری بھی نہیں پہنی۔ ضرورت بھی نہیں تھی کہ اس کی لمبی، گھنوں سے بالشت بھر اونچی قمیص کے گلے پہ کافی کام تھا۔ وہ شیفون کی قمیص تھی، اور اس کا رنگ آلو بخارے کے چھلکے کا سا تھا۔ قمیص کا گلا گردن تک بند تھا اور گردن سے لے کر دو بالشت نیچے تک سیاہ اور آلو بخارے کے رنگ کے چھوٹے بڑے ہر سائز کے Diamonties (نگ) لگے تھے۔ ان کی جھلملاہٹ بہت خوب صورت تھی۔ نیچے ہم رنگ سلک کا پاجامہ تھا اور آستینیں کلائیوں تک آتی چوڑی دار تھیں۔ لیکن آج بھی اسے کل کی طرح اپنے لباس کی خوب صورتی سے قطعاً دلچسپی نہ تھی۔

میرج ہال کے باہر بارات ابھی ابھی اتری تھی۔ داخلی دروازے پہ خاصا رش تھا۔ سجی سنوری، زیورات، قیمتی ملبوسات اور خوشبوؤں میں رچی بسی لڑکیاں اور خواتین گاڑیوں سے نکل کر، اپنے بال اور میک اپ ٹھیک کرتی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ رضا اور زاہد چچا وہاں کھڑے خوش اخلاقی سے مسکراتے مہمانوں کو ویلکم کر رہے تھے۔ اسے پتا تھا کہ مہوش کی کل والی بات کو آج بھلا کر سب شادی میں شرکت کریں گے اور واقعی یہ ہو رہا تھا۔

کار رکنے پر اس نے دروازہ کھولا اور باریک ہیل باہر پتھریلی زمین پہ رکھی۔ بے اختیار اسے اپنی ٹوٹی ہوئی سرخ ہیل یاد آئی۔ سر

Downloaded From http://paksociety.com

جھٹک کر وہ باہر نکلی اور پرس سنبھالتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ ابا، جہان اور اماں ایک ساتھ میرج ہال کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے اور وہ بھی وہیں چلی جاتی اگر جو اس کے پاؤں پہ وہ پتھر آ کر نہ لگتا۔

''آؤچ!'' اس نے کراہ کر پیر ہٹایا۔ وہ بجری کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ مخالف سمت سے آیا تھا، جہاں پارکنگ میں گاڑیاں کھڑی تھیں اور کسی نے بہت تاک کر اسے مارا تھا۔ ان گزرے تین چار ماہ میں اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ اتفاقات نہیں ہوتے تھے۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے اس سمت دیکھا اور پھر ٹھہر سی گئی۔ پارکنگ کے پیچھے سے ایک ہیولا سا نکلا اور اس کی جانب بڑھنے لگا۔ چند لمحے تو وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی۔

رات کی تاریکی میں پارکنگ ایریا کو اونچے پولز کی زرد بتیوں نے مدھم سی روشنی بخش رکھی تھی۔ اس روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا یاد دے رہی تھی۔

بھڑکتا ہوا نیلا زرتار دوپٹہ، ہم رنگ جوڑے کے اوپر پہنے، وہ دوپٹے کا پلو چہرے پہ ذرا سا ڈالے، اسے دانتوں سے یوں پکڑے ہوئے تھا کہ دور سے اس پہ کسی عورت کا گمان ہوتا تھا۔ چہرے کو سفید پینٹ کیے، گہرے آئی میک اپ، سرخ چونچ سی لپ اسٹک اور سنہرے بالوں کی وگ لگائے، وہ اس کی طرف چلتا آ رہا تھا۔ وہ اسے ایک نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔

''پنکی!''

اس نے ہراساں نگاہوں سے گردن موڑ کر دور ہال کی طرف کو دیکھا۔ ابا کی اس کی جانب پشت تھی۔ وہ واپس مڑی، تب تک وہ قریب آ چکا تھا۔

''کیسی ہو باجی جی؟'' وہ مسکرایا تھا۔

''تم..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے سراسیمگی سے اسے دیکھتے اپنے پرس پہ گرفت مضبوط کر لی، گویا ذرا بھی وہ آگے بڑھا تو وہ بھاگ اٹھے گی۔

''آپ سے ملنے آئی تھی جی! پنکی کہتے ہیں مجھے۔ یاد ہے جی؟'' وہ مسکرا کر بولا۔

''اچھی طرح یاد ہے اور بھولی تو تمہاری ماں اور بہن بھی نہیں ہوں گی! اب ہٹو میرے راستے سے۔''

''غصہ کیوں کر رہی ہو جی! میں تو آپ کو کچھ بتانے آئی تھی۔''

''مائی فٹ! مسئلہ کیا ہے آپ کو میجر احمد؟'' وہ پیر پٹخ کر بولی۔ ''اتنے باوقار عہدے پہ فائز ہو کر کیسی حرکتیں کر رہے ہیں آپ؟''

''لو جی..... میں تو ڈولی کا پیغام دینے آئی تھی مگر.....''

''کیسا پیغام؟'' وہ اسی رکھائی سے بولی۔

''ڈولی کی حالت امید بخش نہیں ہے، پتا نہیں کتنے دن جی پائے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' وہ ذرا چونکی۔

''خود چل کر دیکھ لیجیے۔ آیئے! میں آپ کو لے جاتی ہوں۔''

''نہیں نہیں، مجھے کہیں نہیں جانا۔'' وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

''ایک دفعہ تو اس سے مل لیں، اس نے کچھ بتانا ہے آپ کو۔''

''مجھے کچھ نہیں جاننا۔ تم لوگوں کی ساری معلومات مجھے اے آر پی کی ماں سے مل گئی تھیں۔'' تلخی سے کہتے ہوئے اس نے پھر سے پلٹ کر دیکھا۔ بارات کے مہمان اندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

''ہو سکتا ہے کچھ ایسا ہو، جو اس کی ماں کو بھی نہ پتا ہو۔''

''کیا؟'' وہ چونکی، پھر بغور پنکی کو دیکھا۔ اس کے اونچے قدم کے سوا کوئی چیز اس روز جناح سپر کی شاپ میں ملنے والے اس اسمارٹ، گلاسز والے نوجوان کا پتا نہیں دیتی تھی۔ پنکی کا تو چہرہ بھی جلا ہوا نہیں لگتا تھا مگر نہیں..... اس کا چہرہ تو سلیٹ کی طرح چپٹا تھا۔ ایسی

Downloaded From http://paksociety.com

جھلی جس نے سب نقش چھپا دیے ہوں۔ خدایا! کیسے یہ لوگ اپنے چہرے بدل لیتے تھے۔ مگر آنکھیں..... وہ چونکی یہ آنکھیں وہی تھیں۔ وہی گلاسز کے پیچھے سے جھلکتی آنکھیں۔ اب آئی شیڈو کی چمکیلی تہہ کے باوجود انہیں پہچان گئی تھی۔

''اس بات کا جواب تو بس ڈولی کے پاس ہے جی اور اس نے مجھے یہی آپ کو بتانے کا کہا تھا۔ سہیلی کی دوستی نبھا رہی ہوں میں تو جی! ورنہ میری جوتی کو بھی شوق نہیں ہے۔ آپ جیسی بدزبان خاتون کے منہ لگنے کا۔''

چڑ کر کہتے ہوئے اس نے دوپٹے کے اندر چھپے ہاتھ باہر نکالے۔ اس میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبا تھا۔

''یہ ڈولی نے بھیجا ہے۔ اسے اسی طریقے سے کھولیے گا جو اس پہ لکھا ہے، مگر جب تک آپ اسے کھول پائیں گی، وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔''

حیا نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں پکڑے اس ڈبے کو دیکھا۔ اس کی کلائی پہ وہی کانٹے کا سرخ بھورا سا نشان تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے اچنبھے سے سر اٹھا کر پنکی کو دیکھا۔ وہ کہاں کھڑی ہے، اسے لمحے بھر کو بالکل بھول گیا تھا۔

''یہ ایک پہیلی سے کھلے گا، مگر یہ پہیلی صرف آپ ہی بوجھ سکتی ہیں اور آپ بوجھ ہی لیں گی۔ یہ بہت آسان ہے، لیکن اس کے اندر موجود چیز نکالنے کے لیے اسے توڑنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ اسے توڑ دیا تو وہ چیز آپ کے کام کی نہیں رہے گی۔'' پنکی نے مسکرا کر کہتے ہوئے ڈبا اس کے مزید سامنے کیا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تھام لیا۔

''اچھا بابا جی جی! رب راکھا۔'' وہ وہی خوابیہ سراؤں والا لہجہ بنا کر بولتا، سلام جھاڑ کر دوپٹہ منہ پہ ڈالے پلٹ گیا۔

اس نے جلدی سے ڈبا پرس میں رکھا اور پیشانی پہ نمودار ہوئے پسینے کے قطے ٹشو سے تھپتھپائی، خود کو کمپوز کرتی ہال کی جانب بڑھ گئی۔

بارات کا فنکشن ویسا ہی تھا، جیسا کسی بھی شاندار شادی کا ہونا چاہیے۔ بقعہ نور بنا ہال، بہترین سجاوٹ، دلہن کا قیمتی ڈیزائنر سوٹ اور جیولری، مہوش کی نخیالی کزنز کے گروپ ڈانسز، اور پرتکلف طعام کی اشتہا انگیز خوشبو جو ابھی کھلا نہیں تھا۔ آج بھی مرد و خواتین اکٹھے تھے مگر یوں کہ آدھے ہال میں مرد اور باقی آدھے کی میزوں پہ خواتین براجمان تھیں تاکہ ایک حد تک علیحدگی رہے۔ ان کی فیملی کی کسی بھی لڑکی نے رقص میں حصہ نہیں لیا مگر مہوش کی کزنز ہر طرف چھائی رہیں۔

وہ آج بھی ایک الگ تھلگ کونے والی میز پہ بیٹھی رہی۔ اس کا دل اسٹیج پہ جا کر مووی بنوانے کو قطعاً نہیں چاہ رہا تھا۔ اس شریفوں کے مجرے نے اُسے ایسا احساس عدم تحفظ بخشا تھا کہ وہ کسی بھی دوسرے کے کیمرے یا موبائل میں تصویر کھنچوانے سے احتیاط برت رہی تھی۔ یہ مووی اور تصاویر کہاں کہاں نہیں گھومتی ہوں گی۔ اس نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔

اتنے بڑے ہال میں کوئی بھی اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ وہ ویسے بھی اس میز پہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے چند لمحے کے لیے سوچا، پھر میز پہ رکھے پرس سے وہ ڈبا نکالا اور فانوس کی چکاچوند روشنی میں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

وہ ایک ہاتھ جتنا لمبا اور پانچ انچ موٹا مستطیل ڈبا تھا۔ ڈبہ نہ بہت بھاری تھا، نہ بہت ہلکا۔ وہ گہری بھوری لکڑی کا بنا تھا اور اس کے ڈھکن کے علیحدہ ہونے کی جگہ پر چھ خانے بنے تھے۔ جس کے اندر A لکھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک A پہ انگلی رکھ کر نیچے کو رگڑا تو A نیچے چلا گیا اور B سامنے آ گیا۔ وہ اسے نیچے کرتی گئی۔ ان چھ خانوں میں پوری انگریزی کے حروف تہجی لکھے تھے۔ جیسے عموماً بریف کیسز پہ ایسی اسٹرپس لگی ہوتی ہیں جو تین زیرو پہ کھل جاتی ہیں، ویسے ہی اس باکس کو کھولنے کے لیے کوئی چھ حرفی لفظ سامنے لانا تھا۔

پنکی نے کہا تھا کہ اسے کھولنے کا طریقہ اس ڈبے پہ لکھا ہوا ہے۔ اس نے ڈبے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور لحظہ پھر کو ٹھٹھکی۔ اسے ڈھکن کی اوپری سطح پر کچھ کھدا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ چہرہ ڈبے پہ جھکائے آنکھیں سکیڑ کر پڑھنے لگی۔ وہ بہت باریک انگریزی میں لکھا ایک فقرہ تھا۔

"Into the same river, no man can enter twice! "

(ایک ہی دریا میں کوئی شخص دو دفعہ نہیں اتر سکتا۔)

"Into the same river, no man can enter twice!" اس نے الجھن بھرے انداز میں وہ فقرہ دہرایا۔ کیا یہی وہ پہیلی تھی، جس کا ذکر پنکی نے کیا تھا؟ مگر یہ پہیلی تو نہیں لگتی تھی۔ اس میں تو کوئی سوال نہ تھا۔ بس ایک سادہ سا فقرہ تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''السلام علیکم حیا!''

آواز پہ اس نے کرنٹ کھا کر گردن اٹھائی اور ساتھ ہی گود میں رکھے ڈبے پہ دوپٹا ڈالا۔

سامنے شہلا کھڑی تھی۔ سیاہ عبایا کے اوپر سبز اسکارف کا نقاب انگلیوں سے تھامے، اپنے ازلی نرم انداز میں مسکراتے ہوئے۔

''وعلیکم السلام شہلا بھابھی! کیسی ہیں آپ؟ آئیں بیٹھیں۔'' وہ ذرا سنبھل کر اٹھی اور جلدی سے ڈبا پرس میں ڈال کر ان سے گلے ملی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ، مجھے علم نہیں تھا کہ تم آئی ہوئی ہو۔'' وہ رسان سے کہتی ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی۔ ''پھر ابھی فاطمہ پھپھو نے تمہاری فرینڈ کا بتایا..... رئیلی سوری فار ہر۔''

ڈی جے کے ذکر پہ اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ پھر سے افسردہ ہوگئی۔

''پتا نہیں شہلا بھابھی! اللہ تعالیٰ کی کیا مرضی تھی۔ میری ایک ہی دوست تھی ترکی میں اور وہ میری تمام دوستوں سے بڑھ کر ہوگئی تھی۔ بہت دعا کی میں نے اس کے لیے، مگر کوئی دعا قبول نہیں ہوئی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ لبوں پہ آ گیا۔

''اللہ تمہیں صبر دے گا۔ ہم سب ہیں نا تمہارے ساتھ۔'' شہلا نیاس کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔ ''سبین آنٹی کا بیٹا بھی آیا ہے؟''

''جی، وہ ادھر ہے'' اس نے نگاہوں کا زاویہ موڑا تو شہلا نے تعاقب میں دیکھا۔

اسٹیج کے قریب وہ سلیمان صاحب کے ساتھ کھڑا تھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس اس کی مقناطیسی شخصیت بہت شاندار لگ رہی تھی۔ سلیمان صاحب اس کے شانے پہ ہاتھ رکھے کسی سے اس کا تعارف کروا رہے تھے اور وہ دھیمے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ آج وہ اس کے ساتھ اتنے مطمئن اور مسرور لگ رہے تھے گویا روحیل واپس آ گیا ہو۔

''بہت اچھا ہے ماشاء اللہ۔''

''تھینکس۔'' وہ لمحے بھر کو جھجکی۔ ''شہلا بھابھی! ایک بات کہوں۔ آپ کی ساس نے آپ کی اتنی خوبصورت بری بنائی تھی اور آج بھی آپ نے ان ہی میں سے کوئی سوٹ پہنا ہوگا، اس طرف تو عورتیں ہی ہیں۔ آپ کا عبایا..... میرا مطلب ہے، آپ کے کپڑے تو نظر ہی نہیں آ رہے۔'' وہ رک رک کر، ہچکچاتے ہوئے بولی تھی۔ داور بھائی کی مہندی پہ اس نے بہت کھنک دار لہجے میں شہلا کو نقاب اتارنے کے لیے کہا تھا مگر آج اس کی آواز سے وہ کھنک مفقود تھی۔

جواباً شہلا بہت تھکن سے مسکرائی تھی۔

''کیا فرق پڑتا ہے حیا! اتنے مردوں کو اپنے کپڑے دکھا کر مجھے کیا مل جائے گا؟''

''تو نقاب ہی اتار دیں۔'' اس کا لہجہ بہت کمزور تھا۔ اس نے نقاب ڈھیلا بھی نہیں کیا۔ حیا نے پھر نہیں کہا۔ اس سے کہا ہی نہیں گیا۔

وہ تو خود دل سے نہیں چاہتی تھی کہ شہلا نقاب اتار دے۔ وہ تو بس اس کا جواب سننا چاہ رہی تھی۔ اسے شریفوں کے مجرے کا وہ منظر اچھی طرح سے یاد تھا، جب سنہری اور چاندی کی محور قص پریوں کے پیچھے کرسی پہ ترچھی ہو کر بیٹھی کسی آنٹی سے بات کرتی شہلا نظر آ رہی تھی، مگر نقاب میں ہونے کے باعث اسے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ سو اس کے حصے میں وہ بدنامی نہیں آئی، جو ان دونوں کے نصیب میں آئی تھی مگر آج وہ اتنی پژمردگی اور تھکان سے کیوں مسکرائی تھی..... یوں جیسے اس کا دل اندر تک زخمی ہو۔ وہ دکھ، وہ تھکن، وہ زخمی نگاہیں۔ اسے کسی نے پکار لیا اور وہ اٹھ کر چلی گئی مگر حیا کی نگاہیں کافی دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

پچھلی دفعہ اسے شہلا کو عبایا میں دیکھ کر عجیب کوفت بھرا احساس ہوا تھا مگر آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی ان دکھ بھری آنکھوں میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ شہلا کو کیا غم تھا۔ اتنی اچھی فیملی میں شادی ہوئی۔ اتنا ہینڈسم شوہر، امیر کبیر، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا پھر..... پھر اسے کیا دکھ تھا؟ وہ پھر سارا فنکشن یہی سوچتی رہی۔

☆ ☆ ☆

آدھی رات گئے اپنے کمرے میں بیٹھے وہ پھر سے اس ڈبے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ جہان، ڈولی، پنکی، احمد، پاشا مگر انگریزی میں یہ سارے نام پانچ حرفی تھے۔ چھٹا حرف نہیں ملتا تھا۔ وہ بار بار اس سطر کو پڑھے گئی مگر کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ مگر وہ کون سا شخص تھا، جس

Downloaded From http://paksociety.com

کے پاس ایسے ہر محنت طلب مسئلے کا حل ہوتا تھا؟

وہ ڈبا لیے بھاگ کر باہر آئی۔ جہان کچن میں کھڑا کاؤنٹر پہ گلاس رکھے پانی کی بوتل اس میں انڈیل رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے آئی اور باکس اس کے ساتھ رکھا۔

''یہ مجھے کسی نے دیا ہے اور مجھے اس کا پاس ورڈ نہیں معلوم اسے کھول دو۔''

وہ آواز پہ چونکا، پھر بوتل رکھ کر ڈبا اٹھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ ذرا اچھنبے سے اسے پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''جو بھی ہے، تم اسے کسی طرح کھول دو۔''

''ہوں! کھل جائے گا نو پرابلم۔'' وہ ڈھکن اور ڈبے کی بند دراز پہ انگلی پھیر کر کچھ محسوس کر رہا تھا۔ ''تم مجھے ایک بڑا چھرا اور ایک ہتھوڑا لا دو۔''

''افوہ! توڑنا نہیں ہے اسے بلکہ تم تو رہنے ہی دو۔'' اس نے خفگی سے ڈبا اس کے ہاتھ سے واپس لے لیا۔

''کیا ہوا؟ میں کھول تو رہا تھا، ایک منٹ مجھے دیکھنے تو دو۔''

''میں خود کر لوں گی، تم رہنے دو۔ تم میرے لیے کچھ نہیں کرتے۔'' پتا نہیں وہ کس بات پہ اس سے خفا تھی جو جھنجھلا کر بولی۔

''پھر سوچ لو۔ میں تو ابھی ماموں کے پاس جا رہا تھا انہیں تمہیں دوبارہ استنبول بھیجنے کے لیے راضی کرنے مگر ٹھیک ہے، میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرتا۔'' وہ شانے اچکا کر پانی پینے لگا۔

''سچ؟'' اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔ ''تم انہیں منا سکتے ہو؟''

''میں ایک اچھا شیف اور اچھا مکینک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا وکیل بھی ہوں۔ ٹرائی می!'' وہ گلاس رکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

''ابا ایک دفعہ اڑ جائیں تو کبھی فیصلہ نہیں بدلتے۔ تم انہیں کیسے مناؤ گے؟''

''ویسے تو تمہارا دوبارہ استنبول جانا میرے مفاد میں قطعاً نہیں ہے کیونکہ اب تم ہر ٹورسٹ اٹریکشن دیکھنے جانے کے لیے مجھے ہی خوار کرواؤ گی، مگر مجھے لگا تم جانا چاہتی ہو۔ سو میں ماموں سے بات کرنے ہی جا رہا تھا اور وہ مان جائیں گے۔ بروقت کونیا کو کینیا نہ بناتا تو شاید وہ کبھی نہ مانتے۔''

''ہاں استنبول تو بہت محفوظ شہر ہے اور پاکستان میں تو روز بم دھماکے ہوتے ہیں اور پاکستان میں تو پتا نہیں لوگوں کے پاس انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہے بھی یا نہیں!'' وہ ذرا جل کر بولی۔ وہ بنا کچھ کہے مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اگلا ایک گھنٹہ وہ کچن میں کرسی پہ بیٹھی جہان کا انتظار کرتی رہی۔ بالآخر جب وہ ابا کے کمرے سے نکلا تو وہ تیزی سے اٹھی۔

''کیا ہوا؟''

''پیکنگ کر لو۔ ہم کل صبح کی فلائٹ سے واپس جا رہے ہیں۔'' وہ دھیما مسکرا کر بولا۔ ''مگر اس شرط پہ کہ فی الحال تو تم ہمارے ساتھ رہو گی، بعد میں جب تمہاری اسپرنگ بریک ختم ہو جائے تو بے شک چلی جانا۔''

''سچ!'' وہ بے یقینی و خوشگوار حیرت میں گھری اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک طمانیت بھرا احساس اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا۔

البتہ ایک بات وہ جانتی تھی۔ استنبول ڈی جے کے بغیر کبھی بھی ویسا نہیں ہوگا جیسا پہلے تھا۔

☆ ☆ ☆

''تمہارا دماغ درست ہے؟''

ہاشم نے بے یقینی سے اپنی بیوی کو دیکھا، جو بستر کے دوسرے کنارے پہ بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان حارث آنکھیں موندے سو رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ہاشم کے ہاتھ میں تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ایسا کیا غلط کہہ دیا ہے میں نے؟'' وہ جی بھر کر کوفت کا شکار ہوئی۔

''تم پاگل ہوگئی ہو، تمہارے حواس جواب دے گئے ہیں۔'' حیرت کی جگہ اب جھنجلاہٹ نے لے لی تھی۔

''حواس تو تمہارے جواب دے گئے ہیں۔ میں تمہیں ایک سیدھا سادا سا حل بتا رہی ہوں اس سارے مسئلے کا۔ تم روز کے چوبیس گھنٹے بھی کام کرو تو اس رقم کے آدھے لیراز بھی اکٹھے نہیں ہوں گے، جو ہمیں حارث کی سرجری کے لیے چاہئیں۔ اور ایسے مت دیکھو مجھے۔'' آخر میں وہ خفا ہو کر بولی۔

''عبدالرحمٰن مجھے جان سے مار دے گا۔ وہ اس کی لڑکی ہے۔''

''اور عبدالرحمٰن کو بتائے گا کون؟ وہ تو مہینہ بھر پہلے ہی انڈیا چلا گیا تھا۔ تم نے خود ہی مجھے بتایا تھا۔'' وہ چمک کر بولی۔ نیم روشن کمرے میں سبز بلب کی مدھم روشنی اس کے چہرے کو عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔

''وہ انڈیا گیا ہے، مر نہیں گیا، جو اسے کبھی پتا نہیں چلے گا۔ وہ مجھے جان سے مار دے گا سلمیٰ۔''

''تو پھر تم اپنی جان سنبھال کر بیٹھے رہو اور حارث کو مرنے کے لیے چھوڑ دو۔'' غصے سے کہتی اٹھ کر چادریں تہہ کرنے لگی۔

''سلمیٰ..... میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' اب کے وہ قدرے تذبذب سے بولا تھا۔

''تو تم کر کیا سکتے ہو؟ اور کیا کیا ہے تم نے حارث کے لیے؟''

''میرا بیٹا مجھے بہت پیارا ہے۔'' اس نے سوتے ہوئے حارث پہ ایک نظر ڈالی۔ ''مگر وہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے۔''

''میں بھی تو کسی کی بیٹی تھی، مجھے اس ڈربے میں لا کر پل پل مارنے سے پہلے تم نے سوچا؟'' وہ چادر کا گولا بنا کر ایک طرف پھینکتی جارحانہ انداز میں اس کی طرف آئی۔ ''تم مرد ہو کر ڈرتے کیوں ہو؟''

''تم عبدالرحمٰن کو نہیں جانتیں۔''

''میں بس اتنا جانتی ہوں کہ اگر میرا بیٹا مر رہا ہے تو اس کا ذمہ دار عبدالرحمٰن پاشا ہے۔ اگر وہ تمہیں تمہاری مطلوبہ رقم دے دیتا تو ہم کبھی یہ کرنے کا نہ سوچتے۔ کوئی کمی تو نہیں ہے اس کو پیسے کی، پھر بھی اس نے ہاتھ روک کر رکھا ہوا ہے۔ اب یا تو تم اس کا خیال کر لو، یا اپنے بیٹے کا۔ فیصلہ تمہارا ہے۔'' سلمیٰ کے نقوش مدھم روشنی میں بگڑے بگڑے دکھائی دے رہے تھے۔ اس وقت یوں تیز تیز بولتی وہ میک بتھ کی چوتھی جادوگرنی لگ رہی تھی۔

ہاشم متذبذب سا اسے دیکھے گیا۔ وہ جو کہہ رہی تھی وہ اتنا مشکل تو نہ تھا مگر.....

☆ ☆ ☆

وہ جہان کے ساتھ سیدھی اس کے گھر آئی تھی، پھر کھانا کھا کر اس نے اجازت چاہی۔ اس کا سارا سامان سبانجی کے ڈورم میں رکھا تھا اور جس افراتفری میں وہ گئی تھی، سوائے چند چیزوں کے کچھ بھی انہیں اٹھایا تھا۔ پھپھو نے اصرار کیا کہ وہ چھٹیاں ختم ہونے تک ان کے پاس رک جائے مگر وہ کل آنے کا وعدہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں تو پھر کہوں گی کہ رک جاؤ۔'' پھپھو ذرا خفا تھیں۔

''پھپھو! میں کل آؤں گی ناں پرامس۔ اب چلتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے مگر کل ضرور آنا۔'' جہان ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھا۔ اس کی آنکھیں اور ناک گلابی پڑ چکے تھے۔ سرد و گرم علاقوں کے مابین سفر کا موسمی اثر تھا کہ استنبول پہنچتے پہنچتے اس کا فلو بخار میں بدل گیا تھا۔

''آؤ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔''

''صرف ٹاقسم تک چھوڑنا۔ آگے میں گورسل پکڑ لوں گی۔''

''میں سبانجی تک چھوڑ دوں گا، نو پرابلم۔'' وہ چابی پکڑے، جیکٹ پہنتے ہوئے بولا۔

''نہیں اس بخار میں تم سے پینتالیس منٹ کی ڈرائیونگ کروائی تو پینتالیس دن تک تم جتاتے رہو گے۔ ویسے بھی مجھ پہ تمہارے

Downloaded From http://paksociety.com

احسان بہت جمع ہو گئے ہیں، اتنے سارے، کیسے اتاروں گی؟'' وہ اس کے سامنے سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''اتارنے کے لیے کس نے کہا ہے۔''

وہ ذرا سا مسکرا کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اس کی پشت کو دیکھے گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہان کا رویہ اس کے ساتھ نرم پڑتا جا رہا تھا۔ پاکستان میں پہلے دو دن تو وہ لاتعلق رہا، شاید اس لیے کہ دونوں کو ٹھیک سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا مگر پھر اس نے خود ہی کچھ محسوس کیا تھا، تب ہی وہ خود آگے بڑھا اور ان کے درمیان کھڑی سرد دیوار ڈھا دی لیکن کیا وہ اس کے لیے وہ محسوس کرتا تھا، جو وہ اس کے لیے کرتی تھی؟ کیا اسے ان کا وہ بھولا بسرا رشتہ یاد تھا جس کے متعلق اس گھر میں کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ ابھی کچھ دن وہ اس کے گھر رہے گی تو ان سارے سوالوں کے جواب جاننے کی کوشش ضرور کرے گی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔

ٹاقسم اسکوائر کا مجسمہ آزادی اسی طرح تھا، جسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ مجسمے کے گرد گول چکر میں اگی گھاس پہ سرخ سفید اور زرد ٹیولپس کھلے تھے۔ ہر جگہ سالانہ ٹیولپ فیسٹول کے پوسٹرز بھی لگے تھے، جو ہر سال کی طرح اس موسم بہار میں بھی استنبول میں منعقد ہوتا تھا۔ ٹیولپ کا پھول استنبول کا ''سمبل'' تھا، مگر ان کی دلفریب مہک میں ڈوبا ٹاقسم اسکوائر حیا کو خزاں آلود لگا تھا۔ وہ بہار اب وہاں نہیں تھی، جیسے ڈی جے نہیں تھی۔

''تم جا رہی ہو، حالانکہ میں چاہتا تھا کہ تم کچھ دن ہمارے گھر رہو۔'' گاڑی روکتے ہوئے جہان نے چہرہ اس کی طرف موڑے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''میں کل آجاؤں گی مگر کل تک میں سبانجی، اپنا ڈورم بلاک، جھیل اور ہر جگہ جہاں میں اور ڈی جے اکٹھے گئے تھے، ایک دفعہ پھر دیکھنا چاہتی ہوں۔ اکیلے، بالکل اکیلے..... میں ان بیتے لمحوں میں پھر سے جینا چاہتی ہوں۔''

''مت کرو۔ تمہیں تکلیف ہوگی۔''

''بہت تکلف سہہ لی، اب اس سے زیادہ تکلف مجھے نہیں مل سکتی۔'' اس نے بھیگی آنکھ کا کونا انگلی کی نوک سے صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اوکے!'' اس نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پہ ابھی تک نقاہت تھی۔ وہ واقعی بیمار لگ رہا تھا۔

جہان چلا گیا اور وہ مجسمہ آزادی کے گرد اگی گھاس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ گھاس کا گول قطعہ اراضی دراصل یوں تھا، جیسے کوئی چپٹا رکھا گول سا سبز پھول ہو جس کی سبز پتیاں بنی ہوں، اور ہر دو پتیوں کے درمیان ایک سیدھی روش تھی جو مجسمے تک لے جاتی تھی۔ یوں چار گزرگاہیں مجسمے تک لے کر جاتی تھیں!

ٹاقسم کے ہر پھول، ہر پتھر اور ہر بادل پہ جیسے یادیں رقم تھیں۔ وہ اس کا اور ڈی جے کا زیرو پوائنٹ تھا۔ مین اسٹاپ۔ تقریباً ہر دوسرے روز وہ ادھر آتی تھیں۔ گورسل انہیں یہیں جو اتارا کرتی تھی۔ یہاں سے آگے وہ عموماً میٹرو ٹرین پکڑ لیا کرتی تھیں۔ اس اسکوائر کا چپہ چپہ انہیں یاد تھا اور ڈی جے کے بغیر سب کچھ ادھورا تھا۔

اور اس طرف استقلال اسٹریٹ تھی۔ وہاں سے کی گئی ان کی ڈھیروں شاپنگ جو رائیگاں چلی گئی۔ استقلال اسٹریٹ آج بھی وہی تھی، بہت طویل، نہ ختم ہونے والی..... مگر زندگی ختم ہو گئی تھی۔

گورسل کی کھڑکی کے شیشے کے پار وہ باسفورس کا عظیم الشان سمندر دیکھ رہی تھی۔ وہاں سے ایک فیری گزر رہا تھا۔ اسے یاد تھا جب پہلی دفعہ ان دونوں نے اسی جگہ پل پار کرتے ہوئے نیچے فیری تیرتا دیکھا تھا تو وہ تو خوشی اور جوش سے پاگل ہی ہو گئی تھیں۔ وہ کبھی بحری جہاز میں نہیں بیٹھی تھیں اور صرف اسے دیکھ کر ہی وہ پرجوش ہو گئی تھیں، پھر فیری وہیں رہ گیا اور زندگی ختم ہو گئی۔

دوپہر کی ٹھنڈی ٹھنڈی دھوپ سبانجی کے در و دیوار پہ پھیلی تھی۔ ڈورم بلاک تقریباً ویران پڑے تھے۔ اسپرنگ بریک ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں اور اسٹوڈنٹس اپنے اپنے ٹورز پہ تھے۔ اسے کسی کو اطلاع دینے کا ہوش ہی نہیں تھا، مگر پاکستان روانگی والے دن جانے ہالے کو کسی نے بتایا اور پھر سب کے فون آنے لگے تھے۔ معتصم، حسین، ٹالی، سارہ، لطیف، انجم باجی سب اسے برابر فون کرتے رہے تھے، مگر وہ

Downloaded From http://paksociety.com

سب یقیناً ابھی واپس نہیں آئے تھے۔

وہ اپنے ڈورم بلاک کا گول چکر کھاتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب وہ سب انجی آئی تھیں تو ان زینوں پہ برف جمی ہوتی تھی۔ اب وہ برف بہار لے گئی تھی۔ اس نے گردن اوپر اٹھا کر بالکونی کے بلب کو دیکھا اور پھر اداسی سے مسکرا دی۔ کتنا ڈر گئے تھے وہ اپنے پہلے دن جب یہ بلب خود بخود جل اٹھا تھا کہ پتا نہیں یہاں کون سے جن بھوت ہیں۔

''نکلے ہم وہی، پاکستان کے پینڈو۔'' ہالے کے یہ بتانے پر کہ یہ ٹیکنالوجی کا کرشمہ، ڈی جے اس کے جانے کے بعد کتنی دیر افسوس کرتی رہی تھی۔

اس نے ڈورم کا لاک کھولا۔

کمرا سنسان پڑا تھا۔ صاف ستھرا بنے ہوئے بستر، میز پہ ترتیب سے رکھی چیزیں، ڈی جے کے بینک کی میز البتہ خالی تھی۔ اس کی ساری چیزیں حیا نے اس کے بھائی کو پیک کر کے دے دی تھیں۔

وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اور سلائیڈ کھولی۔

''گڈ..... گڈ ما.....'' اس نے کہنا چاہا مگر آواز گلے میں اٹک گئی۔ آنسوؤں نے اس کا گلا بند کر دیا تھا۔ دور کہیں کسی بلاک سے ڈی جے کو جواب دینے والے لڑکے نے اتنے دن کی غیر حاضری پہ کچھ تو سوچا ہوگا، مگر شاید وہ خود بھی اسپرنگ بریک پہ ہو۔ اب وہ آئے گا تو اسے کوئی آواز نہیں آئے گی۔ اسے کیا معلوم کہ اب ساری آوازیں ختم ہو گئیں۔

''گڈ مارننگ ڈی جے!'' اس نے کھڑکی میں کھڑے بھیگی، بے حد مدھم آواز سے ڈی جے کو پکارا۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر چہرے پہ لڑھک رہے تھے۔

جواب نہیں آیا۔ اب جواب کبھی نہیں آنا تھا۔

وہ پلٹ کر اپنے بینک کی طرف آئی اور شانے سے پرس اتار کر اپنی میز پر رکھا، پھر زپ کھول کر اندر سے لکڑی کا وہ چھوٹا سا ڈبا نکالا۔ اس کا جواب بھی اسے ڈھونڈنا تھا۔

''اوہ حیا..... تم کب آئیں؟'' آواز پہ وہ چونک کر پلٹی۔ کھلے دروازے میں معتصم کھڑا تھا وہ راہداری سے گزرتے ہوئے اسے دیکھ کر حیرت سے رکا تھا۔

''آج ہی آئی ہوں۔ تم سب واپس آ گئے؟'' اسے یک گونا گو طمانیت کا احساس ہوا۔ وہ ڈبا ہاتھ میں لیے اس کی طرف آ گئی۔

''نہیں، وہ سب تو ابھی کونیا میں ہیں۔ مجھے ذرا کام تھا، اس کے لیے آیا تھا۔'' وہ دانستہ لمحہ بھر کو رکا۔ ''مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ خدیجہ..... اتنا اچانک کیسے ہوا؟''

''اللہ کی مرضی تھی معتصم! ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ بیری اینورزم پھٹے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اچانک سے انسان کو لپس کرتا ہے اور اچانک مر جاتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو چند روز قبل سر درد شروع ہوتا ہے، ڈی جے کو بھی ہوا تھا مگر اس نے میگزین سمجھ کر نظر انداز کیے رکھا اور پھر..... پھر سب ختم ہو گیا۔''

''دوستوں کو کھونا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔'' وہ دونوں اسی طرح چوکھٹ پہ کھڑے تھے۔

''میں تو تب سے یہی سوچ رہی ہوں معتصم! کہ کیا زندگی اتنی غیر یقینی چیز ہے؟ ایک لمحے پہلے وہ میرے ساتھ تھی اور اگلے لمحے وہ نہیں تھی۔ موم بتی کے شعلے کی طرح بے ثبات زندگی جو ذرا سی پھونک سے بجھ جائے..... لمحے بھر کا کھیل؟''

''یہی اللہ تعالیٰ کا ڈیزائن ہے حیا اور ہمیں اسے قبول کرنا پڑے گا۔ یہ کیا کوئی پزل باکس ہے؟'' وہ اس کے ہاتھ میں پکڑے ڈبے کو دیکھ کر ذرا سا چونکا۔

اس نے ناسمجھی سے ڈبا اس کی طرف بڑھایا۔

''چائنیز پزل باکس؟ تم نے یہ کہاں سے لیا؟'' وہ ڈبا الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''کسی نے دیا ہے مگر میں اسے کھول نہیں پا رہی۔ کیا تم اسے کھول سکتے ہو؟'' اس نے پرامید نگاہوں سے معتصم کو دیکھا۔

''میں دیکھتا ہوں، ٹھہرو۔'' وہ اس کا اوپر نیچے سے جائزہ لیے رہا تھا۔ ''یہ قدیم چائنیز باکس کی طرز پہ بنایا گیا ہے۔ اس کے اوپر عموماً کوئی پزل بنا ہوتا ہے جس کو سالو کرنے سے یہ کھلتا ہے یا پھر کوئی پانچ حرفی الفاظ لگانے سے۔ ایک منٹ.....'' اسے جیسے اچنبھا ہوا..... ''پانچ نہیں، اس پہ تو چھ حروف ہیں۔ اس طرح کی چیزوں پہ ہمیشہ پانچ حروف ہوتے ہیں، مگر شاید اس کا جواب کوئی خاص لفظ ہو جس پہ چھ حروف ہی پورے آتے ہوں۔''

''مگر اب یہ کھلے گا کیسے؟'' وہ بے چینی سے بولی۔

''یہ تو جس نے دیا ہے، اس کو ہی.....'' وہ رکا اور اوپر لکھی سطر پڑھنے لگا۔

''ایک ہی دریا میں کوئی شخص دو دفعہ نہیں اتر سکتا۔ ہوں..... حیا! تمہارا واسطہ کسی سائیکو سے پڑ گیا ہے۔ یہ ایک پہیلی ہے اور اسے حل کرنا ہے۔''

''اور اس نے کہا تھا کہ اسے صرف میں ہی حل کر سکتی ہوں اور اگر اسے توڑا تو یہ میرے کسی کام کا نہیں رہے گا۔''

''یعنی وہ چاہتا ہے کہ تم دماغ استعمال کرو۔ ویسے یہ فقرہ.....'' وہ اس سطر پہ انگلی پھیرتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ ''یہ فقرہ مجھے کچھ سنا سنا لگ رہا ہے۔ شاید..... شاید.....'' وہ جیسے یاد کرنے لگا۔ ''اس دن، جب ہم جیوانفارمیشن کی کلاس میں لکھ لکھ کر باتیں کر رہے تھے، تب شاید پروفیسر نے یہ بولا تھا۔''

''نہیں، مجھے تو ایسا کچھ یاد نہیں۔''

''پتا نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''انسان کی یادداشت چیزوں کو بہت ریلیٹ کرتی ہے۔ ہمیں ایک چیز کو دیکھ کر اس سے متعلقہ چیز یاد آ جاتی ہے۔ مجھے بھی اس کو دیکھ کر وہی کلاس یاد آئی۔ خیر! جو بھی ہے، تم فکر نہ کر، ہم اس کا کوئی حل نکال ہی لیں گے۔ ابھی تو میں کام سے جا رہا ہوں، دیر سے آؤں گا۔ تم دروازہ اچھی طرح لاک کر دینا، آج کل ڈورم بلاک تقریباً خالی ہے۔ ٹھیک ہے؟''

اس کے یوں خیال کرنے پہ وہ زیر لب مسکرا دی۔

وہ چلا گیا تو اس نے واقعی کمرا اچھی طرح لاک کر لیا۔ سبانجی اتنی ویران تھی کہ اسے انجانا سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ٹائم سے یہاں آنے تک اسے مسلسل محسوس ہوتا رہا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ حالانکہ پیچھے مڑ کر دیکھنے پہ اسے سب کچھ معمول کے مطابق ہی نظر آتا تھا، مگر کچھ تھا جو اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔

رات بہت دیر تک لیٹے لیٹے وہ پزل باکس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے، انگوٹھے سے حروف تہجی کی سلائیڈ اوپر نیچے کرتی رہی۔ اس نے حروف کے کئی جوڑ بنائے مگر وہ مقفل رہا۔ اسے نیند نے کب گھیرا، اسے علم بھی نہیں ہوا۔ پزل باکس اس کے گرد..... ایک طرف لڑھک گیا۔ وہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ سرد، جامد اور مقفل۔

☆ ☆ ☆

صبح وہ دیر سے اٹھی۔ ناشتا کر کے رات والے شکن آلود لباس پہ ڈھیلا سا سوئیٹر پہنے، بالوں کو جوڑے میں باندھتی وہ نیچے آ گئی۔ اس کا رخ یونیورسٹی میں فوٹو کاپیئر کی طرف تھا۔ وہاں سے اس نے کچھ نوٹس کئی روز پہلے فوٹو اسٹیٹ کروائے تھے اور انہیں اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

صبح کی چمکیلی مگر ٹھنڈی ہوا سبانجی کے سبزہ زار پہ بہہ رہی تھی۔ وہ فوٹو کاپیئر کے پاس آئی، اپنے نوٹس اٹھائے، سبانجی کے کارڈ سے ادائیگی کی اور پھر واپس جانے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اسے ایک میز پہ رکھا لاوارث سا رجسٹر نظر آیا۔ رجسٹر جانا پہچانا تھا۔ اس نے پہلا صفحہ پلٹا اور اس پہ بڑا بڑا DJ لکھا تھا۔

''او ڈی جے.....'' ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ ڈی جے کا نسیان۔ وہ ہمیشہ اپنا رجسٹر فوٹو کاپیئر پہ چھوڑ جایا کرتی تھی۔ اس نے رجسٹر اٹھا لیا۔ وہ اب اس کا تھا۔ باقی چیزیں تو وہ ڈی جے کی فیملی کو دے چکی تھی، مگر اس کی ایک یادگار سنبھالنے کا حق تو

Downloaded From http://paksociety.com

اسے بھی تھا۔

وہ باہر آ گئی اور گھاس پہ بیٹھ کر ڈی جے کے رجسٹر کے صفحے پلٹنے لگی۔ وہ اس کا رف رجسٹر تھا، جسے وہ زیادہ تر لکھ لکھ کے باتیں کرنے کے لیے استعمال کرتی تھی اور ایسی باتیں عموماً وہ آخری صفحے پہ ہی کیا کرتی تھیں۔ اس نے آخری صفحہ پلٹا تو دھیرے سے مسکرا دی۔

اس روز جیوانفارمیشن سسٹم کی کلاس میں ان کی اور فلسطینیوں کی اسپرنگ بریک کی پلاننگ اس پہ لکھی تھی۔ وہ بہت محبت سے ڈی جے کے لکھے الفاظ پہ انگلی پھیرتی انہیں پڑھ رہی تھی، جب ایک دم وہ رک گئی۔

رجسٹر کے اس آخری صفحے کے اوپر بڑا بڑا کر کے ڈی جے کی لکھائی میں لکھا تھا۔

"Into the same river,

no man can enter twice."

- Heraclitus (535-475 BC)

(ایک ہی دریا میں کوئی شخص دو بار نہیں اتر سکتا) (ہراقلیطس ۵۳۵۔۴۷۵ قبل از مسیح)

وہ بالکل شل سی، سانس روکے، تحیر سے اس سطر کو دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ پزل باکس اسے ڈی جے نے بھیجا تھا؟

''جب تک آپ اسے کھول پائیں گی، وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔''

وہ رجسٹر لیے ایک دم سے اٹھ کر ڈورم کی طرف بھاگی۔ اسے معتصم کو ڈھونڈنا تھا۔

☆ ☆ ☆

''ہراقلیطس..... یونانی فلسفی..... یاد آ گیا۔'' معتصم نے وہ سطر پڑھتے ہوئے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ ''یہ ہراقلیطس کا ایک قول ہے، جیسے تم اس کے دوسرے اقوال سنے ہوں گے، مثلاً.....'' وہ یاد کر کے بتانے لگا۔ ''کتے اسی پہ بھونکتے ہیں جسے وہ نہیں جانتے ہوئے یا انسان کا کردار اس کی تقدیر ہوتا ہے۔'' وہ انگریزی کے چند مشہور اقوال بتا رہا تھا۔

''ہاں، بالکل۔'' حیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اس میں سے کوئی بھی قول نہیں سن رکھا تھا۔

''تو ثابت ہوا کہ ہم اس پزل کے ٹھیک راستے پہ چل نکلے ہیں۔ اور اس راستے پہ اس شخص نے یقیناً بریڈ کرمبز گرائے ہوں گے۔ اب ہمیں ایک ایک کر کے ہنسل اور گریٹل کے ان بریڈ کرمبز کو چننا ہے۔''

''شش!'' دور بیٹھی لائبریرین نے کتاب سے سر اٹھا کر عینک کے پیچھے سے ان کو ناگواری سے ٹوکا، وہ دونوں اس وقت لائبریری میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''سوری میم! حیا نے گردن موڑ کر ایک معذرت خواہانہ مسکراہٹ ان کی طرف اچھالی اور واپس پلٹی۔

''اچھا اب کیا کرنا ہے؟'' وہ دھیمی سرگوشی میں پوچھ رہی تھی۔ ''اگر اس نے ہراقلیطس کا ایک قول ڈبے کے اوپر لکھا ہے تو یقیناً اس کے کوڈ ورڈ کا تعلق اسی قول ہوگا۔''

''یا پھر شاید ہراقلیطس کی ذات سے۔ ٹھہرو! میں ایک منٹ آیا۔'' وہ اٹھا اور چند لمحے بعد جب وہ واپس آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں میں موٹی موٹی چند کتابیں اوپر نیچے پکڑ رکھی تھیں۔

''یہ رہا ہراقلیطس کا اعمال نامہ۔'' اس نے دھپ کی آواز کے ساتھ کتابیں میز پہ رکھیں۔

لائبریرین نے چہرہ اٹھا کر اسے تلملا کر دیکھا۔

''سو.....ری!'' وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر کہتا واپس کرسی پہ بیٹھا۔

''میں لاء کی اسٹوڈنٹ ہو کر فلاسفی کی یہ اتنی وزنی کتابیں پڑھوں؟ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں ہراقلیطس کو google کر لیتی ہوں۔ لیپ ٹاپ ادھر دکھاؤ۔'' اس نے ساتھ رکھے معتصم کے لیپ ٹاپ کا رخ اپنی طرف گھمایا اور کی پیڈ پہ انگلیاں رکھیں۔

''اف!'' جب اتنے ڈھیر سارے نتیجے کھلے تو وہ بے زار سی ہو گئی۔ اسے جلدی سے کوئی جواب چاہیے تھا اور بس جلدی سے وہ

Downloaded From http://paksociety.com

باکس کھولنا تھا۔ اتنے لمبے لمبے ڈاکومنٹس پڑھنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔

''ادھر لاؤ، میں پڑھ کر تمہیں مین پوائنٹس بتاتا ہوں۔'' اس کی کوفت دیکھ کر معتصم نے لیپ ٹاپ اپنی طرف گھمایا اور پھر اسکرین پہ نگاہیں دوڑاتے ہوئے پڑھنے لگا۔

''ہوں.....اچھا.....ہراقلیطس کا تعلق Asia Minor سے تھا۔ خاصا بدمزاج فلاسفر تھا۔ اپنے علاقے میں چیف پریسٹ بھی رہا ہے اور بہت خاندانی بھی تھا۔ بڑے بڑے فلسفیوں کو خاصی حقارت سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں ہومر کو بھرے چوک میں لے جا کر درے مارنے چاہئیں اور Hesoid اتنا جاہل ہے کہ اسے دن اور رات کا فرق نہیں پتا۔ ہراقلیطس کے مشہور اقوال یہ ہیں.....

گدھے سونے پہ گھاس کو ترجیح دیتے ہیں، کتے ہر اس شخص پہ بھونکتے ہیں جسے وہ نہیں جانتے، اور.....''

''بس کردو معتصم! ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی!'' اس نے جھنجھلا کر لیپ ٹاپ کی اسکرین ہاتھ سے دبا کر فولڈ کر دی۔ معتصم ہنس دیا پھر اپنا موبائل نکالا۔

''لطیف رات کو آ گیا تھا۔ اس کا ایک سائیڈ کورس فلاسفی ہے، اس کو بلاتا ہوں۔''

لطیف کو ادھر آنے اور اس کو ساری بات سمجھنے میں پندرہ منٹ لگے گئے اب وہ معتصم کے ساتھ والی نشست پہ بیٹھا سوچتے ہوئے اس پزل باکس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کیتھولک اور خالصتاً ڈچ تھا مگر افغانستان میں پیدائش کے وقت لطیف کے نام پہ اس کا نام رکھا تھا اور چونکہ اس کو پہلی خوراک ایک مسلمان نرس نے دی تھی سو لطیف ذہنی اور اخلاقی طور پہ ان فلسطینی لڑکوں جیسا ہی لگتا تھا۔

''میں تو ہراقلیطس نامہ سن کر دنگ آ گئی ہوں، اور اس کے یہ کتوں، گدھوں اور .....'' حیا نے باکس کی طرف اشارہ کیا۔ ''دریاؤں والے اقوال میرے سمجھ سے تو باہر ہیں۔''

''ایک منٹ!'' لطیف ذرا چونکا ''وہ کتوں اور گدھوں والے اس کے اقوال ہوں گے مگر یہ دریا والا صرف اس کا قول نہیں بلکہ اس کی مشہور زمانہ فلاسفی ہے۔ Flux فلاسفی۔ تم نے سن تو رکھی ہوگی؟''

''میں ہراقلیطس کا نام آج پہلی دفعہ سن رہی ہوں، کجا کہ اس کی فلاسفی۔''

''اونہہ۔ تم نے، بلکہ ہر کسی نے یہ فلاسفی سن رکھی ہے۔ یہ محاورہ تو تم جانتی ہو نا کہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ لطیف آگے ہو کر بتانے لگا۔

''یہ محاورہ دراصل ہراقلیطس کی اسی فلاسفی کا نچوڑ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی شخص ایک ہی دریا میں دو دفعہ نہیں اتر سکتا۔ یعنی کہ جب انسان ایک دفعہ پانی میں قدم رکھ کر نکالتا ہے، تو وہ پانی آگے بہہ جاتا ہے، پانی اور انسان دونوں ہر لمحہ تبدیل ہوتے ہیں، وہ دوبارہ جغرافیائی لحاظ سے تو اسی دریا میں قدم رکھتا ہے مگر نہ وہ خود وہی پہلے والا انسان ہوتا ہے اور نہ وہ دریا پہلے والا ہوتا ہے۔ سمجھ آئی؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے قطعاً سمجھ نہیں آئی تھی۔

''نہیں، تمہیں سمجھ نہیں آئی۔ دیکھو! جب استنبول میں پہلے دن تم نے باسفورس کا سمندر دیکھا تھا، تب وہ، وہ سمندر نہیں تھا، جو تم نے کل دیکھا۔ اب نہ تم وہ ہو، اور نہ سمندر وہی ہے۔ ہر چیز لمحہ بہ لمحہ بدل جاتی ہے۔ یہ ہے ہراقلیطس کی فلاسفی آف چینج!''

''فلاسفی آف چینج!'' حیا نے اثبات میں سر ہلاتے باکس اٹھایا۔ ''اور تمہیں پتا ہے، چینج میں پورے چھ حروف ہوتے ہیں۔''

''اوہ ہاں!'' معتصم نے ذرا جوش سے ڈیسک پہ ہاتھ مارا۔

ادھر ادھر ٹیبلز پہ پڑھتے چند طلبا نے سر اٹھا کر دیکھا۔

''لاسٹ ٹائم، ایکسچینج اسٹورنٹس!'' لابریرین نے کڑی نگاہوں سے اسے دیکھتے انگلی اٹھا کر وارننگ کی۔ معتصم نے فوراً سر جھکا دیا۔

وہ دبے دبے جوش سے حروف کی سائیڈز اوپر نیچے کر رہی تھی، یہاں تک کہ اس نے پورا لفظ چینج لکھ لیا۔

''اب یہ کھل جائے گا۔''

Downloaded From http://paksociety.com

مگر پزل باکس جامد رہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ کوڈ کچھ اور ہے۔ اور وہ کچھ ایسا ہے جسے صرف تم کھول سکتی ہو۔ کچھ ایسا جو صرف تمہیں ہی معلوم ہوگا۔''

''حیا! تم ہر اقلیطس کی میٹافزکس میں تو انٹرسٹڈ نہیں ہو؟'' لطیف کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

''فی الحال تو میں صرف ٹاقسم جانے میں انٹرسٹڈ ہوں۔ میرا خیال ہے میں تیار ہو جاؤں۔'' وہ ہار مانتے ہوئے باکس لیے اٹھ گئی۔

''ہم نے بھی ٹاقسم جانا ہے اور ابھی گورسل نکلنے میں ڈیڑھ گھنٹہ تو ہے۔ تم تیار ہو جاؤ تو اکٹھے چلتے ہیں۔''

لکڑی کا وہ پزل باکس اس نے اپنے ڈورم کے لاکر میں رکھا، پھر اپنے کپڑے کھنگالنے لگی۔ جس افراتفری میں گئی تھی، یہ یاد کہاں تھا کہ لانڈری کو کپڑے نہیں دیے۔ اس وقت جو ایک واحد استری شدہ جوڑا ہینگر پہ لٹکا تھا وہ اس کا سیاہ فراک تھا جس کی اوپری پٹی سنہری سکوں سے بھری تھی۔ وہی جو وہ جہان کے استقلال اسٹریٹ میں دیے جانے والے ڈنر پہ پہن کر گئی تھی۔ فی الحال وہ پھپھو سے پہلے اپنی ان میزبان آنٹی کے گھر جا رہی تھی جنہوں نے پہلے روز ان کا کھانا کیا تھا۔ چونکہ وہ ایک طرح سے ڈی جے کے لیے ہی جا رہی تھی، سو یہ کام ولا فراک مناسب نہ تھا، لیکن وہ اوپر سیاہ کوٹ پہن لے گئی تو کام چھپ جائے گا، اور نیچے سے تو فراک سادہ ہی تھا۔ اس نے لباس بدل کر بال کیچر میں باندھے، پھر اپنے سنہری کلچ میں پاکستانی سلم سا میں موبائل ڈالا۔ کلچ چھوٹا سا تھا، اس میں ترک بھدا فون پورا نہیں آتا تھا، سو اس نے ترک فون کوٹ کی جیب میں رکھ دیا اور کلچ کی زنجیر کو ایک کندھے سے گزار کر دوسرے پہلو میں ڈال کر بڑی پن کے ساتھ فراک کی بیلٹ سے ٹھتی کر دیا۔ سنہری سکوں کے کام میں سنہری ستاروں والا پرس بالکل چھپ سا گیا تھا۔ کم از کم اب کوئی اس کا پرس چھین تو نہیں سکتا تھا نا۔

مسز عبداللہ کا پتا اس کے پاس تھا۔ ہالے سے ان کا نمبر لیے کر ان کو فون بھی کر دیا تھا۔ جب سے وہ ترکی آئی تھی، ان کے گھر پلٹ کر نہیں گئی۔ اب اسے لازمی جانا چاہیے تھا۔

گورسل میں وہ درمیانی راستے والی نشست پہ بیٹھی تھی۔ راستے کے اس طرف معتصم اور اس کے ساتھ لطیف بیٹھا تھا۔ حیا کے بائیں طرف کھڑکی کے ساتھ والی نشست پہ ایک ترک لڑکی موجود تھی۔

''تمہارا فلوٹیلا فلسطین کب پہنچے گا معتصم!'' وہ سیاہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھی گردن موڑ کر اس سے مخاطب تھی۔

''جون میں پہنچ جائے گا۔''

''اسرائیلی اسے داخل تو ہونے دیں گے نا؟''

''امید تو ہے کیونکہ یہ فلوٹیلا ترکی کا ہے، اور اس میں بہت سے ممالک کے وفد ہیں۔'' جواب لطیف نے دیا تھا۔

''اور اگر اسرائیلیوں نے ایسا نہ ہونے دیا تو؟ آخر بنی اسرائیل سے کسی بھی چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔''

''تو پھر یہ یاد رکھنا کہ جتنے بنی اسرائیل وہ ہیں، اتنے ہم بھی ہیں۔ وہ سامنے دیکھو! وہ اسرائیلی ایمبیسی ہے!'' معتصم کے اشارے پہ ان دونوں نے گردن اونچی کر کے ونڈ اسکرین کے پار دیکھا، جہاں ایک جھنڈے والی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔

''اگر فلوٹیلا غزہ نہ پہنچا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ ایمبیسی استنبول میں دوبارہ نظر نہیں آئے گی۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' لطیف نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

''می ٹو!'' حیا نے فوراً کہا۔

''می تھری!'' ساتھ ترک لڑکی نے فوراً انگلی اوپر کی۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

''ویسے معتصم! ٹالی کو اغوا کرنا زیادہ مناسب رہے گا نہیں؟'' لطیف کی بات پر سب ہنس پڑے تھے۔ اسے یاد تھا، ڈی جے کو ان کی ٹالی سے دوستی کتنی بری لگتی تھی۔

ٹاقسم اسکوائر پہ مغرب اتر رہی تھی اور ہر طرف اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ اسکوائر کی بتیاں ایک ایک کر کے جلنے لگی تھیں۔

''تم نے جدھر جانا ہے، ہم تمہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اکیلی مت جاؤ۔'' وہ دونوں بس سے اتر کر اس کے لیے رکے کھڑے تھے۔

''ترکوں کے ساتھ رہ کر تم بھی ترک بن گئے ہو۔ ان پر خلوص ترکوں سے راستہ پوچھو تو منزل تک پہنچا کر آتے ہیں۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''مادام! آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ ان پرخلوص ترکوں کے اس ملک میں ہر سال تقریباً پانچ سو لڑکیاں اغوا کر کے آگے بیچ دی جاتی ہیں اور یہ ترکی کا سب سے منافع بخش کاروبار ہے۔''

''اچھا اب ڈراؤ تو مت۔ مجھے تھوڑی دور ہی جانا ہے۔'' وہ تینوں سڑک کے کنارے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگے تھے۔

''تم اپنی آنٹی کے گھر جا رہی ہو؟''

''ہاں مگر مجھے ابھی اپنی ہوسٹ آنٹی کے گھر بھی جانا ہے۔ کچھ دن بعد جب میں واپس آؤں گی تو اس پزل باکس کا حل ڈھونڈیں گے۔''

وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے ٹھنڈی ہوا میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مجسمہ آزادی ان کے پیچھے رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

لاؤنج میں سوگواریت سی چھائی تھی۔ مسز عبداللہ اور ان کی سرخ بالوں والی بیٹی مہر مغموم سی سامنے صوفوں پہ بیٹھی تھیں۔ حیا کے صوفے سے ذرا دور کارپٹ پہ مہر کی بیٹی عروہ کشن کا سہارا لیے نیم دراز ریموٹ پکڑے ٹی وی پہ کارٹوں دیکھ رہی تھی۔

''آپ کو پتا ہے، ہم دونوں ہر ہفتے آپ کی طرف چکر لگانے کا پلان بناتے تھے مگر ہر دفعہ کچھ نہ کچھ روک لیتا، اور اب.....'' اس نے تاسف سے سر جھٹکا۔

''تم مجھے اسی روز بتا دیتیں تو..... کم از کم میں اسے دیکھ ہی لیتی، پھر کلیئرنس میں تمہاری مدد کروا دیتی۔ تم کتنی پریشان رہی ہوگی!''

''مجھے تو اپنی آنٹی کو بتانے کا بھی ہوش نہیں تھا، ایسا اچانک دھچکا لگا تھا کہ.....'' اس نے فقرہ ادھورہ چھوڑا اور سر جھکا کر انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارا پونچھا۔ مہر نے بہت فکرمندی سے اسے دیکھا۔

''تم بہت کمزور ہوگی ہو پہلے سے حیا! اور تمہاری رنگ بھی کملا گئی ہے۔''

''بس..... بخار ہو گیا تھا اور پھر سفر کی تکان!'' وہ اداسی سے مسکرائی۔ وہ واقعی بہت پژمردہ اور تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

''میں ذرا کھانے کا کچھ کروں۔'' مسز عبداللہ اٹھیں تو وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

''کھانا پھپھو کی طرف ہے۔ میں بس چائے پیوں گی۔''

''پھر مجھے صرف دس منٹ دو۔'' وہ عجلت سے کہتی کچن کی جانب بڑھ گئیں۔ مہر بھی اس کے پیچھے جانے کے لیے اٹھی، پھر عروہ کو دیکھا۔

''عروہ! تم حیا کو کمپنی دو اور فادر گاڈ سیک عروہ! جب کوئی مہمان آتا ہے تو ٹی وی نہیں دیکھتے۔'' اس نے جاتے جاتے خفگی سے بچی کو گھورا۔ عروہ گڑبڑا کر سیدھی ہوئی اور مڑ کر حیا کو دیکھا، پھر سادگی سے مسکرائی۔

''سوری!''

''کوئی بات نہیں۔ تم بے شک کارٹون دیکھ لو۔ میں بور نہیں ہوں گی۔ ویسے کون سا کارٹون ہے یہ؟'' اسے کارٹون ذرا شناسا لگے تو آنکھیں سکیڑ کر اسکرین کو دیکھنے لگی۔

''کیپٹن پلینٹ۔ Captain Planet آپ نے دیکھے ہیں کبھی؟'' عروہ دبے دبے جوش سے بتاتی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''ارے! یہ کیپٹن پلینٹ ہیں؟ میرے فیورٹ'' وہ ایک دم خوشی سے کہتی صوفے کی نشست پہ آگے کو ہوئی۔

''مجھے یہ بہت پسند ہیں، اور لنڈا تو بہت ہی زیادہ..... عروہ! میری تو جان تھی کیپٹن پلینٹ میں۔ میں بچپن سے ہی ان کی بہت جنونی فین رہی ہوں۔ جب یہ سارے پلینٹرز اپنی اپنی انگوٹھیاں فضا میں بلند کر کے فائر، ارتھ، ونڈ، واٹر چلاتے تھے تو میرے اندر اتنی انرجی بھر جاتی کہ مجھے لگتا میں ابھی اڑنے لگوں گی۔''

وہ چھوٹے بچوں سے کبھی بھی اتنی بے تکلف نہیں ہو پاتی تھی، مگر یہاں معاملہ کیپٹن پلینٹ کا تھا۔

''پھر میرے ابا نے مجھے سمجھایا کہ آگ، مٹی، ہوا اور پانی ہمارے اس سیارے کو بنانے والے چار ایلیمنٹس ہیں۔ تب پہلی دفعہ مجھے ان چار یونانی عناصر کا پتا چلا تھا۔''

''ہاں مجھے پتا ہے۔ ماما نے مجھے بتایا تھا کہ یہ یونانی عناصر ہیں۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''مجھے بھی تب ہی ابا نے بتایا تھا کہ کس طرح یونانی فلسفیوں نے یہ چار عناصر باری باری پیش.....'' وہ کہتے کہتے ایک دم رکی۔ لمحے بھر کو اس کے اندر باہر بالکل سناٹا چھا گیا۔

''یونانی عناصر!'' اس نے بے یقینی سے زیر لب دہرایا۔ اسے یاد تھا، یہ عناصر یونانی فلسفیوں نے پیش کیے تھے۔ کسی نے کہا دنیا پانی سے بنی ہے، کسی نے کہا ہوا سے.....اور وہ عنصر اس فلسفی کی پہچان بن گیا۔

''ہرا قلیطس کا عنصر کون سا تھا؟'' وہ خود سے پوچھتی جیسے چونک اٹھی۔ عروہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''عروہ! مجھے نیٹ چاہیے، ابھی، اسی وقت'' وہ بے چینی سے بولی تو عروہ سر ہلا کر اٹھی اور صوفے پر سے ایک آئی پوڈ اٹھا کر اسے دیا۔

''یہ ممی کا آئی پوڈ لے لیں۔''

''تھینکس!'' اس نے آئی پوڈ پکڑ کر اس کا گال تھپتھپایا اور جلدی جلدی گوگل کھولنے لگی۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد جب وہ ان کو خدا حافظ کر کے باہر آئی تو سڑک کے کنارے چلتے ہوئے اس نے کوٹ کی جیب سے اپنا ٹرک فون نکالا اور تیزی سے معتصم کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''حیا! خیریت؟'' وہ فون اٹھاتے ہی ذرا فکر مندی سے بولا تھا۔

''معتصم! تمہیں پتا ہے یونانی فلسفیوں نے زمین کی تخلیق کی وضاحت کرنے کے لیے کچھ عناصر پیش کیے تھے کہ زمین ان سے مل کر بنی ہے؟'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ آہستہ سے بولا۔

''حیا! میرے خیال سے تم ذرا تھک گئی ہو، تھوڑا سا ریسٹ کر لو، اس کے بعد تم نارمل ہو جاؤ گی۔''

''معتصم!'' اس نے جھنجھلا کر زور سے کہا۔ ''میں سنجیدہ ہوں۔ میری بات سنو! ہم خوامخواہ اس نیم پاگل آدمی کی سوا سو سال عمری پڑھ رہے تھے۔ ہمیں اس کی فلاسفی چاہیے تھی۔ اس دور کے ہر فلسفی نے اپنا ایک عنصر پیش کیا تھا اور اس کے خیال میں زمین کی ہر چیز اس عنصر سے بنی تھی۔ کسی نے کہا وہ پانی ہے، کسی نے کہا ہوا اور یوں ان چاروں، بلکہ پانچوں عناصر کی فہرست مرتب ہوئی تھی۔ ہرا قلیطس کا عنصر ''آگ'' تھا اور یہی اس کی پہچان تھا۔''

''فائر؟''

''ہاں، فائر ہرا قلیطس کی دائمی آگ۔ اس نے آگ کی بنیاد پہ اپنی فلاسفی آف چینج پیش کی تھی۔ معتصم.....معتصم انسان ایک دریا میں دو دفعہ کیوں نہیں اتر سکتا؟ کیونکہ انسان اور دریا، دونوں ہرا قلیطس کے خیال میں آگ سے بنے تھے اور دنیا میں سب سے زیادہ تبدیل ہونے والی چیز آگ ہے جو ہر لمحہ بدلتی ہے.....اور جو ہر ہر چیز کو بدل دیتی ہے۔ اس پزل باکس پہ لکھی بات ایک ہی لفظ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو ہے ''فائر۔'' وہ کالونی کے سرے پہ کھڑے ہو کر فون پہ کہہ رہی تھی۔ رات گہری ہو رہی تھی اور اسٹریٹ پولز جل اٹھے تھے۔

''مگر حیا! فائر میں تو چار حروف ہوتے ہیں۔ یہ کوڈ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ کوڈ ہے بھی نہیں۔ اس کا مطلب ہے آگ، اصلی والی آگ، ٹالی کالائٹر، اسرائیلی آگ، یاد ہے تمہیں؟''

''اوہ مائی!'' اسے ایک لمحہ لگا تھا سمجھنے میں۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ اس نے آگ کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ.....کیونکہ اس خط کی طرح اس باکس پر بھی کچھ لکھا ہو گا جو.....''

''جو صرف آنچ دکھانے سے ظاہر ہو گا۔'' اس نے مسکرا کر کہتے ہوئے اس کی بات مکمل کی۔

''حیرت ہے، یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا؟''

''کیونکہ تم کافی تھک گئے ہو، ذرا آرام کر لو، پھر تم نارمل ہو جاؤ گے۔''

وہ جواباً ہنس دیا تھا۔

''چلو پھر تم رات کو واپس آئی تو اس باکس کو کھولیں گے۔''

''نہیں، میں آج رات واپس نہیں آؤں گی۔ میں آنٹی کی طرف رکوں گی۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''تمہاری اپنی آنٹی یا پھر وہ ہوسٹ آنٹی؟''

''میں.....'' فقرہ اس کے لبوں میں رہ گیا۔ کسی نے اس کے کان پہ لگا فون زور سے کھینچا تھا۔ اسے مڑنے یا چیخنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔

کسی نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا اور کوئی سوئی کی نوک تھی جو اس کی گردن کے آس پاس کہیں کبھی تھی۔ لمحے بھر کا عمل تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے بادل چھانے لگے۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ دل و دماغ کے سن ہونے سے قبل جو آخری بات اس نے سوچی تھی، وہ یہ تھی کہ کوئی اسے پیچھے کی طرف گھسیٹ رہا تھا.....اور پھر.....ہر طرف اندھیرا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ بدقت پلکیں اوپر کو اٹھی تھیں، ان پہ جیسے بہت بوجھ سا تھا۔

ہر سو اندھیرا تھا۔ گھپ اندھیرا۔ وہ ایسے پڑی تھی کہ کمر دیوار سے لگی تھی اور گھٹنے سینے سے۔ وہ جیسے ایک بہت تنگ و تاریک جگہ پر بہت سے سامان کے اندر کہیں پھنسی بیٹھی تھی۔

اس نے آنکھیں چند ایک بار جھپکائیں۔ منظر ویسا ہی رہا۔ اندھیرا، تاریکی، بس اتنا احساس ہوا کہ وہ کسی تنگ سے کمرے میں ہے، جہاں اس کے دونوں اطراف وزنی چیزیں رکھی ہیں۔

اس نے کہنیوں کے بل ذرا سا اٹھنا چاہا تو دائیں ہاتھ میں کھینچاؤ تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچا۔ ذرا سا لوہا کھنکا۔ اس کی دائیں کلائی میں ہتھکڑی ڈلی تھی اور وہ دیوار سے بندھی تھی۔ اس نے زور سے کلائی کو جھٹکا، مگر بے سود۔

اس کے سر اور کمر میں بے تحاشا درد ہو رہا تھا، جیسے کوئی چوٹ لگی ہو۔ بمشکل وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے، دوسرے ہاتھ کے سہارے ذرا سی سیدھی ہو کر بیٹھی۔ بائیں جانب کوئی بوجھ سا اس کے اوپر گرنے لگا۔ اس نے آزاد ہاتھ سے اسے پردے دھکیلا تو وہ نرم سا بوجھ دوسری جانب ذرا سا لڑھک گیا۔

حیا نے گردن موڑی۔ درد کی ایک ٹیس بے اختیار اٹھی۔ اس کے لبوں سے کراہ نکلی۔ پیچھے دیوار لکڑی کے پھٹوں سے بنی تھی اور پھٹوں میں باریک سی درازیں تھیں۔ اب ذرا آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں تو اسے نظر آیا۔ ان درزوں سے رات کی تاریکی میں زردی روشنی جھانک رہی تھی۔ وہ بدقت چہرہ اس درز کے قریب لائی اور آنکھیں سکیڑ کر جھانکا۔

باہر ہر سو سمندر تھا۔ سیاہ پانی جو رات کے اس پہر زرد روشنیوں میں چمک رہا تھا۔ پل کی روشنیاں۔ ہاں، وہ پل ہی تھا۔ وہ باسفورس کے سمندر پہ بنے اس پل کے آس پاس ہی کہیں تھی۔ مگر وہ باسفورس برج نہیں تھا، وہ ذرا مختلف لگ رہا تھا، یا شاید وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھی۔

بائیں طرف موجود بوجھ پھر سے اس پہ لڑھکنے لگا۔ اس نے کوفت سے اسے پردے دھکیلا تو اس کا ہاتھ نم ہو گیا۔ وہ نم ہاتھ چہرے کے قریب لائی اور دور سے آتی روشنی میں دیکھنا چاہا۔ اسے نمی کا رنگ تو نظر نہیں آیا مگر.....وہ خون تھا۔

وہ متوحش سی ہو کر ہاتھ اپنے کپڑوں سے رگڑنے لگی۔ اس کا کوٹ اس کے جسم پہ نہیں تھا۔ جو واحد خیال اسے اس وقت آیا تھا۔ وہ بہت تکلیف دہ تھا۔

عبدالرحمان پاشا نے اغوا کروالیا تھا۔

زور زور سے وہ اپنا ہاتھ سنہری سکوں سے رگڑ رہی تھی، جب اس کی انگلیاں ذرا بھاری سی چیز سے ٹکرائیں۔ وہ ٹھہر گئی اور اسے ٹٹولا۔

اس کا چھوٹا سنہری کلچ جو فراک کی بیلٹ کے ساتھ منتھی تھا۔ اس کے سر میں درد سے ٹیس اٹھ رہی تھیں۔ ذہن میں اپنی پھپھو کی آخری گفتگو گونج رہی تھی۔ اس نے شام میں انہیں یقین دلایا تھا کہ رات کھانے پر وہ ان کے ساتھ ہوگی۔ اب جانے کون سا وقت تھا، پھپھو نے اس کا انتظار کیا ہوگا اور اسے نہ پا کر.....کیا ان کے ذہن میں آیا ہوگا کہ وہ اغوا ہو گئی ہے؟

اس نے اپنے آزاد ہاتھ میں کلچ کھولا۔ اندر اس کا پتلا سا پاکستانی موبائل رکھا تھا۔ انہوں نے اس کا فون کیوں نہیں لیا، وہ سمجھ گئی

Downloaded From http://paksociety.com

تھی۔اس کا ترک فون کھینچ کر انہوں نے سمجھا ہوگا کہ وہ اسے رابطے کے ہر ذریعے سے محروم کر چکے ہیں اور فراک کے ساتھ ننھی کلچ پہ ہم رنگ ہونے کے باعث کسی نے غور نہیں کیا ہوگا۔انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس کے پاس دو فون تھے۔مگر عبدالرحمٰن پاشا کو تو معلوم تھا لیکن.....

اس نے اسکرین کو چھوا تو وہ روشن ہوگئی۔بند کمرے میں مدھم سی سفید روشنی جل اٹھی۔اس موبائل میں مہوش کی مہندی کے روز ہی اس نے بیلنس ڈلوایا تھا اور یہ پاکستانی نمبر تھا۔جس کی رومنگ آن تھی۔معلوم نہیں کتنے پیسے بچے تھے،ایک کال کے تو ہوں گے۔اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ بیلنس چیک کیا۔اس میں اتنے ہی روپے تھے کہ وہ ترکی کے کسی نمبر پہ تیس سیکنڈ کی کال کر سکتی بس۔اتنی سی دیر میں بھی وہ جہان کو اپنی صورتحال سمجھا سکتی تھی۔

وہ جلدی جلدی فون بک نیچے کرنے لگی۔''جے'' میں جہان کا نمبر نہیں تھا اس نے ''سی'' میں دیکھا۔وہاں بھی نہیں تھا۔وہ ذرا حیرت سے سین پھپھو کا نام تلاشنے لی۔ان کا نمبر بھی غائب۔بس پاکستانی نمبر تھے۔

''کیوں؟'' اس نے دکھتے سر کے ساتھ سوچنا چاہا اور تب ایک جھماکے سے اسے یاد آ گیا۔یہ پاکستانی موبائل تھا اور ترکی کے سارے نمبرز اس نے اپنے ترک فون میں محفوظ کر رکھتے تھے۔اب وہ گھر فون کر کے اپنے اغوا کا نہیں بتا سکتی تھی اور نہ اتنا بیلنس تھا کہ وہ انہیں فون کر کے جہان کا نمبر لیتی۔تیس سیکنڈ کی کال اسے ضائع نہیں کرنی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سر دیوار سے لگا دیا۔وہ سوچنا چاہتی تھی،فرار کا کوئی راستہ،مدد کی کوئی صورت،اور تب ہی اس نے لکڑی کی اس دیوار کے پار وہ آوازیں سنیں۔عربی میں تیز تیز بولتا ایک آدمی جیسے دور سے چلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔

''پاشا تمہیں جان سے مار دے گا اگر اسے علم ہوا کہ تم اس کی لڑکی اٹھا لائے ہو۔''

''یہ بحری جہاز روانہ ہو جائے،پھر میں یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا جہاں پاشا کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔'' دوسری آواز ذرا جھنجھلائی ہوئی تھی۔وہ دونوں اسی دیوار کے پیچھے باتیں کر رہے تھے۔

''تم امید کرو،اور تم اچھی امید کرو،کیونکہ اگر پاشا کو.....'' آوازیں دور جا رہی تھیں۔اب وہ مبہم ہوگئی تھیں۔

اس نے ان کی باتوں پہ غور کرنا چاہا۔وہ پاشا کا ذکر کر رہے تھے کچھ ایسا جو اس کے علم میں نہیں تھا۔بحری جہاز کی روانگی اور پاشا کی لاعلمی.....تو کیا پاشا کے کہنے پہ اغوا نہیں کی گئی تھی؟

وہ کتنی ہی دیر اپنے درد کرتے سر کے ساتھ سوچنے کی کوشش کرتی رہی مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔اس نے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا۔

اس فون میں ترکی کا ایک ہی نمبر تھا۔جب وہ ریسٹورنٹ میں اپنا ترک موبائل چھوڑ کر گئی تھی،تو اسے اسی پاکستانی فون پہ پاشا نے کال کیا تھا۔اس نے وہ نمبر محفوظ نہیں کیا تھا مگر وہ کال لاگ میں پڑا تھا۔اس نے کپکپاتی انگلیوں سے لاگ کھولا۔وہ خالی تھا۔صرف ایک کال تھی،جو ترکی آتے ہی ابا نے اس نمبر پہ کی تھی۔باقی لاگ ارم نے مٹا دیا تھا۔

اس کا سر گھومنے لگا۔ہر طرف اندھیرا تھا،ہر راستہ مسدود،ہر دروازہ بند،وہ تیس سیکنڈ کی کال کس کو کرے؟ سارے ایمرجنسی نمبرز ترک فون میں تھے اور ترکی کے دوسرے نمبر اسے زبانی یاد نہیں تھے۔فون نمبر حیا سلیمان کو کبھی زبانی یاد نہیں رہتے تھے۔

بوجھ پھر سے اس پہ لڑھکنے لگا۔اس نے موبائل کی روشنی اس پہ ڈالی اور ایک دم بالکل شل رہ گئی۔وہ لمبے سنہری بالوں والی ایک لڑکی تھی۔جو اس پر گری تھی۔اس کے منہ اور کندھے سے خون نکل رہا تھا۔بغیر آستین کی قمیص سے جھلکتے اس کے سنہری بازو پہ کچھ لکھا تھا۔اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بازو پہ موبائل کی روشنی کی۔وہاں سیاہ رنگ سے انگریزی میں لکھا تھا۔''Natasha'' ''نتاشا.....'' شاید اس کا نام تھا،اور وہ اس کے نام کا ایک بدصورت سا ٹیٹو تھا۔یا جلا ہوا کوئی داغ۔

اس نے موبائل کی روشنی ادھر ادھر دوڑائی۔اس چھوٹے سے ڈربے میں ہر طرف لڑکیاں تھیں۔ایک دوسرے کے اوپر گری ہوئی۔بے ہوش،بے سدھ پڑی کسی کے چہرے پہ نیل تھے،تو کسی کے بازوؤں پہ خراشیں یا جما ہوا خون تھا۔

خون کی بو اور سر میں اٹھتا شدید درد۔اس کا جی ایک دم سے متلانے لگا تھا۔اسے محسوس ہوا،وہ پھر سے ہوش کھو دے گی۔اپنے ناکارہ فون کو کھلے کلچ میں ڈالتے ہوئے اس کی نگاہ اندر پڑے کارڈ پہ پڑی اس نے جلدی سے وہ کارڈ نکالا۔اتصالات کا کالنگ کارڈ جو انہوں

Downloaded From http://paksociety.com

نے ابوظہبی میں خریدا تھا، مگر اب وہ بے کار تھا۔ اس نے اندر انگلیاں ڈال کر ٹٹولا اور پھر یہ تہہ شدہ کارڈ نکالا۔

کارڈ کو سیدھا کر کے اس نے گھٹنے پہ رکھا اور موبائل کی روشنی اس پہ ڈالی۔ آف وائٹ کارڈ پہ لکھے سیاہ الفاظ روشن ہوئے۔

''شیخ عثمان شبیر۔''

نیچے ترکی کے تین نمبرز لکھے تھے۔ آفس، گھر اور موبائل کا۔ اس کا دل نئی امید سے دھڑکنے لگا۔

اسے ایکسٹینشن یاد نہیں آ رہی تھی۔ کوئی تاریخ تھی۔ کوئی نشان، کوئی مشہور واقعہ۔ اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے یہ تیس سیکنڈ کی کال ضائع نہیں کرنی تھی۔ مگر اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ سر میں اٹھتا درد اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول کر دوبارہ کارڈ کو دیکھا اور کچھ سوچ کر موبائل نمبر ملایا اور فون کان سے لگایا۔ ترک میں ریکارڈنگ چلنے لگی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ فون بند ہے۔ اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ گھر کا نمبر ملایا۔

گھنٹی جا رہی تھی۔ وہ بے چینی سے لب کاٹتی سنے گئی۔ اس کی امید کا دیا بار بار جلتا بجھتا جا رہا تھا۔

بند کمرے میں خون کی عجیب سی بو پھیلی تھی۔ اس سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ دوسری جانب گھنٹی ابھی تک جا رہی تھی۔

''پلیز اللہ تعالیٰ، پلیز.....اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''السلام علیکم۔!'' اسی لمحے فون اٹھا لیا گیا۔

''کون، عثمان انکل؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''آ.....نہیں، میں ان کا بیٹا، سفیر!'' وہ جو بھی تھا۔ ذرا چونکا۔

''میں حیا بول رہی ہوں۔ حیا سلیمان۔ میں عثمان انکل کے ساتھ آئی تھی۔ اتحاد ائیر لائنز۔ سبانجی یونیورسٹی۔ ایکسچینج اسٹوڈنٹ۔'' وقت کم تھا اور وہ اسے تعارف میں ضائع نہیں کر سکتی تھی۔

''کیا ہوا؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''نہیں، مجھے ان لوگوں نے اغوا کر لیا ہے، یہاں پر کوئی کمرا ہے میں اس میں بند ہوں یہاں چھ، سات اور لڑکیاں بھی ہیں۔ پلیز کسی سے کہیں میری مدد کرے۔'' وہ تیز تیز بولتی گئی۔

''ایک منٹ۔ مجھے بتائیں آپ کس جگہ پر ہیں۔ کوئی آئیڈیا ہے آپ کو؟ کسی کھڑکی وغیرہ سے باہر دیکھ سکتی ہیں؟''

''ہاں، یہاں باہر سمندر ہے، مجھے ایک فیری نظر آ رہا ہے اور ادھر پل ہے۔ باسفورس برج.....نہیں، یہ.....'' رابطہ کٹ گیا۔

اس نے بوکھلا کر اسکرین کو دیکھا اور پھر اس باریک درز سے جھلکتے منظر کو۔ اس نے باسفورس برج کہہ دیا تھا جبکہ وہ باسفورس برج نہیں تھا۔ وہ اب پہچانی تھی۔ یہ سلطان احمت برج تھا۔ شہر کے دونوں حصوں کو ملانے والا دوسرا پل۔ اس نے اپنی لوکیشن ہی غلط بتائی تھی۔ اب؟

وہ بے بسی سے موبائل کو دیکھے گئی۔ بیلنس ختم ہو گیا تھا اور اب وہ کال ریسیو کرنے سے بھی قاصر تھی۔

دروازے پہ آہٹ ہوئی۔ تالا کھلنے کی آواز۔ اس نے جلدی سے فون کلچ میں ڈال کر اسے بند کیا اور گردن ایک طرف ڈھلکا کر آنکھیں موند لیں۔

دروازہ بھاری چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ کوئی اندر آیا، اس پہ جھک کر اس کی ہتھکڑی چابی سے کھولی اور پھر اسے بازو سے کسی جانور کی طرح گھسیٹتے باہر لے جانے لگا۔

اس کے لبوں سے بے اختیار کراہ نکلی۔

وہ آدمی اسے بڑے کمرے میں لایا اور اب کرسی پہ بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں کرسی سے باندھ رہا تھا۔

''مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو۔'' وہ منمنائی تھی۔ اس نے جواباً ٹیپ کا ایک ٹکڑا دانت سے کاٹ کر اس کے لبوں سے کس کر چپکا دیا۔

''ام.....'' وہ گردن دائیں سے بائیں مارنے لگی۔ ٹیپ سے اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ توجہ دیے بنا لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

اس نے نگاہیں پورے کمرے پہ دوڑائیں۔ وہ بڑا سا کمرا تھا۔ ایک طرف بڑا صوفہ رکھا تھا اور دوسری طرف آتش دان، جس کے پاس وہ کرسی سے جکڑی بیٹھی۔ آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی۔ ہر قلیطس کی دائمی آگ۔ ساتھ ہی لوہے کی چند سلاخیں پڑی الاؤ میں دہک رہی تھیں۔ ان کے سرے پہ انگریزی کے مختلف حروف لکھے تھے اور وہ حروف دہک دہک کر سرخ انگارے بن چکے تھے۔

آتش دان کے ایک طرف ایک چھوٹی انگیٹھی رکھی تھی۔ اس میں جلتے انگاروں پہ ایک برتن میں شہد کی طرح کا گاڑھا سا مائع ابل رہا تھا۔ اس کی بو سارے کمرے میں پھیلی تھی۔ شہد سے زیادہ بھورا مائع۔ وہ شاید ویکس تھی۔

اس نے گردن گرادی۔ اس کی ہمت ختم ہوتی جارہی تھی۔ وہ اب بہت دیر سے اس کمرے میں تنہا پڑی تھی اور یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس نے وہ کال ضائع کردی۔ پتا نہیں وہ کون تھا اور اسے اس کی بات سمجھ میں آئی بھی تھی یا نہیں اور وہ کچھ کرے گا بھی یا نہیں۔ اگر وہ گھر فون کرلیتی تو شاید..... مگر نہیں، گھر فون کرنے کی صورت میں بات پھیل جاتی اور اس سے تو بہتر تھا کہ وہ یہیں پڑی رہتی۔ لیکن بات تو اب بھی پھیل جائے گی اور جو ذلت، جو بدنامی اس کا انتظار کررہی تھی۔ اس کے سامنے وہ بھولی بسری سی ویڈیو آگئی۔

شریفوں کا مجرا۔

''نہیں، پلیز اللہ تعالیٰ، پلیز میری مدد کریں۔'' وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ دعا مانگے گئی۔ اس کی دعا پہلے قبول نہیں ہوئی تھی، شاید اب ہوجائے۔ شاید اب اس کی مدد کردی جائے۔

آتش دان کے قریب ہونے کے باعث تپش اس تک پہنچ رہی تھی اور اس مسلسل حدت سے اس کے پاؤں دہکنے لگے تھے۔ وہ زرد الاؤ کو دیکھ رہی تھی جس کی سرخ لپٹیں اٹھ اٹھ کر ہوا میں گم ہورہی تھیں۔ گرمی بڑھتی جارہی تھی اس کا سارا وجود گویا آگ میں دہک رہا تھا۔ لمبے بال کمر اور کندھوں پہ بکھرے تھے، وہ ان کو سمیٹنے پہ بھی قادر نہیں تھی۔ اس نے پورا زور لگا کر کرسی کو پیچھے دھکیلنا چاہا، مگر وہ نہیں ہلی۔ پسینے کی چند بوندیں اس کی گردن اور پیشانی پہ چمک رہی تھیں۔

دفعتاً دروازہ کھلا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ایک پستہ قد، چینی نقوش کا حامل شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا بیگ تھا۔ جسے اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی میز پہ رکھا پھر اس کی طرف آیا اور ایک ہاتھ سے کرسی کا رخ اپنی جانب موڑا اور ہاتھ سے ڈکٹ ٹیپ کا کنارا پکڑ کر کھینچ کر اتارا۔

''آہا..... نتاشا!'' وہ قریب سے دیکھنے پہ کوئی روسی لگتا تھا۔

''میں نتاشا نہیں ہوں، پلیز مجھے جانے دو۔'' ایک امید سی بندھی کہ وہ اسے کسی اور کے دھوکے میں پکڑ لائے تھے۔

''ناؤ یو آر نتاشا..... انگلش، انگلش؟ آل رائٹ، آل رائٹ!'' وہ اثبات میں سر ہلا کر مسکراتا ہوا انگیٹھی کی طرف بڑھ گیا۔

''پلیز مجھے جانے دو۔'' وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولی۔ وہ آگ کے ساتھ کھڑا تھا۔ تپش کا رستہ رک گیا۔ ذرا سا سکون ملا۔

''پور کنٹری، تو رسٹ گرل، پور پیپل!'' وہ نفی میں سر ہلا کر ایک سلاخ اٹھائے اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

''میرا باپ امیر آدمی ہے، وہ تمہیں تاوان کی رقم دے دے گا۔''

''سو نتاشا، یو وانٹ انگلش نیم؟'' وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہتا اس کی طرف پلٹا۔ وہ جواب دیے بنا یک ٹک اس سلاخ کو دیکھے گئی جس پہ لکھا ''ایم'' دہک رہا تھا۔ یا شاید وہ ''ڈبلیو'' تھا۔

وہ سلاخ کیوں دہکا رہا تھا؟ کس لیے؟''

''ایک خوف سا اس کے اندر سر اٹھانے لگا۔ اسے بے اختیار اس کمرے میں بے سدھ پڑی لڑکی کا بازو یاد آیا۔ وہ ٹیٹو نہیں تھا۔ وہ لمحے بھر میں جان گئی تھی۔

''یو وانٹ انگلش نیم؟'' وہ اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

''نو..... نو.....'' وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلاتی بڑبڑائی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ناؤ دس از یور نیم!'' وہ سلاخ کا دہکتا لوہا اس کے قریب لایا۔

''نہیں.....نہیں.....'' وہ گردن دائیں بائیں ہلاتی زور سے چلانے لگی۔ وہ اسے اس گرم لوہے سے داغنے لگا تھا۔ اس کا چہرے خوف و دہشت سے سفید پڑ گیا تھا۔

''یور نیم!'' اس نے جتا کر کہتے سلاخ حیا کے بازو کے قریب کی جہاں فراک کی چھوٹی آستین ختم ہوتی تھی۔ کندھے سے ذرا نیچے وہاں وہ سلاخ قریب لے گیا۔ اسے دہکتے انگارے کی حدت محسوس ہوئی۔ وہ تڑپ کر ادھر ادھر سر مارنے لگی۔

''نہیں پلیز.....نہیں.....''

اس لمحے اس نے بہت دل سے دعا کی تھی کہ کوئی آ جائے اور اس پستہ قد روسی سے اسے نجات دلا دے۔ کوئی آ جائے، چاہے وہ عبدالرحمٰن پاشا ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی تو.....

روسی نے دہکتا ہوا لوہا اس کے بازو کے اوپر حصے پہ رکھ کر دبایا۔ وہ بری طرح سے بلبلا اٹھی۔ اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی تھی مگر وہ اسی طرح زور دے کر سلاخ دبائے کھڑا تھا۔

اندر سے ماس جلنے لگا تھا۔ وہ روح میں اتر جانے والی، زخمی کر دینے والی بدترین جلن تھی۔ وہ چیخ رہی تھی، وہ رو رہی تھی۔

چند لمحے بعد اس نے سلاخ اٹھالی۔ وہ مکمل طور پہ جل گئی تھی۔

روسی دوبارہ پلٹا اور سلاخ رکھ دی۔ اس کے دائیں بازو کے اوپری حصے پہ سیاہ، جلا ہوا حرف لکھا تھا۔

روسی واپس اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ حیا نے متورم، سرخ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور دہل کر رہ گئی۔ اس کے ہاتھ میں دوسری سلاخ تھی جس پہ HO لکھا تھا، اور اوپر تلے لکھے دونوں حروف انگارہ بن چکے تھے۔

''نہیں.....تمہیں اللہ کا واسطہ.....نہیں۔'' وہ وحشت سے تڑپتی خود کو پیچھے دھکیلنے لگی مگر رسیوں نے اسے اتنی مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا کہ وہ ہل بھی نہ پائی۔

''نہیں.....'' وہ خوف سے چلا رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا سیاہ داغے گئے حرف تلے سلاخ گاڑ دی۔

کھولتا ہوا گرم درد، دہکتے انگارے، آگ اس کی تکلیف آخری حد کو چھونے لگی۔ وہ درد سے گھٹی گھٹی سی چیخ رہی تھی۔ اسے لگا وہ اس تکلیف میں مرنے والی ہے۔ وہ جسم کے اندر تک گھس کر جلا دینے والا درد تھا۔

چند لمحوں بعد اس نے سلاخ ہٹائی تو حیا کی گردن بے دم سی ہو کر ایک جانب ڈھلک گئی۔ اس کا تنفس آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ تکلیف سے وہ ہوش کھونے والی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا مگر مزید رونے کی سکت وہ خود میں نہیں پاتی تھی۔

روسی اب تیسری سلاخ اٹھا لایا تھا۔ اس پہ RE لکھا تھا۔ حیا نے تکلیف سے بند ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس میں مزید کچھ کہنے کی سکت نہیں رہی تھی، اپنی ساری زندگی فلم کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ بچپن کے دن، یادیں، اس کے نانا کا گھر، اس کی نانی اس کے لمبے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھیں۔ منظر بدل گیا۔ وہ اور روحیل کار کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھے تھے، اسکول بیگ لیے، وہ اسکول جا رہے تھے، روحیل کچھ بتا رہا تھا اور وہ ہنس رہی تھی۔ پھر اس نے خود کو ابا کی لائبریری میں دیکھا۔ وہ ان کی ایک موٹی سی کتاب کھول رہی تھی جس میں سوکھا پھول رکھا تھا، وہ اس نے خود ہی وہاں رکھا تھا۔ اب وہ تایا فرقان کو اپنے عید کے کپڑے ہینگر سے اٹھائے دکھا رہی تھی، اور وہ اس کا جوش و خروش اور خوشی دیکھ کر مسکرا رہے تھے روحیل اس کے ساتھ لان میں بھاگ رہا تھا، ان کے آگے دو خرگوش دوڑ رہے تھے۔ وہ دوڑ دوڑ کر تھک گئی تھی۔ اس کے لمبے بال کمر پہ بکھرے تھے۔ خرگوش گھاس پہ دور بھاگتے جا رہے تھے۔ سفید.....نرم نرم سے خرگوش.....

روسی نے گرم سلاخ اس کے بازو میں مس کی، ایک کھولن سی اس کے اندر اترتی گئی۔ اگلے ہی پل، اس نے کرنٹ کھا کر سلاخ ہٹائی کہیں فون کی گھنٹی بجی تھی۔

خرگوش غائب ہو گئے۔ درد ہر شے پہ غالب ہو گیا۔ وہ پہلی دو دفعہ سے کئی گنا زیادہ شدید درد تھا کیونکہ سلاخ جلدی ہٹانے کے باعث جلد پوری نہیں جلی تھی اور حسیات باقی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی ہمت ختم ہو گئی ہے، مگر وہ پھر سے رو رہی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''فون؟ یورفون؟ آواز کے تعاقب میں وہ آگے بڑھا اور اس کے فراک کی بیلٹ سے لگا پرس نوچا۔ سیفٹی پن ٹوٹ گئی، کپڑا اُدھڑ گیا۔ اس نے تیزی سے پرس کھولا اور فون نکالا۔ وہ زور زور سے بج رہا تھا۔

شدید تکلیف میں بھی وہ پہلی بات اس کے ذہن میں آئی تھی وہ یہی تھی کہ اس کا فون رومنگ پہ تھا اور بیلنس ختم، پھر فون کیسے بجا؟ روسی کبھی بے یقینی سے اسے دیکھتا، کبھی فون کو۔ پھر اس نے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ اس پہ اس نے جلدی سے فون بند کیا اور پوری قوت سے اسے دیوار پہ دے مارا۔ فون کی اسکرین چکنا چور ہوتی زمین پر جا گری۔

''یو کالڈ سم ون؟'' وہ وحشیوں کی طرح اس پہ جھپٹا، اور گردن کے پیچھے سے بال دبوچ کر اس کے چہرہ سامنے کیا۔ حیا نے نیم جاں، نڈھال آنکھوں سے اس کو دیکھا اور پھر اس کے منہ پہ تھوک دیا۔

وہ بلبلا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے بال چھوڑے اور انگیٹھی پہ دہکتا برتن ہینڈل سے اٹھایا۔ کھولتی ہوئی ویکس۔

''یو..... یو بچ!'' وہ غصے سے مغلظات بکتا اس کے قریب آیا اور برتن اس کے سر پہ اونچا کیا۔

''نن..... نو.....'' اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ''میرے بال.....'' اس کے لبوں سے بس اتنا ہی نکل پایا تھا کہ روسی نے برتن اس کے سر پہ الٹ دیا۔

گرم، کھولتی ہوئی ویکس تیزی سے اس کے بالوں کی مانگ پہ گری اور ہر طرف سے نیچے لڑھکنے لگی۔ اس کی دلخراش چیخ نکلی۔ ابلتے مادے نے اس کے سر کی جلد کو گلا دیا تھا۔ بازو کا درد غائب ہو گیا، وہ وحشیانہ انداز میں زور زور سے چیخ رہی تھی، اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ بھی چیخ رہا تھا۔ اور تب اس نے زور سے اس کی کرسی کو دھکا دے کر الٹ دیا۔ وہ کرسی سمیت اوندھے منہ زمین پہ جا گری۔ آتش دان کے بالکل قریب۔

کمرے میں دھواں سا بھرنے لگا تھا۔ ویکس اس کے سر پر جمنے لگا تھا۔ اس کا سر بے حد وزنی ہو گیا تھا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ کمرے میں دھواں بڑھتا جا رہا تھا۔ آتش دان سے آگ کی لپٹیں لپک لپک کر اس کی طرف آ رہی تھیں۔

اس نے زمین پہ گرے، گال فرش پہ رکھے بند ہوتی آنکھوں سے اس دھندلے منظر کو دیکھا۔ دھوئیں کے اس پار کوئی اس روسی کا سر پکڑ کر دیوار سے مار رہا تھا۔ چیخیں، دھواں، آگ، خون۔ اس کا پورا جسم آگ میں دہک رہا تھا۔

جو آخری شے اس نے دیکھی، وہ اس کا سیاہ فراک کا دامن تھا، آگ کی ایک لپیٹ نے اسے چھو لیا تھا۔ اس نے سیاہ کپڑے کو زرد شعلے میں بدلتے دیکھا۔ ہر طرف دھواں تھا۔ اور وہ جانتی تھی کہ وہ مر رہی تھی۔ اس کے سفید خرگوش اس دھوئیں میں غائب ہو رہے تھے۔ وہ جل کر مر رہی تھی، ہر اقلیطس کی دائمی آگ ہر سو پھیل رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ وہ..... سفید چھت اس کی نگاہوں کے سامنے تھی جس پہ خوبصورت نقش و نگار بنے تھے۔ درمیان میں ایک قیمتی نفیس فانوس لٹک رہا تھا۔

اس کا سر ایک نرم، گداز تکیے پہ تھا اور مخملیں کمبل گردن تک ڈالا تھا۔ اس نے ایک خالی خالی سی نگاہ کمرے پہ دوڑائی۔ وسیع و عریض، پرتعیش بیڈ روم، ایک طرف دیوار گیر کھڑکی کے آگے برابر کیے گئے سفید جالی دار پردے جن سے صبح کی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

اس نے آنکھیں پھر سے موند لیں اور ان پہ بازو رکھ لیا۔ ان گزرے دنوں میں سوتی جاگتی کیفیت میں وہ بہت روئی تھی، بہت چلائی تھی۔ یہ کمرا اس نے دیکھا تھا۔

وہ ادھر ہی لائی گئی تھی۔ ہاتھ سے لگی ڈرپ اپنے بالوں میں نرمی سے چلتے اس بھوری آنکھوں والی لڑکی کے ہاتھ، وہ انجکشن، نیم بے ہوشی۔ اسے ٹوٹا ٹوٹا سا سب یاد تھا اور اس ڈوبتی، ابھرتی نیند میں بھی وہ جانتی تھی کہ وہ بیوک ادا میں ہے، عبدالرحمن پاشا کے سفید محل میں۔

دروازے پہ دھیرے سے دستک ہوئی اور پھر وہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ قدموں کی نرم سی آواز بیڈ کے قریب آئی۔ اس نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کون تھی۔

''صبح بخیر! نیند پوری ہو گئی ہے تو اٹھ جاؤ، ناشتا کر لو۔''

Downloaded From http://paksociety.com

باب 6

نرم لہجے کے ساتھ اسے سائیڈ ٹیبل پہ ٹرے رکھنے کی آواز آئی۔ وہ ہلی تک نہیں۔

''نیند اچھی ہے لیکن زیادتی اگر اچھی چیز کی بھی ہو تو نقصان دہ ہوتی ہے۔ یہ کھیرے کا سوپ ہے اور ساتھ ناشتہ''۔

حیا ہنوز آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی رہی۔

''اور یہ عبدالرحمٰن کی کال ہے، وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے''۔

اس نے بازو چہرے سے ہٹایا۔ سبز اسکارف چہرے کے گرد لپیٹے، نیچے سرمئی اور گلابی پھول دار اسکرٹ پہ لمبا سفید سوئیٹر پہنے وہ ہاتھ میں پکڑا کارڈلیس فون اس کی جانب بڑھائے ہوئے تھی۔

''لو، بات کرو!'' اس کے کم عمر چہرے پہ ایک معصومیت بھری شفافیت تھی اور اس کی آنکھیں جو رات میں حیا کو بھوری لگی تھیں، صبح کی روشنی میں سبز لگ رہی تھیں۔ وہ دنیا کا سب سے شفاف، سب سے خوب صورت چہرہ تھا۔

''مجھے اس سے بات نہیں کرنی''۔ وہ بولی تو اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت چیخنے کے باعث اب گلا جواب دے گیا تھا۔

''وہ کہہ رہی ہے، اسے تم سے بات نہیں کرنی''۔ اس نے فون کان سے لگا کر نرم لہجے میں انگریزی میں بتایا۔

''وہ کہہ رہا ہے، ایک دفعہ اس کی بات سن لو''۔

''اس سے کہو، جو اس نے میرے لیے کیا، میں اس کی احسان مند ہوں، شکر گزار ہوں لیکن اگر اس کے بدلے میں وہ مجھے یوں اذیت دینا چاہتا ہے تو میں ابھی اسی وقت اس کے گھر سے چلی جاؤں گی''۔ وہ بے حد رکھائی سے بولی۔ عائشے گل کا چہرہ جواباً ویسا ہی نرم اور شفاف رہا۔ اس نے سن کر فون کان سے لگایا اور ساری بات من وعن انگریزی میں دہرا دی۔ پھر فون بند کر دیا۔

''وہ کہہ رہا ہے کہ وہ انڈیا میں ذرا پھنس گیا ہے، وہ ادھر نہیں آ سکے گا اور آئے گا بھی نہیں اگر تم یہ نہیں چاہتیں اور تم جب تک چاہے ادھر رہ سکتی ہو۔ میں یہاں بیٹھ جاؤں؟'' اس نے کارڈلیس میز پہ رکھتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ نہ اجنبیوں سے جلدی گھلتی ملتی تھی اور نہ ہی اسے پاشا کے گھر والوں سے راہ و رسم بڑھانے میں دلچسپی تھی مگر اس لڑکی کا چہرہ اتنا نرم اور دوستانہ تھا کہ خود بخود اس کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''شکریہ''۔ وہ اسی مدھر مسکراہٹ کے ساتھ کہتی کرسی پہ ٹیک لگا کر بیٹھی، سفید سوئیٹر میں مقید کہنیاں کرسی کے دونوں بازوؤں پہ رکھیں اور ہتھیلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے عادتاً اپنی انگوٹھی انگلی میں گھمانے لگی۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے''۔ وہ کہنی کے بل ذرا سی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

''تم عبدالرحمٰن کی طرف سے پریشان مت ہونا اس نے کہا کہ نہیں آئے گا تو نہیں آئے گا۔ جو اس نے تمہارے لیے کیا، وہ اس کا فرض تھا۔ سفیر کی فیملی سے ہمارے پرانے تعلقات ہیں جب تم نے سفیر کو فون کیا تو اس نے فوراً عبدالرحمٰن کو اپروچ کیا، یوں پولیس کی مدد لے کر وہ تمہیں وہاں سے نکال لائے''۔

''مجھے کس نے اغوا کیا تھا؟'' وہ بہت دیر بعد بس اتنا ہی کہہ پائی۔

''یہاں بہت سے ایسے گروہ ہیں جو روس، مالدووا اور یوکرائن سے لڑکیاں اغوا کر کے یا دھوکے سے ادھر لاتے ہیں، اس کے علاوہ ان ٹورسٹ لڑکیوں کو جن کا تعلق کسی ایسے غریب ملک سے ہو کہ ان کے گھر والے ترکی آ کر زیادہ دیر تک کیس کا تعاقب نہ کر سکیں، ان کو بھی یہ اغوا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے پاس پہنچنے کے بعد سب لڑکیاں ''نتاشا'' بن جاتی ہیں۔ یہ ان نتاشاز کو آگے بیچ دیتے ہیں اور ان سے

Downloaded From http://paksociety.com

وائٹ سلیوری White Slavery کروائی جاتی ہے''۔

اس نے تکلیف سے آنکھیں موندلیں۔اسے یاد آ گیا تھا۔نتاشا،ترکی میں کام کرنے والی روسی کال گرل کو کہتے ہیں۔

''تم چھوڑو یہ سب،اپنے گھر فون کرلو۔دو دن ہو گئے ہیں،تمہیں انہیں اپنی خیریت کی اطلاع تو دینی چاہیے''۔

اس نے جواب نہیں دیا۔بس خالی خالی نگاہوں سے کھڑکی کے جالی دار پردے کو دیکھتی رہی جو ہوا سے ہولے ہولے پھڑ پھڑا رہا تھا۔اس کے پاس جواب تھا بھی نہیں۔

''میں اور بہارے جنگل تک جا رہے ہیں،تم چلو گی؟''

اس نے بنا تردد کے نفی میں گردن ہلا دی۔عائشے کے چہرے پہ ذرا سی اُداسی پھیلی۔

''چلو،جیسے تمہاری خوشی۔آج نہیں تو کل تم ضرور ہمارے ساتھ چلنا''۔اس نے فوراً خود ہی نئی اُمید ڈھونڈ نکالی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔''ناشتہ ضرور کرنا،مہمان بھوکا رہے تو میزبان کا دل بہت دکھتا ہے''۔شگفتگی سے کہتے ہوئے اس نے کرسی واپس رکھی اور باہر چلی گئی۔

حیا نے کمبل اُتارا اور اُٹھ کر پاؤں نیچے رکھے۔نرم گداز قالین میں پاؤں گویا دھنس سے گئے۔وہ اپنے پیروں پہ کھڑی ہوئی تو کمر میں درد کی لہر اُٹھی۔کرسی سمیت گرنے سے اس کے کندھوں،کمر اور گھٹنوں پہ بہت سی چوٹیں آئی تھیں۔

وہ قالین پہ ننگے پاؤں چلتی ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔اس کا عکس بہت تھکا تھکا،نقاہت زدہ سا لگ رہا تھا۔متورم آنکھوں تلے حلقے،ایک آنکھ کے نیچے گہرا جامنی سا نیل،پیشانی پہ چند خراشیں،ٹھوڑی پہ بڑی سی خراش،ہونٹ کا دایاں کنارہ سوجا ہوا اور.....اس نے اُنگلیاں اوپر سے نیچے اپنے بالوں پہ پھیریں۔

وہ ایسے ہی تھے،اتنے ہی لمبے اتنے ہی گھنے،مگر ان کی چمک کھو گئی تھی۔وہ ریشمی پن جو ہمیشہ ان میں چمکتا تھا،اب وہاں نہیں تھا۔

جانے کیسے عائشے نے وہ ویکس اُتاری اور اس دوران کتنے بال ٹوٹے وہ نہیں جانتی تھی۔ویکس دُھل گئی مگر جو تکلیف اس نے سہی تھی،وہ ایسے نہیں دُھل سکتی تھی۔

پولیس یا پاشا کے بندے،جو بھی اس وقت دروازہ توڑ کر اندر آئے تھے،انہوں نے اس کے فراک کے دامن کو آگ پکڑتے ہی بجھا دیا تھا مگر جتنا وہ پستہ قد روسی اسے جلا چکا تھا،حیا کو لگا وہ جلن ساری زندگی تکلیف دیتی رہے گی۔

وہ اس وقت ڈھیلے ڈھالے اسپتال کے گاؤن میں تھی۔اس نے دائیں آستین دوسرے ہاتھ سے اوپر کندھے تک اُٹھائی۔بازو کے اوپری حصے پہ اوپر سے نیچے سیاہ راکھ کی طرح کے لکھے تین حروف ویسے ہی تھے۔''WHO''۔باقی کے دو حروف RE چونکہ داغے ٹھیک سے نہیں گئے تھے اس لیے ان پہ چھالا سا بن گیا تھا۔چھالا ختم ہونے کے بعد ان کا نشان نہیں رہنا تھا۔جو رہ گیا تھا،وہ WHO تھا۔

''WHO!''اس نے زیرِ لب دہرایا۔وہ کون تھی؟ کیوں کسی دوسرے کے گھر یوں پڑی تھی،وہ بھی ایک ایسے شخص کے گھر جس کو وہ سخت ناپسند کرتی تھی۔اس کا گھر کال کرنے یا واپس سبانجی جانے کا دل کیوں نہیں چاہا تھا؟

شاید اس لیے کہ اس رات پھپھو اس کا انتظار کر رہی تھیں۔انہوں نے اس کے نہ آنے پہ ان دو دنوں میں ہر جگہ پتا کیا ہوگا اور اب تک پاکستان میں یہ بات پہنچ گئی ہوگی۔کیا اب وہ کبھی واپس جا سکے گی؟ عزت سے جی سکے گی؟ کسی کو منہ دکھا سکے گی؟ کیا ابا،تایا فرقان اور صائمہ تائی کا سامنا کر سکیں گے؟ یا اس نے اپنے ماں باپ کو سارے خاندان میں بے عزت کر دیا تھا؟ کون اس کی دہائی سنے گا کہ وہ بھاگی نہیں تھی،اغوا ہوئی تھی۔اس کے خاندان میں اور اس کے ملک میں اغوا ہونے والی لڑکی اور گھر سے بھاگنے والی لڑکی میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اسے لگا''شریفوں کا مجرا''بھرے بازار میں چلا دیا گیا تھا۔وہ واقعی بدنام ہو گئی تھی۔

وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اور جالی دار پردہ ہٹایا۔پھر کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔سمندر کی سرد برفیلی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی اور کھلے بال پیچھے کو اُڑانے لگی۔

وہ دوسری منزل کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔نیچے اسے باغیچہ نظر آ رہا تھا اور اس کے پار لکڑی کا گیٹ جسے ایک بیتی شام اس نے ہذیانی انداز میں بھاگتے ہوئے پار کیا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

باغیچے میں ایک خوب صورت، شاہانہ سی بگھی کھڑی تھی۔ اس میں ایک چکنا سفید گھوڑا جتا تھا۔ بگھی کے پیچھے ایک لکڑی کا صندوق نصب تھا جس کا ڈھکن کھولے کھڑی عائشے گھاس سے چیزیں اُٹھا کر اس میں رکھ رہی تھی۔ آرے، کلہاڑے، چاقو اور ایسے کئی اوزار۔ چھوٹی بچی بہارے سرخ چمکتے سیبوں سے بھری ٹوکری لیے بگھی میں اوپر چڑھ رہی تھی۔ اندر بیٹھ کر اس نے ٹوکری گود میں رکھ لی۔ وہ جس حصے میں بیٹھی تھی، وہ حیا کے سامنے تھا۔ عائشے، صندوق کا ڈھکن بند کر کے پیچھے سے گھوم کر دوسری طرف آ بیٹھی۔

دفعتاً بہارے کی نگاہ اوپر کھلی کھڑکی میں کھڑی حیا پہ پڑی۔

''حیا!'' اس نے جلدی سے ہاتھ ہلایا۔ اس کے پکارنے پہ اس کے بائیں جانب بیٹھی عائشے نے آگے ہو کر چہرہ بہارے کے کندھے سے اس طرف نکال کر حیا کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

وہ مسکرا نہیں سکی، بس تھوڑا سا ہاتھ اُٹھا کر واپس گرا دیا۔

دفعتاً عائشے نے جھک کر بہارے کے کان میں کچھ کہا تو بچی نے ''اوہ'' کہہ کر جلدی سے ٹوکری سے ایک سرخ سیب نکالا اسے اپنے فراک سے رگڑا اور ''کیچ'' کہتے ہوئے اوپر کی سمت اُچھالا۔ لاشعوری طور پہ اس نے ہاتھ بڑھائے مگر اُڑ کر آتا سیب اوپر بالکونی کی ریلنگ میں اٹک گیا۔

''اوہ نو!'' بہارے نے مایوسی سے گردن پیچھے کو پھینکی۔ اسی اثنا میں بگھی بان گھوڑے کو چابک مار چکا تھا۔ بگھی گھوڑے کے پیچھے کھنچتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ بہارے کا سیب وہیں ریلنگ گرل کے ڈیزائن میں پھنسا رہ گیا۔

وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ لکڑی کے فرش کی چمکتی راہ داری سنسان پڑی تھی۔ وہ ننگے پاؤں چلتی آگے آئی۔ راہ داری کے سرے پہ ایک کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ اس کے آگے جہاں راہداری ختم ہوتی تھی وہاں ایک گول چکر کھاتا لکڑی کا زینہ تھا جو نیچے لونگ روم سے شروع ہو کر بالائی منزل کی راہداری، جہاں وہ کھڑی تھی، سے ہوتا ہوا اوپر تیسری منزل تک جاتا تھا۔ اس نے گردن اُٹھا کر اس بلند و بالا سفید محل کو دیکھا۔ اگر کبھی اسے اس محل سے بھاگنا ہو تو سارے چور راستے اسے معلوم ہوں۔ اسے اب کسی پہ بھی اعتبار نہیں رہا تھا۔

حیا نے کمرے کا نیم وا دروازہ پورا کھول دیا۔ وہ ایک چھوٹا اسٹڈی روم تھا جس میں آبنوسی اور صنوبر کی لکڑی کے بُک شیلف بنے تھے، وہاں بہت سی بیش قیمت کتب سجی تھیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی اندر آئی۔

اسٹڈی کی دیواروں پہ جا بجا بڑے بڑے فوٹو فریم نصب تھے۔ وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں انہیں دیکھے گئی۔ وہ سب اس کی تصاویر تھیں۔ کب لی گئیں، کیسے لی گئیں، وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ تو بس مبہوت سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

وہ داور بھائی کی مہندی والے روز اپنے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے لہنگا ذرا سا اُٹھائے، دوسرے سے آنکھ کا کنارہ صاف کرتی ہوئی۔

وہ کار کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی تھی۔ ریڈ فراک میں ملبوس، بال کانوں کے پیچھے اڑستی، مضطرب سی کچھ کہتی ہوئی۔ داور بھائی کی شادی کی شام البتہ ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا ولید تصویر میں نہیں تھا۔

اور یہ تصویر جناح سپر کی تھی۔ وہ سر جھکائے، جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس نیم تاریک چبوترے کے سامنے چل رہی تھی۔ سڑک پہ دُکانوں کی زرد روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا اور بھی بہت سی تصویریں..... بہت سے واقعات.....

وہ ایک دم پلٹی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

ہر سُو آگ پھیلی تھی۔ زرد، سرخ لپٹیں کسی اژدہے کی زبان کی مانند لپک لپک کر اس کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ وہ وسط میں کھڑی تھی اور اطراف میں دائرے کی صورت میں الاؤ بھڑک رہا تھا۔ شعلے ہر گزرتے پل بڑھتے جا رہے تھے، ہر سُو دھواں تھا۔ اس کے سیاہ فراک کا دامن جل رہا تھا۔ دھواں، سرخ شعلے..... ہرا قلیطس کی دائمی آگ.....

Downloaded From http://paksociety.com

گرمی کی حدت نا قابلِ برداشت ہوگئی تھی۔ وہ بری طرح سے جل رہی تھی۔

''پانی..... پانی ڈالو میرے اوپر.....'' وہ تکیے پہ بند آنکھوں سے گردن اِدھر اُدھر مارتی، ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگا تھا۔ تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔ گرمی..... اسے گرمی لگ رہی تھی۔

وہ لحاف پھینک کر تیزی سے باہر بھاگی۔ لکڑی کا گول چکر کھاتا زینہ اس نے دوڑتے قدموں سے عبور کیا اور بنا کسی طرف دیکھے، باہر کا دروازہ پار کر گئی۔ باغیچے میں اُتر کر وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔

رات ہر سُو پھیلی تھی۔ بارش تڑاتڑ برس رہی تھی۔ سیاہ آسمان پہ کبھی کبھی چمکیلی بجلی نمودار ہوتی تو پل بھر کو سڑک اور سارے بنگلے روشن ہو جاتے، پھر اندھیرا چھا جاتا۔ وہ دونوں بازو سینے پہ لپیٹے اس برستی بارش میں سڑک پہ چلتی جا رہی تھی۔ آسمان کے تھال گویا اُلٹ گئے تھے، بارش تڑاتڑ گرتی اس کو بھگو رہی تھی۔

اس کا پاؤں کسی پتھر سے ٹکرایا تو اسے ٹھوکر لگی۔ وہ گھٹنوں کے بل پتھریلی زمین پہ گر گئی۔ ہتھیلیاں چھل گئیں، گھٹنوں پہ بھی خراشیں آئیں۔ اس نے ہتھیلیاں جھاڑتے ہوئے اُٹھنا چاہا، کمر میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ وہ واپس بیٹھ گئی، گھٹنوں کے بل، سڑک کے وسط میں۔

پانی سے اس کا لباس بھیگ چکا تھا۔ بال موٹی لٹوں کی صورت چہرے کے اطراف سے چپک گئے تھے، اس کے اندر کی آگ سرد پڑنے لگی تھی۔ جامنی پڑتے لب کپکپانے لگے تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی وہ واپس اس سفید محل تک آئی تھی۔

لونگ روم کی انگیٹھی میں دو لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اندھیرے کمرے میں آگ اور اوپر لگے مدھم سے زرد بلب کی روشنی نے عجب فسوں طاری کر رکھا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے یہ سب نہیں دیکھا تھا مگر اب چوکھٹ پہ کھڑی وہ دیکھ رہی تھی۔ عائشے بڑے صوفے پہ سر جھکائے بیٹھی، سامنے میز پہ رکھے کاغذ پہ پیمانے سے لکیر کھینچ رہی تھی۔ آہٹ پہ اس نے گردن موڑی۔

''آؤ، بیٹھو''۔ وہ نرمی سے کہتی صوفے کے ایک طرف ہوگئی اور دونوں ہاتھوں سے وہ لمبا سا کاغذ رول کرنے لگی۔

''یہ آگ بجھا دو!'' وہ آتش دان میں بھڑکتے شعلوں کو دیکھتے ہوئے بولی تو اس کی آواز بیوک ادا کی بارش کی طرح گیلی تھی۔

عائشے بنا تردد کے اُٹھی اور آتش دان کے ساتھ لگا سوئچ گھمایا۔ آگ بجھ گئی۔ مصنوعی انگارے سرخ رہ گئے جو دراصل ہیٹر کے راڈ تھے جس سے بھڑکنے والی آگ اس مصنوعی لکڑیوں کے اوپر یوں اُبھرتی گویا اصلی لکڑیاں جل رہی ہوں۔

''اب آؤ''۔ اپنی بات دُہرا کر عائشے رول کر کے لپیٹے کاغذ پہ ربڑ بینڈ چڑھانے لگی۔

وہ میکانکی انداز میں چلتی آگے آئی اور صوفے کے دوسرے کنارے پہ ٹک گئی۔ اس کی نگاہیں بجھتے انگاروں پہ تھیں جو اپنا سرخ رنگ کھو رہے تھے۔

''اپنے گھر فون کر لو، وہ لوگ پریشان ہوں گے''۔

''مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں سب کو کیسے فیس کروں گی؟'' آتش دان پہ جمی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سراسیمگی تیر رہی تھی۔

''جس اللہ نے تمہاری پہلے مدد کی ہے، وہ اب بھی کرے گا''۔

''تین دن ہو گئے ہیں، اب تک سب کو پتا چل گیا ہوگا''۔

''جب تمہارا قصور نہیں ہے تو ڈرو بھی مت''۔ عائشے نے کارڈلیس اس کی طرف بڑھایا۔ ''اگر انہوں نے کوئی غلط بات کی تو میں دوبارہ نہیں کہوں گی مگر ایک دفعہ کوشش کر لو''۔

اس نے کارڈلیس پکڑتے ہوئے عائشے کو دیکھا۔ سیاہ اسکارف میں لپٹا اس کا چہرہ مدھم روشنی میں بھی دمک رہا تھا۔ اب اس کی آنکھیں گہری لگ رہی تھیں۔ سیاہی مائل گہری۔

اس نے وال کلاک کو دیکھا۔ یہاں آدھی رات تھی تو وہاں نو، دس بجے ہوں گے۔ گھر کا نمبر اسے زبانی یاد تھا، وہ بھیگی اُنگلیوں سے بٹن پش کرنے لگی، پھر فون کان سے لگایا۔

عائشے اپنے پیمانے، پرکار اور پنسل سمیٹ کر چھوٹی تھیلی میں ڈالنے لگی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ہیلو''۔وہ فاطمہ کی آواز تھی۔

''ہیلو اماں؟ میں حیا.....''اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔''کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں، سوری بیٹا! میں تمہیں اتنے دن فون ہی نہیں کر سکی۔اصل میں مہوش کی دعوتیں ہو رہی ہیں، آج کل پوری فیملی میں، کبھی کدھر تو کبھی کدھر۔اتنی مصروف رہی کہ روز فون کرنا ہی رہ جاتا تھا''۔

''ابا.....ابا کدھر.....؟''اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''وہ یہ سامنے ہی بیٹھے ہیں، کراچی گئے تھے، آج ہی واپسی ہوئی ہے.....''اماں اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔اس کے سینے میں اٹکی سانسیں بالآخر بحال ہوئیں۔دکھتے سر میں درد ذرا کم ہوا۔

کسی کو پتا نہیں چلا تھا۔

اماں سے پھپھو کا نمبر لے کر اس نے انہیں کال کی۔

''اچھی بھتیجی ہو تم بھی۔کھانے کا کہہ کر غائب ہی ہو گئیں۔میں پہلے تو اتنی پریشان رہی، سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔جہان کو پوری رات سخت بخار رہا، اس کو بھی نہیں اُٹھا سکتی تھی۔تمہارے دونوں نمبرز بھی بند تھے۔صبح ہوتے ہی تمہارے ہاسٹل گئی تو وہ جو فلسطینی لڑکا ہے نا.....''

''معتصم المرتضیٰ؟''

''ہاں وہی، اس نے بتایا کہ تم نے اپنی ہوسٹ آنٹی کے گھر رُکنا تھا، مجھے بتا تو دیا ہوتا حیا.....''پھپھو فکر مند سی تھیں۔اوہ! معتصم.....وہ اس پزل میں اتنا اُلجھا ہوا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ حیا نے پھپھو کے گھر رُکنا ہے یا ہوسٹ آنٹی کی طرف۔ان کی تسلی تشفی کروا کر، پرس میں پانی جانے سے دونوں فونز خراب ہونے کی یقین دہانی کروا کر جب اس نے فون بند کیا تو عائشے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔اب تم آرام سے ڈھیر سارے دن ہمارے ساتھ رہو۔کل ہم تمہیں اپنے ساتھ جنگل لے جائیں گے، چلو گی نا''۔

''ہاں.....چلوں گی''۔وہ ذرا سا مسکرائی۔اس کے بالوں کے سروں سے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔

''آگ سے مت ڈرا کرو۔آگ سے اسے ڈرنا چاہیے جس کے پاس اللہ کو دکھانے کے لیے کوئی اچھا عمل نہ ہو۔تم تو اتنی اچھی لڑکی ہو، تم کیوں ڈرتی ہو؟''

اس نے ویران نگاہوں سے عائشے کا چہرہ دیکھا۔ذہن کے پردے پہ ایک ویڈیو لہرائی تھی اور اس کے نیچے لکھے کمنٹس۔

''میں اچھی لڑکی نہیں ہوں''۔

''کوئی لڑکی بری نہیں ہوتی، بس اس سے کبھی کبھی کچھ برا ہو جاتا ہے اور تم سے بہت کچھ اچھا بھی تو ہوا ہے نا۔تم نے ایک امیر اور طاقت ور شخص کے لیے اپنے شوہر کو نہیں چھوڑا، تم نے وفا نبھائی۔اس سے بڑی اچھائی کیا ہو گی؟''

''میری دُنیا تمہاری دنیا سے مختلف ہے عائشے! ہم میں بہت فرق ہے''۔

''چلو پھر تم ڈھیر سارے دن میری دُنیا میں رہو اور پھر تم مجھے بتانا کہ اُمید اور انجام کے اعتبار سے کس کی دُنیا زیادہ اچھی ہے؟''ساتھ ہی اس نے مسکرا کر نرمی سے حیا کا ہاتھ دبایا۔

''تم کون ہو عائشے؟ میرا مطلب ہے تمہارا.....؟''اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

'میں اس گھر کی مالکن ہوں۔بہارے میری بہن ہے اور آنے میری دادی کی سگی بہن ہے۔آنے ترک ہے، مگر اس کا شوہر انڈین تھا''۔

''آنے، عبدالرحمٰن پاشا کی ماں؟''

''ہاں وہی، مگر ہم آنے کو آنے کہتے ہیں، دادی وغیرہ نہیں''۔

''تو عبدالرحمٰن تمہارا چچا لگا؟''وہ سوچ سوچ کر کہہ رہی تھی۔جواباً وہ سادگی سے مسکرائی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''چچا، باپ کا سگا بھائی ہوتا ہے، اس لحاظ سے وہ میرا اور بہارے کا چچا ہے، نہ ہی محرم۔ خیر اب تم سو جاؤ، صبح ملتے ہیں''۔
وہ سر ہلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے واقعی نیند کی ضرورت تھی۔

☆ ☆ ☆

عائشے گل نے کہا تھا کہ اس سفید محل کی مالکن وہ ہے، اس لیے وہ ادھر رک گئی تھی۔ ذہنی اور جسمانی طور پہ وہ قطعاً اتنی صحت یاب نہیں تھی کہ وہ واپس جاتی، ابھی وہ اکیلی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اسے کوئی سہارا چاہیے تھا اور اس نے ان تین عورتوں کو اپنا سہارا بنا لیا۔ آنے آج کل استنبول گئی ہوئی تھیں اور پیچھے گھر میں صرف وہ دونوں بہنیں اس کے ساتھ تھیں۔

صبح اس نے عائشے کا لایا ہوا لباس زیب تن کیا۔ پوری آستینوں والی پاؤں کو چھوتی آف وائٹ میکسی جس کا گلا گردن تک بند تھا اور جگہ جگہ سفید ننھے ننھے موتی لگے تھے۔ بال چہرے کے ایک طرف ڈالے وہ دونوں پہلوؤں سے میکسی ذرا سی اُٹھائے لکڑی کے زینے اُتر رہی تھی جب اس نے عائشے کی آواز سنی۔ وہ نیچے اپنے بیڈروم کے ادھ کھلے دروازے سے کمبل تہہ کرتے ہوئے بہارے کو آوازیں دیتی نظر آ رہی تھی۔

''بہارے گل، اُٹھ جاؤ۔ اور کتنا سوؤ گی؟'' فیروزی اسکارف اور اسکرٹ بلاؤز پہ لمبا سوئیٹر پہنے، وہ باہر جانے کے لیے تیار تھی۔

''بس پانچ منٹ اور، عائشے گل!'' کمبل سے بہارے کی آواز آئی۔

''ہماری اُمت کے صبح کے کاموں میں برکت ہوتی ہے بہارے! جو علی الصبح روزی کی تلاش میں نکلتے ہیں، ان کا رزق بڑھتا ہے۔ جو پڑھتے ہیں، ان کا علم بڑھتا ہے اور جو سوتے رہتے ہیں، ان کی نیند بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ سارا دن سوتے ہی رہتے ہیں''۔

بہارے منہ بسورتی کمبل پھینک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عائشے اس کا کمبل بھی تہہ کرنے لگی۔

''تم ہمارے ساتھ چلو گی حیا؟'' بہارے نے مندی مندی آنکھوں سے اسے چوکھٹ میں کھڑے دیکھا تو پوچھ اُٹھی۔

''ہاں، ابھی تم جنگل جاؤ گی؟''

''نہیں، پہلے ہم سفیر کی ممی کی طرف جائیں گے، مجھے ذرا کام تھا ان سے۔ ٹھیک ہے نا؟'' عائشے نے تائید چاہی۔

''شیور!'' اس نے شانے اُچکا دیے۔ وہ خود کو ان دو بہنوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ چکی تھی۔

''یہ سب کس لیے؟'' عائشے بگھی کے صندوق میں چمکتے ہوئے اوزار رکھ رہی تھی تو حیا پوچھ اُٹھی۔

''ہم جنگل لکڑیاں کاٹنے جاتے ہیں۔ یہاں لکڑیاں کاٹنے کی اجازت ہے تو نہیں مگر ہمارے پاس خصوصی پرمٹ ہے۔ ہم لکڑی کی چیزیں بنا کر بازار بیچتے ہیں''۔

''اتنے بڑے گھر کی مالکن کو بڑھئی بننے کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ بگھی میں چڑھتے ہوئے مسکرا کر بولی تھی۔

''حیا سلیمان، ہمیں انڈر اسٹیمیٹ مت کرو۔ ہم بہت مہنگی چیزیں بناتے ہیں''۔ وہ ہنس کر کہتے ہوئے اندر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں اطراف میں تھیں اور بہارے ان کے درمیان۔

بگھی اب بنگلوں سے گھری سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سارے ماحول میں گونج رہی تھی۔

''عثمان انکل کا گھر کہاں ہے؟''

''وہیں مسجد کے پاس۔ تم نے ہماری مسجد دیکھی ہے نا، وہاں تم ایک دفعہ آئی تھیں''۔

''ہاں مجھے یاد ہے۔ میں نے تب تم دونوں کو دیکھا تھا''۔ وہ ہوا سے اُڑتے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی تھی۔ بہارے کے چہرے پہ بار بار اس کے بال اُڑ کر آ رہے تھے، مگر بہارے برا مانے بغیر اپنے گلابی بڑے سے پرس کو سینے سے لگائے خاموش سی بیٹھی تھی، اس کے گھنگھریالے، بھورے بال پونی میں بندھے تھے۔

''تمہارے ساتھ اس دن کوئی تھا؟'' عائشے نے آنکھیں بند کر کے لمحے بھر کو جیسے یاد کیا۔ فیروزی اسکارف میں اس کی بھوری، سبز آنکھیں اب نیلی سبز لگ رہی تھیں۔

''ہاں، وہ میرا کزن ہے اور..... شوہر بھی''۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اچھا تھا!'' عائشے مسکرادی۔

وہ بھی جواباً ذرا سا مسکرائی۔ اس پل اسے وہ اچھا شخص بہت یاد آیا تھا۔

شیخ عثمان شبیر کا بنگلہ بیوک ادا کے دوسرے بنگلوں کی نسبت ذرا سادہ تھا۔ ایک بڑے کمرے میں جہاں فرشی نشست تھی، حلیمہ آنٹی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بہت ملن سار، بہت خوب صورت خاتون تھیں۔ شلوار قمیص پہ بڑا سا دوپٹہ چہرے کے گرد لپیٹے، وہ پہلی ہی نظر میں اسے بہت اچھی لگی تھیں۔

''یہ حیا ہے، میں نے بتایا تھا نا؟'' عائشے قالین پہ ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی، دونوں کے درمیان ایک چھوٹی میز تھی جس پہ عائشے نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

حیا اور بہارے ایک طرف بیٹھ گئیں۔

''میں جانتی ہوں۔ مجھے اچھا لگا کہ تم حیا کو ساتھ لائی ہو''۔ وہ مسکرا کر عائشے کے ہاتھ کی پشت پہ اسپرے کر رہی تھیں۔ حیا جواباً مسکرائی، پھر بہارے کے قریب بہت دھیمی سی سرگوشی کی۔

''یہ کیا کر رہی ہیں؟''

''آج چاند کی 21 ویں تاریخ ہے نا، آج عائشے اپنا خون نکلوائے گی۔ ابھی دیکھنا، آنٹی اس کے ہاتھ میں بلیڈ سے کٹ لگائیں گی''۔

اس نے بے یقینی سے بہارے کو دیکھا اور پھر قدرے فاصلے پر بیٹھی عائشے اور حلیمہ آنٹی کو۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پہ کچھ لگا رہی تھیں۔ عائشے کی اس کی جانب کمر تھی، سو وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔

قریباً دس منٹ بعد عائشے اُٹھی تو اس کے ہاتھ کی پشت پہ ایک گول، سرخ نشان سا بنا تھا۔ وہ یک ٹک اس کے ہاتھ کو دیکھے گئی۔

''یہ کیا.....؟'' اس نے ناسمجھی سے عائشے کو دیکھا۔

''بہت عرصہ ہو گیا میں نے Cupping (سینگی لگوانا) نہیں کروائی تھی، سوچا آج کروالوں۔ تم نے کبھی کروائی ہے یہ تھراپی؟''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے لاشعوری طور پہ اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''تم.....کیوں کرواتی ہو یہ؟'' وہ ابھی تک ورطۂ حیرت سے عائشے کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔

''میں یہ اس لیے کرواتی ہوں کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ معراج پر گئے تھے تو ادھر فرشتوں نے انہیں ہماری اُمت کے لیے جو بہت پُرزور تاکید کی تھی، وہ کپنگ کروانے کی تھی۔ اللہ نے اس میں بڑا سکون رکھا ہے۔ تم آنٹی سے باتیں کرو، تب تک میں اور بہارے گل بہار باغ سے پھول توڑ لیں''۔

وہ دونوں باہر چلی گئیں۔ تو وہ قدرے ہچکچاتے ہوئے اُٹھ کر ان کے سامنے آ بیٹھی۔ انہوں نے نرمی سے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھایا تو بلا ارادہ حیا نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ انہوں نے شفاف پتلا دستانہ پہن رکھا تھا۔

''تم اچھا محسوس کرو گی۔ یہ تمہاری اُداسی لے جائے گا''۔

''مجھے نہیں لگتا کہ میری اُداسی ان چیزوں سے دور ہو سکتی ہے''۔ وہ ان کے ہاتھ میں دیے اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی جس کی پشت پہ وہ کوئی اسپرے کر رہی تھیں۔

''وہ کیوں؟''

''میری زندگی بہت پیچیدہ اور مسئلوں سے بھری ہے''۔ اس نے اُداسی سے کہتے ہوئے نفی میں سر جھٹکا۔ کھڑکی سے چھن کر آتی صبح کی روشنی اس کے چہرے پر پڑے نیلوں کو واضح کر رہی تھی۔ ''میری بیسٹ فرینڈ میرے سامنے دم توڑ گئی اور میں کچھ نہیں کر سکی۔ میں نے بہت دُعا کی تھی حلیمہ آنٹی! مگر وہ پھر بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی''۔

''وہ نہ مرتی تو کل کو تم خود ہی اسے چھوڑ جاتیں۔ بعض چیزیں ہمیں ناگوار لگتی ہیں مگر وہ ہمارے لیے اچھی ہوتی ہیں۔ اگر وہ اس بیماری سے بچ جاتی مگر معذور ہو جاتی اور کسی بھی وجہ سے اس کا گھر چھوٹ جاتا، وہ تمہارے آسرے پر آ پڑتی اور تمہیں ساری زندگی اس کی

Downloaded From http://paksociety.com

خدمت کرنی پڑتی تو تم چند ماہ یہ کر پاتیں، پھر تنگ آ کر خود ہی اس کو چھوڑ دیتیں۔ بعض دفعہ موت میں بھی ایک ریلیف ہوتا ہے''۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پہ زیتون کا تیل ملتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''مگر میں نے اسے اللہ سے ویسا ہی مانگا تھا جیسی وہ تھی!''

''وہ تمہیں اگلے جہاں میں اسے ویسا ہی واپس کر دے گا اور وہی تم دونوں کے لیے بہتر ہوگا''۔ وہ رسان سے کہتے ہوئے اب ایک شیشے کا کپ جس کے پیندے پہ کوئی آلہ لگا تھا، اُلٹا کر کے اس کی ہتھیلی کی پشت پہ رکھ رہی تھیں۔

''مگر میں اس غم کا کیا کروں جو میرے اندر سلگ رہا ہے؟''

''غم؟'' سر جھکائے، اُلٹے رکھے کپ کو دباتے ہوئے انہوں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ہم مرنے والے کے لیے تھوڑی روتے ہیں، بچے! مرنے والے کے لیے کوئی بھی نہیں روتا۔ ہم سب تو اپنے نقصان پہ روتے ہیں، ہمارا غم تو بس یہی ہوتا ہے کہ وہ ''ہمیں'' اکیلا چھوڑ کر چلا گیا''۔

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی۔ اسے اپنے ہاتھ پہ کپ کا دباؤ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحے کے لیے ہر شے سے دور چلی گئی تھی۔

''میری زندگی میں اتنے مسئلے کیوں ہیں حلیمہ آنٹی؟''

''تمہیں لگتا ہے حیا! کہ صرف تمہاری زندگی میں مسئلے ہیں؟ باقی سب خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں؟ نہیں بچے! یہاں تو ہر شخص دُکھی ہے۔ ہر ایک کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ سب کو کسی ''ایک'' چیز کی طلب ہے۔ کسی کو مال چاہیے، کسی کو اولاد، کسی کو صحت تو کسی کو رُتبہ۔ کوئی ایک محبوب شخص یا کوئی ایک محبوب چیز، بس یہی ایک مسئلہ ہے ہماری زندگی میں، ہم سب کو ایک شے کی تمنا ہے۔ وہی ہماری دُعاؤں کا موضوع ہوتی ہے اور وہ ہمیں نہیں مل رہی ہوتی۔ وہی چیز ہمارے آس پاس کے لوگوں کو بے حد آسانی سے مل جاتی ہے اور ہم ان پہ رشک کرتے رہ جاتے ہیں، یہ جانے بغیر کہ ان لوگوں کی خاص تمنا وہ چیز ہے ہی نہیں۔ وہ تو کسی اور چیز کے لیے دُعائیں کرتے رہتے ہیں۔ یوں ہم اس ایک شے کے لیے اتنا روتے ہیں کہ وہ ہماری زندگی پہ حاوی ہو جاتی ہے اور یہ شے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ تم مجھے ایک بات بتاؤ، تمہاری زندگی میں بہت سے مسئلے آئے ہوں گے۔ لمحے بھر کو اپنے سارے مسئلے یاد کرو''۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اب کپ ہٹا کر اس گول نشان کے اندر موجود جلد میں نشتر کی سوئی سے کٹ لگا رہی تھیں۔ اسے تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ کچھ اور یاد کر رہی تھی۔

''سفید پھول..... شریفوں کا مجرا کی ویڈیو..... ارم کے رشتے کے لیے آئے لڑکے کا انہیں پہچان جانا..... ولید کی بدتمیزی..... ترکی کا ویزا نہ ملنا..... پھر یہاں آ کر پھولوں کا سلسلہ..... اس کا بیوک ادا میں قید ہو جانا..... پھر اس کا اغوا..... اور آگ کا وہ بھڑکتا الاؤ.....''

اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کی ہتھیلی کی پشت پہ خون کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ حلیمہ آنٹی نے کپ واپس ہتھیلی پہ رکھ کر دباتے ہوئے اس کو دیکھا۔

''اب بتاؤ، ان مسئلوں کا کیا بنا؟''

''کیا بنا؟'' وہ غائب دماغی سے کپ کو دیکھ رہی تھی۔ اوپر لگا Sucker اندر سے خون کھینچ رہا تھا۔ شیشے کا کپ سرخ ہونے لگا تھا۔

''میں تمہیں بتاؤں ان مسئلوں کا کیا بنا؟ وہ مسئلے حل ہو گئے۔ سارے مسئلے ایک ایک کر کے حل ہوتے گئے مگر نئے مسئلوں نے تمہیں اتنا اُلجھا دیا کہ تمہارے پاس ان بھولے بسرے مسئلوں سے نکلنے پہ اللہ کا شکر ادا کرنے کا وقت ہی نہیں رہا''۔

وہ بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ واقعی، اس کے وہ سارے مسئلے تو حل ہو گئے تھے..... اس نے کبھی سوچا ہی نہیں.....

''ہر شخص کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب وہ تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے راز کھلنے والے ہوتے ہیں اور اس وقت جب وہ خوف کے کوہِ طور تلے کھڑا کپکپا رہا ہوتا ہے تو اللہ اسے بچا لیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اور اسے اپنا ایک ایک احسان

Downloaded From http://paksociety.com

یاد ہے، ہم بھول جاتے ہیں، وہ نہیں بھولتا۔ تم اپنے حل ہوئے مسئلوں کے لیے اس کا شکر ادا کیا کرو۔ جو ساری زندگی تمہارے مسئلے حل کرتا آیا ہے، وہ آگے بھی کردے گا، تم وہی کرو جو وہ کہتا ہے، پھر وہ وہی کرے گا جو تم کہتی ہو۔ پھر جن کے لیے تم روتی ہو، وہ تمہارے لیے روئیں گے، مگر تب تمہیں فرق نہیں پڑے گا''۔

کپ کا شیشہ سرخ ہو چکا تھا۔ اس میں اوپر تک خون بھرتا جا رہا تھا۔

''میں..... میرا لائف اسٹائل بہت مختلف ہے، میں ان چیزوں سے خود کو ریلیٹ نہیں کر پاتی۔ لمبی لمبی نمازیں، تسبیحات، یہ سب نہیں ہوتا مجھ سے۔ میں زبان پہ آئے طنز کو نہیں روک سکتی، میں عائشے گل کی طرح کبھی نہیں بن سکتی۔ میں ان چیزوں سے بہت دور آ گئی ہوں''۔

''دور ہمیشہ ہم آتے ہیں۔ اللہ وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ فاصلہ ہم پیدا کرتے ہیں اور اس کو مٹانا بھی ہمیں ہوتا ہے''۔ انہوں نے خون سے بھرا کپ سیدھا کر کے ایک طرف رکھا اور ٹشو سے اس کا ہاتھ صاف کیا۔ ہاتھ کی پشت پہ گول دائرے میں جگہ خاصی اونچی اُبھر گئی تھی، کسی بیک شدہ کیک کی طرح جس کا درمیان کناروں سے زیادہ اونچا اُبھر جاتا ہے۔

''حلیمہ آنٹی! کیا میرے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے؟''

''پہلے جس نے حل کیے تھے، وہ اب بھی حل کر دے گا۔ حیا! لوگ کہتے ہیں کہ زندگی میں یہ ضروری ہے اور وہ ضروری ہے۔ میں تمہیں بتاؤں، زندگی میں کچھ بھی ضروری نہیں ہوتا، نہ مال، نہ اولاد، نہ رُتبہ، نہ لوگوں کی محبت۔ بس آپ ہونے چاہئیں اور آپ کا اللہ تعالیٰ سے ایک ہر پل بڑھتا تعلق ہونا چاہیے۔ باقی یہ مسئلے تو بادل کی طرح ہوتے ہیں۔ جہاز کی کھڑکی سے کبھی نیچے تیرتا کوئی بادل دیکھا ہے؟ اوپر سے دیکھو تو وہ کتنا بے ضرر لگتا ہے مگر جو اس بادل تلے کھڑا ہوتا ہے نا، اس کا پورا آسمان بادل ڈھانپ لیتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ روشنی ختم ہو گئی اور دنیا تاریک ہو گئی ہے۔ غم بھی ایسے ہوتے ہیں۔ جب زندگی پہ چھاتے ہیں تو سب تاریک لگتا ہے لیکن اگر تم اس زمین سے اوپر اُٹھ کر آسمانوں سے پورا منظر دیکھو تو تم جانو گی کہ یہ تو ایک ننھا سا ٹکڑا ہے جو ابھی ہٹ جائے گا۔ اگر یہ سیاہ بادل زندگی پہ نہ چھائیں ناں حیا! تو ہماری زندگی میں رحمت کی کوئی بارش نہ ہو''۔

انہوں نے تیل لگا کر اس کا ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھ چہرے کے قریب لے جا کر دیکھا۔

''میں اتنا جلی ہوں آنٹی! کہ مجھے لگتا ہے میرا دل ہی مر گیا ہے''۔

''جلنا تو پڑتا ہے بچے۔ جلے بغیر کبھی سونا کندن نہیں بنتا''۔ ان کی بات پہ وہ آزردگی سے مسکرائی۔

''یہ ابھی ٹھیک ہو جائے گا اور تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گی''۔

''تھینک یو آنٹی! مجھے آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ ایک آخری بات، کیا یہ اتفاق تھا کہ عثمان انکل اور ہم ایک ہی فلائٹ میں آئے تھے؟''

''اس دنیا میں اتفاق کم ہی ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے عثمان کو عبدالرحمٰن نے ایسا کہا تھا''۔

وہ سمجھ کر سر ہلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کبھی اسے لگتا، اسے زندگی میں سب سے زیادہ تکلیف پاشا نے دی ہے اور کبھی لگتا کہ اس کے احسان اس کی دی گئی اذیت سے زیادہ ہیں۔

بجھی سڑک پہ رواں دواں تھی۔ رات کی بارش اب سوکھ چکی تھی اور ہر جگہ نکھری نکھری، دُھلی دُھلائی لگ رہی تھی۔ سبزہ، ہوا، سرمئی سڑک، وہ چھوٹا سا جزیرہ جنت کا ٹکڑا لگتا تھا۔ وہ بجھی کی کھڑکی سے باہر دیکھتی ان باتوں کو سوچ رہی تھی، جو حلیمہ آنٹی نے اس سے کہی تھیں۔

''عائشے''۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے گردن ان دونوں کی طرف پھیری تو ایک دم ٹھہر گئی۔ درمیان میں بیٹھی بہارے اپنے گلابی پرس سے کچھ نکال رہی تھی۔ حیا بالکل ساکت، سانس روکے اسے دیکھے گئی۔

وہ حیا کا بھورے رنگ کا لکڑی کا پزل باکس تھا۔

''بہارے..... یہ تم نے کہاں سے لیا؟'' وہ بنا پلک جھپکے اس باکس کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ مجھے عبدالرحمٰن نے میری برتھ ڈے پہ گفٹ کیا تھا، اس میں میرا گفٹ ہے، مگر ابھی یہ مجھ سے کھلا نہیں ہے''۔ وہ مایوسی سے

Downloaded From http://paksociety.com

بتاتی اس کی سلائیڈ پہ اُنگلی پھیر رہی تھی جس میں پانچ حروف بنے تھے۔ باکس کے اوپر ڈھکن کی سطح پہ انگریزی میں ایک لمبی سی نظم کھدی تھی۔ یہ حیا کا باکس نہیں تھا مگر یہ بالکل اس جیسا تھا۔

''یہ..... یہ اس نے کہاں سے لیا؟''

''ہم سے ہی لیا تھا۔ عائشے نے بتایا نہیں، ہم جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر یہی پزل باکسز تو بناتے ہیں۔ بہت مہنگے بکتے ہیں یہ۔ ان میں فائیو لیئر کوڈ لگتا ہے، جس کے بغیر یہ نہیں کھلتے''۔

عائشے مسکراتی ہوئی بہارے کی بات سن رہی تھی۔

''سنو.....'' وہ بہت دیر بعد بولی۔ اس کی نگاہیں ابھی تک اس باکس پہ تھیں۔ ''تم نے کبھی کوئی ایسا باکس بنایا ہے جس میں چھ حروف کا کوڈ ہو؟''

وہ دونوں ایک دم چونکیں۔

''ہاں، میں نے بنایا تھا''۔

''کس کے لیے؟'' وہ چینی سے بولی۔

''عبدالرحمٰن کا کوئی ملازم تھا، اس نے چھ حرفی کوڈ بار کا آرڈر دیا تھا تو میں نے بنا دیا۔ مہینہ پہلے کی بات ہے''۔ وہ سوچ کر بتانے لگی۔

''تو اس کا کوڈ تم نے ہی رکھا ہوگا۔ تمہیں وہ یاد ہے؟''

''یاد؟'' عائشے ذرا جھینپ کر ہنسی۔ ''چھ حروف کا کوئی لفظ ذہن میں نہیں آ رہا تھا تو میں نے اس کا کوڈ Ayeshe رکھ دیا۔ عائشے میں چھ حروف ہوتے ہیں نا!''

''ترک چی میں عائشے کو بھی ایسے لکھتے ہیں کیا؟'' اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

''نہیں، نہیں، ترک چی میں Aysegul لکھتے ہیں مگر یہ باکس انگریزی حروفِ تہجی میں تھا، اس لیے انگریزی میں لکھا!''

''جو شخص یہ تم سے خریدنے آیا تھا، اس کو جانتی ہو تم؟'' چند لمحے کے توقف کے بعد وہ ذرا سوچ کر پوچھنے لگی۔

''میں اس کا نام تو نہیں جانتی مگر وہ اونچے قد کا حبشی تھا اور اس کے بال گھنگھریالے تھے''۔

''اچھا!'' حیا نے بہارے کو اس کا پزل باکس واپس کر دیا۔ اب وہ اپنے پزل باکس کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کے کمرے میں رکھا تھا۔ اگر وہ وہی باکس تھا جو عائشے نے بنایا تھا اور اسے عبدالرحمٰن کے ہی کسی آدمی نے عائشے سے خریدا تھا اور قوی امکان تھا کہ اس نے وہ ''ڈولی'' کے پاس بھجوا دیا تھا تو کیا عبدالرحمٰن اس بات سے واقف تھا؟ یا پھر عائشے سے خریدنے والا شخص ہی ڈولی تھا کیونکہ ڈولی بھی تو پاشا کا خاندانی ملازم تھا۔ کچھ ایسا ہی بتایا تھا اے آر پی کی ماں نے اسے۔

''سنو! کیا عبدالرحمٰن پاشا کو معلوم ہے کہ تم نے اس کے کسی ملازم کے لیے باکس بنایا ہے؟''

''حیا! مجھ سے بہت سے لوگ پزل باکسز خریدتے ہیں، میں ہر ایک کی خبر عبدالرحمٰن کو نہیں کرتی اور اس نے تو مجھے عبدالرحمٰن کو بتانے سے منع کیا تھا۔ تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کیونکہ اس نے صرف عبدالرحمٰن کو بتانے سے منع کیا تھا''۔ عائشے ذرا سا مسکرا کر بولی۔

حیا نے اثبات میں گردن ہلا دی اور باہر دیکھنے لگی۔ بگھی اس بل کھاتی سڑک پہ اوپر چڑھ رہی تھی۔ وہاں دونوں اطراف میں سرسبز اونچے درخت تھے۔ مری میں عموماً سڑک کے ایک جانب ایسے اونچے درخت ہوتے تھے اور دوسری جانب کھائی، مگر یہاں دونوں جانب ہی گھنا جنگل تھا۔

بالآخر ایک جگہ بگھی بان نے بگھی روک دی۔ عائشے نیچے اُتری اور بگھی کے پیچھے مرصع صندوق سے اوزاروں کا بھاری تھیلا نکالا۔ حیا اور بہارے بھی اس کے پیچھے اُتر آئیں۔ اب آگے انہوں نے پیدل چلنا تھا۔

''تم چل لو گی؟'' عائشے نے تھیلا اُٹھاتے ہوئے ذرا فکرمندی سے اسے دیکھا۔

''ہاں، میں بہتر محسوس کر رہی ہوں''۔ اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ عائشے کو تسلی دی۔

Downloaded From http://paksociety.com

بہارے سب سے آگے اُچھلتی، کودتی، ذرا لہک لہک کر کچھ گاتی چل رہی تھی۔

''کائنات وہ ہے جسے تو نے بنایا

اور سیدھا راستہ وہ ہے جسے تو نے دکھایا

پس تو قدموں کو پھیر دے

اپنی رضا کی طرف

اے بلندیوں کے رب!''

وہ ایک عربی گیت گنگناتی ادھر ادھر پودوں پہ ہاتھ مارتی چل رہی تھی۔ عائشے اس کے عقب میں تھی اور سب سے پیچھے حیا تھی جو اپنی سفید میکسی کو دونوں پہلوؤں سے اُٹھائے سہج سہج پتھروں پہ پاؤں رکھ رہی تھی۔

وہاں ہر سو سرخ صنوبر اور ببول کے درخت تھے۔ کچھ ایسے درخت بھی تھے جن کو وہ نہیں پہچانتی تھی۔ سرخ اور جامنی پھولوں کی جھاڑیاں بھی جا بجا تھیں۔

جنگل میں کافی آگے جا کر عائشے ایک جگہ رُکی۔ وہاں ایک درخت کا کٹا ہوا تنا پڑا تھا۔ اس نے تھیلا زمین پہ رکھا اور اندر سے کلہاڑے نکالنے لگی۔

ٹھنڈی ہوا صنوبر کے پتوں کو ہولے ہولے جھلا رہی تھی۔ حیا ایک بڑے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور عائشے کو کٹے ہوئے تنے پہ کلہاڑے سے ضربیں مارتے دیکھتی رہی۔ اس کی اتنے دنوں کی تھکن، نقاہت اور بیماری حلیمہ آنٹی کے شیشے کے پیالے میں رہ گئی تھی۔ وہ اب خود کو بہت ہلکا پھلکا اور تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ نیا چہرہ، نئی روح، نئی زندگی..... بہارے بھی اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ حیا کے بال ہوا سے اُڑ کر اس کے چہرے کو چھونے لگے۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے نرمی سے ان کو سمیٹا۔

''تمہارے بال کتنے خوب صورت ہیں حیا''۔

اس نے گردن ذرا سی موڑ کر مسکراتے ہوئے بہارے کو دیکھا۔ وہ بہت محویت سے اس کے بالوں پہ ہاتھ اوپر سے نیچے پھیرتے کہہ رہی تھی۔

''میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میرے بال اتنا ہی لمبے اور ملائم ہوں اور میں انہیں ایسے ہی کھولوں مگر.....'' جوش سے کہتے کہتے اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ ''مگر عائشے کہتی ہے، اچھی لڑکیاں بال کھول کر باہر نہیں نکلتیں''۔

بہارے کی بات پہ اس نے ایک نظر عائشے کو دیکھا، جو کوٹ کی آستینیں موڑے رکوع میں جھکی لکڑی پہ کلہاڑا مار رہی تھی۔ ہر ضرب کے بعد وہ سیدھی ہوتی، اور پیشانی پہ آیا پسینہ آستین سے پونچھ کر پھر سے جھک جاتی۔

''وہ تمہیں منع کرتی ہے؟''

''نہیں، وہ کہتی ہے، بہارے تمہاری مرضی، جب تم میں حیا نہ رہے تو جو جی چاہے کرو''۔ اس نے عائشے کے خفگی بھرے انداز کی نقل کر کے دکھائی۔

''تم ساری دُنیا میں سب سے زیادہ عائشے کی بات مانتی ہو؟''

''نہیں، پہلے عبدالرحمٰن کی، پھر عائشے کی!''

''تم عبدالرحمٰن کو بہت پسند کرتی ہو بہارے؟'' وہ اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے استفسار کرنے لگی۔ کیا یہ بہنیں عبدالرحمٰن کی شہرت نہیں جانتیں؟ یا یہ اسے لوگوں سے زیادہ جانتی ہے''۔

''بہت زیادہ۔ وہ ہے ہی اتنا اچھا''۔ وہ اس کے بالوں کو ہاتھ میں لیے بہت محبت سے کہہ رہی تھی۔ حیا نے اپنے کھلے بالوں کو دیکھا اور پھر بہارے کی نفاست سے بندھی گھونگھریالی پونی۔

''میں بال باندھ لوں بہارے؟ مجھے ہوا تنگ کر رہی ہے''۔ اس نے جیسے خود کو وضاحت دی کہ وہ عائشے کی اچھی لڑکیوں والی

Downloaded From http://paksociety.com

نشانیوں کا اثر نہیں لے رہی۔ ہوا کی وجہ سے بال باندھنا چاہ رہی ہے۔

''میں باندھ دوں۔ میرے پاس فالتو پونی ہے''۔

اس نے اپنے گلابی پرس میں ہاتھ ڈال کر جھٹ سے ایک سرخ رنگ کا بینڈ نکالا۔ حیا نے ذرا سا رُخ موڑ لیا۔ بہارے اس کی پشت پہ گھٹنوں کے بل اونچی ہو کر بیٹھ گئی اور اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے بال سمیٹنے لگی۔ حیا نے آنکھیں بند کر لیں۔

''عثمانی سلطنت کی شہزادیاں تمہاری طرح خوب صورت ہوتی ہوں گی حیا! ہے نا؟'' وہ نرمی سے اس کے بالوں میں اُنگلیاں چلاتی اس کی ایک ڈھیلی سی چوٹی بنا رہی تھی۔ بینڈ باندھ کر اس نے چوٹی حیا کے کندھے پہ آگے کو ڈال دی۔ حیا نے اپنی موٹی، سیاہ چوٹی پہ ہاتھ پھیرا اور گردن موڑ کر ممنونیت سے بہارے کو دیکھا۔

''میری اماں کہتی ہیں کہ میں اتنی خوب صورت نہ لگتی اگر میں اپنی گرومنگ پہ اتنی محنت نہ کرتی۔ تمہارا اور عائشے کا شکریہ، ورنہ میرے بال نہ بچ پاتے''۔

''دوست کس لیے ہوتے ہیں؟'' بہارے نے مسکرا کر شانے اُچکائے۔ اس نے اور عائشے نے کن جوکھوں سے اس کے بالوں سے ویکس اُتاری تھی۔ یہ روداد بہارے اسے سنا چکی تھی۔ ویکس بال ضائع تب کرتی اگر کھینچ کر اُتاری جاتی، جبکہ انہوں نے اسے پگھلا کر نرم کر کے اُتارا تھا۔

''اچھا اپنا پزل باکس دکھاؤ، میں اس کی پہیلی دیکھوں''۔ بہارے گل نے سر ہلا کر بیگ سے باکس نکال کر اسے تھمایا۔ اس کا گلابی بیگ ایک زنبیل تھی جس میں ہر شے موجود ہوتی تھی۔

''بہارے! تم نے حیا کا گفٹ نہیں بنایا؟'' عائشے نے ہاتھ روک کر رکوع میں جھکے جھکے سر اُٹھا کر خفگی سے اپنی بہن کو دیکھا۔

''اوہ ہاں۔ میں ابھی آئی''۔ بہارے ماتھے پہ ہاتھ مارتی اُٹھی، بڑے تھیلے میں سے ایک خالی ٹوکری نکالی اور درختوں کے درمیان اُچھلتی، پھدکتی آگے بھاگ گئی۔

عائشے واپس کام میں مصروف ہو گئی۔

حیا سر تنے سے ٹکائے باکس کو چہرے کے سامنے لا کر دیکھنے لگی۔ اس کے ڈھکن پہ انگریزی میں چند فقرے کھدے تھے جو شاید ایک نظم تھی۔

A creamy eye in silver chest
Sleeps in a salty depth
Rises from a prison grain
Shines as its veil is slain

پزل باکس کے کوڈ بار میں پانچ چوکھٹے بنے تھے۔ حیا نے تین چار دفعہ اس نظم کو پڑھا تو اسے وہ پانچ حرفی لفظ سمجھ میں آ گیا۔ جو اس باکس کی کنجی تھا۔ پہیلی آسان تھی مگر ظاہر ہے، وہ بہارے کو جواب نہیں بتا سکتی تھی وہ بہارے کا تحفہ تھا اور وہ اسے خود ہی کھولنا تھا۔

مگر کون لکھتا تھا یہ نظمیں؟ یہ پہیلیاں؟

باکس گود میں رکھے، اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے جسم کا سارا درد دھیرے دھیرے غائب ہو رہا تھا۔ ہر سُو میٹھی نیند تھی، بہت دنوں بعد اس پہ سکون سا چھا رہا تھا۔ وہ حلیمہ آنٹی کی باتوں کو سوچتی، اپنے حل ہوئے مسئلوں کو یاد کرتی، کب سو گئی، اسے پتا نہیں چلا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ جنگل میں اکیلی تھی۔ عائشے اور بہارے وہاں نہیں تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی۔

''عائشے..... بہارے''۔ وہ متوحش انداز میں ان کو پکارتی درختوں کے درمیان آگے کو بھاگی۔

''حیا! ہم اِدھر ہیں''۔ عائشے نے کہیں قریب سے پکارا۔ وہ آواز کا تعاقب کرتی اس گھنے جھنڈ تک آئی تو دیکھا، عائشے ان درختوں کے پاس کلہاڑا پکڑے کھڑی تھی۔ ساتھ ہی بہارے زمین پہ بیٹھی تھی۔ کٹا تنا ساتھ ہی رکھا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''تم سو گئی تھیں تو مجھے لگا، ہماری آوازیں تمہیں ڈسٹرب نہیں کریں، سو ہم سب کچھ اِدھر لے آئے''۔

''خیر تھی عائشے''۔ اس نے خفت سے ان دونوں کو دیکھا۔ تنا، لکڑیاں، اوزار وہ ہر چیز بنا آواز پیدا کیے وہاں سے لے گئی تھیں، وہ بھی صرف اس کے خیال سے۔ اسے ان دو پریوں کی طرح معصوم لڑکیوں پہ بے حد پیار آیا۔

''تم بتاؤ، تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''بہت بہتر''۔ وہ بہارے کے ساتھ خشک گھاس پہ بیٹھ گئی۔

بہارے کی گود میں سفید پھولوں کی لڑی رکھی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ایک موٹی سبز ٹہنی پکڑے، اس کے دونوں سرے ملا کر ان کو باندھ رہی تھی، یوں کہ وہ ایک گول، سبز سا رنگ بن گیا تھا۔

''تم کیا کر رہی ہو؟''

''تمہارا گفٹ بنا رہی ہوں۔ تمہیں پہیلی سمجھ میں آئی؟''

''فوراً ہی آ گئی۔ بہت آسان تھی''۔ اور کم از کم اس کے لیے اسے کسی فلاسفر کے گدھوں اور کتوں والے اقوالِ زریں نہیں پڑھنے پڑے تھے۔

''عائشے کی بھی سمجھ میں آ گئی تھی، مگر یہ مجھے نہیں بتاتی''۔

''ٹھیک کرتی ہوں۔ یہ تمہارا تحفہ ہے اور تمہیں خود نکالنا ہے۔ تحفہ خوشی کے لیے ہوتا ہے، اگر تم اسے خود بوجھ کر نکالو گی تو تمہیں اصلی خوشی ہو گی ورنہ توڑ کر بھی نکال سکتی ہو''۔ عائشے نے کہا۔

''عائشے ٹھیک کہہ رہی ہے، ویسے یہ پہیلیاں کون لکھتا ہے؟''

''عبدالرحمٰن کے پاس ہر کام کے لیے بہت سے بندے ہوتے ہیں۔ اس نے کسی سے لکھوالی ہو گی''۔ بہارے نے شانے اُچکا کر کہا۔ گویا عبدالرحمٰن سے بہت محبت و عقیدت کے باوجود اس کا خیال تھا کہ وہ اس نے خود نہیں لکھی تھی۔ تو پھر شاید ڈولی نے.....؟

بہارے بہت مہارت سے سفید پھولوں کی لڑی کو سبز ٹہنی پر لپیٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ سبز رنگ، ایک سفید پھول دار حلقے میں تبدیل ہو گیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے وہ تاج حیا کے سر پہ رکھا۔

''بہارے گل اور عائشے گل کی طرف سے!''

اس کے انداز پہ کام کرتی عائشے نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''بہارے گل اور عائشے گل کا بہت شکریہ!'' اس نے مسکراتے ہوئے سر پہ پہنے تاج کو چھوا۔ مری میں ایسے تاج بکثرت ملتے تھے مگر ان میں سے کوئی تاج اتنا خوب صورت نہ تھا۔ کوئی تاج اتنا خوب صورت ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

بہارے اب پزل باکس اور سوئی دھاگہ احتیاط سے اپنی گلابی زنبیل میں رکھ کر عائشے کے ساتھ کام کروانے لگی تھی۔ اس نے بھی اُٹھنا چاہا مگر عائشے نے روک دیا۔

''تم مہمان ہو اور تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جب ٹھیک ہو جائے گی تو کروا لینا''۔

پھر کام ختم کر کے بہارے نے چٹائی بچھائی اور بڑی باسکٹ سے پانی کی بوتل نکال کر حیا اور عائشے کے ہاتھ دُھلائے۔ پھر لنچ باکس کھول کھول کر چٹائی پہ رکھنے لگی۔

''یہ تلی ہوئی مچھلی ہے، یہ سلاد ہے اور یہ مرغابی کا سالن ہے''۔ کھانا ابھی تک گرم تھا اور اس کی خوشبو بہت اشتہا انگیز تھی۔

اسے یاد تھا، شروع شروع میں وہ اور ڈی جے ترک کھانے سے کتنی متنفر ہو گئی تھیں مگر چند ہی روز بعد ان کو ترک کھانے سے اچھا کھانا کوئی نہیں لگتا تھا۔

یوں سنسان جنگل میں درختوں کے بیچ زمین پہ بیٹھے ٹھنڈی سی دوپہر میں وہ اس کا پہلا کھانا تھا۔ استنبول کی چہل پہل اور ہنگامہ خیز زندگی سے دور ایک تنہا جزیرے پہ، جہاں وہ خود کو فطرت سے زیادہ قریب محسوس کر رہی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

کھانا کھا کر چیزیں، سمیٹ کر وہ لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے گٹھے سروں پہ اُٹھائے ڈھلان سے اُتر کر واپس بگھی تک آ گئیں۔ عائشے نے ساری لکڑیاں اور اوزار صندوق میں رکھے اور پھر وہ بگھی کو وہیں چھوڑ کر دوسری سمت چل دیں۔ اس نے نہیں پوچھا تھا کہ اب وہ کدھر جا رہے ہیں۔ وہ خود کو ان دو بہنوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ چکی تھی۔ پھر بھی عائشے خود سے ہی بتانے لگی۔

''اب ہم ساحل کی طرف جا رہے ہیں''۔

''مگر فائدہ کوئی نہیں ہے''۔ اس کے ساتھ چلتی بہارے نے ذرا خفگی سے سرگوشی کی۔ وہ جو دونوں پہلوؤں سے میکسی ذرا سی اُٹھا کر چل رہی تھی، ذرا چونکی۔

''وہ کیوں؟''

''ہم سمندر پہ سیپ چننے جا رہے ہیں، مگر کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے کسی سیٹ سے موتی نہیں نکلتا اور عائشے کے ہر سیپ سے موتی نکلتا ہے''۔

''اچھا؟ وہ کیوں؟''

''عبدالرحمٰن کہتا ہے، عائشے کے سیپ سے موتی اس لیے نکلتے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ سچ بولتی ہے''۔

''نہیں، یہ کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ بہارے کے سیپ سے موتی اس لیے نہیں نکلتے کیونکہ بہارے ہمیشہ اللہ سے برا گمان رکھتی ہے، جس دن بہارے اچھا گمان رکھے گی، اس دن موتی نکل آئیں گے اور ایک دفعہ تو موتی نکلا بھی تھا۔'' آگے چلتی عائشے نے گردن موڑے بغیر کہا۔ اس کی آخری بات پہ حیانے سوالیہ نگاہوں سے بہارے کو دیکھا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''ہاں..... بس ایک ہی دفعہ موتی نکلا تھا، سفید موتی اور وہ بہت خوب صورت تھا۔ میں نے وہ عبدالرحمٰن کو گفٹ کر دیا''۔

''وہ اس کا کیا کرے گا؟ تم اپنے پاس رکھتیں نا!''

جواباً بہارے نے ملال بھری ''تم نہیں سمجھ سکتیں'' والی نظروں سے اسے دیکھا اور سر جھٹکا۔

ساحل کا یہ حصہ قدرے سنسان پڑا تھا۔ نیلے سمندر کی لہریں اُمڈ اُمڈ کر پتھروں سے سر پٹختیں اور واپس لوٹ جاتیں۔ ساحل کی ریت گیلی تھی اور اس پہ قطار میں بہت سے پتھر پڑے تھے۔ کراچی کا ساحل ریت والا ہوتا تھا مگر یہ ساحل پتھروں والا تھا۔

وہ چیزیں محفوظ جگہ پہ رکھ کر، جوتے اُتار کر ننگے پاؤں چلتی پانی میں آ کھڑی ہوئیں۔

''ادھر سمندر اکثر سیپ ڈال دیتا ہے مگر روز نہیں''۔ عائشے پاؤں پاؤں بھر پانی میں چلتی کہہ رہی تھی۔

لہریں اُمڈ اُمڈ کر تیں، اس سے ٹکراتی اور اسے گھٹنوں تک بھگو کر واپس چلی جاتیں۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے فاصلے پہ کھڑی اپنی اپنی ٹوکریاں اُٹھائے سیپ ڈھونڈ رہی تھیں۔

پانی یخ بستہ تھا اور ہوا سرد تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو عائشے اور بہارے ریت سے سیپ اُٹھا اُٹھا کر اپنی ٹوکریوں میں بھر رہی تھیں مگر اسے اپنے پاس کوئی سیپ نظر نہیں آیا۔ وہ متلاشی نگاہوں سے پانی کی تہہ تلے جھلکتی ریت کو دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ تب ہی ایک تیز لہر آئی تو وہ لڑکھڑا کر پھسلی اور کمر کے بل ریت پہ جا گری۔ صد شکر کہ پتھروں کا ساحل چند قدم دور تھا۔ لہر واپس پلٹ گئی۔ وہ ریت پر گری پڑی تھی۔ مکمل طور پہ بھیگی ہوئی۔ اس کی چوٹی بھیگ گئی تھی۔ ریت کے ذرے سفید بالوں پہ جا بجا لگے تھے۔ وہ درد سے دُکھی کمر کو سہلاتی بمشکل اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔ عائشے اور بہارے نے اسے گرتے دیکھا نہ اُٹھتے۔ اس نے بھی واویلا نہ کیا۔ پانی کا درد، آگ کے درد سے کم ہی ہوتا ہے۔ وہ برداشت کر گئی۔

اسے گرانے والی لہر اس کے قدموں میں ایک سیپ ڈال گئی تھی۔ اس جھک کر سیپ اُٹھالی۔ وہ ایک شامی کباب کے سائز جتنا تھا وراس کا خول سفید، سرمئی اور گلابی رنگوں سے بنا تھا۔

''اوہ تم تو بھیگ گئیں، ٹھہرو، یہ شال لے لو''۔

پتھروں کے پار چٹائی پر بیٹھتے ہوئے عائشے نے فکرمندی سے اسے دیکھا اور ایک شال ٹوکری سے نکال کر دی جو اس نے شانوں

Downloaded From http://paksociety.com

کے گرد لپیٹ لی۔

''چلو، اب سیپ کھولتے ہیں''۔ وہ تینوں تکون کی صورت بیٹھی تھیں۔ اپنی اپنی ٹوکریاں اپنے سامنے رکھے۔ عائشے نے بڑے سے چپٹے بلیڈ والا چھرا اُٹھایا اور اپنی ایک سیپ نکال کر پھر اس کے خول کے دونوں حصوں کی درمیانی درز میں رکھ کر ''بسم اللہ'' پڑھتے ہوئے سیدھا سیدھا چھرا چلا دیا۔ چٹخنے کی ذرا سی آواز آئی۔ عائشے نے چھرا ایک طرف رکھا اور دونوں ہاتھوں سے سیپ کے خول کو یوں کھولا جیسے کوئی کتاب کھولتے ہیں۔

اندر موجود سمندری جانور کا گوداخون آلود تھا۔ وہ مر چکا تھا مگر اس کے اوپر ایک مٹر کے دانے جتنا سفید موتی جگمگا رہا تھا۔

عائشے نرمی سے مسکرائی اور پلکر (Plucker) سے موتی اُٹھا کر ایک مخملیں تھیلی میں ڈالا۔ وہ مسحور سی یہ سارا عمل دیکھ رہی تھی۔ بہارے البتہ آلتی پالتی مارے بیٹھی ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے منہ بسورے عائشے کو دیکھ رہی تھی۔ عائشے نے ایک کے بعد ایک اپنے ساتوں سیپ کھولے۔ سب میں سے موتی نکلے۔ سات موتی اس کی مخملیں تھیلی میں جمع ہو چکے تھے۔

پھر اس نے چھرا بہارے کی طرف بڑھایا۔

''اب تم کھولو''۔

بہارے نے بے دلی سے چھرا پکڑا اور ایک ایک کر کے اپنے پانچوں سیپ کھولے۔ ان کے اندر سوائے خون آلود Mollusk کے، کچھ بھی نہ تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ سات تو نکل آئے ہیں، یہ بھی تمہارے ہیں''۔ عائشے نے نرمی سے اس کا گال تھپتھپایا۔ وہ خفا خفا سی بیٹھی رہی۔

حیا نے چھرا پکڑا اور سیپ کے دونوں حصوں کی درز میں رکھا پھر دل مضبوط کر کے چھرا چلا دیا۔ لمحے بھر کو اسے یوں لگا جیسے اس نے کسی نرم سے گوشت کو کاٹ دیا ہو۔ بہارے اور عائشے منتظر سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے سیپ کے دونوں حصوں کو پکڑے رکھے، کسی کتاب کی طرح اسے کھولا۔

سمندری جانور کے خون آلود لوتھڑے کے سوا سیپ میں کچھ نہ تھا۔ وہ موتی سے خالی تھا۔

اس نے بہارے کی سی بے دلی سے سیپ ایک طرف ڈال دی۔

''تم دونوں نے پہلے سے سوچ لیا تھا کہ تمہارا موتی نہیں نکلے گا۔ کل سے تم اچھے گمان کے ساتھ سیپ چنو گی''۔

عائشے نے بے بسی سے انہیں دیکھ کر کہا۔ وہ دونوں یونہی خفا خفا سی بیٹھی رہیں۔

☆ ☆ ☆

رات بیوک ادا پہ سیاہ چادر تان چکی تھی جس میں جھلملاتے سے تارے ٹکے تھے۔ اس کے کمرے کی کھڑکی کے جالی دار پردے ہٹے ہوئے تھے اور ان سے مقیش کی وہ سیاہ چادر صاف دکھائی دے رہی تھی۔

وہ گردن تک کمبل ڈالے، پہلو کے بل لیٹی تھی۔ لمبے بال تکیے پہ بکھیرے تھے۔ نگاہیں کھڑکی سے نظر آتے آسمان پہ ٹکی تھیں۔

صبح اس نے عائشے سے کہا تھا کہ اب وہ واپس جانا چاہتی ہے مگر ان دونوں بہنوں کے چہرے پہ اتنی اُداسی آ گئی اور انہوں نے صرف چند دن کے لیے، جب تک اس کی خراشیں اور سارے زخم مندمل نہیں ہو جاتے اور نیل غائب نہیں ہو جاتے، اس سے رُکنے کو کہا تو وہ رُک گئی۔ اسے بیوک ادا اچھا لگا تھا یا پھر شاید اسے یہ خوف تھا کہ ابھی سبا نجی..... میں لوگ اس کے چہرے کے زخموں کے متعلق استفسار کریں گے۔ وہ اس پُرفضا مقام پہ مکمل صحت مند ہو کر پہلے جیسا چہرہ لے کر واپس پلٹنا چاہتی تھی اور پھر بیوک ادا اسے کھینچتا بھی تھا۔ اس سفید محل میں کوئی مقناطیسی کشش تھی اور ان بہنوں کا خلوص تھا جو اسے باندھے رکھ رہا تھا۔

وہ گھر عائشے گل کا تھا، یہی وہ دل سے سارے بوجھ اُتار دینے والا احساس تھا جس کے باعث وہ اِدھر رُک گئی تھی۔ سبا نجی سے آج کل اسپرنگ بریک کی چھٹیاں تھیں، اور بریک ختم ہونے تک وہ ادھر رہ سکتی تھی۔ ابھی واپس جانا، دوسروں کو اپنے بارے میں مشکوک کرنا ہوگا۔ چہرے کے زخم بھرنے میں ابھی وقت تھا اور دل کے پتا نہیں کب بھر پائیں گے!

Downloaded From http://paksociety.com

ایک لمحے کے لیے اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ کہیں وہ اس گھر میں اس لیے تو نہیں رُک گئی کہ اس کا تعلق عبدالرحمٰن پاشا سے ہے؟ مگر نہیں اس کے دل میں تو جہان سکندر کے علاوہ کسی کی گنجائش نہ تھی۔ ٹھیک ہے پاشا نے اس پہ بہت بڑا احسان کیا تھا اور وہ اس ممنون تھی مگر اس کے دل میں پاشا کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اس نے ابھی تک موبائل نہیں لیا تھا۔ عائشے نے کہا تھا کہ کل تک ان کے ہوٹل کا ملازم موبائل اور سم پہنچا دے گا، بل سمیت۔ اس نے ابا سے کچھ پیسے عائشے کے اکاؤنٹ میں منگوا لیے تھے تاکہ وہ اپنے اخراجات خود اُٹھا سکے۔ البتہ نہ اس نے اماں، ابا اور نہ ہی جہان کو بتایا تھا کہ وہ کدھر رہ رہی ہے۔ وہ پہلے ہی ان سے دور تھی، جہاں بھی رہے، کیا فرق پڑتا تھا اور پھر استنبول میں عبدالرحمٰن پاشا کی رہائش سے بڑھ کر محفوظ جگہ کوئی نہ تھی، اس کا اندازہ اسے ہو چکا تھا۔

مگر جہان..... جانے وہ کیسا ہوگا۔ اتنے دنوں سے اس سے بات بھی نہیں ہوئی۔ آخری دفعہ اسے تب دیکھا تھا جب وہ اسے تقسیم پہ چھوڑنے آیا تھا۔ تب بخار کے باعث اس کی آنکھیں اور ناک سرخ تھی۔ ''پتا نہیں اس کا بخار ٹھیک ہی ہوا یا نہیں''۔ وہ اسے فون کرنے کا سوچ کر اُٹھی اور باہر آ کر گول چکر زینہ اُترنے لگی۔

آخری سیڑھی پہ اس کے قدم سست پڑ گئے۔ لونگ روم میں انگیٹھی دہک رہی تھی اور اس کے سامنے عائشے گل صوفے پہ پاؤں اوپر کیے بیٹھی تھی۔ حیا کی جانب پشت کیے، وہ ہاتھوں میں قرآن پکڑے پڑھ رہی تھی، مدھر، دھیمی، خوب صورت آواز، جو آیات کے ساتھ اوپر نیچی ہوتی تھی۔

''اور آگ والے جنت والوں کو پکار پکار کر کہیں گے کہ ڈالو ہم پر پانی میں سے یا اس میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشا ہے۔ وہ کہیں گے، بے شک اللہ نے ان دونوں کو حرام کر دیا ہے انکار کرنے والوں پر''۔

وہ وہیں ریلنگ پہ ہاتھ رکھے، ساکت سی کھڑی رہ گئی۔ ایک دم سے وقت پانچ روز پیچھے چلا گیا۔ وہ کرسی سے بندھی ہوئی اسی کمرے میں گری پڑی تھی جس میں بہت سے آگ تھی۔ الاؤ، انگیٹھی، اُبلتا ویکس، دہکتی سلاخیں۔ اسے اپنی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ''پانی ڈالو مجھ پر..... پانی ڈالو مجھ پر.....'' وہ اگلے تین روز سوتی جاگتی کیفیت میں یہی چلاتی رہی تھی۔

عائشے اسی طرح پڑھ رہی تھی۔

''بے شک اللہ نے ان دونوں کو حرام کر دیا ہے انکار کرنے والوں پر، وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو شغل اور کھیل بنا لیا تھا.....''

وہ بے دم سی ہو کر وہیں آخری سیڑھی پہ بیٹھی چلی گئی۔

''وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنے دین کو شغل اور کھیل بنا لیا تھا اور ان کی دُنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا.....''

انگیٹھی میں جلتی مصنوعی لکڑیوں سے چنگاریاں اُٹھ اُٹھ کر فضا میں گم ہو رہی تھی۔ وہ یک ٹک گم صم سی دہکتی لکڑیوں کو دیکھے گئی۔

''تو آج کے دن، ہم بھلا دیں گے ان کو جیسا کہ وہ اپنی اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے اور وہ ہماری نشانیوں کا انکار کیا کرتے تھے''۔ (الاعراف 51۔50)

دفعتاً عائشے نے کسی احساس کے تحت گردن موڑی۔ اسے یوں آخری زینے پہ بیٹھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں فکرمندی اُبھری۔ اس نے قرآن بند کیا اور اُٹھ کر احتیاط سے شیلف کے اوپری خانے میں رکھا، پھر اس کے ساتھ زینے پہ آ بیٹھی۔

''ایسے کیوں بیٹھی ہو حیا؟'' وہ نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

حیا گم صم سی اس کا چہرہ دیکھے گئی۔ اسکارف میں لپٹا عائشے کا چہرہ نیم اندھیرے میں بھی دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب سیاہ لگ رہی تھی۔ یہ لڑکی اتنی پُرسکون، اتنی نرم کیسے رہتی تھی ہر وقت؟ اس کے چہرے پہ کوئی دھول، کوئی دھند، کوئی مبہم پن کیوں نہیں ہوتا تھا؟ صاف، شفاف، اُجلا چہرہ۔ معصومیت، کم عمری۔

''حیا!'' اس نے دھیرے سے حیا کی بند مٹھی پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ حیا نے چہرہ ذرا سا پھیرا تھا، اس سے روشنی نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے کی بہت عادی ہو چکی تھیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

''یہ دُنیا دھوکے میں کیسے ڈالتی ہے عائشے؟'' وہ اب بالکل بھی اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ الاؤ کو دیکھ رہی تھی جس سے سرخ دانے اُڑ اُڑ کر فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔

''جب یہ اپنی چمکنے والی چیزوں میں اتنا گم کر لیتی ہے کہ اللہ بھول جاتا ہے''۔

''کیا مجھے بھی دُنیا نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟''

''پہلی دفعہ دھوکا انسان بھولپن میں کھاتا ہے مگر بار بار کھائے تو وہ اس کا گناہ بن جاتا ہے اور اگر کسی احساس ہونے کے بعد نہ کھائے تو اسے ایک بری یاد سمجھ کر بھول جانا چاہیے اور زندگی نئے سرے سے شروع کرنا چاہیے''۔

''نئے سرے سے؟ اسے یوٹرن لینا آسان ہوتا ہے کیا؟ انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ خوب صورت لگے، خوب صورت لباس پہنے، کیا یہ بری بات ہے؟'' اس کی آواز میں بے بسی در آئی تھی، جیسے وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کیا غلط تھا کیا صحیح، سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔

''نہیں! اللہ تعالیٰ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔ یہ چیزیں زندگی کا حصہ ہونی چاہئیں۔ مگر ان کو آپ کی پوری زندگی نہیں بننا چاہیے۔ انسان کو ان چیزوں سے اوپر ہونا چاہیے۔ کچھ لوگ میری طرح ہوتے ہیں جن کی زندگی لکڑی کے کھلونے بنانے، مچھلی پکڑنے اور سچے موتی چننے تک محدود ہوتی ہے اور کچھ لوگ بڑے مقاصد لے کر جیتے ہیں۔ پھر وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر پریشان نہیں ہوتے''۔

حیا نے غیر ارادی طور پہ ایک نگاہ اپنے کندھے پہ ڈالی جہاں آستین کے نیچے Who لکھا تھا۔

''اور جن کی زندگی میں بڑا مقصد نہ ہو، وہ کیا کریں؟''

''وہی جو میں کرتی ہوں۔ عبادت! ہم عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، سو ہمیں اپنے ہر کام کو عبادت بنا لینا چاہیے۔ عبادت صرف روزہ، نوافل اور تسبیح کا نام نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر انسان کا ٹیلنٹ بھی اس کی عبادت بن سکتا ہے۔ میں بہارے کے لیے پھولوں کے ہار اور آنے کے لیے کھانا بناتی ہوں۔ میری یہ صلہ رحمی میری عبادت ہے۔ میں پزل باکسز اور موتیوں کے ہار بیچتی ہوں، میرا یہ رزق تلاشنا میری عبادت ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام کرتے کرتے انسان بڑے بڑے مقاصد پا لیتا ہے''۔

''اور انسان ان چیزوں کے لیے مضبوطی کہاں سے لائے؟''

''حیا! مجھے لگتا ہے ہم لڑکیوں نے اپنے اوپر Fragile stickers (نازک) اسٹکرز لگا رکھے ہیں۔ فریجائل اسٹکرز سمجھتی ہو نا؟ وہ جو نازک اشیاء کی پیکنگ کے اوپر چسپاں ہوتے ہیں، اور ان پہ لکھا ہوتا ہے ''ہینڈل ود کیئر!'' وہی اسٹکرز ہم لڑکیاں اپنی پیشانی پہ لگائے رکھتی ہیں۔ پھر کسی کا ذرا سا طنز ہو یا بے جا پڑی ڈانٹ، ذرا سا کانٹا چبھ جائے یا دل ٹوٹ جائے، ہم گھنٹوں روتی ہیں۔ اللہ نے ہمیں اتنا نازک نہیں بنایا تھا، ہم نے خود کو بہت نازک بنا لیا ہے اور جب ہم لڑکیاں ان چیزوں سے اوپر اُٹھ جائیں گی تو ہمیں زندگی میں بڑے مقصد نظر آ جائیں گے''۔ عائشے خاموش ہو گئی۔ اب لونگ روم میں صرف لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز آ رہی تھی۔

''عائشے گل، تم بہت پیاری باتیں کرتی ہو''۔ وہ تھکان سے ذرا سا مسکرا کر بولی تو عائشے دھیرے سے ہنس دی۔

''تم بھی بہت پیاری ہو!''

''یہ تو تم نے مروت میں کہا! اچھا عائشے! میں کل سے تم دونوں کے کمرے میں سو جایا کروں؟ مجھے اوپر والے کمرے میں تنہائی محسوس ہوتی ہے''۔

''ٹھیک ہے پھر ہم کل اپنے کمرے کی سیٹنگ بدل دیں گے۔ بڑا والا ڈبل بیڈ گیسٹ روم سے ادھر لے آئیں گے''۔ عائشے اُٹھتے ہوئے بولی۔ اس نے مسکرا کر دھیرے سے سر ہلا دیا۔ جو بھی تھا، عائشے کی باتیں اس کے دل کو بہت اُلجھا دیا کرتی تھیں۔ وہ کبھی بھی زندگی میں ایسے تذبذب اور شش و پنج میں مبتلا نہیں رہی تھی جس سے اب گزر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز اسے موبائل تو ہوٹل گرینڈ (وہ ہوٹل جو بیوک ادا میں اے آر پاشا کا گڑھ سمجھا جاتا تھا) کے ایک ملازم نے سم سمیت لا

Downloaded From http://paksociety.com

دیا۔ مگر بیڈ وہ شفٹ نہ کر سکیں کہ وہ کھل نہیں رہا تھا۔ انہوں نے یہ کام ایک دن کے لیے ملتوی کر دیا۔ سورات کو جب وہ سونے لیٹی تو اوپر اپنے کمرے میں اکیلی ہی تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کے ذہن کے پردوں پہ وہی رات، دہکتی سلاخیں اور بھڑکتا الاؤ چھانے لگا تو وہ مضطرب سی اُٹھ بیٹھی۔ وہ رات اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ اس کے مسئلے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ پہلے وہ سفید پھول اور پاشا کا تعاقب اور اب یہ یادیں۔ اگر وہ اس روز اکیلی مسز عبداللہ کے گھر سے نہ نکلی ہوتی اور اگر پانچ چھ ماہ قبل وہ اس چیریٹی لنچ پہ اس فائیو سٹار ہوٹل میں نہ گئی ہوتی تو یہ مسئلے پیش نہ آتے۔ اس نے بہت اضطراب سے سوچا تھا۔

یقیناً پاشا اسی چیریٹی لنچ پہ مدعو ہوگا۔ اسے اس سفید محل میں جگہ جگہ پاشا اور آنے کی تصاویر آویزاں نظر آئی تھیں اور اب تک تو اسے عبدالرحمٰن پاشا کی شکل حفظ ہو چکی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنے کی سعی کی۔ کیا اس نے اس لنچ پہ پاشا کو دیکھا تھا؟''

اسے فون نمبرز یاد نہیں رہتے تھے کیونکہ وہ انہیں یاد رکھنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ ہاں اس کے بچپن میں ہوتا تھا۔ وہ ڈائری پہ نمبرز لکھنے اور زبانی یاد کرنے کا رواج، مگر جب سے موبائل کلچر عام ہوا تھا، اس نے فون بک میں نمبرز محفوظ کر کے انہیں یاد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ البتہ چہرے، مناظر، چھوٹی چھوٹی جزیات، کپڑوں کے ڈیزائن پوری تفصیل کے ساتھ اسے یاد رہا کرتے تھے اور اسے نہیں یاد تھا کہ اس نے پاشا کو اس لنچ پہ دیکھا ہو۔ وہاں بہت سے لوگ تھے۔ وہ یقیناً وہاں ہوگا مگر حیا کی نگاہ ہی اس پہ نہیں پڑی ہوگی ورنہ پاشا کی تصویر دیکھ کر اسے وہ چہرہ جانا پہچانا لگتا۔ اس لنچ پہ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو معمول سے ہٹ کر ہو سوائے اس لڑکی کے جس کی ٹرے میں چار کپ تھے۔

اس نے قدرے اچنبھے سے آنکھیں کھولیں۔ اسے وہ لڑکی کیوں یاد آئی تھی؟ ہال میں نہیں، البتہ ہوٹل کی لابی سے ہو کر جب وہ ریسٹورنٹ سے گزر رہی تھی تب وہ اسے ملی تھی۔ حالانکہ حیا اسے نہیں جانتی تھی مگر اس نے کہا تھا کہ وہ اس سے یونیورسٹی میں مل چکی ہے۔ حیا کو ایسا کوئی واقعہ یاد نہ تھا، مگر وہ لڑکی مصر تھی کہ وہ مل چکی ہیں۔

اس نے آنکھیں موند کر دوبارہ وہ منظر یاد کرنے کی سعی کی۔ وہ زارا کے ساتھ چلتی ہوئی جا رہی تھی کہ سامنے سے ٹرے میں چار کپ لیے وہ دراز قد لڑکی چلتی ہوئی آئی، پھر۔۔۔۔

اس کے تخیل میں مخل ہونے والی آواز فون کی تھی۔ اس نے کوفت سے آنکھیں کھولیں اور فون کو دیکھا، وہاں پاکستان کا نمبر لکھا آ رہا تھا۔

ابھی تو یہ نمبر اس نے کسی کو نہیں دیا تھا، پھر.....؟

''ہیلو؟'' اس نے فون کال سے لگایا۔

''حیا.....میجر احمد ہیئر!'' وہی بھاری، خوب صورت، شائستہ آواز۔ اس نے گہری سانس لی۔ یہ لوگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے، وہ جتنا ان کو پرے دھتکارے، وہ اس کا سائے کی طرح تعاقب کرتے رہیں گے۔

''کہیے! کس لیے فون کیا ہے آپ نے؟'' اس کی آواز میں خود بخود رکھائی در آئی۔ یہ پوچھنا بے سود تھا کہ میجر احمد کو اس کا نمبر کیسے ملا اور فون بند کرنا بھی بے سود تھا۔ وہ پھر فون کر لے گا اور کرتا ہی رہے گا۔ اسے کسی اور طرح سے اب اسے ڈیل کرنا ہوگا۔

''کیا ہم کچھ دیر کے لیے بات کر سکتے ہیں؟'' اس کی آواز بوجھل تھی۔ تکان سے بھری۔ غم سے لبریز۔ اُداس، متفکر۔

حیا نے لمحے بھر کو سوچا، اس کا ذہن چند خیالات کو ترتیب دینے لگا تھا۔

''دیکھیں میجر احمد''۔ اس نے سوچ سوچ کر کہنا شروع کیا۔ ''اگر تو آپ کوئی ایسی بات کرنا چاہتے ہیں جو کسی شادی شدہ عورت سے کرنا غیر مناسب ہے تو مت کیجئے، لیکن اگر آپ کوئی باہمی مفاد کی بات کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو سن رہی ہوں''۔

وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر اس کی آواز فون میں اُبھری۔

''مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے جو آپ کے ساتھ ہوا''۔ وہ ایک دم بالکل ساکت ہو گئی۔ اس کے اغوا کی خبر پھیل چکی تھی۔

''تو کیا وہ سب راز نہیں رہا؟'' ایک بوجھ سا اس کے دل پہ آن گرا تھا۔

''فکر نہ کریں، پاکستان میں کسی کو علم نہیں ہوا''۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ اس کے لہجے پہ غور کرنے لگی۔ یہ کیا کوئی دھمکی تھی کہ وہ چاہے تو پاکستان میں سب کو علم ہو سکتا ہے؟ اس کے پاس یقیناً اس کی ویڈیو تھی اور پاشا کے پاس اس کی بہت سی تصاویر۔ بلیک میلرز!

''میں نے آپ سے کہا تھا نا، اگر زندگی میں کوئی آپ کو جنت کے پتے لا کر دے تو انہیں تھام لیجئے گا۔ وہ آپ کو رسوا نہیں ہونے دیں گے''۔ اس کی آواز میں دل کو چیرتا ہوا درد تھا۔

''اور میں نے بھی آپ سے کہا تھا کہ ہم دُنیا والوں نے جنتیں کہاں دیکھی ہیں''

''آپ نے میری بات نہیں مانی۔ مجھے اس واقعے نے جتنی تکلیف دی، شاید زندگی میں کسی اور شے نے اتنی تکلیف نہیں دی''۔

''میں اغوا ہوئی، ظلم میرے ساتھ ہوا، تو آپ مجھے کیوں قصوروار ٹھہرا رہے ہیں؟''

''وہ ہر کسی کو نہیں اغوا کرتے۔ خوب صورت لڑکیوں کو کرتے ہیں''۔

''میں خوب صورت ہوں تو اس میں میرا قصور ہے؟''

وہ حیران نہیں ہو رہی تھی، وہ پوچھ رہی تھی۔

''انہیں یہ پتا چلا کہ آپ خوب صورت ہیں، اس میں آپ کا قصور ہے''۔ وہ بھی طنز نہیں کر رہا تھا، بس مغموم انداز میں کہہ رہا تھا۔

''تو اب میں کیا کروں؟ اب ان سارے مسائل سے کیسے جان چھڑاؤں؟''

''کون سا مسئلہ ہے؟ مجھے بتائیں، آپ مجھے ہمیشہ اپنا خیر خواہ پائیں گی''۔

وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر کہنے لگی۔

''اگر کوئی آپ کو بلیک میل کرنے لگے تو کیا کرنا چاہیے؟''

''بلیک میلر ایک بے تھنے بیل کی طرح ہوتا ہے حیا! اس سے بھاگیں گی تو وہ آپ کا تعاقب کرے گا اور تھکا تھکا کر مار دے گا۔ سو اس سے کمر کر کے بھاگنے کے بجائے اس کا سامنا کریں اور آگے بڑھ کر اس کو سینگوں سے پکڑ لیں۔ دُنیا کا کوئی ایسا بلیک میلر نہیں ہے جس کی اپنی کوئی ایسی کمزوری نہ ہو جس پہ اسے بلیک میل نہ کیا جا سکے''۔

''آپ کی کمزوری کیا ہے؟''

''بہت سی ہیں۔ کمزوریاں پوچھی نہیں، تلاشی جاتی ہیں، لیکن میں بلیک میلر نہیں ہوں''۔

''اگر مجھے آپ کی کمزوری تلاشنی ہوتی تو پوچھتی نہیں''۔ اس نے ذرا محظوظ سے انداز میں جتایا۔

''ویسے وہ پزل باکس مجھے کس نے بھیجا تھا؟'' وہ جواباً خاموش رہا۔

''میجر احمد! میرا خیال ہے اب ہم یہ ڈمب گیم بند کر دیں اور یہ بات تسلیم کر لیں کہ آپ مجھ سے ایک خواجہ سرا بن کر ملتے رہے ہیں''۔ اس نے پنکی کے بجائے خواجہ سرا کہنا مناسب سمجھا۔

''میں تسلیم کرتا ہوں''۔

''آپ پنکی تھے مگر ڈولی کون تھا؟''

''ارے آر پی کی ماں نے بتایا تو تھا آپ کو''۔

''کیا میں نے کبھی ڈولی کا اصلی چہرہ دیکھا ہے؟''

''نہیں، آپ اسے نہیں جانتیں''۔

''وہ باکس مجھے ڈولی نے بھیجا ہے مگر اس کی پہیلی، وہ کس نے لکھی تھی؟ کون لکھتا ہے یہ پہیلیاں؟ کیا آپ لکھتے ہیں؟'' وہ خاموش رہا۔

''میجر صاحب! مجھے سچ سچ بتا دیں۔ ویسے میں جانتی ہوں کہ وہ آپ ہی لکھتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ منظرِ عام پہ آنے کے بجائے پسِ منظر میں بیٹھ کر عقل کی ڈوریں ہلاتے رہتے ہیں''۔

''جی، وہ میں ہی لکھتا ہوں''۔

Downloaded From http://paksociety.com

''وہ کریمی آئی'' والی پہیلی بھی آپ نے لکھی تھی، بلکہ آپ سے لکھوائی گئی تھی؟''

''جی وہ میں نے ہی لکھی تھی۔ ویسے پزل باکس کھول لیا آپ نے؟'' اس نے پہلی دفعہ میجر احمد کی آواز میں سرسری سا تجسس محسوس کیا۔ کیا اس کی کمزوری اس کے ہاتھ میں آنے لگی تھی؟

''جی، کھول لیا اور مجھے وہ مل گیا جو ڈولی مجھ تک پہنچانا چاہتا تھا''۔

وہ بالوں کی لٹ اُنگلی پہ لپیٹتی بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھی۔ اپنی بات کے اختتام پہ اس نے واضح طور پہ کرسی کے پہیوں کی آواز سنی، جیسے ریوالونگ چیئر پہ ٹیک لگا کر بیٹھا میجر احمد کرنٹ کھا کر آگے کو ہوا تھا۔

''واقعی؟'' اس کی آواز میں محتاط سی حیرت تھی۔

''جی! پہیلی آسان تھی۔ میں نے بوجھ لی۔ ویسے جو اس میں تھا، وہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور اس نے مجھ پر ایک بہت حیرت انگیز انکشاف کیا ہے''۔

''جو باکس میں تھا، وہ آپ کے ہاتھ میں ہے اور اس نے آپ پر ایک انکشاف کیا ہے؟'' وہ رُک رُک کر اس کے الفاظ دُہرا کر جیسے تصدیق چاہ رہا تھا۔

''جی بالکل!''

جواباً وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

''نہیں! آپ سے ابھی تک وہ باکس نہیں کھلا، لیکن مجھے آپ کا یوں ذہن استعمال کر کے مجھے گھیر کر کچھ اُگلوانے کی کوشش اچھی لگی''۔

حیا نے تلملا کر موبائل کو دیکھا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے؟

''اچھا مجھے نیند آ رہی ہے''۔ وہ ذرا بے زاری سے بولی۔

''آپ بے شک سو جائیں مگر پلیز فون بند مت کیجئے گا''۔ وہ جیسے التجا کر رہا تھا۔

''جب میں کچھ بولوں گی ہی نہیں تو آپ کیا سنیں گے؟''

''میں آپ کی خاموشی سنوں گا''۔

''میں سو رہی ہوں۔ بائے!'' اس نے تکیے پہ سر رکھتے ہوئے ''جان چھوڑو'' والے انداز میں کہا، مگر پھر اس نے واقعی موبائل بند نہیں کیا۔ ایک ہاتھ سے فون کان پہ سے لگائے دوسرا بازو آنکھوں پہ رکھے، وہ کب سو گئی، اسے علم نہیں ہوا۔

صبح اُٹھتے ہی اس نے موبائل چیک کیا تو میجر احمد کی کال کا دورانیہ تین گھنٹے اور بیس منٹ لکھا آ رہا تھا۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ اس نے تو بمشکل دس منٹ میجر احمد سے بات کی تھی، تو کیا تین گھنٹے وہ اس کی خاموشی سنتا رہا تھا؟ عجیب آدمی تھا یہ بھی!

☆ ☆ ☆

پھر جس روز اس نے عائشے کے ساتھ ان دونوں بہنوں کے کمرے کی سیٹنگ تبدیل کرنے کا پروگرام بنایا، اس صبح اس نے جہان کو اپنا نمبر میسج کر دیا، بغیر کسی بات کے۔

جب وہ عائشے کے ہمراہ بڑا بیڈ اندر رکھ کر اور چھوٹا بیڈ باہر نکال کر، شاور لینے کے بعد تولیے سے بال تھپتھپا کر سکھاتی باہر آئی تو بیڈ پہ رکھا اس کا موبائل بج رہا تھا۔

''جہان کالنگ''۔

اماں سے جب اس نے جہان کا نمبر لیا تھا تو صرف موبائل میں محفوظ ہی نہیں کیا بلکہ زبانی یاد بھی کر لیا۔ اگر کبھی دوبارہ.....

''السلام علیکم!'' اس نے ایک دل نشین مسکراہٹ کے ساتھ فون کان سے لگایا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ تولیہ نرمی سے گیلے بالوں میں رگڑ رہی تھی۔

''وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟'' وہ بھی دوسری طرف جیسے بہت اچھے موڈ میں تھا۔

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

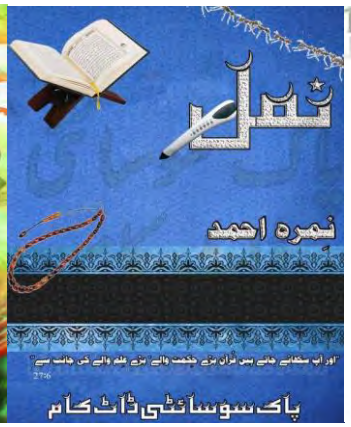

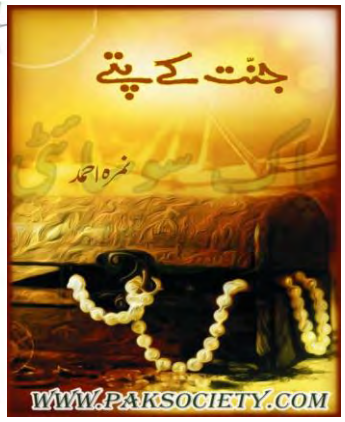

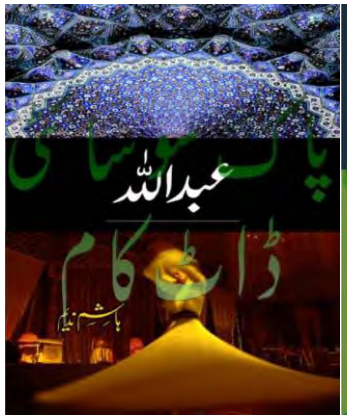

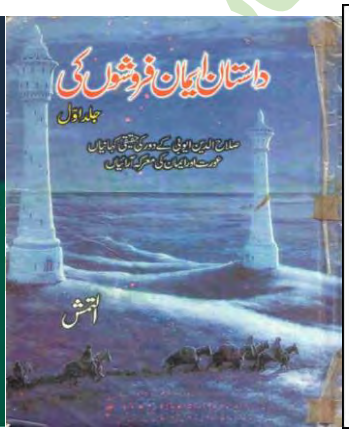

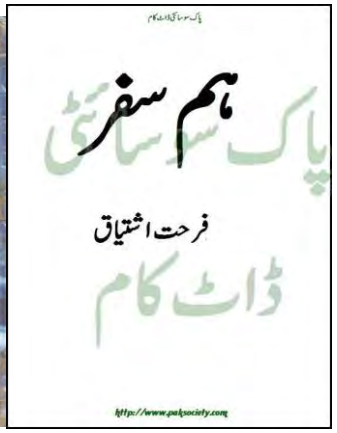

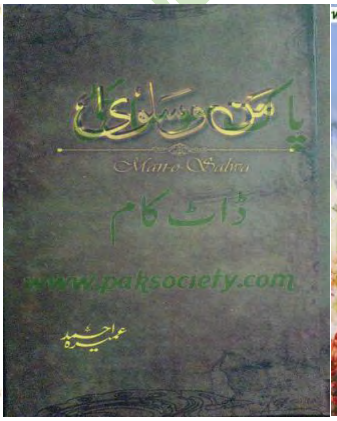

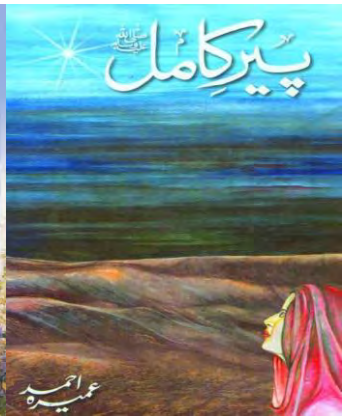

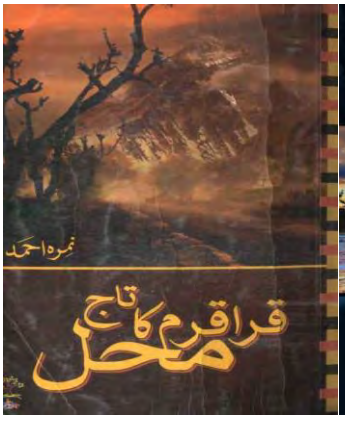

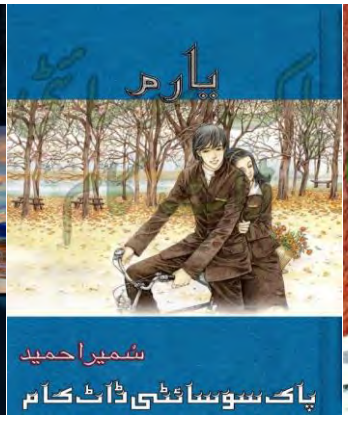

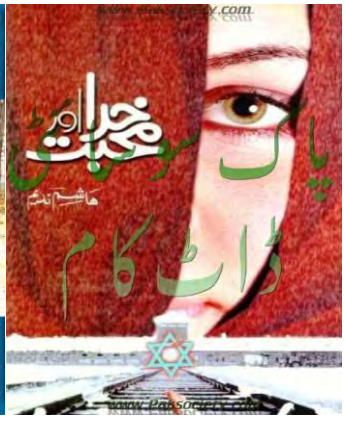

Downloaded From http://paksociety.com

''بہت اچھی اور تم؟''

''جیسا پہلے تھا۔ اور تم نے فون ٹھیک کرالیا؟ ممی کہہ رہی تھیں، تمہارا فون خراب ہو گیا تھا''۔

''ہاں، بہت کچھ خراب ہو گیا تھا۔ ویسے ابھی ایک دو روز پہلے نیا فون لیا ہے''۔ وہ تولیہ کرسی کی پشت پہ ڈالتے ہوئے بولی۔

''پھر تو بہت جلدی نمبر دے دیا تم نے''۔

''مجھے توقع نہیں تھی کہ کسی کو مجھ سے بات کرنے کی جلدی ہو گی، اسی لیے''۔

''اچھا! اپنے یہ طنز چھوڑو، مجھے بتاؤ، تم ڈورم میں ہو؟ میں ذرا مضافات میں آیا ہوا تھا، تمہارے کیمپس سے دس منٹ کی ڈرائیو پہ ہوں۔ چلو پھر ساتھ لنچ کرتے ہیں''۔

اسی پل عائشے کچھ لینے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر رُک گئی۔ وہ متذبذب سی فون پہ کہہ رہی تھی۔

''نہیں، میں..... ابھی کیمپس تو.....''

عائشے نے لمحے بھر کو غور سے اسے دیکھا پھر جیسے سمجھ کر سر ہلاتی آگے آئی اور رائیٹنگ ٹیبل پہ رکھے گ سے پین نکالا۔ نوٹ پیڈ کے اوپری صفحے پہ کچھ لکھ کر اس نے پیڈ اسے تھمایا۔ پھر خود باہر چلی گئی۔ حیا نے رُک کر صفحے پہ لکھے الفاظ پڑھے۔

''سچ سے بہتر جواب کوئی نہیں ہوتا''۔

''حیا؟'' دوسری جانب وہ پوچھ رہا تھا۔

''جہان! میں بیوک ادا میں ہوں''۔ وہ پیڈ پکڑے، اس پہ لکھی تحریر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''اوہ، فرینڈز ٹرپ تھا کوئی؟ مجھے پہلے بتا دیتیں تو.....''

''میں ادھر کچھ دن سے رہ رہی ہوں۔ میری فرینڈ کا گھر ہے ادھر۔ اور پھر تمہیں کیا بتاتی، تم تو ہمیشہ مصروف ہوتے ہو''۔ اس نے حملے کا رُخ بدلا تو وہ دفاعی پوزیشن میں آ گیا۔

''اتنا مصروف کہاں ہوتا ہوں؟''

''پھر کل ملتے ہیں۔ تم کل بیوک ادا آ جاؤ کیونکہ میں تو چند دن اپنی فرینڈز کے ساتھ ادھر ہی رہوں گی''۔

''کل میں مصروف ہوں''۔

''اچھا پرسوں؟''

''میں اگلا سارا ہفتہ مصروف ہوں۔ تم اپنی فرینڈز کے ساتھ انجوائے کرو، میں کام کرتا ہوں۔ اللہ حافظ''۔ اس نے ٹھک سے فون رکھ دیا تھا۔

''جہان!'' اس نے جھنجھلا کر موبائل کان سے ہٹایا۔ اس شخص کا کوئی پتا نہیں چلتا تھا کہ اسے کب کیا برا لگ جائے۔

باہر سے بہارے پھر سے آوازیں دینے لگی تھی۔

''حیا.....! یہ کریمی آئی کیا ہے؟ کوئی ہنٹ دے دو''۔

''جو بوجھے گا، گفٹ اسی کا ہو گا''۔ اس نے جواباً زور سے آواز دی۔ بہارے فوراً خاموش ہو گئی۔ عبدالرحمٰن کا تحفہ کسی دوسرے سے شیئر کرنے کا تصور بھی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔

☆ ☆ ☆

اس صبح وہ ابھی گہری نیند میں تھی جب موبائل اچانک بجنے لگا۔ چمکتی اسکرین پہ جہان کا نام جل بجھ رہا تھا۔ اس نے خمار آلود سا ہیلو کہتے ہوتے فون کان سے لگایا۔

''میں فیری سے بیوک ادا آ رہا ہوں، تم پورٹ پہ پہنچ جاؤ''۔

''کیا؟'' وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ ''تم آ رہے ہو؟'' اس کے لہجے میں سارے زمانے کی خوشی در آئی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ہاں، میں نے سوچا، بندے کو اتنا مصروف بھی نہیں ہونا چاہیے''۔ وہ ہنس کر بولا۔

وہ لحاف پھینک کر باہر کو بھاگی۔ عائشے کچن میں کام کرتی نظر آ رہی تھی۔ بہارے کرسی پہ بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔

''آج تم جنگل نہیں جاؤ گی، بس میں نے کہہ دیا، حلیمہ آنٹی نے کہا ہے کہ تمہیں پورا سبق دوبارہ یاد کرنے کی ضرورت ہے''۔

''مگر عائشے .....'' بہارے نے منہ بسور کر پلیٹ پرے ہٹائی۔

''عائشے! مجھے پورٹ جانا ہے''۔ وہ بھاگتی ہوئی چوکھٹ میں آن رُکی۔ ''میرا کزن آ رہا ہے۔ استنبول سے''۔

''ٹھیک ہے، پھر ہم پہلے پورٹ چلے جائیں گے''۔

''ٹھیک!'' وہ اپنی خوشی چھپاتی تیار ہونے واپس بھاگ گئی۔

دو روز قبل حلیمہ آنٹی نے عائشے کے ہاتھ اس کے لیے ایک میرون رنگ کا شیشوں کے کام والا کرتا بھیجا تھا۔ اس نے نیلی جینز پہ وہی گھٹنوں تک آتا کرتا پہن لیا اور گیلے بال کھلے چھوڑ دیئے۔ کندھوں پہ اس نے عائشے کا میرون پونچو پہن لیا تھا۔

بہارے کو حلیمہ آنٹی کے پاس چھوڑ کر وہ دونوں فیری پورٹ پر آ گئیں، فیری ابھی پانچ منٹ قبل پہنچا تھا۔ ٹورسٹس کا ایک بحر بیکراں س سے اُتر رہا تھا۔ وہ آنکھوں پہ ہاتھ کا سایہ کیے، فیری سے اُترتے لوگوں کو متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگی، تب ہی اسے جہان نظر آ گیا۔

وہ نیلی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سامنے سے چلتا ہوا آ رہا تھا، اس نے بھی اوپر میرون سوئٹر پہن رکھا تھا۔ جہان کو اپنے ریب دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرا دی۔

''جہان! اوور ہیئر!'' اس نے ہاتھ اونچا کر کے ہلایا۔ جہان نے دیکھ لیا تھا، تب ہی دھیما سا مسکراتا ان کی طرف آ گیا۔

''واؤ، تم تو ٹائم پہ پہنچ گئیں''۔

''تھینکس۔ یہ میری فرینڈ ہے، عائشے گل۔ میں اسی کے ساتھ رہ رہی ہوں اور عائشے! یہ میرا کزن ہے، جہان سکندر''۔

''السلام علیکم!'' عائشے نے اپنے نرم، ازلی خوش اخلاق انداز میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' اس نے مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی۔ ''تو تم ان کی بن بلائی مہمان بنی ہوئی ہو؟''

''ارے نہیں، بن بلائی کیوں؟ ہم نے تو خود حیا کو بصد اصرار چند دن ادھر رُکنے کا کہا تھا''۔ عائشے ذرا جھینپ گئی۔

پھر تھوڑی دیر ہی وہ رُک پائی کہ اسے جنگل جانا تھا۔ وہ چلی گئی تو وہ دونوں بندگاہ سے ہٹ کر سڑک کی طرف آ گئے۔ میرون اور نیلے رنگ میں ملبوس، وہ سڑک کے کنارے چلتے بالکل ایک سے لگ رہے تھے۔

''تمہارا فون اتنی افراتفری میں آیا کہ میں ناشتہ بھی نہیں کر سکی''۔ مین بازار میں ریسٹورنٹس کے کھلے فرنٹس سے اشتہا انگیز سی خوشبو باہر آ رہی تھی۔

''پھر جاؤ، اور میرے لیے بھی ناشتہ لے آؤ۔ مگر پے میں کروں گا''۔ اس نے والٹ نکال کر چند نوٹ نکالے۔

''ترک رسم و رواج کے مطابق ادائیگی ہمیشہ میزبان کرتا ہے اور ادھر میزبان میں ہوں جہان!''

''چھوڑو ترک رسوم کو۔ ہم پاکستانی ہیں''۔

''شکر۔ تمہیں یاد تو رہا''۔ اس نے نوٹ پکڑے اور ریسٹورنٹس کی قطار کی سمت چلی گئی۔

وہاں سڑک کے ایک طرف ریسٹورنٹس تھے تو دوسری طرف قطار میں بنچ اور میزیں ایسے لگی تھی جیسے کسی چرچ میں لگی ہوتی ہیں۔ درمیان میں کھلی، سرمئی سڑک تھی جو گزشتہ رات کی بارش سے ابھی تک نم تھی۔

جہان ایک بنچ پہ بیٹھ گیا اور کہنیاں میز پہ رکھ کر دونوں مٹھیاں باہم ملا کر ہونٹوں پہ رکھے اسے دیکھنے لگا، جو سڑک کے پار ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ چند ثانیے کے بعد وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں کافی کے کپ اور سینڈوچز رکھے تھے۔ اس نے سڑک پار کی اور ٹرے میز پہ جہان کے سامنے رکھی۔

''شکریہ''۔ اس نے مسکرا کر کہتے ہوئے ایک کپ اُٹھا لیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اور اب تم واپس استنبول آ جاؤ۔ بہت رہ لیا اُدھر''۔

''کیوں؟'' کافی کا کپ لبوں تک لے جاتے ہوئے وہ ساختہ رُکی تھی۔

''ممی تمہیں یاد کر رہی تھیں''۔

''صرف ممی؟'' اس نے آزردگی سے سوچا، پھر سر جھٹک کر پھیکا سا مسکرائی۔

''تو پھر جہان سکندر ایک گھنٹے کی مسافت طے کر کے مجھ سے ملنے آنے کا احسان کتنے دن تک جتائیں گے''۔

''قریباً.....'' جہان مسکرا کر کچھ کہتے کہتے رُکا، اس کی آنکھوں میں اُلجھن بھری۔

''تمہاری آنکھ پہ کیا ہوا ہے؟'' اس کی نگاہیں حیا کے چہرے پر سے پھسلتی گردن پہ جا ٹکیں۔ ''اور ہونٹ، اور گردن پہ؟ تمہیں چوٹ لگی ہے؟''

''ہاں، بہت گہری چوٹ لگ گئی تھی''۔

''کیسے؟'' وہ ذرا تفکر سے کہتا آگے کو ہوا اور کپ میز پہ رکھا۔

''میں گر گئی تھی۔ بہت بری طرح سے گر گئی تھی''۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بھی کہیں دور چلی گئی تھی۔

''اوہ۔ اب ٹھیک ہو؟''

حیا نے جواباً اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور یہ تم نے اپنی عمر سے اتنی چھوٹی لڑکی سے دوستی کرنا کب سے شروع کر دی؟''

''جب سے اپنی عمر والی ساتھ چھوڑ گئی''۔

ایک بوجھل سی خاموشی دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ ایک نہ ختم ہونے والے کرب نے سڑک کنارے لگے پنجز کی قطار کو گھیرے میں لے لیا۔ قریب میں ایک بچہ تین گیندیں جو موٹے موٹے زرد لیموں سے مشابہہ تھیں، یوں اُچھالتے ہوئے چلا آ رہا تھا کہ کوئی گیند گرنے نہ پاتی تھی۔

''خیر۔ یہ دو بہنیں عمر میں اتنی چھوٹی نہیں ہیں۔ بس چہرے سے لگتی ہیں۔ عائشے بیس سال کی ہے اور چھوٹی بہارے نو سال کی۔ انہوں نے میری مدد کی تھی، یوں ہماری دوستی ہو گئی''۔

''کیسی مدد؟''

''میرے بالوں پہ کچھ گر گیا تھا، حادثاتی طور پہ، وہ عائشے نے اُتار دیا۔ مگر تم فکر نہ کرو، اب سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا ہے''۔

''مگر کچھ تو بدلا ہے حیا!'' وہ کافی کے گھونٹ لیتا ذرا اُلجھن سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

''ہاں، کچھ تو بدلا ہے''۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر گیندوں کا کرتب دکھاتے لڑکے کو دیکھنے لگی۔

ایک ڈولی تھا جو کسی نگران فرشتے کی طرح اس کا پہرہ دیا کرتا تھا، ایک میجر احمد تھا جو اس کی خاموشی سننے کے لیے تین گھنٹے تک فون کان سے لگائے رکھتا تھا، ایک عبدالرحمٰن تھا جو دوسرے ملک میں ہونے کے باوجود اس کی مدد کے لیے آتا تھا اور ایک جہان سکندر تھا جو اس کی ایک وضاحت پہ مطمئن ہو جاتا تھا، جو اس کے چہرے کے زخم تو دیکھ سکتا تھا مگر ان کے پیچھے اس کی جلی ہوئی روح اسے نظر نہیں آتی تھی، جو نظر آتا ہے وہ تو سب دیکھ لیتے ہیں، جو نہیں نظر آتا وہ کوئی کوئی ہی دیکھ سکتا ہے اور جہان ایسے لوگوں میں شامل نہیں تھا۔

دفعتاً میسج ٹون بجی تو جہان نے موبائل جیب سے نکالا اور دیکھا۔

''ممی کو بتا کر نہیں آیا تھا، اب ان کی تفتیش شروع ہو گئی ہے''۔ وہ پیغام کا جواب ٹائپ کرتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگا۔

''تم جتنی ان کی مانتے ہو، میں جانتی ہوں''۔

''وہ مجھ سے کچھ منواتی نہیں ہیں، ورنہ شاید میں ان کی واقعی مانتا''۔ اس نے پیغام بھیج کر سیل فون وہیں میز پر ڈال دیا۔ حیا نے ایک نظر اس کے فون کو دیکھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''تو وہ سم ون اسپیشل کون تھا جس نے تمہیں یہ فون گفٹ کیا تھا؟'' جہان نے موبائل اُٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ تم رکھ لو، میں اور لے لوں گا۔ اتنے سوال پوچھتی ہو نا تم میرے فون کے بارے میں''۔ حیا نے فون اس کے ہاتھ سے لے کر واپس میز پہ رکھا۔

''بات کو مت ٹالو۔ میرے سوال کا جواب دو''۔

''نہیں، تم فکر نہ کرو، کسی لڑکی نے نہیں دیا تھا۔ یہ میرا آفیشل فون تھا، میری جاب کا فون۔ میرے باس نے دیا تھا''۔

''تمہارا باس؟'' اس کی آنکھوں میں اُلجھن اُبھری۔ ''مگر تم تو اپنا کام کرتے ہو نا؟''

''ہمیشہ سے تو اپنا نہیں کرتا تھا۔ یہ ریسٹورنٹ تو ڈیڑھ دو سال پہلے کھولا تھا، اس سے پہلے تو بہت سی جابز کی ہیں''۔ وہ زرد گیندیں اُچھالتے بچے کو دیکھ کر دھیما سا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کوئی ایسا نرم سا تأثر تھا جو حیا نے صرف ایک دفعہ پہلے دیکھا تھا۔ جیسے وہ کچھ یاد کر رہا تھا۔ کوئی گم گشتہ قصہ۔

''ایک بات کہوں جہان؟ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اپنی جاب اور اپنا باس بہت پسند تھا''۔ وہ بغور اس کے چہرے کے تأثرات کو دیکھتے ہوئے بولی تو جہان نے بری طرح سے چونک کر اسے دیکھا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگا؟''

''کیونکہ ابھی اپنے باس اور جاب کا ذکر کرتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں جو چمک اور محبت در آئی ہے نا، یہ میں نے پہلے تب دیکھی تھی جب تم ہمارے کچن میں مجھے اس اسپیشل گفٹ کے بارے میں بتا رہے تھے اور اب بھی یہ سب کہتے ہوئے تمہارا چہرہ ایک دم سے اتنا Glow کرنے لگ گیا کہ مجھے لگا اس ذکر سے وابستہ کوئی خاص یاد تمہارے ذہن میں چل رہی ہے''۔

''تم تو چہرے پڑھنے لگ گئی ہو؟'' وہ جیسے سنبھل کر مسکرایا۔

''بتاؤ نا، تمہیں اپنی پچھلی جاب بہت پسند تھی؟''

''ہاں، بہت زیادہ۔ بڑے عیش تھے تب، اپنی راجدھانی، اپنی جگہ کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے''۔ وہ اپنے چہرے کے تأثرات کو ہموار رکھے۔ دوبارہ ''کہیں'' پیچھے نہ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تو وہ جاب کیوں چھوڑ دی؟''

''بعض دفعہ انسان کو بہت کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ اپنی سلطنت سے خود کو خود جلاوطن کرنا پڑتا ہے۔ ان شہزادوں کے جزیروں کو ترک میں ''ادالار'' Adalar کہتے ہیں کیونکہ یہاں ان شہزادوں کو جلاوطن کر کے بھیجا جاتا تھا جو سلاطین کو اپنے تخت کے لیے خطرہ لگتے تھے''۔ وہ بات کو کہیں اور لے گیا۔

''ہاں، اور میں سوچتی ہوں جہان! وہ جلاوطن شہزادے اپنے پرانے شاہانہ دور کو کتنا یاد کرتے ہوں گے''۔

''اور جو خود کو خود ہی جلاوطن کرتے ہیں، ان کی یاد میں تکلیف بھی در آتی ہوگی''۔ پھر اس نے دھیرے سے سر جھٹکا۔ ''آؤ سمندر پہ چلتے ہیں''۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ساحل سمندر پہ پتھروں کی قطار پہ چل رہے تھے۔ ہوا سے حیا کے بال اُڑ اُڑ کر جہان کے کندھے سے ٹکرا رہے تھے مگر وہ انہیں نہیں سمیٹ رہی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے قدم اُٹھا رہا تھا۔

''تمہارا ریسٹورنٹ کیسا جا رہا ہے؟''

''رینوویشن کروا رہا ہوں اور میری لینڈ لیڈی بھی کوئی لائیر (وکیل) کر رہی ہے میرے خلاف۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے پاس ایک دم سے خود کا اتنا پیسہ کہاں سے آ گیا کہ وہ اتنا مہنگا لائیر کر سکے''۔

حیا کا دل آزردگی کے سمندر میں ڈوب کر اُبھرا۔ وہ جانتی تھی کہ اچانک سے اس کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا تھا۔ وہ سب اس کی غلطی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''تو تم اب کیا کرو گے؟''

''آج کل بس چھپا ہوا ہوں، اسی لیے ریسٹورنٹ سے بھاگ کر ادھر آ گیا ہوں۔ ذرا لو پروفائل رکھی ہوئی ہے''۔ وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔

''تم اس سے اتنا ڈرتے ہو؟''

''ڈرتا تو میں فرقان ماموں اور صائمہ مامی کے سوا کسی سے نہیں ہوں''۔ سمندر کی ایک تیز لہر آئی اور ان کے قدموں کو بھگو کر واپس پلٹ گئی۔

''اوہ فرقان ماموں کی بیٹی کی منگنی ہو رہی ہے''۔ اسے اچانک یاد آیا۔ حیا حیرت سے رُک کر اسے دیکھنے لگی۔

''ارم کی؟ کب؟ کس سے؟''

''کل رات مامی کا فون آیا تھا ممی کو۔ انہوں نے ہی بتایا تھا۔ فنکشن تو معلوم نہیں کب ہے، البتہ رشتہ طے ہو گیا ہے''۔

''مگر کس سے؟''

''فرقان ماموں کے کسی دوست کی فیملی ہے۔ زیادہ تفصیل مجھے نہیں معلوم!'' وہ شانے اُچکا کر بولا۔ وہ دونوں پھر سے چلنے لگے تھے۔

(ارم نہیں مانی ہو گی، تایا نے زبردستی کی ہو گی) وہ یہی سوچ رہی تھی۔

''تمہیں پتا ہے جہان! اماں، ابا اور تایا، تائی کی بڑی خواہش تھی کہ ارم کا رشتہ روحیل سے ہو۔ اب پتا نہیں تایا، تائی نے کہیں اور کیوں کر دیا رشتہ''۔

''مگر روحیل تو.....'' وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رُکا۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے لگا کہ جہان کے لبوں سے کوئی بات غیر ارادی طور پر پھسلی تھی۔

''مگر روحیل کیا؟'' وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''روحیل کی تو ابھی کافی اسٹڈیز رہتی ہیں''۔ وہ بات بدل گیا تھا، وہ شرطیہ کہہ سکتی تھی۔

''روحیل کی پڑھائی ختم ہو چکی ہے، جب میں پاکستان واپس جاؤں گی، وہ تب آنے والا ہی ہو گا''۔

جواباً جہان نے ایک گہری پرکھتی نظر اس پر ڈالی۔

''تمہارا روحیل سے رابطہ ہے جہان؟ پھپھو نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ تم لوگ ان ٹچ ہو''۔ اس نے اپنی پرانی اُلجھن کو الفاظ پہنا دیے۔

''ہاں کبھی کبھی بات ہو جاتی ہے۔ میں اس سے ملا تھا امریکہ میں''۔

''اچھا؟ کب؟ اس نے تو نہیں بتایا''۔ وہ خوشگوار حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''پرانی بات ہے۔ تین سال تو ہو ہی گئے ہیں''۔ وہ شانے اُچکا کر بولا۔ اسے بہت حیرت ہوئی تھی۔

ایک تو پتا نہیں اس کے گھر والوں کو ہر بات اپنے تک محدود رکھنے کا شوق کیوں تھا۔ ابھی پاکستان میں اس نے اماں سے سکندر انکل کے کیس کا پوچھا تو اسے معلوم ہوا کہ اماں ابا کو سب پتا تھا اور اب، روحیل جہان سے مل بھی چکا تھا مگر اس نے کبھی نہیں بتایا۔ آج تو وہ روحیل سے ضرور پوچھے گی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔

لہریں اسی طرح اُمڈ اُمڈ کر ان کے پیر چھو رہی تھیں۔

جہان! تم نے کبھی سیپ چنے ہیں؟''

''یہاں سیپ ہوتے ہیں؟'' وہ ذرا حیران ہوا۔

''ہاں، تمہیں نہیں پتا؟ آؤ سیپ چنتے ہیں۔ ان سے موتی نکلیں گے؟''

''واقعی؟''

''اب دیکھتے ہیں کہ تمہارا موتی نکلتا ہے یا نہیں''۔ وہ چیلنجنگ انداز میں مسکراتی آگے بڑھ گئی۔

Downloaded From http://paksociety.com

ان دونوں کو ایک ایک سیپ ہی ملی۔ حیا نے دور بیٹھے ٹورسٹس کی ایک ٹولی سے ایک بڑا چھرا لیا جو وہ فروٹ کاٹنے کے لیے لائے تھے اور جہان کے پاس واپس پتھروں پہ آ بیٹھی۔

پہلے اس نے اپنی سیپ کھولی۔ وہ خالی تھی۔ مولسک پہ خون کے قطرے لگے تھے، اس نے مایوسی سے چھرا جہان کی طرف بڑھا دیا۔

جہان نے بلیڈ سیپ کے خول کے درز میں رکھ کر احتیاط سے اسے کاٹا اور کتاب کی مانند اسے کھول لیا۔ حیا نے گردن آگے کر کے دیکھا۔

مولسک کے خون آلود لوتھڑے کے عین اوپر قطار میں مٹر کے دانوں جتنے تین سفید موتی جگمگا رہے تھے۔

وہ متحیر سی ان چمکتے موتیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جہان نے چھری کی نوک سے موتی اُکھاڑے، ان کو پانی سے دھویا اور جیب سے ایک ٹشو نکال کر ان میں لپیٹا۔

''یہ تمہارے ہوئے''۔ اس نے ٹشو حیا کی طرف بڑھایا۔

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

''تم اتنے قیمتی موتی کسی دوسرے کو کیسے دے سکتے ہو؟'' وہ ابھی تک اسی لمحے کے زیرِ اثر تھی۔

''یہ لڑکیوں کے شوق ہوتے ہیں۔ میں ان کا کیا کروں گا''۔ وہ لاپروائی سے بولا تھا۔

''تمہیں نہیں معلوم کہ اگر یہ بہارے گل کے نکلتے تو اس کے لیے کتنی قیمتی ہوتے۔ اس کی زندگی کا واحد ''مسئلہ'' موتی ہیں جو اس کی سیپ سے کبھی نہیں نکلتے''۔ اس نے بے دلی سے ٹشو تھام لیا۔ اسے اپنے نکلے موتیوں سے زیادہ خوشی کوئی شے نہیں دے سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

شام میں وہ عائشے کے لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی، روحیل سے اسکائپ پہ بات کر رہی تھی۔ جہان دوپہر میں ہی واپس چلا گیا تھا اور وہ اس کے بعد سیدھی گھر آ گئی تھی۔

جب تک روحیل آن لائن نہیں ہوا، وہ سوچتی رہی تھی کہ تین سال پرانی بات روحیل نے کبھی کیوں نہیں بتائی۔ تین سال پہلے کیا کبھی اس نے اشاروں کنایوں میں بھی بتایا کہ اسے سیبن پھپھو کا بیٹا ملا تھا۔ اس کی ہر سوچ کا جواب نفی میں تھا۔ تین سال پہلے ان کی زندگیوں میں کیا ہو رہا تھا؟ وہ شریعہ اینڈ لاء کے دوسرے سال میں تھی۔ ان کے ایک دور کے چچا کی شادی ہوئی تھی، اور.....اور.....روحیل نے ایک دن بہت ہنگامی انداز میں کال کر کے ابا سے پیسے مانگے تھے۔

وہ ایک دم سے چونکی۔ تین، ساڑھے تین سال قبل ایک دن روحیل کا اچانک ہی فون آیا تھا، اس نے ابا سے دو یا تین لاکھ روپے منگوائے تھے۔

''ابا! میں جھوٹ نہیں بول رہا، مجھے واقعی ضرورت ہے''۔

اور ہر ''کیوں'' کے جواب میں وہ یہی کہتا کہ پاکستان آ کر بتاؤں گا۔

حیا کو اس کی پریشانی دیکھ کر پکا یقین تھا کہ اس نے کسی دوست کی کوئی قیمتی شے گم کر دی ہے اور اسی کی قیمت بھرنے کے لیے مانگ رہا ہے۔ پھر پتا نہیں روحیل نے ابا کو وجہ بتائی یا نہیں مگر اب سارے معاملے کو دوبارہ یاد کرتے ہوئے وہ سوچنے لگی کہ کیا ان دو واقعات کا کوئی باہمی تعلق تھا؟ سیدھا سیدھا پوچھا تو روحیل شاید چھپا جائے، سو اسے اندھیرے میں نشانہ باندھنا پڑے گا۔

روحیل آن لائن آ گیا تھا اور اب اس کا چہرہ اسکرین پہ نظر آ رہا تھا۔ رسمی باتوں کے بعد اس نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

''تم نے جہان کا کون سا نقصان بھرنے کے لیے ابا سے پیسے منگوائے تھے؟''

لمحے بھر کو تو روحیل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، پھر وہ ذرا حیرت سے بولا۔

''یہ تم سے کس نے کہا ہے؟''

''تم پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ تم سے جہان کا کوئی نقصان ہوا تھا نا؟ جب وہ تمہارے پاس امریکہ آیا ہوا تھا تو تم نے ابا سے پیسے منگوائے تھے''۔ اندر ہی اندر وہ خود بھی گڑبڑا رہی تھی، کیا پتا ایسی کوئی بات ہی نہ ہو۔

Downloaded From http://paksociety.com

''تم سے یہ جہان نے کہا ہے؟'' وہ اچنبھے سے پوچھ رہا تھا۔

''جس نے بھی کہا ہو، تم میرے سوال کا جواب دو، روحیل''۔

وہ چند لمحے خاموش رہا، جیسے شش و پنج میں ہو۔

''تم جہان سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں؟''

''وہ سب کچھ بتا چکا ہے مگر تم سے اس لیے پوچھ رہی ہوں تاکہ یہ جان سکوں کہ میرا بھائی مجھ سے کتنا جھوٹ بول سکتا ہے؟'' تلخ لہجے میں کہہ کر اس نے روحیل کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں واضح تملاہٹ در آئی تھی۔ جذباتی بلیک میلنگ کام کر گئی تھی۔

''بات جھوٹ بولنے کی نہیں ہے اور مجھے پتا ہے اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا، وہ بتائے گا بھی نہیں کیونکہ اس نے مجھے بھی منع کر رکھا تھا۔ پھر بھی، میں تمہیں بتائے دیتا ہوں''۔ پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''وہ ایک رات کے لیے بہت اچانک میرے پاس آیا تھا، اس کے بائیں کندھے پہ گولی لگی تھی اور اسے بروقت طبی امداد چاہیے تھی مگر وہ اسپتال نہیں جانا چاہتا تھا، سو اس کے کہنے پہ میں نے اپنی ایک ڈاکٹر فرینڈ کو بلایا جو تب اپنی ریزی ڈینس کر رہی تھی۔ اس نے میرے اپارٹمنٹ پہ جہان کو ٹریٹ کیا اور بینڈ یج وغیرہ کیا۔ پھر جہان نے مجھے بس اتنا بتایا کہ اس کے پیچھے کوئی ہے اور وہ کسی سے بھاگتا پھر رہا ہے۔ اس کے پاس ترکی کے ٹکٹ کے لیے پیسے بھی نہیں تھے، سو اس کے پیسے مانگنے پہ میں نے ابا سے کہہ کر راتوں رات پیسے ارینج کیے تھے۔ وہ صبح ہوتے ہی واپس ترکی چلا گیا پھر ہفتے بعد ہی اس نے پیسے واپس بھجوا دیے۔ بس یہی بات تھی''۔

وہ حق دق سنے جا رہی تھی۔

''ابا کو پتا ہے اس بات کا؟''

''نہیں اور تم مت بتانا۔ وہ پہلے ہی جہان سے متنفر رہتے ہیں۔ یہ بات بتائی تو.....''

''وہ تو بس جہان کی لاپروائی کی وجہ سے اس سے کھنچے کھنچے سے تھے مگر اب ایسا نہیں ہے''۔

''نہیں، وہ کسی اور بات پہ اس سے برگشتہ تھے، اب مت پوچھنا کہ وہ کیا بات تھی۔ میں ابھی جلدی میں ہوں، بعد میں بتا دوں گا، مگر اتنا یقین رکھو کہ وہ جس زخمی حالت میں میرے پاس آیا تھا، مجھے وہ اسی دن سے اچھا لگنے لگا تھا اور میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ سچ بول رہا تھا جب اس نے اس رات مجھے کہا تھا کہ روحیل، آئی ایم ناٹ دی بیڈ گائے، بلکہ جو میرے پیچھے ہیں، وہ برے ہیں''۔

''اور وہ دوسری بات؟'' اس نے اصرار کرنا چاہا مگر روحیل اسے کوئی موقع دیئے بغیر میز سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ اسے باہر جانا تھا اور وہ جلدی میں تھا۔

حیا نے بے دلی سے لاگ آؤٹ کیا۔ اس کا دل ایک دم بہت بوجھل ہو گیا تھا۔

اس کے گھر والے اس کو چھوٹا سمجھ کر اس سے اتنی باتیں چھپاتے کیوں تھے آخر؟

☆ ☆ ☆

عائشے نے لیٹتے ہوئے بہارے پہ کمبل برابر کیا، پھر ایک نظر اسے دیکھا جو بہارے کے اس طرف لیٹی، چھت کو تکے جا رہی تھی۔ وہ تینوں یوں سوتیں کہ بہارے درمیان میں ہوتی۔

''عائشے!'' اس نے عائشے کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کیا تھا یا شاید وہ اسے پکارنے کا ارادہ پہلے سے رکھتی تھی۔

''کہو!'' عائشے پہلو کے بل لیٹی، نرمی سے بہارے کے گھنگھریالے بالوں کو سہلا رہی تھی۔

''میری سیپ سے موتی کیوں نہیں نکلتے؟ میں اتنا جھوٹ تو نہیں بولتی''۔ وہ چھت کو تکتی کہنے لگی۔

''تم بہارے کے فلسفے کو ذہن سے نکال دو۔ یہ تو رزق ہوتا ہے۔ کبھی نکل آتا ہے تو کبھی نہیں''۔

چند لمحے کمرے کی تاریکی میں ڈوب گئے جس میں سبز نائٹ بلب کی مدھم روشنی پھیلی تھی۔ بہارے کی بند آنکھوں سے سانس لینے کی آواز ہولے ہولے ابھرتی رہی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''عائشے''۔اس نے اسی طرح چھت کو تکتے ہوئے پھر سے پکارا۔''کیا مجھے دُنیا نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

''پتا نہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں بہت دور نکل آتی ہوں، اتنی دور کہ میں ان باتوں سے خود کو ریلیٹ نہیں کر پاتی، جو تمہاری زندگی کا حصہ ہیں''۔

''حیا! دور ہمیشہ ہم جاتے ہیں۔اللہ دور نہیں جاتا''۔

وہ نگاہوں کا زاویہ موڑ کر عائشے کو سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

''اگر تمہیں لگتا ہے کہ دوریاں بہت بڑھ گئی ہیں تو انہیں ختم کرنے کی کوشش میں پہل بھی تمہیں کرنی ہوگی''۔

''کیسے؟'' وہ بے اختیار بول اُٹھی۔

''تم کیا کرنا چاہتی ہو؟''

''میرا بازو مجھ سے روز یہ سوال کرتا ہے کہ میں کون ہوں، میں چاہتی ہوں کہ میرے پاس اس کے سوال کا کوئی اچھا جواب ہو۔ میں زندگی میں کچھ اچھا کرنا چاہتی ہوں''۔

''اس لیے تاکہ تمہاری سیپ سے موتی نکل آئیں؟''

''نہیں''۔وہ ذرا خفت زدہ ہوئی۔''بلکہ اس لیے تاکہ مجھے اس آگ میں کبھی نہ جلنا پڑے جس سے مجھے اب بہت ڈر لگتا ہے''۔

''پھر اس فاصلے کو سمیٹنے کی کوشش کرو''۔

''کیسے؟''

''حیا، یہ جو ہمارا اللہ سے فاصلہ آجاتا ہے نا، یہ سیدھی سڑک کی طرح نہیں ہوتا۔ یہ پہاڑ کی طرح ہوتا ہے۔اس کو بھاگ کر طے کرنے کی کوشش کروگی تو جلدی تھک جاؤ گی، جست لگاؤ گی تو درمیان میں گر جاؤ گی، اُڑنے کی کوشش کروگی تو ہوا ساتھ نہیں دے گی''۔

عائشے سانس لینے کو لمحہ بھر کے لیے رُکی۔

''یہ فاصلہ بے بی اسٹیپس سے عبور کیا جاتا ہے۔چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا کر چوٹی پہ پہنچا جاتا ہے۔کبھی بھی درمیان میں پلٹ کر نیچے اُترنا چاہو گی تو پرانی زندگی کی کشش ثقل کھینچ لے گی اور قدم اُترتے چلے جائیں گے اور اوپر چڑھنا اتنا ہی دشوار ہوگا مگر ہر اوپر چڑھتے قدم پہ بلندی ملے گی۔سو بھاگنا مت، جست لگانے کی کوشش بھی نہ کرنا۔بس چھوٹے چھوٹے اچھے کام کرنا اور چھوٹے چھوٹے گناہ چھوڑ دینا''۔

عائشے گل کا چہرہ مدھم سبز روشنی میں دمک رہا تھا۔وہ اتنا نرم بولتی کہ لگتا جیسے گلاب کی پنکھڑیاں اوپر سے گر رہی ہوں، جیسے شہد کی ندی بہہ رہی ہو، جیسے شام کی بارش کے ملائم قطرے ٹپک رہے ہوں۔

''تو میں کیا کروں؟''

''تم اپنی کوئی بہت محبوب شے اللہ تعالیٰ کے لیے قربان کردو''۔

اس کی بات پہ حیا نے لمحے بھر کے لیے سوچا۔اس کے پاس ایسی کون سی شے تھی؟

''سبانجی کے ڈروم میں میرے پاس ایک ڈائمنڈ رنگ پڑی ہے، وہ بہت قیمتی ہے''۔

''قیمتی چیز نہیں، محبوب چیز قربان کرو۔ضروری نہیں ہے کہ تمہاری محبوب چیز قیمتی بھی ہو''۔وہ مسکرا کر بولی۔''اور میں بتاؤں کہ ہماری محبوب ترین شے کیا ہے؟''۔

''کیا؟''

''تمہاری انا۔تم اسے قربان کردو''۔

''مگر کس کے لیے؟'' وہ ذرا حیرت سے بولی۔

''اپنے چچا کی کسی بیٹی کے لیے۔تمہارے کوئی چچا اور ان کی بیٹیاں ہیں؟'' حیا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''تم ان کے لیے وہ کرو جو تم کبھی نہیں کرتیں۔ سب سے مشکل قربانی دینا چچا کے بچوں کے لیے ہوتا ہے، کیونکہ سب سے زیادہ مقابلہ ان سے رہتا ہے اور سب سے زیادہ ناقدرے بھی وہی ہوتے ہیں''۔

''میں ان کے لیے کیا کروں؟ میں ان سے کبھی زیادتی نہیں کرتی۔ بس میں ان کے طنز کے جواب میں زبان پہ آئے طنز کو روک نہیں پاتی''۔

''حیا! یہ جو چھوٹے چھوٹے طنز اور طعنے ہوتے ہیں نا، ان سے بچا کرو۔ مکہ میں چند بڑے بڑے سردار تھے، جو یونہی چھوٹے چھوٹے طنز کر جاتے تھے، پھر کیا ہوا؟ وہ بدر سے پہلے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں سے مر گئے۔ کوئی خراش سے مرا تو کوئی چھوٹے سے پھوڑے سے۔ تم اپنی کزن کے لیے اپنی انا کی ضرب کو بھول جاؤ''۔

''میں کوشش کروں گی۔ ویسے عائشے!'' وہ ذرا سا مسکرائی۔ ''تم بہت پیاری ہو''۔

جواباً عائشے دھیرے سے ہنس دی۔

''تم بھی بہت پیاری ہو حیا!''

''اور میں بھی بہت پیاری ہوں''۔ بہارے نے بند آنکھوں سے کہا تو وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

''گندی بچی! تم جاگ رہی تھیں؟ چلو سو جاؤ۔ صبح کام پہ بھی جانا ہے''۔

عائشے نے بہارے کو مصنوعی خفگی سے ڈانٹتے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آف کیا، سبز روشنی غائب ہو گئی۔ کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

صبح سویرے کچن سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کھلے بال اُنگلیوں سے سمیٹ کر جوڑے میں لپیٹتی چوکھٹ تک آئی۔

عائشے کرسی پہ بیٹھی تھی اور اپنے آگے کھڑی بہارے کے بال بنا رہی تھی۔ آج گھر کے کام تھے، سو جنگل نہیں جانا تھا تو بہارے باہر جدیسی (گلی) میں بچوں کے ساتھ کھیلنے جا رہی تھی۔

''اب بہارے گل اکیلی جائے گی تو اچھی لڑکی بن کر جائے گی، ٹھیک ہے نا؟'' عائشے نرمی سے تائید چاہتی اس کی چوٹی گوندھ رہی تھی۔

''ٹھیک!'' بہارے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور اچھی لڑکیاں جب بازار سے گزرتی ہیں تو نظریں جھکا کر گزرتی ہیں''۔

''ایسے اگر ٹھوکر لگ جائے تو؟''

عائشے نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے چوٹی کے آخری بل ایک دوسرے میں گوندھے۔

''جو لڑکی اللہ کی بات مانتی ہے، اسے اللہ ٹھوکر لگنے نہیں دیتا''۔

''اور جو نہیں مانتی؟''

''اسے لگنے دیتا ہے''۔ اس نے پونی باندھ کر نچلے بالوں کو برش کیا۔ پھر شانوں سے تھام کر بہارے کا رُخ اپنی جانب کیا۔

''اور اچھی لڑکیاں جب باہر نکلتی ہیں تو کیسے چلتی ہیں؟'' بہارے کی پیشانی کے بال نرمی سے سنوارتے اس نے روز کا دُہرایا جانے والا سبق پھر سے پوچھا۔

''وہ ان دو لڑکیوں کی طرح چلتی ہیں جو کنویں پہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی تھیں''۔

''اور وہ دو لڑکیاں کیسے چل رہی تھیں؟'' اس نے بہارے کی بھوری گھنگھریالی لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔

''حیا کے ساتھ.....''

''اور عمر بن خطابؓ نے کیا کہا تھا۔ حیا والی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں؟''

''وہ ہر جگہ نہیں چلی جاتیں، ہر بات نہیں کر لیتیں۔ ہر کسی سے نہیں مل لیتیں''۔ بہارے نے اُنگلیوں پہ تینوں نکات جلدی جلدی دُہرائے، جیسے اسے بھاگنے کی جلدی ہو۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اور یاد رکھنا کہ جب تم میں حیا نہ رہے، تو پھر جو جی چاہے کرنا''۔ بظاہر نرمی سے کہتے عائشے کی آنکھوں میں وہ تنبیہ ابھری جو بہارے کو سیدھا رکھتی تھی۔

بہارے نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ کر باری باری عائشے کے دونوں رُخسار چومے۔

''عائشے گل! بہارے گل تم سے بہت پیار کرتی ہے''۔

وہ بھاگ کر دروازے میں آئی، تو حیا اس سے ملنے کے لیے جھکی، اس نے اسی طرح حیا کے دونوں گال چومے۔

''حیا سلیمان! بہارے گل تم سے بہت پیار کرتی ہے''۔ کہہ کر وہ باہر بھاگ گئی۔

''تم بہت محنت کرتی ہو، اس کی ذہن سازی کے لیے''۔ وہ آگے چلی آئی۔ وہ جب تک بیدار ہوتی تھی، وہ دونوں بہنیں حلیمہ آنٹی کے گھر سے قرآن پڑھ کر آ چکی ہوتی تھیں۔

''کرنی پڑتی ہے۔ چھوٹی لڑکیاں تو نرم ٹہنی کی طرح ہوتی ہیں۔ جہاں موڑو، مڑ جائیں گی، اگر وقت گزرنے کے ساتھ ٹہنی رنگ بدل لے، سوکھ بھی جائے تو بھی اس کا رُخ وہی رہتا ہے مگر جو بڑی لڑکیاں ہوتی ہیں نا، وہ کانچ کی طرح ہوتی ہیں۔ اسے موڑو تو مڑتا نہیں ہے، زبردستی کرو تو ٹوٹ جاتا ہے۔ کانچ کو تراشنا پڑتا ہے اور جب تک اس کی کرچیاں نہیں ٹوٹتیں اور اپنے ہاتھ زخمی نہیں ہوتے، وہ مرضی کے مطابق نہیں ڈھلتا''۔

''صحیح کہہ رہی ہو''۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اچھا فون کدھر ہے؟ میرا کریڈٹ ختم ہے۔ پاکستان فون کرنا تھا''۔

''اوہ سوری! یہ پڑا ہے، عبدالرحمان کا فون آیا تھا تو میں نے ادھر ہی رکھ دیا اور یہ تمہاری چائے''۔ اس نے کارڈلیس فون اور حیا کے ناشتہ کا واحد جز چائے اس کے سامنے رکھی۔

''کیا کہہ رہا تھا وہ؟'' بے اختیار ہی وہ پوچھ اُٹھی۔ حالانکہ اسے پاشا میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

''بس کچھ پیپرز کا پوچھ رہا تھا۔ اس کے کمرے میں رکھے تھے''۔

''بہارے تو خوش ہوئی ہوگی اس سے بات کر کے''۔

ناشتے کے برتن سمیٹتی عائشے کے ہاتھ ذرا سست پڑے۔ ایک آزردگی اس کے چہرے پہ بکھر گئی۔

''تم بہارے کو مت بتانا۔ میں نے بھی اسے نہیں بتایا۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے فون نہیں کرتا، اپنے کام کے لیے کرتا ہے بس''۔ وہ اُداسی سے سر جھٹک کر کام کرنے لگی۔

حیا خاموشی سے فون اور چائے کا کپ لیے باہر آ گئی۔ گھاس پہ شبنم کے قطروں کی چادر چڑھی تھی۔ بہار کے پھول ہر سُو خوشبو بکھیرے ہوئے تھے۔ وہ گھاس پہ بیٹھ کر چائے کے گھونٹ بھرتی تایا فرقان کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

فون ارم نے ہی اُٹھایا۔ دُعا، سلام اور رسمی سے حال احوال کے بعد وہ بہت چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تمہیں آج کیسے خیال آ گیا فون کرنے کا؟''

عام دنوں میں حیا کو اس فقرے سے زیادہ تپ کسی شے سے نہیں چڑھتی تھی۔ انسان جب کسی کو فون کرے، چاہے سال بعد ہی سہی تو وہ اگلے کا خیال کر کے ہی فون کرتا ہے۔ اس پہ کسی گلے سے بات کا آغاز کرنا مخاطب کو یہ کہنے کے برابر ہے کہ آئندہ یہ خیال کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، مگر اس نے اب زندگی میں اتنی تکلیف سہہ لی تھی کہ اسے محسوس نہیں ہوا، یا پھر وہ خود ہی نظر انداز کر گئی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو، میں بھی بس مصروفیت کے باعث کر ہی نہیں پاتی۔ تم سناؤ کیسی ہو؟ اور ہاں، منگنی کی بہت مبارک ہو''۔

''بہت شکریہ!'' ارم کا لہجہ خاصا روکھا تھا۔

چند چھوٹی چھوٹی نرم سی باتیں کر کے اور ارم کی چھوٹی چھوٹی تند باتوں کو نظر انداز کر کے اس نے فون رکھا تو اس کا دل پہلے سے بہت ہلکا تھا۔

☆ ☆ ☆

Downloaded From http://paksociety.com

اس روز شام میں عائشے اور بہارے جب اپنے جاننے والوں میں کسی کی فوتگی پہ گئی تھیں تو حیا نے گھر ٹھہرنا زیادہ مناسب سمجھا، مگر اب تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔

وہ سارا دن اکٹھی ہوتی تھیں، پھر رات کو ہوٹل گرینڈ کے گارڈز گیٹ پہ اور دو گارڈز جدیسی (گلی) کے سرے پہ آ کر پہرہ دیتے تھے تو ایک تحفظ کا احساس گھیرے رہتا تھا۔ البتہ اب وہ بہت تنہائی محسوس کر رہی تھی۔

پہلے تو وہ اوپر اسٹڈی روم میں آ گئی، جہاں اس کی تصاویر دیواروں پہ آویزاں تھیں۔ اسے یوں اپنی تصاویر ادھر دیکھ کر ہمیشہ بہت کوفت ہوتی تھی۔

وہ میٹرو اسٹیشن کی سیڑھیوں کے دہانے پہ ذرا سی لڑکھڑائی تھی۔ ٹوٹی سرخ جوتی پاؤں سے لٹک رہی تھی۔

وہ اپنے سنہری سکوں والے فراک میں پاشا کی سیاہ کار سے نکل رہی تھی۔

اور بھی ترکی اور پاکستان کی بہت سی تصاویر، پاشا کے بندے ہر پل اس کا تعاقب کرتے تھے۔ اسے یقین تھا۔ وہ بے دلی سے باہر آ گئی۔ اس کو بلیک میل کرنے کے لیے اس نے بہت سا سامان اکٹھا کر رہا تھا مگر کوئی کمزوری تو پاشا کی بھی ہوگی۔

کچھ سوچ کر اس نے گردن اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ گول چکر کھاتا لکڑی کا زینہ تیسری منزل تک جاتا تھا۔ وہاں پاشا کا کمرہ تھا۔ بہارے بات بے بات ذکر کرتی۔ راہداری کا آخری کمرہ۔ وہ ادھر گئی تو نہیں تھی۔ مگر جانے میں حرج بھی نہ تھا۔ اسے اس گھر کے بارے میں جتنا پتا ہوتا اچھا تھا۔

وہ ننگے پاؤں زینے چڑھتی اوپر آئی۔ چابیوں کا گچھا اس نے عائشے کی دراز سے نکال لیا تھا۔ آخری کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے چابیاں لگانی شروع کیں۔ چوتھی چابی پہ لاک کھل گیا۔ اس نے دھیرے سے دروازہ دھکیلا۔

وہ بہت شاہانہ طرز کا بیڈ روم تھا۔ اونچی چھت، جھلملاتا فانوس۔ دیوار گیر کھڑکی کے ہلکے سرمئی مخملیں پردے۔ قالین بھی سرمئی۔ سارا کمرہ گہرے نیلے اور سرمئی شیڈز میں آراستہ کیا گیا تھا۔

کمرے میں پرفیوم کی خوشبو پھیلی تھی۔ خوشبو پرفیوم کے بے حد قیمتی ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی نازک شیشیوں کو دیکھا۔ ایک سے ایک مہنگا پرفیوم ادھر رکھا تھا۔

وہ ادھر اُدھر کمرے میں ٹہلتی ہر شے کا جائزہ لیتے ہوئے الماریوں کی طرف آئی۔ ایک ایک کر کے اس نے پانچوں پٹ کھولنے کی کوشش کی..... پہلے چار لاکڈ تھے۔ آخری کھلا تھا۔ اس نے پٹ کھولا تو اندر بہت سے قیمتی، نفیس تھری پیس سوٹ ہینگرز میں لٹکے تھے۔ نچلے خانے میں ایک بریف کیس رکھا تھا۔

اس نے احتیاط سے بریف کیس اُٹھایا اور بیڈ پہ آ بیٹھی۔ بریف کیس لاکڈ نہیں تھا۔ حیا نے اسے کھولا۔ اندر چند فائلز رکھی تھیں اور اوپر ایک نوٹ پیڈ پہ سیاہ روشنائی سے ترکی میں کچھ نام فہرست کی صورت میں لکھے تھے۔ وہ فہرست اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ تب ہی بریف کیس میں سے بیپ کی آواز آنے لگی۔ وہ چونکی، اندر کچھ بج رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے کاغذ اندر ڈالا تو انگوٹھے پہ ایک حرف کی سیاہ روشنائی لگ گئی۔ بہت تیزی سے بریف کیس کو واپس رکھ کر بستر کی چادر کی شکن درست کرتی وہ باہر نکل آئی۔

کمرہ لاک کر کے جب وہ زینے اُتر رہی تھی تو لاؤنج کا فون بج رہا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی نیچے آئی اور فون اُٹھایا۔

''ہیلو؟''

جواباً لمحے بھر کو خاموشی چھائی رہی۔ پھر ایئر پیس میں سے عبدالرحمان پاشا کی آواز گونجی۔

''عائشے کدھر ہے؟''

''وہ دونوں کسی کے گھر گئی ہیں''۔ وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

چند لمحے کے لیے وہ خاموش رہا۔ پھر بولا تو اس کی آواز بے حد سرد تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''آئندہ اگر آپ میرے کمرے میں گئیں یا میرے بریف کیس کو کھولنے کی کوشش کی تو اپنے پیروں پہ گھر نہیں جا سکیں گی، سمجھیں؟'' بہت ضبط سے بولا تھا۔

حیا کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس نے گھبرا کر ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا۔ پھر انگوٹھے پہ لگے سیاہی کے دھبے کو کپڑے سے رگڑ کر گویا ثبوت مٹانے کی کوشش کی۔

عبدالرحمان کو کیسے علم ہوا؟ اس کا دماغ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ البتہ اس کے اندر کوئی اسے کہہ رہا تھا کہ اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے، لیکن قصر بیوک اداوران بہنوں کی کشش..... وہ عجیب مخمصے میں پڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

''یہ اداچائے کے کھیت ہیں''۔ اگلے روز عائشے نے اسے اپنی ایک عزیزہ کبریٰ خانم کا لہلاتا ہوا کھیت دکھاتے ہوئے بتایا تھا۔

''اداچائے کیا ہوتی ہے؟'' اس نے اس پودے کے ترکی نام کا مطلب پوچھا۔

''اداالعنی جزیرہ، اور چائے یعنی ٹی''۔

''اوراچھا..... ہم بھی ٹی کو چائے ہی کہتے ہیں''۔ وہ دھیرے سے ہنس دی۔ کبریٰ خانم ایک معمر خاتون تھیں۔ ان کی فصل تیار تھی مگر ان کے پاس کوئی ہیلپر نہ تھا جو ان کے ساتھ فصل چنتا، سو عائشے کے کہنے پہ حیا نے لکڑیاں کاٹنے کے بجائے کبریٰ خانم کے ساتھ اداچائے کے پتے چننے شروع کر دیے۔ چمکتے سورج اور ٹھنڈی ہوا کے امتزاج میں کام کرنا مشقت طلب تھا۔ مگر وہ اس فطرت کے قریب ماحول میں خوش تھی۔ کبریٰ خانم سے وہ چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتی رہی تھی اور جو باتیں وہ عبدالرحمان پاشا کے بارے میں کر جاتی، وہ انہیں ذہن میں محفوظ کرتی جاتی۔ اسے ہوٹل گرینڈ کے معاملات میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔ وہ اب تنہا کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ ورنہ کئی دفعہ اس کا جی ہوٹل گرینڈ کا چکر لگانے کو چاہا تھا۔ واپس جانے کا ارادہ اس نے فی الحال ملتوی کر دیا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہتی تھی کہ بیوک ادا میں کچھ ہے۔ کچھ ایسا جو اسے اگر معلوم ہو گیا تو اس کے پاس ایک قیمتی ہتھیار آ جائے گا جو مستقبل میں اس کے کام آ سکتا ہے۔

شام میں وہ تینوں ساحل کنارے چٹائی پہ بیٹھی تھیں۔ عائشے کو آج دو سیپ ملے تھے۔ سو وہ انہیں کھول رہی تھی۔ حیا اب بڑے سیپ نہیں چنتی تھی۔ بلکہ بادام کے سائز کی سیپوں کے خالی خول ریت سے اُٹھا لیتی اور اب ان ہی کے ڈھیر کو لیے وہ ایک مالا میں پرو رہی تھی۔ ساتھ ہی بہارے اپنے پزل باکس کے سلائیڈز کو اوپر نیچے کر رہی تھی۔

''حیا.....! میں اسے کبھی نہیں کھول پاؤں گی''۔ اس کا لہجہ مایوس کن تھا۔ حیا نے ننھے خول کو سوئی میں پروتے سر اُٹھا کر اس کا اُداس چہرہ دیکھا۔ پھر گردن آگے جھکا کر اس پہ لکھی نظم کو پڑھا۔ ''یہ بہت آسان ہے بہارے۔ ٹھہرو..... میں تمہیں ایک ہنٹ دیتی ہوں''۔

اس نے دوبارہ سے وہ نظم پڑھی۔ پھر سمجھ کر بولی۔ ''یہ ایک سفید چھوٹی سے آنکھ ہے جو چاندی کے صندوق میں بند ہوتی ہے اور وہ صندوق نمکین گہرائی میں رکھا ہوتا ہے۔ بہارے! وہ کون سی گہرائی ہے جو نمکین ہوتی ہے؟''

بہارے جو اُداس نظروں سے پزل باکس کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دم چونکی۔

۞.....۞.....۞

Downloaded From http://paksociety.com

باب 7

''مرمرا..... سمندر..... نمکین پانی''۔

عائشے نے مسکرا کر ان کو دیکھتے ہوئے چھرا اپنے سیپ کے ایک طرف رکھا۔

''ہاں تو بہارے، وہ کیا چیز ہے جو پانی کے اندر ایک صندوق میں ریت کے ذرے سے بنتی ہے؟''۔

''حیا..... حیا..... وہ مٹی کے ذرے سے بنتا ہے..... اور..... اور اس کا صندوق جب قتل کیا جاتا ہے تو..... چھرا گھونپ کر قتل.....'' وہ جوش سے بے ربط جملے بولتی عائشے کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جو ایک چاندی سے چمکتے سیپ میں چھرا چلا رہی تھی۔ سیپ کا خول چٹخا۔ عائشے نے کتاب کی طرح سے اسے کھولا۔ اندر دم توڑتے جانور پہ ایک سفید موتی جگمگا رہا تھا۔

''موتی..... پرل..... پورے پانچ حروف.....''۔ بہارے خوشی سے چلائی اور پھر جلدی جلدی ڈبے کے کوڈ بار کی سلائیڈز اوپر نیچے کرنے لگی۔ وہ اب اس پہ Pearl لکھ رہی تھی۔

حیا اور عائشے بے اختیار اپنا کام چھوڑ کر آگے ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ جیسے ہی بہارے آخری حرف ''ایل'' سامنے لائی، کلک کی آواز کے ساتھ باکس کے سائیڈ سے دروازہ باہر کو کھلا۔ حیا کی توقع کے برعکس وہ باکس اوپر ڈھکن کے بجائے سائیڈ کی دراز سے کھلتا تھا۔

دراز میں سیاہ مخملیں کپڑا بچھا تھا اور اس پہ ایک نازک سا نیکلس رکھا تھا۔ نیکلس دراصل پلاٹینم کی زنجیر تھی۔ جس پر ہر دو کڑیاں چھوڑ کر ننھے ننھے ہیرے لٹک رہے تھے۔ زنجیر کے بالکل وسط میں ہیرے کے بجائے تین کڑیاں لٹکتی تھیں جن کے آخر سرے پہ ایک سفید موتی پرویا ہوا تھا۔

وہ تینوں مبہوت سی اس بیش قیمت، جگمگاتے ہوئے نیکلس کو دیکھ رہی تھیں۔

''بہارے! یہ تو وہی موتی ہے جو تمہاری سیپ سے نکلا تھا۔ جو تم نے عبدالرحمٰن کو دے دیا تھا''۔ عائشے ششدر سی اس موتی کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''ہاں یہ تو وہی ہے۔ عبدالرحمٰن نے وہ مجھے گفٹ کر دیا''۔

''اور وہ بھی اتنے خوب صورت انداز میں''۔ حیا بس اتنا ہی کہہ سکی۔ اسے اس تحفے اور اس تحفے کو دینے کے انداز نے بہت متاثر کیا تھا۔

بہارے نے اپنی ننھی انگلیوں سے نیکلس اٹھایا اور گردن سے لگایا، پھر چہرہ اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔

''یہ کیسا لگ رہا ہے؟''۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''بہت پیارا''۔

''عبدالرحمٰن نے مجھے کتنا پیارا گفٹ دیا ہے۔ اللہ، اللہ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا''۔ وہ اپنے پرس سے آئینہ نکال کر اب ہر زاویے سے اس کو اپنی گردن سے لگا لگا کر دیکھ رہی تھی۔

''تم عبدالرحمٰن کو ضرور تھینک یو کرنا''۔

''اللہ..... اللہ!'' بہارے کی خوشی بیان سے باہر تھی۔ ''حیا! میں تم سے بھی خوب صورت لگ رہی ہوں، ہے نا''۔

''ہاں! تم مجھ سے بھی خوب صورت لگ رہی ہو''۔ وہ مسکرا کر اسے تسلی دیتی سیپ کے خول اٹھانے لگی۔ ابھی اسے پوری مالا بنانی تھی۔

''حیا! تم میری تصویر کھینچو۔ میں اسے سر پہ کراؤن کی طرح پہنتی ہوں۔ کیونکہ میں پرنسس ہوں''۔ وہ نیکلس اپنے سر پہ تاج کی طرح پہنے اٹھ کر ساحل پہ جا کھڑی ہوئی۔ اس نے وہ تحفہ دو، ڈھائی ماہ بعد کھولا تھا۔ سو آج اس کا دن تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''دھیان سے بہارے! ہوا تیز ہے''۔ سمندر کی طرف پشت کیے کھڑی بہارے نے عائشے کی بات نہیں سنی تھی۔ حیا نے موبائل نکال کر کیمرا آن کیا۔ پھر موبائل چہرے کے سامنے لا کر بہارے کو فوکس کیا۔

''پرنسس! اب تم ذرا مسکراؤ''۔

بہارے بڑے معصوم انداز میں مسکرا دی۔ اسے بے اختیار بیوک ادا کے بازار میں سڑک کے وسط میں کھڑی بہارے یاد آ گئی، جس کے گرد سیاحوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ ریڈ کارپٹ شو پھر سے شروع ہو گیا تھا۔

اسی لمحے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ساتھ پانی بھی۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کسی کی کچھ بھی سمجھ میں آتا، بہارے کے سر سے نیکلس اُڑتا ہوا پانی میں جا گرا۔ وہ بوکھلا کر پلٹی اور پھر اس کی چیخیں ہر سو بلند ہوئیں۔

حیا تیزی سے اُٹھی۔ گود میں رکھی لڑی گر گئی۔ سیپوں کے خول بکھر گئے۔ وہ بھاگ کر پانی میں آئی۔ بہارے چیختی ہوئی پانی میں ہاتھ مارتی اپنا نیکلس تلاش کر رہی تھی۔ جو لہر اس کا نیکلس چھین کر لے گئی تھی۔ وہ واپس جا رہی تھی۔ حیا ننگے پیر بھاگتی ہوئی لہر کے پیچھے گئی، مگر پانی جیت گیا، لہر پلٹ گئی۔ ہار پانی میں گم ہو گیا۔ بہارے زور، زور سے روتے ہوئے چیخ رہی تھی۔

''میرا نیکلس..... حیا..... میرا نیکلس.....'' عائشے پیچھے سے اسے بازوؤں میں لیے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر وہ کسی بے آب مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے خود کو چھڑا رہی تھی۔

''حیا..... آگے مت جاؤ..... پانی گہرا ہے..... وہ گم جائے گا''۔ عائشے اسے آواز دے رہی تھی، مگر وہ سب کچھ بھلائے بیوک ادا کی شہزادی کی تاج ڈھونڈ رہی تھی۔ ساحل کی گیلی ریت، پانی، سمندر، وہ پانی میں ہاتھ مارتی پوری طرح بھیگ چکی تھی، مگر نیکلس کہیں نہیں تھا۔ اس نے تھک کر اپنے عقب میں دیکھا، جہاں عائشے بمشکل آنسو روکے، تڑپتی، بلکتی بہارے کو پکڑے کھڑی تھی۔

''عائشے! میرا نیکلس..... عائشے! مجھے نیکلس واپس لا دو''۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی عائشے کے بازو خود سے ہٹانے کی سعی کر رہی تھی۔

نیکلس وہاں کہیں بھی نہیں تھا۔ اسے نمکین گہرائی واپس اپنے اندر لے گئی تھی۔ بہارے کی زندگی کا پہلا اور واحد موتی اس سے کھو گیا تھا۔

''بہارے! میں نے بہت ڈھونڈا مگر دیکھو، جو اللہ کی مرضی''۔ وہ واپس آئی اور اپنے گیلے ہاتھوں میں بہارے کے ہاتھ تھام کر کہا۔ بہارے کچھ نہیں سن رہی تھی۔ وہ گردن ادھر اُدھر مارتی چلی جا رہی تھی۔

''مجھے نیکلس واپس لا دو۔ کوئی مجھے نیکلس واپس لا دے''۔ وہ انگریزی اور پھر ترک میں ایک ہی بات دہراتی بلک بلک کر رو رہی تھی۔

حیا کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا پڑ گیا۔

اسے لگا وہ خود بھی ابھی رو دے گی۔ وہ بمشکل لب بھینچ کر ضبط کیے ہوئے تھے۔ پا کر کھو دینے کا دکھ وہ پہچانتی تھی۔ جب اس کا جنجر بریڈ ہاؤس ٹوٹا تھا۔ جب استقلال اسٹریٹ کی اس شاپ میں ڈی جے سر پکڑ کر گر گئی تھی۔ پا کر کھو دینے سے بڑا کرب کوئی نہیں ہوتا۔

اس شام وہ دونوں بمشکل بہارے کو سنبھالتی، گھر واپس لائی تھیں اور اب لونگ روم میں بڑے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ یوں کہ بہارے درمیان میں تھی اور اسے حیا نے اپنے ساتھ لگا ہوا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی اور کھڑکیوں کے پار اندھیرا اُتر آیا تھا۔ آتش دان میں مصنوعی لکڑیاں بھڑک رہی تھیں۔ بہارے اسی طرح روئے جا رہی تھی۔ اس کے پاس آنسوؤں کا مرمرا تھا جو ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

''بہارے! میں تمہیں اور نیکلس لا دوں گی''۔ وہ اسے اپنے ساتھ لگائے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''مگر وہ ایسا نہیں ہوگا''۔ وہ نفی میں سر ہلاتی روئے جا رہی تھی۔

''بالکل اس جیسا لا دوں گی..... پرامس!''۔

Downloaded From http://paksociety.com

''مگر وہ عبدالرحمٰن کا گفٹ نہیں ہوگا''۔

''عبدالرحمٰن تمہیں خود ویسا ہی نیکلس گفٹ کرے گا۔ میں اسے کہوں گی''۔

''مگر اس میں میرا موتی نہیں ہوگا۔ عائشے ..... ممی .....'' وہ روتے روتے اپنی ماں کو یاد کرتی، تو کبھی عائشے کو پکارتی۔ عائشے سر گھٹنوں پہ رکھے مغموم سی بیٹھی تھی۔

''تمہارا جب دوبارہ موتی نکلے گا تو میں اسے نیکلس میں پرو دوں گی''۔ مگر بہارے اس کی کوئی بات نہیں مان رہی تھی۔ اس کے لیے اس نیکلس کا متبادل کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ ہر شے کا متبادل نہیں ہوا کرتا۔

''بہارے! اب بس کرو''۔ جب وہ سر پٹخ پٹخ کر مزید بلند آواز میں رونے لگی تو عائشے نے برہمی سے ڈانٹا۔ ''وہ کب سے تمہیں منا رہی ہے اور تم ہو کہ بدتمیزی کیے جا رہی ہو؟''۔

جواباً بہارے نے غصے اور پانی سے بھری آنکھوں سے عائشے کو دیکھا۔

''تم mean ہو عائشے ..... تمہیں اچھا نہیں لگتا کہ عبدالرحمٰن مجھے گفٹ دے''۔

''ہا؟'' عائشے ہکا بکا رہ گئی۔ ''میں ..... میں ایسی ہوں؟ تمہیں پتا ہے، تم کیا کہہ رہی ہو؟''۔

''ہاں تم mean ہو''۔ وہ آگے بڑھ کر اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں سے عائشے کے گھٹنے پہ مکے مارنے لگی۔ حیا نے پیچھے سے اسے بازوؤں میں لیتے ہوئے ہٹایا۔

''میں نے کیا، کیا ہے؟'' عائشے روہانسی ہوگئی۔

''تم ..... تم لڑ رہی تھیں عبدالرحمٰن سے۔ وہ اسی لیے انڈیا چلا گیا ہے کیونکہ تم اس سے لڑ رہی تھیں۔ تم نے اسے تھپڑ بھی مارا تھا اور تم نے اس سے کہا تھا کہ وہ بہارے گل سے بے تکلف نہ ہوا کرے۔ وہ تمہاری وجہ سے یہاں سے گیا ہے۔ میں نے خود دیکھا تھا سوراخ سے''۔

عائشے کا چہرہ یک دم سرخ پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے بہت سے زخم اُبھرے۔

''سنو بہارے!'' وہ آگے بڑھی اور ایک دم بے حد جارحانہ انداز سے بہارے کے کندھے دبوچ کر اس کا چہرہ سامنے کیا۔

''عبدالرحمٰن ہمارا نہیں ہے اور وہ جلد یا بدیر ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جائے گا''۔

''تم گندی ہو، تم جھوٹ بول رہی ہو''۔

''میں جھوٹ نہیں بولتی، میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ اب میری بات غور سے سنو''۔ اس نے غصے سے بہارے کو جھٹکا دیا۔

''عبدالرحمٰن مر گیا ہے ہمارے لیے''۔ ایک جھٹکے سے اس نے بہارے کے کندھے چھوڑے اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی اوپر چلی گئی۔

بہارے کے آنسو ایک دم سے رُک گئے۔ وہ بالکل ساکت و جامد ہو چکی تھی۔ لب آپس میں پیوست کیے، وہ گویا سانس روکے بیٹھی تھی۔

''بہارے!'' اس نے تاسف سے اسے پکارا۔

وہ ایک دم اُٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

حیا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ان کے مشترکہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا اور بہارے بیڈ پہ چت لیٹی نظر آ رہی تھی۔ ابھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ سو وہ عائشے کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

عائشے چھت پہ تھی۔ وہ ٹیرس کی ریلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اُس کے پیچھے کھلا سیاہ آسمان تھا اور نیچے جدیسی کے اونچے پولز کی مدھم بتیاں۔ اندھیرے میں بھی وہ اس کے سیاہ اسکارف میں دمکتے چہرے پہ لڑھکتے آنسو دیکھ سکتی تھی۔ اسے بے اختیار ڈی جے یاد آئی، جب وہ ان سے ناراض ہو کر اسٹڈی میں چلی گئی تھی۔

''عائشے!'' وہ دُکھی دل سے کہتی اس کے ساتھ آ بیٹھی اور ہولے سے اس کا ہاتھ تھاما۔ عائشے نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔ وہ بس اپنے گھٹنوں کو دیکھتی بے آواز روئے گئی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''عائشے! یوں مت روؤ۔ وہ بچی ہے۔ اس نے یوں ہی کہہ دی وہ بات۔ مجھے پتا ہے، تم کسی سے نہیں لڑ سکتیں''۔

''بہارے ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں واقعی عبدالرحمٰن سے لڑی تھی، مگر صرف اس وقت جب میں بہت پریشان تھی لیکن وہ میری وجہ سے واپس نہیں گیا۔ وہ ہماری وجہ سے کچھ نہیں کرتا۔ وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کرتا ہے لیکن میں کیا کرتی؟ مجھ سے آنے کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی''۔

''کیا ہوا آنے کو؟'' عائشے نے بھیگی نگاہیں اُٹھا کر اسے دیکھا۔

''کیا تمہیں عبدالرحمٰن نے بتایا ہے کہ اس کا ایک بھائی بھی ہے؟''۔

''نہیں!'' وہ بری طرح سے چونکی۔

''میں اور بہارے اپنے والدین کے ساتھ اناطولیہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ایک سال پہلے ہمارے والدین کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تو ہماری سب سے قریبی عزیزہ، یعنی ہماری دادی (آنے) ہمیں ادھر لے آئیں۔ یہ گھر آنے کا اپنا نہیں تھا۔ یہ گھر آنے کے والد کی ملکیت تھا۔ بعد میں یہ نسل در نسل چلتا میرے باپ اور پھر مجھ تک آیا۔ آنے کے دونوں بیٹوں نے اس سے اپنا حصہ نہیں لیا۔ سو آنے نے قانونی کارروائی کے بعد اسے میرے نام کر دیا۔ جب ہم یہاں آئے تھے، تب یہاں صرف آنے اور عبدالرحمٰن رہتے تھے، مگر مجھے یاد تھا کہ آنے کا ایک اور بیٹا بھی تھا۔ تب آنے نے بہت دُکھ سے بتایا کہ ان کا دوسرا بیٹا ہمارے آنے سے چند ماہ قبل گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کیوں، کیسے، عبدالرحمٰن لاعلم تھا۔ مگر آج سے تین ماہ قبل مجھے کسی نے بتایا کہ وہ عبدالرحمٰن کے آفس میں جاتے دیکھا گیا ہے اور یہ کہ وہاں سے کسی جھگڑے کی آواز آ رہی تھی۔ تب میں عبدالرحمٰن سے بہت لڑی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بھائی کدھر ہے مگر اس نے ہم سب سے جھوٹ بولا۔ آنے کو تو ابھی تک نہیں معلوم کہ عبدالرحمٰن اس کے بارے میں جانتا ہے''۔

''مگر اس کا بھائی کہاں گیا؟''۔

''یہی تو میں نے عبدالرحمٰن سے پوچھا تھا مگر وہ کسی بات کا ٹھیک جواب دے تب نا۔ وہ کہتا ہے اس نے اپنے بھائی کو نہیں نکالا، وہ خود سب کچھ چھوڑ کر گیا ہے۔ پہلے تو ان دونوں کی بہت دوستی تھی۔ عبدالرحمٰن پانی کی طرح اس پہ پیسہ بہایا کرتا تھا، پھر ایک دم سے وہ کیوں سب کچھ چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ آنے اس کو بہت یاد کرتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسے ان کے لیے کچھ کروں''۔

''تم نے دیکھا ہوا ہے ان کے دوسرے بیٹے کو؟''۔

''جب میں گیارہ سال کی تھی تب آخری بار اسے اپنے سامنے دیکھا تھا۔ پتا نہیں وہ اب کہاں ہوگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ استنبول میں ہی ہے، مگر ہوٹل گرینڈ میں عمومی تاثر یہی ہے کہ وہ یونان چلا گیا اور وہاں پہ ہوٹل گرینڈ کی چین میں کام کر رہا ہے مگر یقین مانو، یونان میں ہمارے ہوٹل کی کوئی شاخ نہیں ہے''۔ وہ اب رو نہیں رہی تھی مگر اس کی آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی۔

''عائشے! تم اور بہارے عبدالرحمٰن کی اتنی تعریفیں کرتے ہو، میں نے تم سے کبھی یہ نہیں کہا مگر آج مجھے یہ کہنے دو کہ وہ استنبول میں خاصا بدنام ہے۔ لوگ اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتے''۔

''میرا دل ان باتوں کو نہیں مانتا۔ لوگ مجھے بھی آ کر یہ باتیں کہہ دیتے ہیں، مگر میں جانتی ہوں کہ وہ بہت اچھا ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ واقعی بہت اچھا ہے۔ بس اس نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت غلط کیا ہے''۔ وہ عائشے کی بات نہیں سن رہی تھی۔ اس کا دماغ اسی ایک نکتہ پہ مرکوز ہو گیا تھا۔ عبدالرحمٰن پاشا کا ایک گمشدہ بھائی۔ کوئی بھی شخص یوں ہی اتنا بڑا بزنس چھوڑ کر نہیں جاتا، کوئی تو بات تھی۔ بالآخر اسے عبدالرحمٰن کی ایک کمزوری مل گئی تھی۔

''اب آئے گا اونٹ پہاڑ کے نیچے''۔

☆ ☆ ☆

''حیا..... حیا''۔ صبح وہ عائشے کے زور، زور سے چلانے پہ ہڑبڑا کر اُٹھی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پریشانی سے عائشے کو دیکھا۔ جس کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''بہارے گھر پہ نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی نہیں ہے۔ ساری میری غلطی ہے۔ میں نے کل اسے ڈانٹا تھا''۔ عائشے بس رو دینے کو تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ ایک جھٹکے سے بستر سے نکلی تھی۔

باہر کھڑے گارڈ نے بتایا کہ اس نے بہارے کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔

''وہ پچھلے دروازے سے نکلی ہوگی۔ اس گھر میں ایک پچھلا دروازہ بھی ہے۔ عبدالرحمٰن کی عنایات۔ وہ ہر شے میں بیک ڈور رکھتا ہے''۔ عائشے تلخی سے بڑبڑاتی اس کے ساتھ باہر نکلی۔

''عائشے! مجھے پتا ہے، وہ کدھر ہوگی''۔ اسے یقین تھا کہ وہ سمندر پہ گئی ہوگی۔

جب وہ اس ویران ساحل پر پہنچیں تو وہ انہیں دور سے ہی نظر آ گئی۔ وہ وہیں اس پتھر پہ بیٹھی تھی جہاں وہ تینوں کل چٹائی ڈالے بیٹھی تھیں۔ اس کے گھنگھریالے بال ہوا سے اُڑ رہے تھے اور وہ خالی خالی نگاہوں سے سامنے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیپ اور دوسرا میں چھرا تھا۔

''بہارے!'' عائشے بمشکل آنسو روکتی، بھاگتی ہوئی بہارے کے گلے لگ گئی۔ ''تم ایسے کیوں آ گئیں؟ میں اتنی پریشان ہوگئی تھی''۔

بہارے نے ویران سی نگاہیں اُٹھا کر اسے دیکھا، پھر ہاتھ میں پکڑی سیپ عائشے کے سامنے کی۔

''عائشے! میرا سیپ پھر خالی نکلا''۔ اس نے بہت دُکھ سے سیپ کھول کر دکھائی۔

''تم میرے سارے موتی لے لینا، میں انہیں اب بازار میں نہیں بیچوں گی، تم حیا کے تینوں موتی بھی لے لینا جو اس کے کزن نے دیے تھے۔ مگر اب تم روؤ گی نہیں''۔

''نہیں عائشے!'' بہارے نے نفی میں سر ہلایا۔

''میرا موتی کھو گیا ہے، وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا''۔

حیا، بہارے کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھی اور اس کے گیلے ہاتھ تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگی۔

''چیزیں وقتی ہوتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں۔ رویے دائمی ہوتے ہیں۔ صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی۔ جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور آج تم نے ایک کھوئے ہوئے موتی سے ہار مان لی؟''

بہارے نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ جیسے کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔

''اپنے دُکھ میں دوسرے کا دل نہیں دکھاتے بہارے! میں تمہیں بالکل ویسا ہی نیکلس لا دوں گی، پرامس!''۔

اور پھر شام میں اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے اس نے عائشے سے کہا کہ جب عبدالرحمٰن کا فون آئے، وہ اسے بتائے، سو جب اس کا فون آیا تو عائشے نے کارڈلیس اسے تھما دیا اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

''السلام علیکم!'' وہ بہت دھیمی آواز میں بولی تھی۔

''وعلیکم السلام..... خیریت؟'' وہ جیسے بہت حیران ہوا تھا۔

''جی..... وہ..... مجھے کچھ کام تھا''۔ اسے یاد تھا کہ آخری دفعہ اس نے جب عبدالرحمٰن کو کام کہا تھا تو اس کا نتیجہ بہت بھیانک نکلا تھا مگر اب وہ اسے ایک اور موقع دے رہی تھی۔

''کہیے..... آپ کو ہم سے بات کرنے کا خیال صرف کام کے وقت ہی آتا ہے، مگر کہیے''۔

دل تو اس کا چاہا کہ فون دیوار پہ دے مارے، مگر برداشت کر گئی اور ساری بات کہہ سنائی۔ آخر میں بولی۔ ''آپ مجھے اس شاپ کا نام بتا سکتے ہیں جہاں سے آپ نے وہ نیکلس لیا تھا؟''

''وہ میرا گفٹ تھا۔ سو مجھے ہی دوبارہ لینا چاہیے، لیکن چونکہ میں ابھی ملک سے باہر ہوں، تو میرا بندہ اس شاپ کے واؤچرز آپ کو دے جائے گا۔ آپ جواہر کی اس شاپ سے وہ نیکلس خرید کر بہارے کو دے دیجیے گا۔ السلام علیکم''۔

بے لچک اور خشک انداز میں کہہ کر اس نے فون رکھ دیا تھا۔ حیا نے ایک تنفر نگاہ کارڈلیس پہ ڈالی اور تہیہ کیا کہ آئندہ وہ کبھی اس شخص سے دوبارہ بات کرنے کی زحمت نہیں کرے گی۔

Downloaded From http://paksociety.com

اس کا خیال بہت جلد غلط ثابت ہونے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہوٹل گرینڈ کا ملازم اگلی صبح واؤچر لے کر آیا، مگر تب جب وہ تینوں استنبول جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ عائشے کو بینک میں کوئی کام تھا۔ سو وہ اور بہارے اس کے ہمراہ چل رہی تھیں۔ حیا نے واؤچرز لے کر کمرے میں رکھے، مگر فیری کے لیے روانہ ہوتے وقت وہ انہیں اُٹھانا بھول گئی۔ سو استنبول آ کر وہ جواہر نہیں گئی۔ نیکلس پھر کبھی خرید لے گی، کیونکہ اس میں پرونا تو بہارے کا موتی ہی تھا جو جانے کب نکلے، مگر سبانجی کے ڈورم میں جا کر وہ اپنا پزل باکس ضرور اُٹھالائی تھی۔ وہ سُن کی کلاسز کا ٹائم تھا اور ڈورم خالی پڑا تھا۔ سو نہ وہ کسی سے خود ملی، نہ ہی کسی سے سامنا ہوا۔ اس کی اسپرنگ بریک ختم ہو گئی تھی مگر ابھی وہ اس سے اوپر دو تین دن کی چھٹی کر سکتی تھی۔

پزل باکس اور چند ضروری چیزیں لے کر جب وہ باہر آئی تو عائشے کے کاموں میں اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ استقلال اسٹریٹ جا سکتی۔ وہ دوپہر تک ہی واپس آ گئے۔ اپنا پزل باکس اس نے احتیاط سے الماری میں کپڑوں کے نیچے رکھا۔ اب اس نے جلد از جلد اسے کھولنا تھا۔

رات وہ عائشے اور بہارے کے سونے کے بعد پزل باکس نکال کر دبے قدموں میں چلتی باہر آئی۔ اس کا رُخ کچن کی طرف تھا۔ کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑے اس نے کوڈ بار کی سلائیڈز اوپر نیچے کرنا شروع کیں۔ پہلے اس نے Ayeshe لکھا، مگر باکس جامد رہا۔ اسے یہی تو قع تھی۔ یقیناً باکس لیتے ہی خریدار نے پاس ورڈ بدل دیا ہوگا۔ پھر اس نے Yangin لکھا جو ''آگ'' کو ترکی میں کہتے ہیں۔ باکس جوں کا توں رہا۔ اسے یہی اُمید تھی۔ اب اسے وہ کرنا تھا جس کی طرف ہرا قلیطس کا قول اشارہ کر رہا تھا۔ آگ، اصلی والی آگ۔

اس نے ماچس اُٹھائی اور تیلی سلگا کر باکس کے قریب لائی مگر آنچ لکڑی کو سیاہ کرنے لگی اور شعلہ تیلی کو کھا کر اس کی اُنگلی تک پہنچنے لگا تو اس نے جھنجھلا کر تیلی پھینکی۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتی رہی، پھر باکس لیے باہر آئی۔

لونگ روم کا آتش دان سرد پڑا تھا۔ اس نے تاب پھیر کر آگ لگائی تو مصنوعی لکڑیوں والا ہیٹر جل اُٹھا۔ وہ باکس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے اس جگہ کے قریب لائی جہاں صرف دہکتے انگارے تھے۔ شعلے نہ تھے۔

ہیٹر کی تپش اس کی اُنگلیوں کو چھونے لگی۔ وہ ضبط کر کے باکس پکڑے بیٹھی رہی۔ بار بار نگاہوں کے سامنے وہ تکلیف دہ رات اُبھرتی۔ الاؤ، کھولتا مائع، دہکتی سلاخیں..... اس نے سر جھٹک کر توجہ پزل باکس کی طرف مرکوز کی۔ اس نے اسے ذرا ترچھا پکڑ رکھا تھا۔ یوں کہ اس کی دو اطراف انگاروں کے سامنے تھیں، جو طرف ذرا زیادہ سامنے تھی۔ اس پہ حروف اُبھرنے شروع ہو گئے تھے۔

حروف..... بلکہ الفاظ..... فقرے۔

اس نے حیرت سے باکس کی اس سائیڈ کو دیکھا جس کا رنگ تپش کے ساتھ سیاہ ہو رہا تھا اور اوپر سنہری سے الفاظ اُبھر رہے تھے۔ وہ شاید لاشعور طور پر کسی چھ حرفی لفظ کی توقع کر رہی تھی، مگر یہاں تو..... حیا نے باکس آگ سے ہٹا کر دیکھا۔ اس پہ لکھے دو فقرے واضح تھے۔ وہ کوئی نظمیہ شعر تھا۔

Marked on Homer's doubts

A Stick with twin Sprouts

(ہومر کے شبہات پہ نشان زدہ ایک چھڑی جس کی دو نوکیں ہوتی ہیں)۔

وہ ابھی ان الفاظ پہ ٹھیک سے اُلجھ بھی نہ سکی کہ اس کی نگاہ اس سیاہ ہوتی طرف سے متصل طرف پہ پڑی۔ جو ذرا سی تپش اس جگہ کو ملی تھی، اس نے وہاں چند ادھورے حروف ظاہر کیے تھے۔ حیا نے وہ طرف آگ کے سامنے کی۔ ادھورے الفاظ مکمل ہو کر ایک شعر میں ڈھل گئے۔

Round the emeralad crusified

And the Freedom Petrified

(مصلوب زدہ زمرد اور ٹھہری ہوئی آزادی کے گرد)۔

کسی احساس کے تحت اس نے تیسری متصل دیوار کو آنچ دکھائی۔ باکس کی تیسری طرف بھی کسی جادوئی اثر کی طرح سیاہ پڑنے

Downloaded From http://paksociety.com

لگی اور اوپر جیسے کوئی اَن دیکھا قلم سنہری روشنائی سے لکھنے لگا۔

Snapped there a blooded pine

Split there some tears divine

(ادھر خون میں ڈوبا صنوبر چٹختا تھا اور آفاقی آنسو بکھرتے تھے)۔

اب کوڈبار سے متصل دو دیواریں اور تیسری جو کوڈ پار کے بالکل متوازی تھی، حروف سے بھری جا چکی تھیں۔ باقی اوپر ڈھکن کی سطح جہاں ہرا قلیطس کا قول لکھا تھا، رہ گئی تھی، یا پھر نچلی طرف۔ اس نے دونوں کو آنچ دکھائی، مگر کچھ نہ ہوا۔ اب صرف کوڈبار والی طرف بچی تھی۔ حیا نے احتیاط سے اس کو انگاروں کے قریب کیا۔ جیسے جیسے تپش لکڑی کو چھوتی گئی، کوڈبار کے چھ چوکھٹوں کے اوپر ایک شعر اُبھرتا گیا۔

A Love lost in symbolic smell

Under which the lines dwell

(علامتی خوشبو میں ایک پیار کھو گیا، جس کے نیچے لکیریں رہتی ہیں)۔

پزل باکس کا آخری شعر۔

آٹھ مصرعوں کی نظم مکمل ہو گئی تھی۔ اب یہ نظم کس طرف اشارہ کر رہی تھی۔ یہ اس کو ابھی سوچنا تھا۔

پہلی بار اسے بری طرح سے معتصم کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

بہارے پھول چننے کے لیے گئی تھی اور اب نیچے درختوں میں اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ نیکلس کا غم اب تک اسے بھول بھال چکا تھا۔ وہ عائشے کے ساتھ ایک درخت تلے چٹائی پہ بیٹھی، اس کی ہدایت کے مطابق ہاتھ میں پکڑے لکڑی کے ٹکڑے کو تراش رہی تھی، سہ پہر کی نرم سی دھوپ، سرخ صنوبر کے درختوں سے چھن چھن کر ان پہ گر رہی تھی۔

ایک پزل باکس بنانے کے لیے پانچ سو سات (507) لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے درکار ہوتے تھے۔ خاصا محنت طلب کام تھا۔ عائشے نے اناطولیہ کے ایک گاؤں میں کسی معمر چینی کاری گر سے یہ فن سیکھا تھا۔

''تمہیں واؤچر منگوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ عبدالرحمٰن کی تو قیمتی تحائف دینے کی عادت ہے۔ یوں ہی بہارے کی عادتیں بگڑتی جائیں گی''۔

اس کی بات پہ حیا نے سر اُٹھایا۔ اس نے ڈھیلی چوٹی باندھ کر آگے کو ڈال رکھی تھی اور چند لٹیں چہرے کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔

''میں تو اپنی طرف سے دینا چاہتی تھی مگر اس نے میری پوری بات ہی نہیں سنی۔ اب لے ہی آیا ہے تو واپس کیا کرنا''۔ وہ سر جھکا کر رندالکڑی کے ٹکڑے پہ آگے پیچھے رگڑنے لگی۔ لکڑی کے باریک رول شدہ چپس سے نیچے گر رہے تھے۔

''اور وہاں، بہارے نے تمہارے لیے کچھ خریدا تھا۔ اسے لگا اس نے تم سے اس دن بہت بدتمیزی کر دی تھی''۔

''اچھا؟ کیا خریدا ہے؟'' وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگی۔

''ایک ریشمی اسکارف ہے''۔

''مگر میں تو سر پہ اسکارف نہیں لیتی''۔ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر پچھتائی، کسی کے تحفے کے لیے ایسے تو نہیں کہنا چاہیے۔

''کوئی بات نہیں، تم گردن میں لے لینا''۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے''۔ وہ مسکرا کر دوبارہ رندالکڑی پہ گڑنے لگی۔

''تمہیں پتا ہے عائشے! جب میں چھوٹی تھی نا، دس، گیارہ سال کی، تب مجھے اسکارف پہننے کا بہت شوق تھا۔ میرے ابا اور تایا فرقان دونوں مجھے اکثر سر ڈھانپنے کو کہا کرتے تھے۔ انہیں ایسے بہت اچھا لگتا تھا۔ میری اماں بھی چاہتی تھیں کہ میں سر ڈھکا کروں، تاکہ میرے چہرے پہ نور آ جائے اور میں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب ہو جاؤں، انہوں نے مجھے قرآن حفظ کرنے کے لیے ایک اسلامک اسکول میں

Downloaded From http://paksociety.com

بھی داخل کرایا، مگر میں وہاں سے تیسرے روز ہی بھاگ آئی۔ تب میرا اسکارف پہننے کو بہت دل چاہتا تھا"۔

"تو کیوں نہیں لیا؟"۔

جواباً حیا نے دھیرے سے شانے اُچکائے۔

"مجھے آہستہ آہستہ سمجھ آ گئی کہ میرا فیس کٹ ایسا ہے کہ میں اسکارف میں اچھی نہیں لگوں گی"۔ وہ کہہ کر سر جھکائے کام کرنے لگی۔ عائشے اسی طرح ہاتھ روکے اس کو دیکھ رہی تھی۔

"کس کو؟"۔

"ہاں؟" اس نے ناسمجھی سے سر اُٹھا کر عائشے کو دیکھا۔

"تم کس کو اسکارف میں اچھی نہیں لگو گی؟"۔

"لوگوں کو"۔

"اور.....؟"

"اور کیمرے کو۔ مثلاً تصویروں میں"۔

"اور؟"

"اور خود کو؟"

"اور اللہ تعالیٰ کو؟" عائشے دھیرے سے مسکرائی۔ اس کی سبز آنکھیں نرم دھوپ میں سنہری لگ رہی تھیں۔ "ہوسکتا ہے تم اللہ تعالیٰ کو اسکارف میں بہت اچھی لگتی ہو"۔ وہ ایک دم، بالکل سن ہوئی، عائشے کو دیکھے گئی۔

"تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا حیا! کہ میں ہر وقت اسکارف کیوں پہنتی ہوں"۔ عائشے سر جھکائے لکڑی کے ٹکڑے کا کنارہ تراشتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میں تمہیں بتاؤں، میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں وہ خوب صورت ملبوسات پہنوں جو بیوک ادا میں استنبول یا اٹلی اور اسپین کی لڑکیاں پہن کر آتی ہیں۔ بالکل جیسے ماڈلز پہنتی ہیں اور جب وہ اونچی ہیل کے ساتھ ریمپ پہ چلتی آ رہی ہوتی ہیں تو ایک دنیا ان کو مسحور ہو کر دیکھ رہی ہوتی ہے۔ میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں بھی ایسے اسمارٹ اور ٹرینڈی ڈیزائنر لباس پہن کر جب سڑک پہ چلوں تو لوگ مسحور و متاثر ہو کر مجھے دیکھیں.....لیکن....." وہ سانس لینے کو رُکی، حیا بنا پلک جھپکے، سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔

"لیکن.....پھر مجھے ایک خیال آتا ہے۔ یہ خیال کہ ایک دن میں مر جاؤں گی، جیسے تمہاری دوست مر گئی تھی اور میں اس مٹی میں چلی جاؤں گی، جس کے اوپر میں چلتی ہوں۔ پھر ایک دن سورج مغرب سے نکلے گا اور زمین کا جانور زمین سے نکل کر لوگوں سے باتیں کرے گا اور لال آندھی ہر سو چلے گی۔ اس دن مجھے بھی سب کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔ تم نے کبھی اولمپکس کے وہ اسٹیڈیمز دیکھے ہیں جن میں بڑی بڑی اسکرینز نصب ہوتی ہیں؟ میں خود کو ایک ایسے ہی اسٹیڈیم میں دیکھتی ہوں۔ میدان کے عین وسط میں کھڑے۔ اسکرین پہ میرا چہرہ ہوتا ہے اور پورا میدان لوگوں سے بھرا ہوتا ہے۔ سب مجھے ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں اور میں اکیلی وہاں کھڑی ہوتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں حیا، اگر اس وقت میرے رب نے مجھ سے پوچھ لیا کہ انا طولیہ کی عائشے گل، اب بتاؤ تم نے کیا، کیا؟ یہ بال، یہ چہرہ، یہ جسم، یہ سب تو میں نے تمہیں دیا تھا۔ یہ نہ تم نے مجھ سے مانگ کر حاصل کیا تھا اور نہ ہی اس کی قیمت ادا کی تھی۔ یہ تو میری امانت تھی۔ پھر تم نے اسے میری مرضی کے مطابق استعمال کیوں نہیں کیا؟ تم نے اس سے وہ کام کیوں کیے جن کو میں ناپسند کرتا ہوں؟ تم نے ان عورتوں کا رستہ کیوں چن لیا جن سے میں ناراض تھا؟"۔

میں نے ان سوالوں کے بہت جواب سوچے ہیں، مگر مجھے کوئی جواب مطمئن نہیں کرتا۔ روز صبح اسکارف لینے سے پہلے میری آنکھوں کے سامنے ان تمام حسین عورتوں کے دل کش سراپے گردش کرتے ہیں جو ٹی وی پہ میں نے کبھی دیکھی ہوتی ہیں اور میرا دل کرتا ہے کہ میں بھی ان کا راستہ چن لوں، مگر پھر مجھے وہ آخری عدالت یاد آ جاتی ہے، تب میں سوچتی ہوں کہ اس دن میں اللہ کو کیا جواب دوں گی؟ میں ترازو کے ایک پلڑے میں وہ سراپا ڈالتی ہوں جس میں مَیں خود کو اچھی لگتی ہوں اور دوسرے میں وہ جس میں مَیں اللہ تعالیٰ کو اچھی لگتی ہوں۔ میری پسند کا پلڑا کبھی نہیں جھکتا۔ اللہ تعالیٰ کی پسند کا پلڑا کبھی نہیں اُٹھتا۔ تم نے پوچھا تھا کہ میں اسکارف کیوں لیتی ہوں؟ سو میں یہ اس لیے

Downloaded From http://paksociety.com

کرتی ہوں کیونکہ میں اللہ کو ایسے اچھی لگتی ہوں''۔

وہ اب چھرے کی نوک سے لکڑی کے کنارے میں خم ڈال رہی تھی۔

''لڑکیاں سمندر کی ریت کی مانند ہوتی ہیں حیا! عیاں پڑی ریت، اگر ساحل پہ ہو تو قدموں تلے روندی جاتی ہے اور اگر سمندر کی تہ میں ہو تو کیچڑ بن جاتی ہے، لیکن اسی ریت کا وہ ذرہ جو خود کو ایک مضبوط سیپ میں ڈھک لے، وہ موتی بن جاتا ہے۔ جوہری اس ایک موتی کے لیے کتنے ہی سیپ چنتا ہے اور پھر اس موتی کو مخملیں ڈبوں میں بند کر کے محفوظ تجوریوں میں رکھ دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی جوہری اپنی دکان کے شوکیس میں اصلی جیولری نہیں رکھتا، مگر ریت کے ذرّے کے لیے موتی بننا آسان نہیں ہوتا، وہ ڈوبے بغیر سیپ کو کبھی نہیں پا سکتا''۔

حیا اب اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے ریگ مال لکڑی کے ٹکڑے پہ رگڑ رہی تھی۔ لکڑی کی گنگھر یالی پتریاں اُتر اُتر کر نیچے گر رہی تھیں۔ اس کے اندر بھی کچھ ایسا ہی چیخ رہا تھا۔ کیا؟ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی اور کبھی کبھی اسے لگتا وہ کبھی نہیں سمجھ سکے گی۔

کبریٰ بہلول کے گھر اور ان کے کھیت میں کام کرتے، ادا چائے کے پتے چنتے، ان کی مرغابیوں کو دانہ ڈالتے، وہ اب ان سے چھوٹے چھوٹے بظاہر بے ضرر سے سوال کثرت سے پوچھنے لگی تھی۔ وہ عائشے کے بتائے گئے دو کو کبریٰ بہلو کے دو سے جمع کر کے دیکھتی جواب چار کے بجائے چار سو نکلتا۔ اب اسے پھر سے عبدالرحمٰن پاشا کے فون کا انتظار تھا۔ کب وہ فون کرے اور وہ اپنے پتے پھینکے۔ کھیل پاشا نے شروع کیا تھا۔ اسے ختم اب وہ کرے گی۔

چند ہی روز میں اسے یہ موقع مل گیا۔ فون کی گھنٹی بجی تو اس نے کارڈلیس اُٹھا لیا اور اوپر اسٹڈی میں آ گئی۔

''ہیلو؟'' اس نے بظاہر سادگی سے کہا۔

دوسری جانب چند لمحوں کی خاموشی چھائی رہی، پھر اس کی بھاری، کھردری آواز سنائی دی۔

''حیا بی بی..... کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں، آپ سنائیے''۔

''جی الحمدللہ..... آپ..... کیا کر رہی تھیں؟'' وہ محتاط لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ جیسے اس کا فون اُٹھانے کا مقصد نہ سمجھا ہو''۔

''میں ایک کہانی لکھ رہی تھی، کہیں تو سناؤں؟''۔

اب کی بار دوسری جانب متذبذب خاموشی چھائی رہی، پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''جی، سنا دیجیے''۔

''تین سال پہلے کی بات ہے، انڈیا کا ایک عام سا اسمگلر اپنی ماں اور بھائی کے پاس بیوک اوا آتا ہے۔ اس کا بھائی اوا میں ایک بہت کامیاب ہوٹل چلا رہا ہوتا ہے۔ نو وارد بھائی اس کے ساتھ ہوٹل کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔ بظاہر اسے اپنے بھائی کا بہت خیال ہے، مگر آہستہ آہستہ وہ ہوٹل پہ قبضہ کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کے تعلقات استعمال کر کے اپنے تعلقات وسیع کرتا ہے۔ مافیا کے ساتھ روابط بڑھاتا ہے اور تو اور، اس کی ایک عالمی دہشت گرد تنظیم سے بھی روابط ہیں۔ پھر آج سے ٹھیک دو سال پہلے وہ اپنے بھائی کو کچھ یوں ہراساں کرتا ہے کہ ایک روز بے چارا بھائی چپ چاپ ہوٹل چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لوگوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ یونان میں ہے، مگر وہ در حقیقت کہاں ہے، یہ اس بڑے بھائی سے بہتر کوئی نہیں جانتا اور اس سے باز پرس کرنے والا کوئی ہے بھی نہیں، سوائے ایک بوڑھی عورت اور دو معصوم لڑکیوں کے، یوں وہ عام اسمگلر استنبول کے بارسوخ ترین افراد میں شامل ہو جاتا ہے، اب بتائیے کیسی لگی کہانی؟ کہتے ہیں تو پبلشنگ کے لیے دے دوں؟''۔

اس نے بہت معصومیت سے پوچھا تھا۔

''میں اس ساری بکواس سے کیا مطلب لوں؟''۔

''یہی کہ میرے بارے میں ذرا احتیاط سے کام لیجیے گا، ورنہ پیر کے نیچے دباؤ تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے''۔

''بہت احسان فراموش لڑکی ہو۔ تمہیں بھول گیا ہے کہ اس رات تمہیں اس بحری جہاز سے نیم مردہ حالت میں کون ادھر لایا تھا؟''۔

لمحے بھر کو وہ بالکل چپ رہ گئی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''میں پرسوں بیوک اداواپس آرہا ہوں۔تم نے جب تک ادھر رہنا ہے،تم رہو، میں ادھر نہیں آؤں گا اور نہ ہی تمہارے راستے میں آؤں گا،سو تم بھی میرے راستے میں آنے کی کوشش مت کرنا''۔دھمکی آمیز لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ اس نے وہیں ہاتھ رکھا ہے، جہاں سب سے زیادہ درد ہوتا تھا۔

''میں نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں،اس کا فیصلہ ابھی نہیں کیا میں نے''۔اس نے محظوظ سے انداز میں کہہ کر فون رکھ دیا۔

میجر احمد کا شکریہ،جس نے اسے ایک دوسرے نہج پہ سوچنا سکھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

''اور کیا قربان کرسکتی ہو تم اپنا فاصلہ گھٹانے کے لیے؟''۔رات سونے سے قبل یہ آخری بات تھی جو عائشے نے اس سے پوچھی تھی۔اس نے نیند میں ڈوبی آنکھیں کھول کر سوالیہ نگاہوں سے عائشے کو دیکھا،بولی کچھ نہیں۔

''میں بتاؤں؟ تم اپنی نیند قربان کرنا سیکھ لو''۔وہ کہہ کر لیٹ گئی تو حیا نے بوجھل ہوتی آنکھیں بند کرلیں۔صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہی بہارے اس کا کندھا جھنجھوڑ کر اسے اُٹھا رہی تھی۔

''اُٹھ جاؤ!عائشے نے کہا آج سے تم بھی ہمارے ساتھ قرآن پڑھنے جاؤ گی''۔

''میں؟''اس نے کسل مندی سے آنکھیں ذرا کھولیں۔''مجھے نیند آرہی ہے''۔

''نہیں،نہیں،اب تو تمہیں بھی جانا پڑے گا۔یہ نار چہ تم بھی سہو ناں۔میں اکیلے کیوں برداشت کروں؟ اب اُٹھ جاؤ''۔دم کٹی لومڑی دوسری کی دم پھندے میں پھنستے دیکھ کر بہت خوشی خوشی اُچھلتی کودتی تیار ہو رہی تھی۔

حیا بدقت تمام کمبل پھینک کر اُٹھی۔اسے اوڈی جے کو صبح خیزی کی عادت تو تھی،مگر ان کی صبح فجر قضا ہونے کے بعد ہوتی تھی اور پھر بھاگم بھاگ کیمپس کی تیاری۔

اس نے اپنا لیموں کے رنگ کا زرد فراک پہنا،جو ایک دفعہ جہان کے گھر پہن کر گئی تھی اور گیلے بال کھلے چھوڑ کر سنگھار میز کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ابھی اس نے پرفیوم کی شیشی اُٹھائی ہی تھی،بہارے عقب میں زور سے چیخی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟''۔

''کیا؟''وہ اس کے اچانک چلّانے پہ ڈر کر پلٹی۔

''تم باہر جانے سے پہلے پرفیوم لگا رہی ہو؟''بہارے نے بے یقینی سے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''آ.....ہاں۔کیا ہوا؟''

''عائشے گل کہتی ہے،اچھی لڑکیاں باہر جانے سے پہلے اتنا تیز پرفیوم نہیں لگاتیں۔تم یہ باڈی اسپرے لگالو،مگر پرفیوم نہیں۔اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے''۔وہ بہت خفگی سے ڈانٹتی حیا کے ساتھ آ کھڑی ہوئی اور پھر ایڑیاں اونچی اُٹھا کر خود کو آئینے میں دیکھتی سر پہ اسکارف لپیٹنے لگی۔

حیا نے ایک ہاتھ میں پکڑے پرفیوم کو دیکھا،اور پھر ذرا سا خفت سے اسے واپس رکھ کر باڈی مسٹ اُٹھالیا۔

حلیمہ آنٹی کے لان میں چاندنی بچھی تھی۔وہ مرکزی جگہ پہ بیٹھی تھیں اور سارے چھوٹے بڑے بچے ان کے گرد نیم دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔وہ تینوں جس وقت داخل ہوئیں،ایک جگہ سے بچوں نے فوراً جگہ چھوڑ کر دائرہ بڑا کر دیا۔حلیمہ آنٹی نے ایک نرم مسکراہٹ ان کی طرف اُچھال کر سر کو جنبش دی۔وہ تینوں ساتھ ساتھ بیٹھ گئیں۔

''میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کے دھتکارے ہوئے شیطان سے۔اللہ کے نام کے ساتھ جو بہت مہربان اور بار بار رحم کرنے والا ہے''۔

قرأت کرنے والا بچہ سنہرے بالوں والا ترک تھا،جس نے سر پہ جالی دار ٹوپی لے رکھی تھی۔باقی بچے خاموش تھے۔وہ اپنی باریک،مدھر آواز میں پڑھ رہا تھا۔

''آپ ایمان لانے والی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں جھکا کر رکھا کریں اور اپنے قابل ستر اعضا کی حفاظت کیا کریں''۔

وہ جو جماہی روکتی ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی،ایک دم گڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اور وہ اپنی زینت ظاہر نہ کیا کریں، سوا اس کے جو خود ظاہر ہو جائے''۔

کم سن بچے کی آواز نے سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہر سو ایک سحر سا طاری ہو رہا تھا۔ حیا نے بے اختیار سر پر اوڑھے دوپٹے سے کان ڈھکے، جن میں اس نے موتی والی بالیاں پہن رکھی تھیں۔ وہی موتی جو جہان کے سیپ سے نکلے تھے۔ بہارے نے اسے ایک ایک موتی دونوں بالیوں میں پرو دیا تھا۔ تیسرا موتی حیا نے سنبھال رکھا تھا۔

''اور انہیں چاہیے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پہ ڈالے رکھا کریں''۔

کسی معمول کی سی کیفیت میں اس نے گردن جھکا کر دیکھا۔ اس کا شیفون کا دوپٹا سر پہ تو تھا مگر گردن پہ اس نے مفلر کی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ قدرے خفت سے اس نے دوپٹہ کھول کر شانوں پہ ٹھیک سے پھیلا کر لپیٹا، اس وقت سوائے حکم ماننے کے اسے کوئی چارہ نظر نہیں آیا تھا۔ یہ عائشے گل کی باتیں نہیں تھیں، جن پہ اُلجھ کر ان کو ذہن سے جھٹکا جا سکتا تھا۔ یہ حکم بہت اوپر آسمانوں سے آیا تھا۔ وہاں سے، جہاں انکار نہیں سنا جاتا تھا، جہاں صرف سر جھکایا جاتا تھا۔

ترک بچہ اپنا سبق ختم کر چکا تھا۔ حلیمہ آنٹی نے بہارے کو اشارہ کیا۔ وہ اپنا قرآن سامنے کیے، تعوذ پڑھ کر اپنا سبق پڑھنے لگی۔

''اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔

اس کے نور کی مثال ایک طاق کی طرح ہے، جس میں چراغ ہیں۔

چراغ فانوس میں ہے۔

فانوس گویا ایک چمکتا ہوا تارہ ہے۔

وہ ایک بابرکت زیتون کے درخت سے روشن کیا جاتا ہے۔

نہ مشرقی ہے اور نہ مغربی۔

قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے۔

اور اگر چہ اسے آگ بھی نہ چھوئی ہو۔

نور ہے اوپر نور کے۔

اللہ اپنے نور کی طرف راستہ دکھاتا ہے، جسے وہ چاہتا ہے.....''۔

لان میں ایک دم بہت سی روشنی اُتر آئی تھی۔ جیسے چمکتا چاند پورے اُفق پہ چھا گیا ہو۔ جیسے سونے کے پتنگے ہر سُو آہستہ آہستہ نیچے گر رہے ہوں، جیسے نیلا آسمان سنہری قندیلوں سے جگمگا اُٹھا ہو۔ وہ اس طلسم میں گھری، سحر زدہ سی ہوئی سنے جا رہی تھی۔

بہارے پڑھ رہی تھی۔

''اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا.....

ان کے اعمال ایک چٹیل میدان میں سراب کی مانند ہیں۔

پیاسا اس کو پانی سمجھتا ہے۔

حتیٰ کہ جب وہ اس کے قریب آتا ہے تو اس کو کچھ بھی نہیں پاتا۔

اور وہ وہاں اللہ کو پاتا ہے۔

پھر اللہ اس کو اس کا پورا پورا حساب دیتا ہے۔

اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے''۔

نیلا آسمان ان دیکھی مشعلوں سے روشن تھا۔ چاندی کی مشعلیں وہاں روشن نہیں تھیں، مگر وہاں روشنی تھی۔ نور تھا اوپر نور کے۔

''یا ان کی مثال سمندر کے گہرے اندھیروں کی مانند ہے۔

پھر اسے ایک لہر ڈھانپ لیتی ہے۔ اس کے اوپر ایک اور لہر۔ اس کے اوپر بادل۔ ان میں سے بعض کے اوپر بعض اندھیرے

Downloaded From http://paksociety.com

ہیں۔ اتنا اندھیرا کہ جب وہ شخص اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا۔

اور جس کا نہیں بنایا اللہ نے کوئی نور۔

تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور!''۔

بہارے اپنا سبق ختم کر چکی تھی۔ دور مرمرا کی لہریں کناروں پہ سر پٹخ پٹخ کر پلٹ رہی تھیں، واپس اپنے اندھیروں میں۔ کلاس کا وقت ختم ہوا تو سحر ٹوٹا۔ قندیلیں غائب ہوگئیں۔ صبح کی روشنی میں آسمان کے چراغ چھپ گئے۔

بچے اُٹھ اُٹھ کر جانے لگے۔ حلیمہ آنٹی ان کی طرف ہی آ رہی تھیں، مگر وہ اپنی جگہ سُن سی بیٹھی کہیں بہت اندر گم تھی۔ اپنی ذات کے اندھیروں میں۔ اندھیری لہر کے اوپر ایک اور لہر اور اس کے اوپر غم کے بادل۔ اتنا اندھیرا کہ مشکلوں کا سرا سجھائی نہ دیتا تھا اور جس کا نہیں بنایا اللہ نے کوئی نور، تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور!

وہ بالکل چپ سی اپنی جگہ پہ اسی طرح بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہوٹل گرینڈ بیوک ادا کے ایک نسبتاً ویران ساحل کے قریب واقع تھا۔ جزیرے کے بازار کے رش اور سیاحوں کے شور و ہنگامے سے دور وہ ایک بہت پُرسکون سی جگہ تھی۔ ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کی کھڑکیوں سے مرمرا کا سمندر بالکل سامنے دکھائی دیتا تھا۔ وہ ادا کا سب سے بڑا، سب سے مہنگا ہوٹل تھا۔

''دیمت فردوس'' پچھلے ساڑھے تین سال سے ہوٹل کے مالک کی پرسنل سیکریٹری تھی۔ اس کا عہدہ ساڑھے تین برس میں وہی رہا تھا، البتہ اس کا باس ایک دفعہ ضرور بدلا تھا۔ جب وہ تازہ تازہ ازمیر (ترکی کا ایک شہر) چھوڑ کر استنبول آئی تھی اور کئی جگہ نوکری کے لیے دھکے کھانے کے بعد اسے استنبول سے دور اس جزیرے پہ یہ جاب ملی تھی، تب دیمت کا باس عبدالرحمٰن پاشا نہیں تھا۔ اس وقت وہ اس کے چھوٹے بھائی کی سیکریٹری تھی، مگر ان پچھلے تین برسوں میں بہت کچھ بدلا تھا۔

اس نرم سی صبح میں اپنے ڈیسک کی کرسی سنبھالتے، پرس اُتار کر میز پہ رکھتے ہوئے بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ہوٹل گرینڈ اب بہت بدل گیا تھا۔ اس کا پچھلا باس بہت خوش خلق اور سادہ لوح سا آدمی تھا۔ ایسا آدمی جس میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی۔ وہ ہوٹل کا مالک ہونے کے باوجود اکثر نیچے ریسٹورنٹ کے کچن میں کام کرتا پایا جاتا تھا۔ اس کے عام سے حلیے کو دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص بیوک ادا کے رئیسوں میں سے ہے۔ پھر وقت بدلتا گیا۔ دیمت عبدالرحمٰن پاشا کو پہلے کبھی کبھار اور پھر اکثر ہوٹل میں اپنے بھائی کے ساتھ آتے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کے آہستہ آہستہ ہوٹل کا کنٹرول اور وہ آفس عبدالرحمٰن پاشا کی دسترس میں چلا گیا۔ عبدالرحمٰن پاشا نے کیسے سب کچھ اپنے قابو میں کیا کہ کوئی چوں بھی نہ کر سکا اور اس کا بھائی کہاں چلا گیا، وہ کبھی نہیں جان سکی تھی۔ وہ اس کی سیکریٹری ہو کر بھی اپنے اور اس کے درمیان موجود فاصلے کو نہیں پاٹ سکی تھی۔ اسے عبدالرحمٰن پاشا کے سوائے چھوٹے موٹے دفتری کاموں کے علاوہ کچھ بھی کرنے کو نہیں دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی دیمت کو شک گزرتا کہ اے آر پی نے اپنی کوئی اور سیکریٹری رکھی ہوئی ہوگی، جو اس کے معمولات سے باخبر ہوگی، ورنہ اس کے پاور آفس میں کیا ہوتا ہے، وہ اس سے قطعاً بے خبر تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ پچھلے چند ماہ میں اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہوٹل گرینڈ میں کچھ اور بھی ہو رہا ہے، کچھ ایسا، جو غلط تھا۔ کچھ ایسا جو ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناتے اسے کبھی ہونے نہیں دینا چاہیے تھا، مگر کیا..... وہ سمجھنے سے قاصر تھی اور کھوج لگانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

اپنی دراز سے ایک فائل نکالتے ہوئے اس نے یونہی ایک سرسری سی نگاہ سامنے..... اس بند دروازے پہ ڈالی، جس پہ اے آر پاشا کی تختی لگی تھی، اور ٹھٹک کر رُک گئی۔

دروازے کی نچلی دراز سے روشنی جھانک رہی تھی۔

کیا عبدالرحمٰن واپس آ گیا ہے؟ کب؟ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

وہ خوشگوار حیرت میں گھری جلدی جلدی اپنی چیزوں کو ترتیب دینے لگی۔ دنیا چاہے جو بھی کہے وہ عبدالرحمٰن پاشا کی سب سے

Downloaded From http://paksociety.com

ہوئے بغیر عورت اپنے شوہر کو کبھی نہیں چھوڑتی''۔

''تمہارا مطلب ہے کہ کوئی اس عورت کو اس کے شوہر کے خلاف بہکائے؟ اونہوں!'' اس نے ناگواری سے سر ذرا سا جھٹکا۔ ''وہ کیوں کسی کی بات پر یقین کرے گی؟''

''جی سر! وہ کسی دوسرے کی بات پہ یقین نہیں کرے گی، وہ صرف اپنے شوہر کی بات پر یقین کرے گی''۔

''اور کوئی شوہر اپنے دھوکے یا اپنی بداعمالیوں کی داستان اپنے منہ سے اپنی بیوی کو کیوں سنائے گا؟''

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ یہ سب اپنی بیوی کو کہے''۔ اب کے دیمت ذرا معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔ ''وہ یہ سب کسی اور سے کہے گا اور اگر ٹائمنگ صحیح رکھی جائے تو اس کی بیوی اس کے علم میں لائے بغیر اس کی باتیں سن لے گی۔ ایک معصوم سا اتفاق۔'' بات ختم کر کے دیمت نے ذرا سے شانے اُچکائے۔

عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں ایک چمک در آئی۔ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں پھینکا اور ذرا آگے ہو کر بیٹھا۔

''مگر دیمت! کوئی آدمی کسی دوسرے کے بھی سامنے اپنے کسی بدعمل کا ذکر کیوں کرے گا؟''۔

''میں نے کہا نا سر! ٹائمنگ صحیح رکھی جائے تو سب ٹھیک رہے گا۔ وہ آدمی اپنے بدعمل کی داستان نہیں سنائے گا۔ وہ عمل کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں، جو کسی کو ہیرو بنا دیتے ہیں لیکن اگر سیاق وسباق کے بغیر پیش کیے جائیں تو وہ ہیرو کو ولن بھی بنا دیتے ہیں۔''

عبدالرحمٰن پاشا کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ اس کے چہرے پہ چھائی فکر غائب ہو رہی تھی۔

''دیمت! جو کام میں پچھلے پانچ مہینوں میں نہیں کر سکا، وہ تم نے پانچ منٹ میں کر دکھایا ہے۔ تھینک یو سو مچ''۔ وہ واقعتاً اس کا بہت ممنون تھا۔

دیمت کا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ بہت مسرت سے اُٹھی تھی۔ گو کہ اندر سے وہ جانتی تھی کہ عبدالرحمٰن کسی بیوی کو اس کے شوہر سے بدظن کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ غلط کام تھا، مگر عبدالرحمٰن کا تشکر ہر شے پہ چھانے لگا۔

''تمہارا شوہر کیسا ہے، ابھی تک دینٹ پہ ہے؟''۔

''جی سر!'' کرسی سے اُٹھتے ہوئے اس نے مغموم انداز میں بتایا۔ ایک حادثے کے بعد اس کا شوہر کچھ عرصے سے وینٹی لیٹر پہ تھا اور یہ پورا ہوٹل گرینڈ جانتا تھا۔

''ایڈوانس سیلری چاہیے ہو تو بتا دینا''۔

''تھینک یو سر!'' وہ پورے دل سے مسکرائی۔ عبدالرحمٰن اسے ''لالچ'' دے رہا تھا۔ یہ اس کے مشورے کا انعام تھا۔ وہ بہت فرحت سے واپس جانے کے لیے مڑی تھی۔

''تمہارا ہیئر اسٹائل اچھا ہے دیمت!''۔

عبدالرحمٰن نے اس کے عقب سے پکارا تھا۔ اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔ وہ بہت اُلجھن سے واپس پلٹی۔ عبدالرحمٰن اب ایک فائل اُٹھا کر اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ وہ بظاہر اس کی طرف متوجہ نہ تھا مگر اس نے یہ بات کیوں کہی؟ پچھلے تین برسوں میں تو اسے کبھی دیمت کے بالوں کا خیال نہیں آیا تھا، نہ ہی وہ عورتوں سے شغف رکھنے والا بندہ تھا۔ پھر اس نے یہ کیوں کہا؟

''تھینک..... تھینک یو سر!'' وہ ذرا تذبذب سے بولی۔

''ویسے تمہارا پچھلا ہیئر اسٹائل بھی اچھا تھا''۔

''پچھلا؟'' اس نے بہت اُلجھ کر اپنے باس کو دیکھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ دیمت نے تو پچھلے تین برسوں میں سوائے اس کٹنگ کے، دوسری کوئی کٹنگ نہیں کرائی تھی۔

''ہاں، جوانتالیہ کے ساحل پہ تھا۔ تم پہ گھنگھریالے سرخ بال اچھے لگتے ہیں''۔ وہ فائل کی طرف متوجہ بہت سرسری انداز میں کہہ رہا تھا۔

دیمت کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ وہ پتھر کا بت بنی رہ گئی۔ ایک دم کمرے میں گھٹن بہت بڑھ گئی تھی۔ اسے

Downloaded From http://paksociety.com

سانس نہیں آ رہا تھا۔ وہ بدقت تمام باہر نکلی اور اپنی کرسی پہ ڈھے سی گئی۔

انتالیہ کا ساحل، سرخ گھنگھریالے بال..... چھ سال پہلے اس نے ایک ایکس ریٹ میگزین کے لیے ماڈلنگ کی تھی۔ وہ بدنام زمانہ میگزین صرف انتالیہ میں چھپتا تھا اور وہاں سے باہر نہیں جایا کرتا تھا مگر..... مگر تب اسے پیسے چاہیے تھے اور وہ نشے میں تھی۔ بعد میں وہ شرمندہ تھی۔ اس نے وہ شہر، وہ جگہ، سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے خاندان، اس کے دوستوں، کبھی کسی کو اس میگزین کی ان چند کاپیز کا علم تک نہیں ہوا تھا۔ وہ میگزین تو شاید اب ردی کا ڈھیر بن کر اس دنیا سے ہی غائب ہو گیا ہو، تو عبدالرحمٰن پاشا کو کیسے پتا چلا؟

وہ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے بیٹھی تھی۔ اس کی بے لچک آواز کی دھمکی وہ سمجھتی تھی۔ اگر اس نے یہ گفتگو کسی کے سامنے دُہرائی تو وہ میگزین منظر عام پہ آ جائے گا اور..... اور اس کا گھر، بچے، زندگی، سب تباہ ہو جائے گا۔

اس نے چہرہ اُٹھا کر بے بس، متنفر نگاہوں سے اے آر پی کے آفس کے بند دروازے کو دیکھا۔

''بلیک میلر!'' اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے تھے۔ اسے آج علم ہوا تھا کہ عبدالرحمٰن پاشا نے کیسے ہر شے کو اپنے قابو میں کیا تھا۔

بند دروازے کے اس پار وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا قیمتی موبائل تھا، جس میں وہ کوئی نمبر ڈھونڈ رہا تھا، ایک نمبر پہ آ کر اس کا ہاتھ تھم گیا۔ وہ نمبر اس نے انگریزی میں "Brother Dearest" کے نام سے محفوظ کر رکھا تھا۔

اب اس نمبر پہ رابطہ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اگر ہر چیز ویسے ہی ہوتی جائے جیسے وہ سوچ رہا تھا تو..... اس نے مسکرا کر اس نمبر کو دیکھا اور پھر اس کے نام پیغام لکھنے لگا۔

''میں انڈیا سے واپس بیوک ادا آ چکا ہوں۔ کیا ہم مل سکتے ہیں؟''۔

''پیغام جانے کے پورے ڈیڑھ منٹ بعد اسی نمبر سے جواب آیا تھا۔

''جہنم میں جاؤ تم۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا''۔

وہ پیغام پڑھتے ہوئے محظوظ سے انداز میں ہنس پڑا۔ پھر مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے جوابی پیغام لکھنے لگا۔

''میں جہنم میں بعد میں جاؤں گا، پہلے تم سے تو مل لوں۔ تم ہوٹل گرینڈ آؤ گے یا میں استقلال اسٹریٹ میں برگر کنگ پہ آ جاؤں؟''۔

سینڈ کا بٹن دباتے وقت وہ جانتا تھا کہ اس کے بردار ڈیرسٹ کا جواب ان دونوں جگہوں میں سے کوئی ہوگا۔ وہ انکار نہیں کرے گا۔ اس نے آج تک عبدالرحمٰن کو ''ناں'' نہیں کی تھی۔ وہ اسے ''ناں'' کبھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

حیا اس صبح جب حلیمہ آنٹی کے گھر سے واپس آ رہی تھی تو اس کے موبائل پہ جہان کا پیغام آیا تھا۔

جھجکی سے اُترتے ہوئے اس نے پیغام کھول کر پڑھا۔

''سنو! میں ابھی ذرا کام سے بیوک ادا آ رہا ہوں۔ دوپہر میں ملتے ہیں۔ لنچ ساتھ کریں گے ٹھیک!''۔

حیا نے حیرت سے ٹائم دیکھا۔ صبح کے ساتھ بجے تھے، اگر وہ ابھی چلا تو آٹھ، ساڑھے آٹھ تک پہنچ جائے گا، پھر وہ دوپہر تک بیوک ادا میں کیا کرے گا؟ اس کا کب سے اس جزیرے میں کوئی کام ہونے لگا؟۔

وہ اُلجھتی اندر آئی تھی۔

بیگ بیڈ پہ رکھتے ہوئے اس نے موبائل پہ جہان کا نمبر ملایا۔ نمبر بزی جا رہا تھا۔ اس نے فون رکھا اور چوکھٹ میں آ کھڑی ہوئی۔ سامنے عائشے اور بہارے اپنی چیزیں اکٹھی کرتی نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے اب جنگل جانا تھا۔

''آج میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گی عائشے! جہان آ رہا ہے''۔ وہ ذرا اُلجھی اُلجھی سی بتا رہی تھی۔

''شیور!'' عائشے نے سمجھ کر سر ہلا دیا اور تھیلا لیے باہر چلی گئی۔ پھر آٹھ بجے کے قریب وہ سنگھار میز کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

Downloaded From http://paksociety.com

جہان آ رہا تھا، اسے ڈھنگ سے تیار ہو جانا چاہیے۔ اس نے ہلکے ہلکے نم بالوں میں برش پھیرا، پھر ایک دراز سے وہ تھیلی نکالی جس میں اس کا تیسرا موتی رکھا تھا۔ بہارے کی سلور چین میں اس نے وہ موتی ویسے ہی پرو دیا جیسے وہ دونوں بہنیں پروتی تھیں اور چین گردن سے لگا کر دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر ہک بند کیا۔ تنگ زنجیر گردن سے چپک گئی تھی اور درمیان میں انکا موتی مزید چمکنے لگا تھا۔

اب اس نے پھر سے جہان کا نمبر ملایا، گھنٹی جا رہی تھی۔

''ہیلو؟'' جہان بولا تو پیچھے بازار کا مخصوص شور تھا۔ بہت سے بندے ایک ساتھ بول رہے تھے۔

''جہان تم پہنچ گئے؟''۔

''ہاں، میں تم سے دوپہر میں ملتا ہوں''۔

''تو تم دوپہر تک کیا کرو گے ادھر؟''۔

''میں وہ.....'' وہ ذرا رُکا۔ ''میں ایک دوست سے ملنے آیا تھا، ابھی اس کے پاس جا رہا ہوں''۔

''کون سا دوست؟'' اچنبھے سے پوچھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ جہان نے سوائے علی کرامت اور اس کی ماں کے، کبھی اپنے دوستوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کیا اس کا کوئی دوست نہیں تھا یا وہ اپنے دوستوں کا ذکر مستور رکھتا تھا؟

''ہے کوئی، تم نہیں جانتیں۔ اچھا۔ میں فارغ ہو کر کال کرتا ہوں''۔ وہ عجلت میں لگ رہا تھا۔

''او کے!'' اس نے فون کان سے ہٹایا، پھر سوچا کہ لنچ پر ہی پوچھ لے گی کیونکہ وہ جہان کو اس سفید محل میں نہیں بلانا چاہتی تھی۔ سو جلدی سے فون کان سے لگا کر ''ہیلو جہان؟'' کہا کہ مبادا اس نے فون بند نہ کر دیا ہو۔

جہان بھی فون بند کرنے کے بجائے کان سے ہٹا کر دوسری طرف کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے یقیناً حیا کا ہیلو نہیں سنا تھا۔ وہ ترکی میں کچھ کہہ رہا تھا۔

''کوئی مبہم سا فقرہ جس میں حیا کو صرف ''اوتل گرینڈ'' سمجھ میں آیا تھا۔ ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

''اوتل گرینڈ؟ یعنی ہوٹل گرینڈ؟ جہان نے ہوٹل گرینڈ کا ذکر کیا؟ یعنی وہ ہوٹل گرینڈ جا رہا تھا؟'' وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہو گئی۔ کیا جہان کو علم نہیں کہ وہ عبدالرحمٰن پاشا کا ہوٹل ہے اور پاشا تو اب بیوک اداوا پس آ گیا ہے''۔ لوگ عموماً ریسٹورانٹس میں ہی ملتے ہیں، اس لیے اس نے یقیناً اپنے دوست کو وہی مقام بتا دیا ہو گا اور جہان تو سرے سے کسی عبدالرحمٰن پاشا کو نہیں مانتا تھا۔ پھر؟۔

''اچھا چھوڑو سب۔ دوپہر میں اس سے ملنا تو پوچھ لینا''۔

سارے خیالات ذہن سے جھٹکتی، وہ پزل باکس لے کر اُٹھی اور اسٹڈی میں آ بیٹھی۔ کچھ دیر تو وہ باکس کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی، پھر ایک دم ایک نہج پہ پہنچ کر وہ باکس میز پہ رکھ کر اُٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔ زرد لمبے فراک پہ اس نے بھورا اسٹول شانوں کے گرد سختی سے لپیٹ لیا، بال یونہی کھلے رہنے دیے اور پرس میں کالی مرچ کا اسپرے رکھ کر وہ باہر نکل آئی۔

اسے معلوم تھا کہ وہ اب جب تک جہان کو اور ہوٹل گرینڈ کو دیکھ نہیں لے گی، اسے بے چینی رہے گی، اب چاہے اس کے لیے اسے تنہا کیوں نہ سفر کرنا پڑے۔ ویسے بھی جزیرہ چھوٹا سا تھا۔ ہوٹل گرینڈ اور اس کی عقبی پھولوں کی مارکیٹ اس محل سے قریباً پندرہ منٹ کی ہارس رائیڈ پہ تھی، مگر بندرگاہ سے اس جگہ کا فاصلہ پانچ دس منٹ اوپر تھا۔

''کیا تم مجھے دس منٹ میں پھولوں کی مارکیٹ پہنچا سکتے ہو؟'' اس نے پانچ لیرا کے دو کڑکڑاتے نوٹ بگھی بان کے سامنے کر کے سنجیدگی سے پوچھا۔ بگھی بان نے ایک نظر نوٹوں کو دیکھا اور دوسری نظر اس پہ ڈالی۔

''تمام! (او کے)'' اگلے ہی لمحے اس کی بگھی کے دونوں گھوڑے پتھریلی سڑک پہ دوڑ رہے تھے۔

وہ ایک لمبی، سیدھی، سڑک تھی جو دو رویہ درختوں سے گھری تھی اور اس کے آخری سرے پہ ہوٹل گرینڈ کی بلند و بالا عمارت کھڑی تھی۔ عمارت کے پیچھے ساحل تھا، گو وہ یہاں سے نظر نہیں آتا تھا۔ عمارت پوری کالونی میں ممتاز دکھتی تھی کیونکہ آس پاس چھوٹے موٹے کیفے تھے یا پھر پھولوں کی دُکانیں۔ پھولوں کی مارکیٹ یہاں سے شروع ہو کر ہوٹل کے عقب میں پچھلی گلی تک پھیلی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ پھولوں کے ایک اسٹال پہ جا کھڑی ہوئی اور یونہی بے توجہی سے پھول اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ بے چین نگاہیں بار بار اُٹھ کر ہوٹل کے دروازے کا طواف کرتیں۔ پتا نہیں جہان نے آنا بھی تھا یا اس نے یونہی اس ہوٹل کا تذکرہ کیا تھا؟

تب ہی گلی کے سرے پہ ایک بگھی رُکتی دکھائی دی۔ اس میں سے نیچے اُترنے والا بلاشبہ جہان ہی تھا۔ اس نے سر پہ سرخ پی کیپ لے رکھی تھی اور اب وہ والٹ سے پیسے نکال کر بگھی بان کو دے رہا تھا۔

حیا جلدی سے ایک اونچے شیلف کے پیچھے جا کھڑی ہوئی جس پہ گملے رکھے تھے۔ گملوں اور پھولوں کی جھکی ٹہنیوں کی درمیانی درزوں سے اسے وہ منظر نظر آ رہا تھا۔

پیسے دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ اب ہوٹل کی مخالف سمت میں سر جھکائے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا جا رہا تھا۔ اس کا رُخ ہوٹل کی عقبی گلی کی جانب تھا۔

''بے چارا آیا ہوگا کسی دوست سے ملنے، وہ کیوں اس کے پیچھے پڑ گئی ہے؟ وہ کیوں اس کا تعاقب کر رہی ہے؟'' اس نے جھنجھلا کر خود کو کوسا۔ جہان کے آس پاس سڑک پہ بہت سے لوگ دوسری سمت میں جا رہے تھے۔ وہ بھی اس ریلے کے پیچھے چل دی۔ اب جہان کو پکارنا بے وقوفی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بس وہ کہیں کسی کیفے میں چلا جائے تو وہ واپس چلی جائے گی۔

گلی کے دوراہے پہ پھولوں کا ایک بڑا سا اسٹال لگا تھا۔ وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ایک فلورل میگزین اُٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیا۔ میگزین کے اطراف سے اسے گلی کا عقبی حصہ نظر آ رہا تھا، جہاں دور آخری سرے پہ ہوٹل گرینڈ کی پشت تھی۔ وہاں ایک چھوٹا سا پرائیویٹ پارکنگ لاٹ بنا تھا اور مستعد گارڈز پہرہ دے رہے تھے۔ یقیناً وہ ہوٹل کے مالکان کے لیے تھا اور یقیناً وہاں پر کوئی پرائیویٹ لفٹ بھی ہوگی جو ہوٹل کے اعلیٰ عہدے داران کو ڈائریکٹ اپنے فلور تک پہنچا دیتی ہوگی۔

اس نے میگزین کے کور کا کنارہ ذرا سا موڑ کر دیکھا۔ جہان اسی طرح سر جھکائے چلتا ہوا سامنے جا رہا تھا۔ گرینڈ کی عقبی طرف۔

سیلز مین اب اس سے ''کیا چاہیے؟'' پوچھ رہا تھا۔

''ٹیولپس..... سبز رنگ کا ٹولپ مل سکتا ہے؟''۔ اس نے اردگرد ٹیولپ کے پھولوں کو دیکھتے ہوئے وہ رنگ پوچھا جو استنبول کیا کرۂ ارض پہ بھی شاید ہی ملتا۔ اس کے خیال میں!

''سبز رنگ کا ٹیولپ؟'' دُکان دار ذرا حیران ہوا پھر بولا ''مل جائے گا''۔

''اتنے زیادہ کیوں ہوتے ہیں ٹیولپس استنبول میں؟ جہاں دیکھو، ٹیولپس ہی نظر آتے ہیں''۔ اس نے جلدی سے دوسرا سوال جھاڑا۔ کن انکھیوں سے اسے جہان اب پارکنگ لاٹ تک پہنچتا نظر آ رہا تھا۔ وہاں رُک کر اس نے والٹ نکال کر گارڈ کو کچھ دکھایا، شاید اپنا آئی ڈی کارڈ۔ نفی میں سر ہلا کر جواباً کچھ کہہ رہا تھا۔

''ٹیولپس تو استنبول کا سمبل ہیں۔ کیا آپ نے ٹیولپ فیسٹیول کے بارے میں.....''۔

دکان دار جوش و خروش سے اسے فیسٹول کے بارے میں بتانے لگا۔ جس میں اسے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بظاہر سر ہلا کر سنتی، گاہے بگاہے ایک نگاہ ہوٹل کے عقبی پارکنگ لاٹ پہ ڈال لیتی، جہاں وہ ابھی تک کھڑا گارڈ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جب تک وہ واپس پلٹا، حیا اسٹول پہ بیٹھ کر میگزین چہرے کے سامنے کیے پھولوں میں کیموفلاج ہوئی بیٹھی تھی۔ اب بس جہان چلا جائے تو وہ بھی خاموشی سے نکل جائے گی۔

کسی نے نرمی سے میگزین اس کے ہاتھ سے کھینچا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

''جب اپنا چہرہ چھپانے کے لیے میگزین اس کے سامنے کرتے ہیں تو اس کو اُلٹا نہیں پکڑتے''۔

عین اس کے سر پہ کھڑے جہان سکندر نے نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر میگزین سیدھا کر کے اسے تھمایا۔

اگر زمین میں گڑ جانے سے زیادہ مبالغہ آمیز محاورہ ہوتا تو وہ اس وقت حیا سلیمان پہ صادق اُترتا۔

وہ قدرے بوکھلا کر کھڑی ہوئی۔

''اوہ..... تم، تم ادھر کیا کر رہے ہو؟''۔

Downloaded From http://paksociety.com

جواباً جہان نے مسکراہٹ دبائے سوالیہ ابرو اُٹھائی۔

''نہیں، ہلکہ، میں..... میں ادھر کیا کر رہی ہوں''۔ وہ ذرا خفت سے مسکرائی۔

''میں ایک کام سے آیا تھا اور تم شاید میرے پیچھے''۔ وہ مسکرا کر بولا، مگر اس کا چہرہ ذرا ستا ہوا لگ رہا تھا۔

''نہیں، تمہارے پیچھے کیوں، میں بھی ایک کام سے آئی تھی''۔ وہ سنبھل کر مسکرا کر بولی، البتہ دل ابھی تک یونہی دھک دھک کر رہا تھا۔

''واقعی؟''۔

''ہاں، میں اس علاقے پہ ایک رپورٹ لکھ رہی ہوں۔ ہالے کی ایک جرنلسٹ دوست کے لیے۔ بہت دلچسپ ہے''۔

جہان نے جواباً نگاہیں جھکا کر اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔

''اور تم کاغذ کے بغیر ہی رپورٹ لکھتی ہو؟''۔

''یہ نوٹ بک کہاں گئی؟ اوہ یہ رکھی ہے۔ اس نے اب بہت اطمینان سے اسٹال کے اس طرف دکان کے کاؤنٹر پہ رکھی نوٹ بک اُٹھائی اور اسے سینے سے لگا کر بازو لپیٹتے ہوئے مسکرا کر جہان کو دیکھا۔ جہان نے گردن موڑ کر دکان دار کو دیکھا۔ دکان دار نے ایک قلم میز سے اُٹھا کر حیا کی طرف بڑھایا۔

''یہ آپ کا قلم! کیا میرے انٹرویو کے ساتھ میری تصویر بھی چھپے گی؟'' ترک دکان دار نے بہت سادگی سے پوچھا تھا۔

''کوشش کروں گی!'' اس نے مسکراہٹ دبائے سر ہلا دیا۔ جہان شانے اُچکا کر پلٹ گیا تو اس نے ایک ممنون نگاہ دکان دار پہ ڈالی جو جواباً مسکرا دیا تھا۔ وہ جلدی سے جہان کے پیچھے لپکی۔

''مل لیے دوست سے؟''۔

''نہیں۔ بعد میں ملوں گا۔ سلیمان ماموں پرسوں استنبول آ رہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے؟'' وہ دونوں ساتھ ساتھ جزیرے کی ایک گلی میں چل رہے تھے جب جہان نے بتایا۔

''ہوں، معلوم ہے۔ اس لیے آج میں تمہارے ساتھ واپس چلی جاؤں گی''۔ اس نے ابھی ابھی کا ترتیب دیا ہوا پروگرام بتایا۔ ابا نے جب اپنے کاروباری ٹرپ کا ذکر کیا تھا تو اس نے استنبول واپس جانے کا تہیہ کر لیا تھا، اب جہان کے آنے سے آسانی ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ چھٹیاں وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

''عیسیٰ کی پہاڑی کس طرف تھی؟''

جب سڑک ختم ہو گئی اور وہ پہاڑی راستے پر چڑھنے لگے تو جہان ایک جگہ رُک گیا اور ذرا متذبذب انداز میں دو مخالف سمتوں میں جانے والے پہاڑی راستوں کو دیکھا۔

''یہ کیسے ہو گیا کہ جہان سکندر کو اپنے ترکی کے راستے بھول گئے؟'' وہ جتا کر مسکراتی ایک سمت اوپر چڑھنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا سے اُڑتی شال کو اس نے سختی سے شانوں کے گرد لپیٹ کر پکڑ رکھا تھا۔

''جہان سکندر جب بیوک ادا تمہارے اور ڈی جے کے ساتھ آیا تھا تو اس وقت وہ دو سال بعد ادھر آیا تھا''۔

''اور مجھے یاد ہے، تب بھی ڈی جے کے فون کرنے پہ تم بمشکل راضی ہوئے تھے''۔

''اوہ تم اس وقت ڈی جے کے ساتھ بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھیں؟ مجھے تو ڈی جے نے بتایا تھا کہ تم مصروف ہو''۔ وہ اس کے پیچھے پہاڑی پہ چڑھتے ہوئے ہلکے سے مسکرا کر بولا۔

''اس نے بعد میں بتایا تھا''۔

وہ مڑی نہیں، مگر اسے حیرت ہوئی تھی کہ جہان کو اتنی پرانی بات اتنی جزئیات سے یاد تھی۔

عیسیٰ تیسی (عیسیٰ کی پہاڑی) کی چوٹی پہ وہ یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے پہنچ ہی گئے تھے۔ پہاڑی کی چوٹی کسی سرسبز لان کی طرح چپٹی اور گھاس سے ڈھکی تھی۔ وہاں فاصلے فاصلے پہ بہت اونچے درخت لگے تھے یوں جیسے کسی یونیورسٹی کیمپس کا لان ہو۔ دور دور ٹولیوں

Downloaded From http://paksociety.com

میں لوگ بیٹھے تھے۔

ایک طرف ایک چوکور بلاک کی مانند لکڑی کی عظیم الشان قدیم عمارت تھی۔ وہ ایک خستہ حال، قدیم یونانی یتیم خانہ تھا جس کو دیکھنے لوگ دور دور سے Hill Jesus (عیسیٰ کی پہاڑی) پہ آتے تھے۔

وہ دونوں ایک درخت تلے آ بیٹھے۔ حیا نے تنے سے ٹیک لگالی، جب کہ جہان اس کے قریب ہی کہنی کے بل گھاس پہ نیم دراز ہوگیا۔ اسے بے اختیار ٹاپ قپی کے عقبی برآمدے کا منظر یاد آیا جب وہ دونوں اسی طرح بیٹھے تھے۔ لمحے جزیرے کی ہواؤں سے پھسلتے لکڑی کی قدیم عمارت پہ گر رہے تھے گویا بارش کے اَن دیکھے قطرے ہوں۔

عمارت کے قریب چندلڑکے گھاس سے ہٹ کر ایک الاؤ کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ الاؤ سے آگ کی لپٹیں اُٹھ اُٹھ کر فضا میں گم ہو رہی تھیں۔

''جہان..... کبھی تم نے اپنی جلد پہ جلنے کا زخم محسوس کیا ہے؟'' وہ دور اس الاؤ کو دیکھتی پوچھ رہی تھی۔

''غریب شیف دن میں کئی بار ہاتھ جلاتا ہے مادام!''۔

اس نے ایک نگاہ جہان پہ ڈالی۔ اس نے سوال ضائع کیا تھا۔ یہ بات اسے میجر احمد سے پوچھنی چاہیے تھی۔ اس نے سوال غلط بندے سے کیا تھا۔

''تم ہر وقت اپنے آپ کو اتنا غریب کیوں کہتے ہو؟'' لمحے بھر کو اسے جہان پہ بے طرح غصہ آیا تھا۔ استقلال اسٹریٹ میں تمہارا ریسٹورنٹ ہے؟ جہانگیر میں تمہارا گھر ہے اور جس روز ہم پاکستان میں آئے تھے، میں نے دیکھا تھا..... ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی Gadget تمہارے کمرے میں رکھا تھا۔ اب وہ سب تو تمہیں گفٹ نہیں ملے تھے نا''۔

''تم زخم کی بات کر رہی تھیں۔ تمہاری گردن کا زخم ٹھیک ہوا؟'' وہ بغیر شرمندہ ہوئے بہت ڈھٹائی سے موضوع بدل گیا۔

''میرے زخم بہت سے ہیں، میں نے ان کا شمار چھوڑ دیا ہے''۔ وہ ذرا تلخی سے کہتی رُخ موڑ کر قدیم، خستہ حال عمارت کو دیکھنے لگی۔ حرکت کرنے سے اس کے کان کی بالی میں موجود موتی ہلنے لگا تھا، مگر جہان کو تو یاد بھی نہیں ہوگا کہ یہ موتی اس نے حیا کو دیا تھا۔

''تمہاری رپورٹ کہاں تک پہنچی؟'' وہ مسکراہٹ دبائے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا جیسے اسے ابھی تک یقین نہیں ہو کہ حیا ''اتفاق'' سے پھولوں کی مارکیٹ میں تھی۔

''بہت دور تک..... سننا چاہو گے؟''

''ہاں تم نے اس بے چارے دُکان دار سے پھولوں کے متعلق کون سا راز اُگلوایا، ذرا میں بھی تو سنوں''۔ وہ کہنی کے بل ذرا اوپر کو ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میں پھولوں کے متعلق نہیں عبدالرحمٰن پاشا، اس کے گمشدہ بھائی اور ہوٹل گرینڈ کے متعلق رپورٹ لکھ رہی ہوں!''۔

اور زندگی میں پہلی بار اس نے جہان کے چہرے سے رنگ اُڑتا دیکھا۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔

''تم مذاق کر رہی ہو؟''۔

''نہیں، مگر اب تم یہ مت کہنا کہ استنبول میں عبدالرحمٰن پاشا نامی کوئی بندہ نہیں ہے۔ وہ ہے اور وہ ہوٹل گرینڈ کا مالک ہے، لیکن تم جانتے ہو، اس ہوٹل کا اصل مالک کون تھا؟''

جہان نے جواباً سوال نہیں کیا، وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اس کا چھوٹا بھائی۔ عبدالرحمٰن کا ایک چھوٹا بھائی تھا، جو اچانک ڈیڑھ دو سال قبل منظر عام سے غائب ہوگیا۔ اگر آج وہ ادھر ہوتا تو عبدالرحمٰن پاشا اتنا مضبوط اور ناقابلِ شکست نہ بنا بیٹھا ہوتا۔ میں وہ وجہ تلاش کر رہی ہوں جس کے باعث اس کا بھائی یوں روپوش ہوا ہے''۔

''تم یہ سب جان کر کیا کرو گی؟'' وہ بہت اُلجھن سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں یہ اسٹوری ہالے کو دوں گی اور وہ اپنی صحافی دوست کو۔ یوں معصوم سی یہ کہانی اخبار میں چھپے گی اور اگر یہ چیز ایک دفعہ میڈیا

Downloaded From http://paksociety.com

کے ہاتھ لگ جائے، تو پریشر کے باعث یا تو عبدالرحمٰن اپنے بھائی کو ڈھونڈ نکالے گا یا میڈیا''۔ وہ بہت جوش سے بولتی جا رہی تھی۔

''اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو کوئی پہلے ہی کر چکا ہوتا اور تم..... تم اس کے بھائی کو منظر عام پہ لا کر کیا کرو گی؟''۔

''میں چاہتی ہوں کہ لوگ، اس غلط فہمی سے نکل آئیں کہ عبدالرحمٰن پاشا کسی Voldemort Lord کا نام ہے۔ تم یقین کرو جہان! میں نے جتنی اس معاملے پہ تحقیق کی ہے، اتنا ہی مجھے اندازہ ہوا ہے کہ پاشا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ محض ایک جعلی پروپیگنڈا مہم ہے۔ بعض لوگ خود کو طاقت ور کہلا کر اپنی اَنا کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ میں قانون پڑھ رہی ہوں، مجھے ان باریکیوں کا پتا ہے''۔

''اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ تم قانون پڑھ رہی ہو، ورنہ میں تو اب تک بھول ہی چکا تھا''۔

''بات مت بدلو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ جب میڈیا میں یہ بات آئے گی کہ ہوٹل گرینڈ کا اصل مالک یونان نہیں، بلکہ کسی چھوٹی سی جگہ پہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو اس بات کو کتنا اُچھالا جائے گا''۔

''اسٹاپ دس حیا!'' وہ ایک دم جھنجھلایا تھا۔ ''تم، تم..... کیا ضرورت ہے، تمہیں پرائے مسئلے میں پڑنے کی؟ ضروری تو نہیں ہے کہ پاشا نے اپنے بھائی کو نکالا ہو، ہوسکتا ہے وہ خود گیا ہو، ہوسکتا ہے ان دونوں کے درمیان کوئی سیٹل منٹ ہو۔ ہزار ممکنات ہوسکتی ہیں''۔

''اور ہوسکتا ہے، اس نے خود اپنے بھائی کو واپس آنے سے روک رکھا ہو، اگر اخبارات اس خبر کو اُچھالیں گے تو عبدالرحمٰن پاشا کی اس خود ساختہ شہرت کے غبارے سے ساری ہوا نکل جائے گی''۔ وہ بہت مزے سے بولی تھی، پھر جہان کے تاثرات دیکھ کر اچنبھا ہوا۔ وہ بہت مضطرب اور کوفت زدہ سا لگ رہا تھا۔

''عبدالرحمٰن پاشا کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فرق پڑے گا تو اس کے بھائی کو حیا! بہت سے لوگ نئی زندگیاں شروع کر لیتے ہیں، وہ خود ہی اپنی پرانی زندگی میں نہیں لوٹنا چاہتے۔ اس طرح اس کو ایکسپوز کر کے تم اس کی زندگی مشکل میں ڈال دو گی۔ خوامخواہ مت پڑو ان لوگوں کے مسئلوں میں۔ چلو چلتے ہیں، مجھے واپس کام پہ بھی پہنچنا ہے''۔

وہ ایک دم ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے انداز میں واضح اضطراب تھا۔

''تم کو اپنے دوست سے نہیں ملنا؟''۔

جہان نے رُک کر ایک نظر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں، پھر کبھی مل لوں گا''۔

''مجھے سامان پیک کرنے میں ذرا وقت لگے گا تم پورٹ پہ میرا انتظار کر سکتے ہو؟ میں تب سامان لے کر سیدھی وہیں آ جاؤں گی''۔

''میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں، تمہاری دوست کے گھر''۔

''نہیں، تم بور ہو جائے گے، مجھے ساتھ والی آنٹی سے کچھ چیزیں لینی ہیں، وقت لگ جائے گا۔ میں تمہیں پورٹ پہ ملوں گی''۔ وہ جہان کو عائشے گل کے گھر کے باہر لگی اے آر پاشا کی تختی دکھانے کی متحمل ہرگز نہیں تھی۔

''او کے!'' اس نے زور نہیں دیا۔ وہ شانے اُچکا کر سر جھکائے نیچے اُترنے لگا۔ وہ کسی اور بات پہ اُلجھا ہوا لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

گھر آ کر اس نے جلدی جلدی سامان پیک کیا۔ فون کر کے عائشے سے معذرت کی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے، ابا کی آمد کا بتا کر جب وہ اپنا بیگ لیے نہایت عجلت میں بندرگاہ جانے کے لیے نکلی تو اسے بھول چکا تھا کہ اس کا پزل باکس اوپر اسٹڈی کی میز پہ پڑا رہ گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

دوپہر کی سرخی بیوک ادا کی اس سرسبز درختوں سے گھری گلی پہ چھا رہی تھی۔ بلند و بالا عثمانی محل کے سفید ستون سنہری روشنی میں چمک رہے تھے۔

عبدالرحمٰن ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا گول چکر دار زینے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس کے جوتوں کی دھمک پہ کچن میں کام کرتی عائشے کے سبزی کاٹتے ہاتھ رُک گئے۔ گھر میں جوتوں سمیت صرف عبدالرحمٰن ہی گھوما کرتا تھا۔ وہ مڈل کلاس ترکوں کی طرح گھر سے باہر کبھی جوتے نہیں

Downloaded From http://paksociety.com

اُتارتا تھا بلکہ استنبول کی ہائی ایلیٹ کی طرح قالین پہ بھی جوتے پہن کر بہت تفاخر سے چلا کرتا تھا۔

عائشے نے صبح ہی اسے ایم ایس ایم کر دیا تھا کہ حیا کل چلی گئی ہے اور رات میں آنے بھی آ گئی تھیں، وہ چاہے تو گھر آ سکتا ہے۔ سو وہ آ گیا تھا۔

اس نے جلدی سے سنک کی ٹونٹی کھولی، ہاتھ دھوئے اور انہیں خشک کیے بنا باہر نکلی تو اسے عبدالرحمٰن بالائی منزل کی راہ داری کے پہلے دروازے میں داخل ہوتا دکھائی دیا تھا۔ وہ اسٹڈی میں جا رہا تھا۔ عائشے تیز قدموں سے اس کے پیچھے زینے چڑھنے لگی۔

اسٹڈی روم کا دروازہ پورا کھلا تھا۔ عبدالرحمٰن ایک بک شیلف کے سامنے کھڑا کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' اس نے چوکھٹ میں رُک کر سلام کیا۔

''ہوں وعلیکم!'' وہ ہاتھ میں پکڑی کتاب کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ وہ اتنے دن بعد گھر آیا تھا، مگر اس کا انداز ویسا ہی تھا۔

''تم کب آئے؟''۔

''ابھی''۔ وہ کتاب رکھ کر اسٹڈی ٹیبل کی طرف آیا اور دراز کھول کر اندر رکھی اشیاء اِدھر اُدھر کرنے لگا۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''۔ عائشے کو بے چینی ہوئی۔

''کچھ پیپرز تھے اور ایک کتاب بھی''۔ وہ اب گھٹنے کے بل زمین پہ بیٹھا نچلی دراز کھول رہا تھا۔

''تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟''۔ وہ اُداسی سے بولی۔

''نہیں!'' وہ بنا پلٹے بولا تھا۔

''میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے جو بھی کہا تھا، آنے کے لیے کہا تھا۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہے مگر تم نے اس دن کے بعد مجھ سے کبھی ٹھیک سے بات نہیں کی''۔

''عائشے! میرے معاملات میں مت بولا کرو!'' اس نے مڑ کر ایک سخت نگاہ عائشے پہ ڈال کر کہا اور واپس پلٹ گیا۔ ''تم نے اپنی دوست کو میرے سو کالڈ بھائی کے بارے میں بتایا ہے نا، اس نے مجھے خصوصاً یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا، تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا''۔

''میں تمہارے حکم کی پابند تو نہیں ہوں عبدالرحمٰن!'' عائشے نے نرمی سے مگر خفا لہجے میں کہا۔ ''بہارے نے ہماری لڑائی کا ذکر کیا تو میں نے پوری بات بتا دی۔ اس سے کیا ہوتا ہے''۔

''آنے کدھر ہیں؟'' وہ اب ٹیبل پہ رکھی کتابیں اُٹھا اُٹھا کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

''وہ سو رہی ہیں''۔ وہ کہہ کر پلٹ گئی۔ جاتے ہوئے اس کا چہرہ بہت خفا اور اُداس تھا۔ وہ چلی گئی تو عبدالرحمٰن نے پلٹ کر دیکھا پھر برہمی سے سر جھٹکا۔ ''یہ لڑکی مروائے گی اسے کسی دن''۔

سرخ جلد والی کتاب ایک فائل تلے رکھی تھی، اس نے گہری سانس لے کر کتاب اُٹھائی۔ اس کے اندر وہ کاغذات پڑے تھے جو اس نے پہلے وہاں رکھے تھے۔ کتاب اُٹھا کر وہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ اس کی نگاہ ایک شے پہ رُک گئی۔

وہ ایک سیاہی مائل پزل باکس تھا جس کی چاروں اطراف جلی ہوئی لگتی تھیں اور ان پہ سنہری حروف اُبھرے ہوئے تھے۔

عبدالرحمٰن نے کتاب واپس رکھی اور آہستہ سے وہ باکس اُٹھایا، پھر اس کو الٹ پلٹ کر کے وہ سطور دیکھنے لگا۔ ایک شعر تلے کوڈ بار کے چھے چوکھٹے بنے تھے اور ان میں متفرق حروف اُبھرے ہوئے تھے۔

وہ باکس پکڑے باہر آیا۔ عائشے کچن سے اسی وقت نکلی جب وہ سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ عبدالرحمٰن نے نامحسوس انداز میں باکس والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ عائشے نے اسے نہیں دیکھا تھا، وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ راہ داری سے گزر کر پچھلے دروازے سے ہوتا ہوا عقبی باغیچے میں آ گیا۔ وہاں کونے میں عائشے کی ورک ٹیبل رکھی تھی جس پہ بہارے کوئی کلرنگ بک رکھے رنگ بھر رہی تھی۔ بہارے سے وہ آتے ہوئے مل چکا تھا، سو اب اسے آتے دیکھ کر وہ سادگی سے مسکرا دی۔

''بہارے!'' وہ مدھم مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اس کے قریب آیا اور پزل باکس اس کے سامنے کیا۔ ''یہ کس کا ہے؟''۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اوہ یہ تو حیا کا ہے، وہ یہیں بھول گئی؟''۔ وہ حیرت سے بولی۔ ''کل اس کا کزن آیا تھا تو اسے جلدی میں جانا پڑا۔ تمہیں پتا ہے، اس کا کزن بہت ہینڈسم ہے''۔

''یہ حیا کا ہے؟'' عبدالرحمٰن نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دُہرایا۔

''ہاں یہ اسے کسی نے دیا تھا''۔

''کس نے؟'' وہ بنا پلک جھپکے بہارے کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا''۔ بہارے نے شانے اُچکا دیے

''کیا یہ عائشے نے بنایا ہے؟''۔

''ہاں، مگر تم اس سے پوچھنا نہیں۔ اس کے خریدار نے تمہیں بتانے سے منع کیا تھا''۔ بہارے کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ وہ مسکرا دیا۔

''اسی لیے تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم اس کو کھول سکتی ہو؟''۔

''نہیں، اس کی پہیلی ابھی حیا نہیں حل کر سکی تھی۔ تم کر سکتے ہو؟'' بہارے کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

''شاید، مگر بہارے گل!'' وہ ذرا سا جھکا اور دھیرے سے بولا۔ ''یہ باکس میرے پاس ہے، یہ بات میرے اور تمہارے درمیان راز رہے گی۔ تم حیا یا عائشے کو نہیں بتاؤ گی اس بارے میں۔ ٹھیک؟''

''ٹھیک!'' بہارے نے اُلجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ ''مگر تم اس کو توڑنا نہیں توڑ کر کھولنے سے اس کے اندر کی موجود شے تمہارے کام کی نہیں رہے گی''۔

وہ سر ہلا کر واپس پلٹ گیا۔ بہارے اپنی کلرنگ بک چھوڑ کر اس کے پیچھے آئی۔ وہ جب تک اندر آئی، عبدالرحمٰن اوپر جا چکا تھا۔ وہ دبے پاؤں زینے چڑھنے لگی۔

تیسری منزل پہ عبدالرحمٰن کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ بہارے نے چوکھٹ کے قریب سر نکال کر جھانکا۔

عبدالرحمٰن پزل باکس الماری میں رکھ رہا تھا۔ الماری کا پٹ بند کر کے اس نے لاک لگایا اور چابی اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے دراز میں ڈال دی۔ بہارے جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور بلی کی چال چلتی واپس اُتر گئی۔

عبدالرحمٰن نے وہ باکس کیوں رکھ لیا، اس کا ذہن کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

☆ ☆ ☆

ابا آج صبح پہنچے تھے اور اب وہ ''مرمرا ہوٹل'' میں تھے۔ مرمرا ہوٹل ٹاقسم میں واقع تھا۔ حیا اور ڈی جے نے غریب عوام کی طرح وہ شان دار ہوٹل باہر سے ہی دیکھا تھا۔ اگر ڈی جے ہوتی تو وہ دونوں اس بات کو بہت انجوائے کرتیں کہ ابا اب اسی ہوٹل میں رہ رہے تھے۔

اس کا ڈورم ڈی جے کے بغیر بہت ادھورا سا تھا۔ ڈی جے ابھی تک وہیں تھی، وہ تو جیسے کہیں گئی ہی نہیں تھی۔ ہالے نے کل ڈورم بدل لیا تھا، اب وہ ڈی جے کے بینک پہ منتقل ہو گئی تھی۔ البتہ ان دونوں نے اس بینک سے ملحقہ میز پہ ڈی جے کی ٹوٹی عینک ٹیپ سے جوڑ کر رکھ دی تھی۔

رات انجم باجی اور ہالے اسی کے پاس رُک گئی تھیں۔ وہ تینوں گھنٹوں ڈی جے کی باتیں کرتی رہی تھیں۔

''جب ہم پہلی دفعہ آپ سے ملے تھے تو اسے آپ کے انڈین ہونے پہ بہت اعتراض تھا۔ اسے پاکستان کا ٹی ٹوئنٹی فائنل میں آخری بال پہ مصباح کے آؤٹ ہونے کا بہت دُکھ تھا۔ اس نے اس کے بعد کرکٹ دیکھنی ہی چھوڑ دی تھی۔ بعض دُکھ اصل واقعات سے بڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ڈی جے کی محبت سے ڈی جے کا دُکھ بڑھ گیا ہے''۔

''اور استقلال اسٹریٹ میں جب.....''

اس کے اور ہالے کے پاس بہت سے واقعات تھے۔ وہ یادوں سے نکل کر جب سوئیں تو صبح دیر سے اُٹھیں۔ آج چھٹی تھی اور

Downloaded From http://paksociety.com

اب اسے ابا سے ملنے جانا تھا۔ سو اب وہ اسی لیے تیار ہو رہی تھی۔

جو گہرا سبز فراک اس نے پہنا تھا یہ وہی تھا جو وہ ڈی۔ جے کے ساتھ آخری دفعہ پھپھو کے گھر پہن کر گئی تھی۔

''بالکل پاکستان کا جھنڈا لگ رہی ہو''۔

کچھ یاد کر کے وہ اُداسی سے مسکرائی اور پرفیوم اُٹھایا۔ ابھی اس نے اسپرے نوزل پہ انگوٹھا رکھا ہی تھا کہ بہارے کہیں آس پاس سے چیخی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' اچھی لڑکیاں اتنا تیز پرفیوم لگا کر باہر نہیں جاتیں''۔

وہ ایک دم رُک گئی۔ اُف، عائشے گل اور اس کی ''اچھی لڑکی!'' اسے ان باتوں کو اپنے ذہن پہ حاوی نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے دوبارہ نوزل دبانا چاہا مگر پتا نہیں کیوں اس نے پرفیوم واپس رکھ دیا۔

اپنے بازو کے اوپری حصے پہ داغے گئے الفاظ پہ وہ پہلے ہی اسکن کلر کا بینڈ تیج لگا چکی تھی۔ فراک کی شیفون کی آستینوں سے بازو جھلکتے تھے۔ کلر بینڈ تیج نے ان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس نے سبز دوپٹہ ٹھیک سے شانوں پہ پھیلایا اور کھلے بالوں کو کندھے کے ایک طرف ڈالتی باہر نکل آئی۔

''اچھی لڑکیاں بال کھول کر باہر نہیں نکلتیں''۔

وہ اپنے ذہن میں گونجتی آوازوں کو نظر انداز کرتی سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔

''اچھی لڑکیاں اللہ تعالیٰ کی بات مانتی ہیں''۔

وہ سر جھٹکتی آخری زینہ پھلانگ آئی۔

''اچھی لڑکیاں.....اچھی لڑکیاں''۔

اس نے اپنا سر اُٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ اندھیرے پہ اندھیرے۔ لہر پہ لہر صبح کے وقت بھی اسے ہر طرف اندھیرا لگنے لگا تھا۔ اس کی روشنی کہاں تھی؟۔

وہ بے دلی سے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی انجم باجی کے اپارٹمنٹ کی طرف آ گئی۔ انجم باجی اپنا چارجر اس کے کمرے میں بھول گئی تھیں۔ ان کا چارجر لوٹا کر اس نے اب چلے جانا تھا مگر پتا نہیں کیوں رُک گئی۔

''انجم باجی! میرے بالوں کی فرنچ بریڈ بنا دیں گی؟'' اس نے خود کو کہتے سنا۔

''ہاں۔ شیور ادھر بیٹھو!'' انجم باجی برش لے کر اس کے بال سنوارنے لگیں۔

''حیا! تمہارے بالوں کو کیا ہوا ہے؟'' فرانسیسی طرز کی چوٹی کے باریک بل باندھتے ہوئے وہ حیرت سے کہہ اُٹھیں۔ وہ ذرا سی چونکی۔

''کیا ہوا؟''۔

''تمہاری Scalp کی جلد کا رنگ ایسا سرخ بھورا سا ہو رہا ہے، چھالے ہوئے تھے بالوں میں؟''۔

''نہیں، ایک شیمپو ری ایکٹ کر گیا تھا۔ بس چند دن میں ٹھیک ہو جائیں گے''۔ اس نے ان سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

چوٹی بناتے ہوئے بال کھنچ رہے تھے اور سر کی جلد درد کر رہی تھی، مگر وہ برداشت کر کے بیٹھی رہی۔ عائشے نے جب وہ ویکس اُتاری تھی تو اس کے بالوں کو کتنا نقصان ہوا، کتنا نہیں، عائشے نے تفصیل اسے کبھی نہیں بتائی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کبھی وہ اس سارے واقعے کی تفصیل دوبارہ سے سنے گی۔

اس نے انجم باجی کے اپارٹمنٹ سے نکلنے سے قبل خود کو آئینے میں نہیں دیکھا۔ اسے پتا تھا، وہ فرنچ بریڈ میں بہت اچھی نہیں لگ رہی ہو گی۔

حسین اور مومن گورسل شٹل سے اُتر رہے تھے جب وہ اسٹاپ پہ پہنچی۔

''معتصم سے کہنا، مجھے اس کو کچھ دکھانا ہے''۔ وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ حسین سے کہہ کر بس میں چڑھ گئی۔ وہ واپس آ جائے پھر

Downloaded From http://paksociety.com

معتصم کے ساتھ مل کر پزل باکس کی پہیلی حل کرنے کی کوشش کرے گی۔

مرمرا ہوٹل، ٹاقسم ڈسٹرکٹ میں واقع تھا۔ شیشوں سے ڈھکی بلند و بالا عمارت، گویا کوئی اونچا سا ناور ہو۔ اندر سے بھی وہی چمکتا، آنکھوں کو خیرہ کرتا منظر۔

وہ پتلی ہیل سے پُر اعتماد انداز میں چلتی لابی میں آئی تھی۔ ابا نے بتایا تھا کہ وہ لابی میں ہی ہوں گے اور وہ اسے دور سے ہی نظر آ گئے تھے۔ ان کا اس کی طرف نیم رُخ تھا۔ وہ کھڑے کسی سے محوِ گفتگو تھے۔

وہ ان کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ نگاہ ابا کے ساتھ کھڑے دونوں افراد پہ پڑی۔ ایک دم سے اس کے پاؤں برف کی سل بن گئے۔

ابا کے ساتھ کوئی اور نہیں، ان کے کاروباری شراکت دار لغاری انکل اور ولید لغاری تھے۔

گویا کرنٹ کھا کر حیا مڑی اور تیزی سے ایک دوسری راہ داری میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ صد شکر کہ ان میں سے کسی کی نظر ابھی اس پہ نہیں پڑی تھی۔

یہ قابلِ نفرت شخص کہاں سے آ گیا؟ وہ اس کا سامنا کیسے کرے؟ وہ کیا کرے؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس وہ بنا دیکھے لیڈیز ریسٹ روم کی طرف آ گئی۔

وہاں آئینے سے ڈھکی دیوار کے آگے قطار میں بیسن لگے تھے۔ ایک طرف باتھ رومز کے دروازے تھے۔ ایک ترک لڑکی ایک بیسن کے سامنے کھڑی آئینے میں دیکھتی لپ اسٹک درست کر رہی تھی۔

حیا اس سے فاصلے پہ آئینے کے آگے کھڑی ہو گئی۔ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار گردن پہ ہاتھ رکھا۔ جب ولید نے اس کا دوپٹہ کھینچا تھا تو اس کی گردن پہ رگڑ آئی تھی۔ ڈولی کا کھردرا ہاتھ، اس کا فرائنگ پین مگر یہاں کوئی ڈولی نہیں تھا، جو اس کے لیے آ جاتا۔ وہ اکیلی تھی۔ کس سے مدد مانگے، اس سے جو کسی مشکل میں اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا؟ مگر شاید اب کی بار.....

اس نے جلدی سے موبائل پہ جہان کا نمبر ملایا۔ طویل گھنٹیاں جا رہی تھیں۔

''اُٹھا بھی چکو!'' وہ فون کان سے لگائے کوفت زدہ سی کھڑی تھی۔ آئینے میں جھلکتے اس کے چہرے پہ اب تک زخموں کے نشان مندمل ہو چکے تھے۔

پانچویں گھنٹی پہ جہان کی خمار آلود آواز گونجی۔

''آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت سو رہا ہے۔ براہِ مہربانی، کافی دیر بعد رابطہ کریں۔ شکریہ''۔

''جہان! اُٹھو اور میری بات سنو!'' وہ جھلا سی گئی تھی۔

''میں بہت تھکا ہوا ہوں، مجھے سونے دو، میں نے ریسٹورنٹ.....''

''جہنم میں گیا تمہارا ریسٹورنٹ۔ تم ابھی اسی وقت مرمرا ہوٹل پہنچو۔ ابا آئے ہوئے ہیں اور ساتھ ان کے دوست وغیرہ بھی ہیں، مجھے اکیلے ان سے ملنا اچھا نہیں لگ رہا''۔ اس کی آواز میں بے بسی در آئی تھی۔

ساتھ کھڑی لڑکی اب بالوں کو اونچے جوڑے میں باندھ رہی تھی۔

''میں نہیں آ رہا، مجھے آرام کرنے دو''۔

''ٹھیک ہے۔ جہنم میں جاؤ تم اور تمہارا ریسٹورنٹ۔ وہ جن لوگوں نے تمہارے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی تھی نا، انہوں نے بہت اچھا کیا تھا، تم ہو ہی اسی قابل''۔ اس نے زور سے بٹن دبا کر کال کاٹی۔

ترک لڑکی اب بیسن کی سلیب پہ رکھا اسکارف اُٹھا کر چہرے کے گرد لپیٹ رہی تھی۔ حیا چند لمحے اسے بے خیالی میں تکتی رہی، پھر کسی میکانکی عمل کے تحت اس نے شانوں پہ پھیلا دوپٹہ اُتارا اور سر پہ رکھ کر چہرے کے گرد تنگ ہالہ بنا کر پلو بائیں کندھے پہ ڈال لیا۔ سبز دوپٹہ کرنکل جارجٹ کا تھا اور چاروں اطراف سفید موٹی پائی پن ہوئی تھی۔ پاکستان کا جھنڈا۔ کندھے، آستین، کلائیاں تک دوپٹے میں چھپ گئی تھیں، مگر کیا وہ اچھی بھی لگ رہی تھی؟ شاید نہیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

لیکن کس کو؟ کسی نے اس سے پوچھا اور ایک دم سے اس کا دل پُرسکون ہو گیا۔ اس وقت وہ لوگوں کو اچھی لگنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہ سب اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے نہیں کر رہی تھی، وہ تو شاید صرف اپنا دفاع کر رہی تھی۔ نیکی، اللہ تعالیٰ کا خوف، اسے اب بھی ان میں سے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔

''ابا!'' ان کے عقب میں جا کر اس نے ان کو پکارا تو وہ تینوں ایک ساتھ پلٹے۔

''او مائی چائلڈ!'' ابا خوشی سے آگے بڑھے۔ وہ ایک رسمی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے ابا سے ملی اور لغاری انکل کو فاصلے سے سلام کر لیا۔

''بیٹا! یہ لغاری ہیں، میرے دوست، اور یہ ان کے صاحب زادے ہیں ولید''۔

''مجھے تو آپ جانتی ہوں گی، ہم پہلے مل چکے ہیں''۔ ولید ایک محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''مجھے یاد نہیں، میں ہر کسی کو یاد نہیں رکھتی''۔ ذرا رکھائی سے کہہ کر وہ ابا کی طرف مڑی اور اپنی بات کا ردِعمل آنے سے قبل ہی بولی۔

''آپ کو کدھر لے کر جاؤں ابا! استنبول کی سیر آپ کہاں سے شروع کرنا چاہیں گے؟''۔

''میرا خیال ہے انکل! استقلال اسٹریٹ چلتے ہیں، اس رونق کے بارے میں بہت سنا ہے''۔ ولید کی مسکراہٹ ذرا سمٹی تو تھی مگر وہ ابھی بھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ استقلال اسٹریٹ کی رونق سے اس کا اشارہ اس جگہ کے بارز اور نائٹ کلبز کی طرف ہی تھا۔

''جہاں تم کہو، تم زیادہ جانتی ہو گی استنبول کو''۔ ابا مسکرا کر بولے تھے۔

''میرا خیال ہے ابا، ہم بلیو موسق (نیلی مسجد) چلتے ہیں۔ میں جہان کو بھی بتا دوں''۔ وہ سارا پروگرام بنا کر موبائل پہ جہان کو میسج کرنے لگی۔ جان بوجھ کر بھی جہان کا نام لینے کے باوجود ان باپ بیٹے نے نہیں پوچھا کہ کون جہان؟'' اسے مزید کوفت ہوئی۔ اسی کوفت زدہ انداز میں اس نے میسج لکھا۔

''ہم بلیو موسق، آیا صوفیہ اور ٹاپ قپی جا رہے ہیں، تم اسی جگہ آ جاؤ اور اگر تم نہ آئے تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی''۔

''یہ بات اسٹامپ پیپر پہ لکھ کر دو!'' فوراً جواب آیا تھا۔

''فائن۔ اب میں تم سے واقعی کبھی بات نہیں کروں گی''۔

''تو کیا نیکسٹ کرو گی؟'' ساتھ ایک معصوم سا مسکراتا چہرہ بھی تھا۔ اس نے جواب نہیں دیا، اگر وہ سامنے ہوتا تو وہ اس کی گردن دبوچ لیتی۔

آیا صوفیہ اور ٹاپ قپی پیلس ساتھ ساتھ ہی واقع تھے اور ان کے سامنے سڑک کی دوسری جانب استنبول کی مشہورِ زمانہ نیلی مسجد تھی، پچھلی دفعہ اگر ڈی جے اور پھر جہان کی طبیعت خراب نہ ہو جاتی تو وہ لوگ نیلی مسجد ضرور جاتے مگر اب سب بدل چکا تھا۔

نیلی مسجد (سلطان احمت مسجد) کا رنگ نیلا نہیں تھا، مگر اس کی اندرونی ازمک ٹائلز نیلی تھیں۔ باہر سے اس کے گنبدیوں تھے گویا چھوٹے چھوٹے پیالے اُلٹے رکھے ہوں۔ مسجد کے احاطے کے آگے گیٹ تھا اور اس کے باہر قطار میں بنچ لگے تھے۔ یوں کہ ہر دو بنچز کے درمیان ایک میز تھی۔

بنچ پر وہ اور ابا میز کے ایک طرف جب کہ ولید اور لغاری صاحب دوسری طرف بیٹھ گئے تھے۔ موبائل حیا نے گود میں رکھا ہوا تھا گو کہ اب وہ جہان کی طرف سے مایوس ہو چکی تھی۔

وہاں ہر سو کبوتر پھڑ پھڑاتے ہوئے اُڑ رہے تھے۔ ہوا سے اس کا دوپٹا بھی پھسلنے لگتا، وہ بار بار اسے دو اُنگلیوں سے پیشانی پہ آگے کو کھینچتی۔ آج اسے اپنے سر سے دوپٹا نہیں گرنے دینا تھا۔ آج نہیں۔

''رات کے سیمینار کے بعد یوں کرتے ہیں کہ عمیر خان سے مل لیں گے''۔ ابا اور لغاری انکل آپس میں محوِ گفتگو تھے۔ ولید اسے نظروں کے حصار میں لیے اس کے مقابل بیٹھا تھا۔ وہ گردن موڑ کر لاتعلق سی اُڑتے کبوتر دیکھ رہی تھی۔

دفعتاً اس نے ابا اور لغاری انکل کو اُٹھتے دیکھا۔ چونک کر اس نے گردن موڑی۔

''تم لوگ بیٹھو، ہم ابھی آتے ہیں''۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

Downloaded From http://paksociety.com

انہیں کچھ دیکھنا تھا یا کوئی مل گیا تھا یا پھر شاید ولید نے اپنے باپ کو کلیو..... دیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھی رہی۔ دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ ابا کو بھی ترکی آ کر اتاترک کا اثر ہو گیا تھا۔ پاکستان ہوتا تو وہ کبھی یوں اپنی بیٹی کو دوست کے بیٹے کے ساتھ تنہا چھوڑ کر نہ جاتے۔

''تو میں آپ کو واقعی یاد نہیں؟'' وہ محظوظ انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ حیا نے گردن پھیر کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''میرے ابا کے دوستوں کے پاس بہت سے کتے ہیں، مجھے کبھی کسی ایک کتے کا بھی نام یاد نہیں رہا''۔

وہ جواباً اسی طرح مسکرائے گیا۔

''بہت نیک ہو گئی ہیں آپ مگر اس سرخ رنگ میں آپ بہت اچھی لگتی تھیں''۔

وہ لب بھینچے رُخ موڑے بیٹھی رہی۔

''کچھ کھائیں گی آپ؟ کیا پسند ہے آپ کو کھانے میں؟''۔

''آپ کو کیا پسند ہے کھانے میں؟ فرائنگ پین؟''۔

اب کے وہ بھی تمسخرانہ مسکرا کر بولی تھی۔ وہ پھر بھی ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔

''گاڑی نہیں ہے آپ کے پاس ادھر؟ آپ کے ساتھ ڈرائیو پہ جانا مجھے اچھا لگتا''۔ وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔ ایک سنگین غلطی جس پر وہ کبھی بھی کھول سکتا تھا۔ نے کھ کندر تک کانپ گئی تھی۔

''اپنی حد میں رہیں ولید صاحب! جورات کے اندھیرے میں آپ کو فرائنگ پین کی ایک ضرب سے زمین بوس کر سکتا ہے، وہ ان کی روشنی میں تو اس سے بھی بدتر کر سکتا ہے''۔ کسی احساس کے تحت اس نے چہرہ موڑا تھا۔

دور سے جہان نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ وہ ان ہی کی طرف آ رہا تھا۔ نیلی جینز پہ سفید ٹی شرٹ میں ملبوس، اس کے چہرے سے لگ رہا تھا، وہ ابھی ابھی سو کر اُٹھا ہے۔

حیا کی انکی سانس بحال ہوئی۔ اسے زندگی میں کبھی جہان سکندر کو دیکھ کر اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی، جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔

وہ بے اختیار اُٹھی، گود میں رکھا موبائل زمین پہ جا گرا۔ وہ چونکی اور جلدی سے جھک کر فون اُٹھایا۔ اس کی اسکرین پہ بڑی سی خراش پڑ گئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے ولید بھی ساتھ ہی اُٹھا تھا۔

''جی میڈم! آپ اپنی بات پہ قائم ہیں؟'' وہ مسکرا کر کہتا اس کے قریب آیا''۔ پھر نگاہ ولید پہ پڑی تو اس نے سوالیہ نظروں سے حیا کو دیکھا۔

''جہان! یہ ابا کے دوست کے بیٹے ہیں، ابا ان کے والد کے ساتھ ابھی..... وہ آ گئے''۔ ابا اور لغاری انکل سامنے سے چلتے آ رہے تھے۔ جہان کو دیکھ کر ابا کے چہرے پہ خوش گوار حیرت اُبھری۔

''سوری ماموں! میں ایئرپورٹ نہیں آ سکا۔ ممی نے بتایا تھا کہ آپ نے خود منع کر دیا تھا''۔ ابا سے مل کر وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بتا رہا تھا۔ لغاری انکل اور ولید سے بھی وہ اسی خوش دلی سے ملا تھا، البتہ وہ دونوں استفہامیہ نظروں سے سلیمان صاحب کو دیکھ رہے تھے۔

''اٹس او کے، آفیشلی پک کر لیا گیا تھا ہمیں، اسی لیے میں نے سین کو منع کر دیا تھا''۔ جہان نے مسکرا کر سر کو جنبش دی، پھر نگاہ لغاری انکل کے سوالیہ تاثرات پہ پڑی تو جیسے جلدی سے وضاحت دی۔

''میں جہان سکندر ہوں، سلیمان ماموں کا بھانجا اور داماد۔ حیا کا ہزبینڈ!''۔

مرمرا کا سمندر ایک دم آسمان تک اُٹھا اور کسی تھال کی طرح اس پہ انڈیل دیا گیا تھا۔ وہ اس بوچھاڑ میں بالکل سن سی ہوئی جہان کو دیکھ رہی تھی جس رشتے کے متعلق نہ پوچھنے کی اس نے قسم کھا رکھی تھی، اس رشتے کا اقراریوں اس منظر نامے میں ہو گا، اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''داماد؟ اوہ آئی سی!'' لغاری انکل نے بمشکل مسکرا کر سر ہلایا، پھر ایک نظر ابا پہ ڈالی، جو لمحے بھر کو گنگ رہ گئے تھے، مگر جلدی ہی

Downloaded From http://paksociety.com

سنبھل گئے تھے۔

''مجھے خوشی ہے جہان! کہ تم آئے''۔حالانکہ وہ اس کے آنے کے بجائے کسی اور بات پہ خوش تھے۔

''سوری ماموں! مجھے پہلے آنا چاہیے تھا اور اگر اب بھی نہ آتا تو حیا نے مجھ سے ساری زندگی بات نہ کرنے کا ارادہ کرلیا تھا''۔اس نے مسکرا کر کہتے حیا کو دیکھا، وہ جواباً دھیرے سے مسکرائی۔جیسے وہ دونوں ہمیشہ سے ہی ایسے ہی آئیڈیل کپل کی طرح بات کرتے رہے ہوں۔جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی تلخ کلامی ہوئی ہی نہ ہو۔

ولید لغاری کے چہرے کی مسکراہٹ پھر یوں غائب ہوئی کہ وہ دوبارہ مسکرا نہ سکا۔بعد میں سارا وقت وہ محتاط انداز میں اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا رہا۔وہ اپنے سامنے، اپنے شوہر اور باپ کے درمیان بیٹھی لڑکی پہ اب نظر ڈالنے کی بھی جرأت نہیں کر رہا تھا۔

اس سہ پہر جہان نے ان تینوں مہمانوں کی بہت اچھے طریقے سے تواضع کی۔ٹاپ قپی اور آیا صوفیہ (میوزیم) کی راہ داریوں میں ان کو ساتھ لیے وہ ایک اچھے گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔آج استنبول میں حیا کا پہلا دن تھا، جب وہ بہت اعتماد سے جہان کے پہلو میں چل رہی تھی۔

''تم ان دونوں کو ہوٹل ڈراپ کر کے ابا کو گھر لے جانا، میں خود ہی گھر آجاؤں گی۔ابھی مجھے یہاں کچھ کام ہے''۔واپسی کے وقت اس نے جہان سے دھیرے سے کہا تھا۔وہ شانے اُچکا کر بنا اعتراض کے ساتھ چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد وہ نیلی مسجد کے گیٹ کے اندر چلی آئی۔اسے یہاں کوئی کام نہیں تھا، اسے بس کچھ وقت کے لیے تنہائی چاہیے تھی۔

مسجد کے احاطے میں سبزہ زار پہ پانی کا فوارہ اُبل رہا تھا۔اونچے گنبدوں پر چھاؤں سی چھائی تھی۔وہ سر جھکائے روش پہ چلتی اندر جا رہی تھی۔

''اندھیروں پہ اندھیرے، اس کے اوپر لہر۔اس کے اوپر بادل''۔

اس کے قدموں میں تھکاوٹ تھی۔اس شخص کی سی تھکاوٹ جس کا سراب اسے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔زندگی کے بائیس برس ایک دھوکے میں گزار دینے کے بعد اس کو آج پہلی بار لگا تھا کہ وہ سب صرف ایک سراب تھا۔چمکتی ریت جسے وہ آبِ حیات سمجھی تھی۔

''اور نہیں بنایا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے نور، تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور''۔

اندر اس عظیم الشان ہال میں وہ گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے، ٹھوڑی ان پہ جمائے ساری دُنیا سے لاتعلق بیٹھی تھی۔

''تو نہیں اس کے لیے کوئی نور.....''۔

اس نے ہمیشہ اپنی مرضی کی تھی۔اس نے ہمیشہ اپنی مرضی کر کے غلط کیا تھا۔اس نے بہت دفعہ اللہ تعالیٰ کو ''ناں'' کی تھی۔اسے کبھی اس بات سے فرق نہیں پڑا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے کیسا دیکھنا چاہتا ہے۔وہ ہمیشہ وہی بنی رہی جیسے وہ خود کو دیکھنا چاہتی تھی۔

''وہ سمجھتا ہے اسے پانی، یہاں تک کہ وہ اس کے قریب پہنچتا تو وہاں کچھ نہیں پاتا اور وہ اس کے قریب اللہ تعالیٰ کو پاتا ہے''۔

اس نے آنکھیں بند کر کے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔

جن دنوں اس کا تازہ تازہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا تھا، اس نے دوپٹا بالکل گردن میں لینا شروع کر دیا تھا۔کتنا ڈانٹتے تھے تایا فرقان اور ابا بھی شروع شروع میں کچھ کہہ دیتے، مگر جب وہ خاموشی سے ان کی بات سنی اَن سنی کر کے آگے نکل جاتی تو رفتہ رفتہ سب نے کہنا چھوڑ دیا اور پھر اس سفر کی نوبت کہاں آ پہنچی؟ اس کی ویڈیو کو مجرے کا نام دیا گیا، ایک بدنام زمانہ آدمی اس کے پیچھے پڑا تھا، صائمہ تائی اس کے بارے میں آگے پیچھے ہر جگہ نازیبا باتیں کہتی پھرتی تھیں اور ایک اغوا کار شخص نے اس کے بازو پہ وہ نام داغ دیا تھا جو شرفاء اپنے منہ سے نہیں نکالا کرتے تھے۔

اس نے دھیرے سے سر اُٹھایا۔

''اللہ نور ہے، آسمانوں اور زمین کا.....''

Downloaded From http://paksociety.com

لوگ کہتے ہیں، مسجدوں میں سکون ہوتا ہے، کوئی اس سے پوچھتا تو وہ کہتی، مسجدوں میں نور ہوتا ہے۔ نور، اور پر نور کے۔

اس نے آہستگی سے گردن موڑی۔ اس کے بائیں طرف ایک تیرہ چودہ سال کا ترک لڑکا آ بیٹھا تھا جس کے ایک بازو پہ پلستر چڑھا تھا۔ وہ گم صم سی نگاہوں سے اوپر مسجد کی منقش چھت کو دیکھ رہا تھا۔

''نور کیا ہوتا ہے؟ تم جانتے ہو؟'' وہ اتنے ہولے سے بولی تھی کہ اپنی آواز بھی سنائی نہ دی۔

''نور وہ ہوتا ہے جو اندھیری سرنگ کے دوسرے سرے پہ نظر آتا ہے، گویا کسی پہاڑ سے گرتا پگھلے سونے کا چشمہ ہو''۔ وہ اسی چھت کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اور کیسے ملتا ہے نور؟''۔

''جو اللہ تعالیٰ کی جتنی مانتا ہے، اسے اتنا ہی نور ملتا ہے۔ کسی کا نور پہاڑ جتنا ہوتا ہے، کسی کا درخت جتنا، کسی کا شعلے جتنا اور کسی کا پاؤں کے انگوٹھے جتنا.....''

لڑکے نے سر جھکا کر اپنے پاؤں کو دیکھا۔

''انگوٹھے جتنا نور، جو جلتا بجھتا، بجھتا جلتا ہے۔ یہ ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو کچھ دن بہت دل لگا کر نیک عمل کرتے ہیں اور پھر کچھ دن سب چھوڑ چھاڑ کر ڈپریشن میں گھر کر بیٹھ جاتے ہیں''۔

''اور انسان کیا کرے کہ اسے آسمانوں اور زمین جتنا نور مل جائے؟''۔

وہ اللہ کو ناں کہنا چھوڑ دے۔ اسے اتنا نور ملے گا کہ اس کی ساری دنیا روشن ہو جائے گی''۔ وہ پھر سے گردن اُٹھائے مسجد کی اونچی چھت کو دیکھنے لگا تھا۔

اسے محسوس ہوا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا ہے۔ وہ دھیرے سے اُٹھی اور باہر کی طرف چل دی۔

''سنو!'' وہ پیچھے سے بولا تھا۔ حیا لمحے بھر کو رُکی۔

''دل کو مارے بغیر نور نہیں ملا کرتا''۔

وہ پلٹے بغیر آگے بڑھ گئی۔ دل تو مارنا پڑتا ہے، مگر ضروری تو نہیں ہے کہ ٹھوکر بھی کھائی جائے۔ انسان ٹھوکر کھائے بغیر، زخم لیے بغیر، خود کو جلائے بغیر بات کیوں نہیں مانتا؟ پہلی دفعہ میں ہاں کیوں نہیں کہتا؟ نیلی مسجد کے کبوتروں کی طرح اوپر اُڑنا کیوں چاہتا ہے؟ پہلے حکم پہ سر کیوں نہیں جھکاتا؟ ہم سب کو آخر منہ کے بل گرنے کا انتظار کیوں ہوتا ہے؟ اور گرنے کے بعد ہی بات کیوں سمجھ میں آتی ہے؟

اس نے ہتھیلی کی پشت سے دھیرے سے آنکھیں رگڑیں اور باہر نکل آئی۔

ایک فیصلہ تھا جو اس نے نیلی مسجد کے گنبدوں کو گواہ بنا کر کیا تھا۔ اب اسے اس فیصلے کو نبھانا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھپھو اور ابا لاؤنج میں بیٹھے بیتے دنوں کی باتیں کر رہے تھے۔ پھپھو بہت خوش تھیں۔ بار بار نم آنکھیں پونچھتیں۔ وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی، جہاں کیک ٹرے میں سیٹ کر رہا تھا۔ آج اس نے کون سا اعتراف کیا ہے۔ وہ سب یوں ظاہر کر رہے تھے، گویا انہیں یاد ہی نہ ہو۔

''تمہاری پڑھائی کا حرج تو بہت ہو گیا ہوگا؟ اتنے دن لگا دیے ادالار میں، ڈورم آفیسر نے طلبی کی ہوگی؟''۔ وہ کیک پہ کچھ چھڑکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں، ڈورم میں حاضری مارکنگ کا کوئی نظام نہیں ہے۔ ہاں کلاسز کا حرج ہوا تو ہے، پانچ دن تو اسپرنگ بریکر میں شامل ہو گئے تھے۔ اوپر کے چھ دن کی غیر حاضری لگی ہوگی۔ اب مزید صرف ایک چھٹی کی گنجائش ہے میرے پاس!'' وہ کیتلی میں چائے ڈالتے ہوئے بولی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

''ایگزامز کب ہیں؟''۔

''مئی کے آخر سے جون کے پہلے ہفتے تک''۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اور پاکستان تم نے پانچ جولائی کو جانا ہے نا؟ یہ آخری مہینہ تو شاید صرف ترکی گھومنے کے لیے ہے''۔

''ہاں مگر ایکسچینج اسٹوڈنٹس کی کوشش ہوتی ہے کہ قریبی ممالک بھی دیکھ لیں۔ کوئی قطر جا رہا ہے تو کوئی پیرس''۔ وہ ٹرے اُٹھا کر جانے کے لیے مڑی۔

''ہم لندن چلیں؟''۔

حیا نے پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اوون سے اسنیکس کی پلیٹ نکالتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا تھا۔

''ہم لندن جا رہے ہیں کچھ عرصے تک، ابا کے علاج کے لیے۔ تم بھی چلو''۔

''آئیڈیا تو اچھا ہے، سوچوں گی''۔ وہ جواباً مسکرائی اور ٹرے لیے باہر آ گئی۔

''میری بہت خواہش تھی بھائی کہ یہ سب پاکستان میں، سب رشتے داروں کے ساتھ ہو، لیکن شاید ایسا جلد ممکن نہ ہو اور پھر ہم دونوں ہیں تو یہاں، اس لیے میں نے سوچا کہ غیر رسمی انداز میں رسم کر لیں''۔

پھپھو شاید ابا سے بات کر چکی تھیں، تب ہی وہ مسکرا رہی تھیں، وہ جو کارپٹ پہ پنجوں کے بل بیٹھی ٹرے سے پیالیاں نکال کر میز پہ رکھ رہی تھی، ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔

پھپھو مسکراتے ہوئے اُٹھیں اور چند لمحوں بعد چھوٹی سلور ٹرے لیے آئیں جس میں سرخ فیتہ رکھا نظر آ رہا تھا۔ حیا نے ناسمجھی سے ٹرے کو دیکھا، پھر کچن سے ٹرالی دھکیل کر لاتے جہان کو وہ بھی پھپھو کے ہاتھ میں ٹرے دیکھ کر رُکا، پھر سوالیہ نگاہوں سے ان کا چہرہ دیکھا۔

''جہان سکندر! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟'' پھپھو نے بظاہر مسکراتے، آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے متنبہ کیا۔ وہ شاید راضی نہیں تھا، مگر ''نہیں'' کہہ کر ٹرالی آگے لے آیا۔ حیا ٹرے میز پہ ہی چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اب نظر آیا تھا، سرخ فیتے کے دونوں سروں پہ ایک ایک انگوٹھی بندھی تھی۔

''شادی کا وقت تو ظاہر ہے ہم بعد میں ڈیسائیڈ کریں گے، مگر ہر ماں کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ میں اپنی بہو کو نسبت کی انگوٹھی پہنا دوں۔ فاطمہ بھی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ دونوں انگوٹھیوں کو پکڑے ان دونوں کے پاس آئیں۔

ان کے ہاتھ بڑھانے پہ حیا نے کسی خواب کی سی کیفیت میں اپنا ہاتھ آگے کیا، انہوں نے مسکراتے ہوئے اس میں انگوٹھی ڈالی۔ وہ ایک سادہ، پلاٹینم بینڈ تھا۔ سرخ ربن کے دوسرے سرے سے بندھا بینڈ انہوں نے جہان کی اُنگلی میں ڈالا، پھر ٹرے سے چھوٹی قینچی اُٹھا کر ربن درمیان سے کاٹا۔ دونوں کی انگوٹھیوں سے بندھا ربن ان کی اُنگلیوں کے ساتھ جھولتا رہ گیا۔ ترکی میں منگنی شاید اسی طرح ہوا کرتی تھی۔

حیا نے سن ہوتے دماغ کے ساتھ سر اُٹھایا۔ جہان پھپھو کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور وہ اس کی پیشانی چوم کر دعا دے رہی تھیں۔ ابا بھی اُٹھ کر اس کو گلے سے لگائے دُعا دے رہے تھے۔ وہ سب کتنا حسین تھا، کسی خواب کی طرح۔ دھنک کے سارے رنگوں سے مزین کوئی بلبلہ جو کشش ثقل سے آزاد ہو کر اوپر اُڑتا جا رہا ہو۔ اوپر..... اور اوپر.....

''تم کیوں چپ بیٹھے ہو برخوردار؟'' ابا شاید جہان سے پوچھ رہے تھے۔

''میں سوچ رہا ہوں، میں وہ پہلا آدمی ہوں گا جس کی منگنی، اس کی شادی کے بعد ہوئی ہے''۔

وہ دھیرے سے ہنس کر بولا تھا۔ وہ نچلا لب دبائے جلدی سے ٹرے لیے کچن میں آ گئی۔ اس کا ست رنگا بلبلہ اوپر، بہت اوپر تیرتا جا رہا تھا۔

شام میں دیر سے جہان، ابا کو واپس چھوڑنے گیا اور پھپھو اپنے کام نپٹانے لگیں تو وہ لاؤنج میں آ بیٹھی۔ اپنی اُنگلی میں پہنی انگوٹھی سے بندھے ربن کو دیکھتے ہوئے وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ تب ہی لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو؟'' اس نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری جانب کوئی نسوانی آواز تھی۔

''کیا میں مسٹر جہان سکندر سے بات کر سکتی ہوں؟''۔

''نہیں، وہ ذرا باہر تک گئے ہیں۔ کوئی پیغام ہو تو دے دیجیے''۔

Downloaded From http://paksociety.com

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی

''جہان کو کہنا، اس نے جو پارسل مجھے بھجوایا تھا، وہ کھو گیا ہے۔ کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا ہے شاید۔ میں اسے رات میں کال کروں گی''۔

اس کے ساتھ ہی اس نے فون رکھ دیا تھا۔

حیا نے ایک نظر ریسیور کو دیکھا اور پھر شانے اُچکاتے ہوئے اسے کریڈل پہ ڈال دیا۔

جہان جب واپس آیا تو وہ لاؤنج میں منتظر بیٹھی تھی۔ پھپھو اب تک سونے جا چکی تھیں۔ حیا کا ارادہ تھا کہ وہ لندن کے ٹرپ کا پروگرام جہان سے ڈسکس کرے اور بھی بہت سی باتیں تھیں مگر پہلے اس کا پیغام۔

''ماموں صبح ہوٹل سے ہی ایئرپورٹ چلے جائیں گے، ہمیں آنے سے منع کر دیا ہے۔ تم یوں کرو، دو کپ کافی بنا لاؤ، میں کچھ نئی موویز لایا تھا۔ دیکھتے ہیں''۔

وہ بہت اچھے موڈ میں کہتے ہوئے ٹی وی کے نیچے بنے ریک کی طرف آیا تھا۔

''او کے لاتی ہوں اور ہاں، تمہارے لیے فون آیا تھا''۔ وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''کوئی لڑکی تھی، نام تو نہیں بتایا مگر کہہ رہی تھی کہ تمہارا پارسل اسے نہیں ملا، کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا ہے۔ شاید وہ رات میں کال کرے''۔

وہ تیزی سے مڑتے ہوئے اُٹھا تھا۔

''میرا پارسل اسے نہیں ملا اور کیا کہا؟'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں۔ کافی لاؤں؟''۔

''نہیں، رہنے دو''۔ وہ قدرے مضطرب انداز میں کہتے ہوئے صوفے کی طرف آیا اور فون اُٹھا کر سی ایل آئی چیک کرنے لگا۔ اس کی اُنگلی میں انگوٹھی اب بھی تھی، مگر ربن نہیں تھا۔

''تم..... تمہیں صبح کیمپس بھی جانا ہوگا، تم یوں کرو سو جاؤ۔ میں بس تھوڑا کام کروں گا''۔ وہ اُلجھے اُلجھے متفکر انداز میں سی ایل آئی چیک کرتے ہوئے بولا۔

ست رنگا بلبلہ پھٹ گیا تھا۔

سارا موڈ غارت، سارا پلان ختم۔

وہ ''اچھا'' کہہ کر بددلی سے کمرے میں چلی آئی۔

اس کا کمرہ لاؤنج سے ملحقہ تھا۔ دروازے کی ہلکی سی درز اس نے کھلی رہنے دی۔ جب تک وہ سو نہیں گئی، اسے جہان صوفے پہ مضطرب سا بیٹھا فون کو دیکھتا نظر آتا رہا تھا۔

وہ صبح فجر پہ اُٹھی تو دیکھا، جہان اسی طرح صوفے پہ بیٹھا، فون کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں رت جگے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس لڑکی کا فون نہیں آیا تھا شاید۔ انتظار لاحاصل۔ اس کے دل پہ بہت سا بوجھ آن پڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

کلاس میں وہ سر سے دوپٹا اُتار کر گئی تھی اور بالکل پیچھے بیٹھی رہی۔ باہر نکلتے ہی اس نے دوپٹا پھر ٹھیک سے سر پہ لے لیا۔ کامن روم میں واپس آئی تو معتصم مل گیا۔

''حیا..... کی آ حال ہے؟'' حسین اور معتصم اس کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ ڈی جے کی سکھائی گئی اردو۔ وہ اداس مسکراہٹ کے ساتھ ان کے پاس آئی۔

''میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور آپ کی خیریت ٹھیک چاہتی ہوں۔ مجھے تمہیں کچھ دکھانا تھا''۔ آخری فقرہ اس نے انگریزی میں ادا کیا۔

''پزل باکس؟ وہ کھلا؟''

Downloaded From http://paksociety.com

''نہیں، مگر اس پہ لکھی پہیلی مل گئی ہے۔ ٹھہرو میں لے آؤں''۔ وہ اُلٹے قدموں واپس پلٹ گئی۔ کمرے میں آ کر اس نے بیگ کھولا، کپڑے، جوتے، سوئٹرز، پرس، ہر چیز اُلٹ پلٹ کی، مگر پزل باکس وہاں نہیں تھا۔

''کدھر گیا؟ یہیں تو تھا۔ آخری دفعہ رکھا تھا اس نے؟'' وہ سوچنے لگی۔ ''ہاں، اسٹڈی میں'' جب وہ جہان کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ''اوہ، خدا نہ کرے وہ پاشا کے ہاتھ لگے''۔

اس نے جلدی سے موبائل اُٹھایا اور اس کی ٹوٹی اسکرین کو دیکھتے ہوئے عائشے کا نمبر ملانے لگی۔

☆ ☆ ☆

سفید محل کے عقبی باغیچے میں سہ پہر اُتری تھی۔ عائشے اسٹول پہ بیٹھی، ورک ٹیبل پہ لکڑی کا ٹکڑا رکھے، نوک دار چھرے سے اس کو چھید رہی تھی۔ اس کی آنکھیں مکمل اپنے کام پہ مرکوز تھیں۔

''عائشے! حیا کی کال!'' بہارے اس کا موبائل پکڑے بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی۔ عائشے نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا اور پھر موبائل تھام لیا۔

''سلام علیکم حیا''۔ اب وہ فون کان سے لگائے ازلی خوش دلی سے رسمی باتیں کر رہی تھی۔ بہارے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ باتیں سننے لگی۔

''پزل باکس؟'' عائشے کی مسکراہٹ ذرا سمٹی بھنویں اُلجھن سے سکڑیں۔ ''تمہارا والا کدھر رکھا تھا؟''۔

بہارے نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا دل اس لمحے زور سے دھڑکا تھا۔

''میں نے کل ہی پوری اسٹڈی کی صفائی اپنے سامنے کروائی ہے۔ اگر ہوتا تو مل جاتا۔ ہو سکتا ہے تم ساتھ لے گئی ہو؟ اچھا تم فکر نہ کرو۔ میں دوبارہ دیکھ کر کرتی ہوں''۔ اس نے موبائل بند کر کے میز پہ رکھا۔

''بہارے! تم نے حیا کا پزل باکس تو نہیں دیکھا؟''۔

''نہیں!'' بہارے نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔

''چلو پھر یوں کرتے ہیں کہ مل کر تلاش کرتے ہیں۔ مہمان کی چیز میزبان کے گھر میں کبھی کھونی نہیں چاہیے۔ بہت شرمندگی کی بات ہوتی ہے''۔

وہ چیزیں سمیٹتے ہوئے اُٹھ گئی۔ بہارے سر جھکائے اپنی بڑی بہن کے پیچھے چل دی۔ اس کے ذہن کے پردے پہ صرف ایک آواز گونج رہی تھی۔

''یہ باکس میرے پاس ہے۔ یہ بات میرے اور تمہارے درمیان راز رہے گی۔ تم حیا یا عائشے کو نہیں بتاؤ گی اس بارے میں۔ ٹھیک؟''۔

''ٹھیک عبدالرحمٰن!'' اس نے بے دلی سے زیر لب دہرایا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس روز جب عائشے نے اسے ایس ایم ایس کیا تب وہ ہالے کے ساتھ جمعہ کی نماز پہ ایوب سلطان جامعہ آئی ہوئی تھی۔

نمازِ جمعہ پہ جامعہ میں خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ ترکِ رسم کے مطابق کم سن بچے جمعے کی نماز پڑھنے سلطان کے مخصوص لباس میں آتے۔ سنہری پگڑی، سنہرا اور سفید زرتار لباس، میان میں تلوار، کامدار جوتے پہنے وہ ننھے سلاطین اپنی ماؤں کی اُنگلیاں تھامے ہر جگہ پھر رہے ہوتے۔

انصاری محلے میں ہالے کے ساتھ چلتے ہوئے اسے بے اختیار اپنا اور ڈی جے کا ترکی میں پہلا دن یاد آیا تھا۔ وہ دن جو بہت طویل تھا۔ اب ان ساڑھے تین ماہ میں کتنا کچھ بدل چکا تھا۔

انصاری محلے میں استنبول کے بہترین اور سستے اسکارف ملا کرتے تھے۔ وہ اب سر ڈھکے بغیر باہر نہیں نکلتی تھی، مگر اس کے سارے

Downloaded From http://paksociety.com

دوپٹے شیفون کے یا ریشمی ہوتے، جو سر پہ نہیں ٹکتے تھے۔ اب وہ یہاں ایسے اسکارف لینے آتی تھی، جو سادہ اور ایک رنگ کے ہوں نہ کہ ایسے شوخ اور کام دار کہ ہر کسی کی توجہ گھیریں۔ اسے اب کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا تھا۔ جہاں اس کا تھا، اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔

وہ اپنے چند جوڑوں کے ساتھ ہم رنگ اسکارف پیک کروا رہی تھی، جب میسج ٹون بجی۔ اس نے فون نکال کر خراش زدہ اسکرین کو دیکھا۔ عائشے کا پیغام جگمگا رہا تھا۔

''میں نے سارے گھر میں ڈھونڈا، مگر نہیں ملا۔ تم خود کسی دن آ جاؤ، دوبارہ مل کر ڈھونڈ لیتے ہیں''۔

اس نے ویک اینڈ پہ آنے کا وعدہ کر کے موبائل پرس میں رکھ دیا۔

''واپسی پہ جواہر چلتے ہیں، مجھے فون کی اسکرین ٹھیک کروانی ہے''۔

''شیور!'' ہالے نے ہامی بھر لی۔ وہ ڈی جے کے بعد اس کے ساتھ ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ ہالے ان لوگوں میں سے تھی جو دوسروں کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور بدلے کی توقع کے بغیر مدد کرتے رہتے ہیں۔ ترکی کے پُرخلوص لوگ!

ٹاقسم سے انہوں نے انڈر گراؤنڈ میٹرو پکڑی۔ پہلا اسٹاپ چھوڑ کر وہ دوسرے پہ اُتر گئیں۔ اسٹیشن سے باہر سامنے ہی جواہر شاپنگ مال تھا۔ بلند و بالا کھجور کے درخت، لش چمکتا مال۔ روشنیوں کا سمندر۔

ہالے کچھ کھانے کے لیے ٹیک اوے کرنے ایک ریسٹورنٹ میں چلی گئی اور وہ بالائی فلور پہ فون ریپئرنگ شاپ پہ آ گئی۔

''پانچ دس منٹ کا کام ہے میم! آپ کاؤچ پہ بیٹھ جائیں۔ میں ابھی کر دیتا ہوں''۔ جس ترک دکان دار لڑکے نے اس سے فون لیا تھا، وہ فون کا معائنہ کر کے بولا۔

''وہ سر ہلا کر سامنے کاؤچ پہ آ بیٹھی اور ریک سے ایک میگزین اُٹھا کر یونہی ورق گردانی کرنے لگی۔

لڑکا اب شوکیس کے پیچھے کھڑا، اس کے موبائل کے ٹکڑے الگ کر رہا تھا۔ کیسنگ اُتار کر اس نے بیٹری نکالی تو ایک دم رُک گیا اور سر اُٹھا کر قدرے تذبذب سے حیا کو دیکھا۔

''میڈم!'' اس نے ذرا اُلجھن سے پکارا۔ حیا نے میگزین سے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''۔

''یہ لگا رہنے دوں؟''۔

''کیا؟'' وہ رسالہ رکھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

''آپ کے فون میں جی پی ایس ٹریسر ہے۔ اسے لگا رہنے دوں؟''۔

''ٹریسر؟ میرے فون میں ٹریسر ہے؟'' وہ سانس لینا بھی بھول گئی تھی۔

''اوہ! آپ کو نہیں معلوم تھا اور جس نے یہ ٹریسر ڈالا ہے، وہ تو ہمہ وقت آپ کی لوکیشن ٹریس کر رہا ہو گا''۔

وہ بنا پلک جھپکے اپنے موبائل کے اندر لگے ناخن برابر باریک ٹریسر کو دیکھے گئی۔

اور وہ سوچتی تھی، پاشا کو اس کی لوکیشن کا کیسے پتا چلتا ہے؟ یقیناً اس کے پچھلے فونز میں بھی ٹریسرز ہوں گے۔ تب ہی۔

''یہ بہت سوفسٹی کیٹڈ ہے میم! وہ جب چاہے اس سے فون کا مائیک آن کر کے آپ کی گفتگو بھی سن سکتا ہے۔ اب اس کا کیا کروں؟''۔

وہ چند لمحے اسے دیکھے گئی۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''اسے لگا رہنے دو''۔

''رئیلی؟'' لڑکا حیران ہوا تھا۔

''ایک ٹریسر نکالوں گی تو وہ دس اور ڈال دے گا۔ اس لیے بہتر ہے میں اس کو اسی ٹریسر سے دھوکا دیتی رہوں۔ میں ہر جگہ اسے ساتھ نہیں لے کر جاؤں گی۔

خصوصاً اس جگہ نہیں، جہاں میں نہیں چاہتی کہ اس کو پتا چلے''۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اوہ ویری اسمارٹ!'' لڑکا مسکرا دیا۔ ''میں آپ کو کسی چھوٹی سی ڈبی میں یہ ڈال دیتا ہوں تاکہ آپ کو اسے بار بار فون سے علیحدہ نہ کرنا پڑے''۔

وہ اب احتیاط سے وہ ننھا سا ٹریسر نکال رہا تھا۔ حیا ابھی تک بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔

عبدالرحمٰن پاشا..... وہ کیا کرے اس آدمی کا؟ وہ اپنا اتنا وقت اور توانائی اس پہ کیوں صرف کرتا تھا؟ کیا یہ اندھی محبت تھی؟ شاید کچھ اور؟

☆ ☆ ☆

اندھیرے کمرے میں مدھم سبز ٹائٹ بلب کی روشنی بکھری تھی اور جزیرے کے ساحل سے سر ٹکراتی لہروں کی سرسراہٹ یہاں تک محسوس ہوتی تھی۔ عائشے آنکھوں پہ بازو رکھے قریباً نیند میں جا چکی تھی۔ جب بہارے نے پکارا۔

''عائشے، بات سنو!'' وہ چت لیٹی چھت پہ کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

''ہوں؟'' عائشے کی آواز نیم غنودگی سے بوجھل تھی۔

''جب بندہ بار بار جھوٹ بولتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟''۔

''اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس۔ ''بہت جھوٹ بولنے والا'' لکھ لیتا ہے''۔

بہارے نے چونک کر اسے دیکھا۔ عائشے کی آنکھوں پہ بازو تھا۔ شکر کہ وہ بہارے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''اپنے پاس کدھر؟ آسمانوں پہ؟''۔

''ہاں، آسمانوں پہ''۔

''کیا اس کے نام کے ساتھ ''جھوٹا'' کسی بڑے پوسٹر پہ لکھا جاتا ہے؟''۔

''شاید ایسا ہی ہو۔ اب سو جاؤ''۔

''عائشے! اگر اللہ تعالیٰ وہ پوسٹر آسمان پہ بچھا دے تو کیا سب کو اس کے نام کے ساتھ جھوٹا لکھا نظر آئے گا؟''۔

اس کی آواز میں انجانا سا خوف تھا۔

چشم تصور میں اس نے دیکھا، باہر تاریک آسمان پہ سرخ انگاروں سے لکھا تھا۔

''انا طولیہ کی بہارے گل..... بہت جھوٹ بولنے والی''۔

''ہاں، سب کو ہر جگہ سے وہ نظر آئے گا''۔

''جو گھر کے اندر، کمرے کے اندر ہوگا اسے بھی؟''۔

''ہاں، اب سو جاؤ بچے! صبح کام پہ بھی جانا ہے''۔

''اور اگر کوئی بیڈ کے نیچے گھس جائے تو وہاں سے بھی آسمان نظر آئے گا؟''۔

''ہاں اور بہارے گل! تم اب بولیں تو میں تمہیں ٹرنک میں بند کر دوں گی''۔

عائشے جھنجلا کر بولی تھی۔ اس کی نیند بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ وہ سارے دن کی تھکی ہوئی تھی۔ بہارے ذرا سی عائشے کے قریب کھسکی اور چہرہ اس کے کان کے قریب لے آئی۔

''عائشے!'' اس نے بہت دھیمی سی سرگوشی کی۔ کیا ٹرنک کے اندر سے آسمان نظر آئے گا؟''۔

''اللہ اللہ!'' عائشے نے غصے سے بازو ہٹایا۔ بہارے نے غڑاپ سے منہ کمبل کے اندر کر لیا۔

مگر اسے کمبل کے اندر سے بھی آسمان نظر آ رہا تھا۔ سرخ انگارے اسی طرح دہک رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس شام وہ ٹاقسم اپنی سرخ ہیل ٹھیک کروانے آئی تھی۔ جب ہیل جڑ گئی تو وہ کسی خیال کے تحت شاپر لیے اسکوائر کے مجسمے کی

Downloaded From http://paksociety.com

طرف آ گئی۔ ''استقلال یعنی'' (مجسمہ آزادی)۔

مجسمے کے گرد گھاس کے گول قطعہ اراضی کو مثبت کے نشان کی طرح دو گلز رگاہوں نے کاٹ رکھا تھا، جس سے گول قطعہ چار برابر خانوں میں بٹ گیا تھا۔ کیمپاس کے چار خانے۔ ہر سو ٹیولپس کی مہک تھی۔

بہادر جرنیل اب مجسم صورت اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا۔ یہ وہ دوسرا پاشا تھا، جس سے اس کو شدید نفرت ہونے لگی تھی۔ صرف اس کی وجہ سے وہ روز کلاس میں اسکارف اُتارتی تھی اور ٹالی اس کو ایک استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا کرتی۔ اس ایک آدمی نے اسے ہرا دیا تھا مگر۔

''انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی، جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے''۔ ڈمی جے کہیں دور سے بولی تھی۔

وہ چند قدم قدم مزید آگے چل کر آئی۔ اس نے مجسم ہوئے جنگجو کی پتھر آنکھوں میں دیکھا۔ یہ آدمی کیوں جیتا؟ کیونکہ یہ لڑنا جانتا تھا، کیونکہ اس نے شکست تسلیم نہیں کی تھی، کیونکہ وہ لڑتا رہا تھا یہاں تک کہ اسے فتح مل گئی اور ایک جنگجو کو کیسے ہرایا جاتا ہے؟ اس نے میجر احمد سے دل ہی دل میں پوچھا تھا۔

''اس سے مقابلہ کر کے۔ اس سے تب تک لڑ کے، جب تک فتح نہ مل جائے یا جان نہ چلی جائے''۔

جواب فوراً آیا تھا۔ اگر وہ غلط ہو کر اتنا پُر اعتماد تھا، تو وہ صحیح ہو کر پُر اعتماد کیوں نہیں تھی؟ وہ غلط ہو کر جیت سکتا ہے تو وہ صحیح ہو کر کیوں نہیں جیت سکتی؟ وہ کیوں اُتارے اسکارف؟ وہ ان لوگوں کے پیچھے اللہ تعالیٰ کو کیوں ناں کرے؟ زیادہ سے زیادہ سبانجی والے نکال دیں گے، تو نکال دیں، مگر کیوں نکال دیں؟ نہیں، وہ نہ اسکارف اُتارے گی، نہ میدان چھوڑے گی۔

وہ اتاترک کے مجسمے کو یہی اسکارف لپیٹ کر سبانجی کے کلاس روم میں بیٹھ کر پڑھ کر دکھائے گی۔ مسجد میں جو فیصلہ میں نے کیا تھا، اسے بس اب پورا کرنا ہے۔ طیب اردگان کو قانون بدلنا پڑے، سو پڑے۔ وہ مزید اس ذلت سے نہیں گزرے گی۔ اللہ تعالیٰ کی حدود مذاق نہیں ہوتیں۔ اب وہ اسکارف پہن کر ہی پڑھے گی، دیکھتے ہیں کون روکتا ہے اسے۔ اس کی ماں اسے روئے!

اتاترک کے مجسمے کو دیکھتے ہوئے اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اسے زندگی بھر اپنے اسکارف پہ سمجھوتا نہیں کرتا۔ وہ نقاب نہیں کر سکتی، وہ برقع نہیں اوڑھ سکتی، مگر اسکارف اوڑھنا۔ یہ ایک کام ہے جو وہ کر سکتی ہے، تو پھر اسے روکنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ کوئی رستہ تو ہوگا۔

''رستہ ضرور ہوتا ہے''۔ میجر احمد نے کہا تھا۔

رستے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ اسے بھی رستہ ڈھونڈنا تھا۔

☆ ☆ ☆

آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے اسکارف کو ٹھوڑی تلے پن سے جوڑا، پھر سامنے کے دو تکونے پلوؤں میں سے ایک کو مخالف سمت چہرے کے گرد لپیٹ کر سر کی پشت پہ پن سے لگا دیا۔ اسکارف خاصا بڑا تھا۔ دوسرے پلو نے سامنے سے اسے ڈھک دیا۔ نیچے سیاہ اسکرٹ پہ اس نے پوری آستینوں والا میرون پھول دار بلاؤز پہن رکھا تھا۔ توقع کے برخلاف، میرون اسکارف کے ہالے میں دمکتا اس کا چہرہ کافی اچھا لگ رہا تھا۔

کتابیں اُٹھائے، بیگ کندھے پہ ڈالے جب وہ سبانجی کی مرکزی عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو سامنے ہی ٹالی چند یورپین اسٹوڈنٹس کے ساتھ آتی دکھائی دی۔ وہ گزرتے گزرتے آج کل حیا کے اسکارف پہ کوئی تبصرہ کر دیا کرتی تھی۔ اب بھی حیا کو آتا دیکھ کر اس کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری۔

''حیا!'' اس نے زور سے آواز دی۔

حیا اسے نظر انداز کر کے تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ آج اس کی پہلی کلاس ٹالی کے ہی ساتھ تھی۔

"Haya! What Colour is your hair today? blue?"

حیا بنا کچھ کہے اندر کی جانب بڑھ گی۔ پیچھے سے آتے قہقہے کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا، آج کل جہاں ان لڑکیوں سے سامنا

Downloaded From http://paksociety.com

ہوتا، وہ اسے تمسخر سے عرب لڑکی کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ بدتمیز نہ ہوں تو.....

آج وہ بنا اسکارف اُتارے کلاس میں چلی آئی اور دوسری قطار میں بہت اعتماد سے بیٹھ گئی۔ چند ہی لمحوں بعد ٹالی اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

''تم نے اسکارف نہیں اُتارا؟ کیا ابھی سب کے سامنے اُتاروگی؟''۔

جواباً اس نے بہت اعتماد سے مسکرا کر ٹالی کو دیکھا۔

''دیکھتے ہیں!'' جتانے والے انداز میں کہہ کر وہ کتابیں جوڑنے لگی۔ اندر سے اس کا دل بھی عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ آج کیا ہوگا؟ وہ اسے نکال دیں گے کیا؟۔

پروفیسر بابر صاحب نے ابھی لیکچر شروع بھی نہیں کیا تھا کہ ان کی نگاہ حیا پہ پڑ گئی۔

''مس..... میرا نہیں خیال آپ کو کلاس روم میں اسکارف کرنے کی اجازت ہے''۔ وہ براہِ راست اسے مخاطب کر کے بولے۔

بہت سے طلبا و طالبات گردنیں موڑ کر اسے دیکھنے لگے، جو ساری بڑی بڑی باتیں، احادیث، آیات، اقوال اس نے اس موقع کے یاد کر رکھے تھے، وہ سب اسے بھول گئے۔ اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کہے۔ وہ بالکل خالی خالی نگاہوں سے پروفیسر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ٹالی بھی مسکراہٹ دبائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مس..... آپ ہیڈ کورنگ ریموکریں''۔ انہوں نے دہرایا۔

''جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لیے راستہ نکال دیتا ہے''۔

عائشے نے ایک دفعہ کہا تھا مگر اسے سارے راستے بند نظر آ رہے تھے۔ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، تب ہی پیچھے سے کوئی ترک لڑکی بول اُٹھی۔

''سر! یہ ایکسچینج اسٹوڈنٹ ہے۔ مہمان اور یہ رول مہمانوں پہ اپلائی نہیں ہوتا''۔ اس نے جلدی سے اپنے پروفیسر کو کچھ یاد دلایا تھا۔

''اوہ سوری، آپ مہمان ہیں؟ پلیز تشریف رکھیے''۔ پروفیسر بہت شائستگی سے معذرت کر کے لیکچر شروع کرنے لگے۔

ٹالی کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ حیا نے ایک نظر اسے دیکھا اور دھیرے سے مسکرائی، پھر گردن موڑ کر پیچھے اپنی محسنہ کو دیکھنا چاہا، لیکچر شروع ہو چکا تھا، تمام سر جھکنے لگے تھے۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ نہیں پائی، سو چہرہ واپس موڑ لیا۔ اس کے دل و دماغ سن سے ہو چکے تھے۔ کسی خواب کی سی کیفیت میں اس نے لکھنا شروع کیا۔ سب اتنا آسان ہوگا، اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

''یہیں رکھا تھا، کہاں جا سکتا ہے''۔ وہ ویک اینڈ پہ بیوک ادا آئی تھی اور اب عائشے اور بہارے کے ساتھ مل کر ساری اسٹڈی چھان کر مایوسی سے کہہ رہی تھی۔ ''وہ بہت قیمتی تھا۔ میں اسے کھونے کی متحمل نہیں ہو سکتی''۔

ساتھ کھڑی بہارے کا چہرہ زرد اور سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت دھیرے سے چل رہے تھے آج۔ شاید وہ بیمار تھی۔

''تمہیں کیا ہوا بہار کا پھول؟'' وہ بہارے کا یہ پژمردہ انداز کافی دیر سے محسوس کر رہی تھی، سو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

بہارے نے گردن اُٹھا کر خالی خالی، خاموش نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہی پرانا مسئلہ، صبح بہارے کو ایک سیپ ملا، جس میں موتی نہیں تھا، حالانکہ مجھے تو آج ایک بھی سیپ نہیں ملا''۔ عائشے اپنے گھر سے پزل باکس کھو جانے پہ بہت اُداس تھی۔

''اب میرے سیپ سے موتی کبھی نہیں نکلے گا''۔ بہارے بڑبڑائی۔ وہ دونوں محسوس کیے بنا اسٹڈی ٹیبل کے دراز کھول کھول کر دیکھ رہی تھیں۔

''وہ باکس عبدالرحمٰن کے ہاتھ نہ لگ جائے، مجھے اسی بات کا ڈر ہے۔ وہ باکس اس کو نہیں ملنا چاہیے عائشے!''۔

بہارے کی جھکی گردن مزید جھک گئی۔

''ملازمہ کبھی چوری نہیں کرتی، اس نے بھی باکس نہیں دیکھا۔ کہاں ڈھونڈیں''۔

Downloaded From http://paksociety.com

حیا تھکے تھکے سے انداز میں کرسی پہ گر سی گئی۔ اس کا دل بہت بُرا ہو رہا تھا۔

''آئی ایم سوری حیا!'' عائشے نے آزردگی سے کہا۔ اسی پل کمرے میں دبی دبی سسکیاں گونجنے لگیں۔ حیا نے چونک کر بہارے کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے ہولے ہولے رو رہی تھی۔

''بہارے! کیا ہوا؟'' وہ دونوں بھاگ کر اس کے پاس آئیں۔ بہارے نے بھیگا چہرہ اُٹھایا۔

''وہ باکس عبدالرحمٰن کے پاس ہے۔ اس نے مجھے تمہیں بتانے سے منع کیا تھا''۔

''کیا؟'' وہ سانس لینا بھول گئی۔ عائشے خود ششدر سی کھڑی رہ گئی۔

''مگر مجھے پتا ہے کہ اس نے وہ کدھر رکھا ہے۔ میں تمہیں لا دیتی ہوں''۔ بہارے ایک دم اُٹھی اور باہر بھاگ گئی۔ وہ دونوں ساکت، ششدر سی اپنی جگہ کھڑی تھیں۔

پانچ منٹ بعد ہی بہارے واپس آئی تو اس کا بھیگا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پزل باکس تھا۔ وہ حیا کا پزل باکس ہی ہے، اس میں کوئی شک نہیں تھا۔

''یہ لو، تمہاری امانت''۔ اس نے باکس حیا کی طرف بڑھایا۔

''بہارے گل! حیا سلیمان تم سے بہت پیار کرتی ہے''۔ اس نے بے اختیار جھک کر اس ننھی پری کے دونوں گال چومے''۔ اور تم اس کو ڈانٹنا مت۔ سچ بولنے پہ کسی کو ڈانٹا نہیں کرتے''۔ اس نے ساتھ ہی عائشے کو کہہ دیا تھا، جو بہارے سے ذرا سی خفا لگ رہی تھی، مگر اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔

آنے کسی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد وہ حیا کو واپس چھوڑنے کے لیے گھر سے نکل آئیں۔ بہارے قریبی کلب سے عبدالرحمٰن کا گھوڑا لے آئی تھی اور اب اس پہ بیٹھی ان دونوں کے عقب میں چلی آ رہی تھی۔

''اسے عبدالرحمٰن نے رائیڈنگ سکھائی ہے۔ بہارے سے اچھی رائیڈنگ پورے ادا میں کوئی بھی نہیں کر سکتا''۔

وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔ عبدالرحمٰن کا نام وہ آخری نام تھا، جو اس وقت وہ سننا چاہتی تھی۔ اس نے اس کا باکس کیوں رکھا، وہ یہی سمجھنے سے قاصر تھی۔

''تم پہ یہ اسکارف بہت اچھا لگتا ہے حیا! اسے کبھی مت چھوڑنا''۔

''نہیں چھوڑوں گی۔ میں سبا نجی سے جیت گئی، میں اتاترک سے جیت گئی، مجھے اور کیا چاہیے''۔

''تمہیں کچھ بھی چھوڑنا پڑے، اسے مت چھوڑنا!'' عائشے نے دہرایا۔ حیا نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

ان کے عقب میں گھوڑے کی پیٹھ پہ بیٹھی بہارے نے اچنبھے سے عائشے کو دیکھا تھا۔ اس کی بہن اتنے اصرار سے اپنی بات دُہراتی تو نہیں تھی، پھر اب کیوں؟

☆ ☆ ☆

معتصم نے جلی ہوئی اطراف والے پزل باکس کو الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر ایک بڑے ڈبے کی طرف اشارہ کیا، جو اس کے ساتھ گھاس پہ پڑا تھا۔

''پہلے فلوٹیلا کے لیے فنڈ دو''۔

''اوہ شیور!'' وہ گھاس پہ بیٹھتے ہوئے پرس سے پیسے نکالنے لگی۔ چند نوٹ ڈبے کی درز میں ڈال کر اس نے دیکھا، اس پہ جلی حروف میں لکھا تھا۔

''فریڈم فلوٹیلا 2010''۔

وہ مئی 2010 تھا اور اسی ماہ کے آخر تک فلوٹیلا نے غزہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ یہ بات اب تک فلسطینی بہت دفعہ دُہرا چکے تھے۔

گھاس کے آگے مصنوعی جھیل دوپہر کی کرنوں سے چمک رہی تھی۔ معتصم اس چمکتی دھوپ میں باکس پکڑے کافی دیر تک اسے

Downloaded From http://paksociety.com

اُلٹ پلٹ کر کے دیکھتا رہا۔

''یقین کرو! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر اس ''ہومر'' والی پہیلی کو حل کرنا آسان ہوگا۔ ٹھہرو! کوشش کرتے ہیں''۔ اس نے جلی لکڑی پہ لکھے سنہرے حروف پڑھے۔

Marked on homer's doubts

A Stick with twin sprouts

''ہومر وہی فلسفی تھا نا جس کے بارے میں ہرا قلیطس نے کہا تھا کہ اسے در ے مارے جانے چاہئیں؟''۔

اس کے کہنے پہ معتصم نے سر اُٹھا کر خفگی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ شانے اُچکا کر رہ گئی۔ یونانی فلسفہ وہ آخری شے تھی جو اسے دلچسپ لگتی تھی مگر شاید میجر احمد کا حساب اُلٹا تھا۔

''ہومر کے شبہات پہ نشان زدہ اسٹک۔ یہاں کسی نشان کی بات ہو رہی ہے۔ ہومر کے شبہات، مگر کیسے شبہات؟'' وہ سوچنے لگا۔

''معتصم! نشان تو کسی کے لکھے ہوئے کام پہ ہی لگایا جا سکتا ہے نا، تو کیا ہومر کے لکھے ہوئے کام میں کسی کے شکوک و شبہات کا ذکر ہے؟''۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا، مگر اس کے اپنے کام میں جو حصہ بعد میں آنے والے ناقدین کو مشکوک لگتا ہے، اسے مارک ضرور کیا گیا ہے''۔

''کیسے مارک کیا گیا ہے؟''۔ وہ چونکی۔ ''کسی خاص نشان سے؟''۔

''مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ ہومر کے کام میں مشتبہ حصہ ہوتا ہے، اس پہ Obelus کا نشان لگا کر مارک کیا جاتا ہے''۔

''Obelus کیا ہوتا ہے؟''۔

''تمہیں اوبلس کا نہیں پتا؟ یہ ہوتا ہے اوبلس!'' اس نے رجسٹر کے صفحے پہ ایک سیدھی لکیر کھینچی اور اس کے اوپر اور نیچے ایک ایک نقطہ لگا دیا۔

''یہ تو تقسیم کا سمبل ہے۔ اس طرح کہو نا''۔ اس نے پزل باکس کی سلائیڈ اوپر نیچے کیں، یہاں تک کہ پورا لفظ ''اوبلس'' لکھا گیا مگر باکس جامد رہا۔

''یہ صرف پہلی پہیلی کا جواب ہے حیا! ہمیں ان چاروں کے جواب تلاش کر کے ان میں سے مشترک بات ڈھونڈنی ہے''۔ اس نے یاد دلایا۔

حیا نے بددلی سے پزل باکس اسے تھما دیا۔ وہ اس وقت خود کو بہارے کی طرح محسوس کر رہی تھی، اپنے تخفے کے اتنے قریب مگر اتنی ہی دور اور بے بس۔ بہت بے بس۔

☆ ☆ ☆

شام کا اندھیرا استقلال اسٹریٹ پہ اُتر آیا تھا۔ گلی کی رونق اور روشنیاں اپنے عروج پہ تھیں۔ وہ اور ہالے کافی دنوں بعد استقلال اسٹریٹ آئی تھیں۔ امتحان قریب تھے سو نکل ہی نہیں پائی تھیں۔ اب نکلیں تو ڈی جے کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ خریدا انہوں نے کچھ نہیں، بس ونڈو شاپنگ کرتی رہیں۔ وہ آٹھ بجے والے گورسل سے آئی تھیں۔ گورسل کو واپس رات کے ڈیڑھ بجے جانا تھا، سو تب تک ان کا ارادہ خوب اچھی طرح سے جدیسی میں گھومنے کا تھا۔

''پہلے تو برگر کنگ میں ڈنر کر لیتے ہیں، ٹھیک؟'' وہ اس روز کے بعد جہان سے بھی نہیں ملی تھی، سوچا اب مل لے۔

''تمہاری صلح ہو گئی اس سے؟'' وہ برگر کنگ کے دروازے پر تھیں۔ جب ہالے نے پوچھا۔ حیا نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا، پھر ہنس دی۔

''وہ بات تو بہت پرانی ہو گئی۔ اب تک بہت کچھ بدل چکا ہے''۔ وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ سیاہ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور اس میں دمکتا اس کا چہرہ بہت مطمئن لگ رہا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''ہاں! لگ تو رہا ہے''۔ ہالے شرارت سے مسکرائی۔

حیا نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کیا۔ پلاٹینم رنگ رات کی مصنوعی روشنیوں میں چمک رہی تھی۔

''واٹ؟ تمہاری جہان سکندر سے منگنی ہوگئی اور تم نے مجھے بتایا نہیں؟'' ہالے خوش گوار حیرت سے کہہ اٹھی۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ کے دروازے میں کھڑی تھیں۔ اطراف میں لوگ آجا رہے تھے۔

''مگر ہماری شادی منگنی سے پہلے ہوئی تھی۔ یہی کوئی بیس، اکیس سال پہلے۔ لمبی کہانی ہے، ڈنر کے بعد سناؤں گی''۔ وہ جلدی سے ہالے کا بازو تھامے اندر چلی آئی۔ آج اس نے وہی سرخ ہیل پہن رکھی تھی اور ذرا احتیاط سے چل رہی تھی۔

''جہان تو چھ بجے آف کر گیا تھا۔ ابھی گھر پہ ہوگا''۔ وہاں کام کرنے والے لڑکے نے بتایا۔ اسے مایوسی ہوئی مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

''مجھے پوری کہانی سناؤ۔ تم نے اتنی بڑی بات نہیں بتائی؟'' ہالے پُرجوش بھی تھی اور سارا قصہ سننے کے لیے بے تاب بھی۔

''چلو! ٹائم چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر سناتی ہوں''۔ وہ ہنس کر بولی۔

چند قدم کا تو فاصلہ تھا۔ باتوں میں ہی کٹ گیا۔ وہ اسکوائر پہ آئیں تو شام میں ہوئی بارش سے گیلی سڑک ابھی تک چمک رہی تھی۔ حیا نے بے اختیار اپنے پاؤں کو دیکھا۔

''یہیں ٹوٹی تھی میری ہیل''۔ اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اپنی مرمت شدہ ہیل کو دیکھا۔ لکڑی کی بہت باریک ہیل اب بالکل ٹھیک لگ رہی تھی۔ پھر کتنا خوار کرایا تھا اس نے اس دن۔ سرخ ہیل، سرخ کوٹ، برستی بارش۔ اسے بہت کچھ یاد آیا تھا۔

''آؤ پارک میں چلتے ہیں''۔ ہالے اسے بلا رہی تھی مگر وہ اسی طرح کھڑی سر جھکائے اپنی ہیل کو دیکھ رہی تھی۔ لمحے بھر کو اس کے گرد جگمگاتا اسکوائر ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ ساری آوازیں بند ہوگئیں۔ وہ بالکل ساکت کھڑی اپنی ہیل دیکھ رہی تھی۔

یہیں ٹوٹی تھی اس کی ہیل۔ یہیں..... یہیں

Snapped there a blooded pine

بلڈڈ؟ یعنی خون..... مگر خون سرخ ہوتا ہے۔ سرخ لکڑی..... لکڑی کی ہیل.....

Split there some tears divine

اس کی متحیر نگاہوں نے ٹائم اسکوائر کا احاطہ کیا۔

آفاقی آنسو، آسمان کے آنسو..... بارش۔ نہریں ''تقسیم'' ہوتی تھیں اس جگہ۔

Round the emerald crusified

اس کی نظریں مجسمے کے گرد پھیلے گھاس کے قطعہ اراضی پہ جم گئیں، جنہیں دو گز رگاہیں صلیب کے نشان کی طرح کاٹ رہی تھیں۔ زمرد گھاس جو مصلوب تھی۔

And the freedom petrified

ساکن ہوئی، پتھر بنی آزادی۔ یقیناً مجسمہ آزادی

.....اتاترک کا مجسمہ استقلال یمینی

A love lost in symbolic smell

پیار جو کھو گیا؟

''ڈی جے.....'' اس کے ذہن میں جھماکہ ہوا۔ ادھر ساتھ استقلال جدیسی میں ڈی جے گری تھی اور روز ٹائم اسکوائر میں ٹیولپس کی مہک پھیلی تھی۔ علامتی خوشبو..... ٹیولپس جو استنبول کی علامت تھے۔

Under which the lines dweli

اس جگہ کے نیچے کیا تھا؟ لکیریں نہیں، لائنز۔ ہاں! میٹرو لائنز، ریلوے لائنز۔ نیچے ریلوے اسٹیشن تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

ایک ایک کر کے پزل کے سارے ٹکڑے جڑتے جا رہے تھے۔

Obelus کا نشان کس چیز کا نشان تھا بھلا؟

''حیا.....! یہ آدمی ہمیں فالو کر رہا ہے''۔ ہالے نے اس کا بازو جھنجھوڑا۔ وہ ہالے کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ کسی خوابیدہ کیفیت میں۔ وہ بڑبڑائی۔

''Taksim پورے چھ حروف''۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، اس نے پزل حل کر لیا تھا۔

''حیا.....! یہ آدمی ہمارے پیچھے آ رہا ہے''۔ ہالے کی آواز میں ذرا سی گھبراہٹ تھی۔ وہ جیسے کسی خواب سے جاگی اور پلٹ کر دیکھا۔

سڑک کے اس پار کھڑا شخص اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ ایک دم برف کا مجسمہ بن گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

وہ اس چہرے کو کیسے بھول سکتی تھی؟

عبدالرحمٰن پاشا۔

آنے کے ساتھ اور انفرادی کتنی ہی تصویروں میں وہ اسے دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر جس شناسائی سے مسکرایا تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے۔

''چلو! واپس اسٹریٹ میں چلتے ہیں''۔ وہ ہالے کا ہاتھ تھامے تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ لوگوں کے رش میں سے جگہ بناتے، تیز تیز قدموں سے فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے وہ دونوں اس شخص سے دور جا رہی تھیں۔ جب حیا کو یقین ہو گیا کہ وہ ان کو کھو چکا ہے، تو اس طرح ہالے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ایک کافی شاپ میں آ گئی۔

''پتا نہیں کون تھا''۔ انہوں نے ایک کونے والی میز کا انتخاب کیا تھا۔ ہالے دھک گرما گرم کافی کے لے آئی اور اب وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی، اس آدمی کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔

''ہاں! پتا نہیں کون تھا؟'' اس نے لاتعلقی سے شانے اُچکائے اور گرم کپ لبوں سے لگایا۔ ایک دم ہی کافی کا گھونٹ کسی تلخ زہر کی طرح اس کی گردن کو جکڑ گیا۔ اسے سامنے سے پاشا آتا دکھائی دیا تھا۔ وہ کافی شاپ میں کب داخل ہوا، انہیں پتا ہی نہیں چلا تھا۔

''ہالے وہ ادھر ہی آ گیا''۔ اس نے سراسیمگی کی سی کیفیت میں کپ نیچے کیا۔ ہالے نے پریشانی سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ عین ان کے سر پہ آ پہنچا تھا۔

''کیا میں آپ کو جوائن کر سکتا ہوں مسز جہان سکندر؟'' کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھ کر کھڑے اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ لمبی سرمئی برساتی میں ملبوس، وہ اچھا خاصا لحیم شحیم آدمی تھا۔ فریم لیس گلاسز کے پیچھے سے چھلکتی آنکھوں میں واضح مسکراہٹ تھی۔ وہ لمحہ ملاقات جس سے اس کو کبھی ڈر نہیں لگا تھا، اس وقت بے حد خوف زدہ کر گیا تھا۔

''جی! ضرور بیٹھیے''۔ اس نے کپ پہ اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بظاہر مسکرا کر کہا۔

ہالے نے اسے آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا تھا۔ حیا نے سمجھ کر سر کو اثبات میں ذرا سی جنبش دی۔ جیسے ہی وہ کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا، حیا نے گرما گرم کافی اس کے چہرے پہ اُلٹ دی۔

Downloaded From http://paksociety.com

باب 8

پاشا کے لیے یہ حملہ قطعاً غیر متوقع تھا۔ گو کہ ردعمل کے طور پر اس نے چہرہ فوراً پیچھے کیا تھا، اس کے باوجود کافی اس کے رخسار کو جھلسا گئی تھی۔

''چھبک، چھبک۔'' (جلدی، جلدی) ہالے نے اس کا ہاتھ تھاما اور دوسرے ہی لمحے وہ دونوں باہر بھاگ گئیں۔

کافی گرم تھی، اور اس نے پاشا کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔ وہ بلبلا کر چہرہ ہاتھوں سے صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے گاہک اور ویٹرز اس کی جانب لپکے تھے۔ یہ وہ آخری منظر تھا جو حیا نے باہر نکلنے سے پہلے دیکھا تھا۔

''وہ نہیں آ رہا، جلدی چلو!'' گلی میں لوگوں کے رش میں سے رستہ بناتے ہوئے تیز قدموں سے دوڑتے، ہالے بار بار گردن موڑ کر دیکھتی تھی۔

''برگر کنگ سامنے ہی ہے، جلدی سے اس میں چلے جاتے ہیں، اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلے۔''

''مگر تمہیں اس پہ کافی الٹنے کی کیا ضرورت تھی؟'' ہالے جھنجھلائی۔

(کچھ پرانے حساب اتارنے تھے۔)

''تم خود ہی تو میرے کپ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔''

''میرا مطلب تھا کہ کپ چھوڑو اور باہر نکلو۔''

وہ مزید بحث کیے بنا ہاتھ سے ہالے کو ساتھ کھینچتی برگر کنگ کا گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ وہ دونوں ایسے اندھا دھند طریقے سے دوڑتی آئی اور استقبالیہ کاؤنٹر پہ آ کر دم لیا کہ وہاں موجود لڑکا قدرے بوکھلا گیا۔

''کیا ہوا؟ جہان نہیں ہے ادھر۔'' وہ سمجھا وہ دوبارہ جہان کے لیے آئی ہیں۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!'' حیا نے پھولے تنفس کے درمیان ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''تمہارے کچن میں کوئی دروازہ ہے جو پچھلی گلی میں کھلتا ہے؟''

''کچن میں نہیں، مگر پینٹری میں بیک ڈور ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔'' شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ دونوں کسی سے بچنا چاہ رہی ہیں، سو بنا کوئی مزید سوال کیے وہ انہیں اپنی رہنمائی میں پینٹری میں لے آیا۔

پینٹری مستطیل سی تھی اور اس میں اسٹور تیج شیلف اور بڑے بڑے فریزرز رکھے تھے۔ کچھ دوسرا کاٹھ کباڑ بھی تھا۔

''وہ رہا دروازہ۔'' اس نے ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا اور ایک مشکوک نظر ان پہ ڈالتا واپس پلٹ گیا۔

ہالے نے پینٹری سے کچن میں کھلنے والا دروازہ بند کیا اور پھر قدرے تذبذب سے پچھلی گلی کے دروازے کو دیکھا۔

''ابھی باہر نکلنے کا فائدہ؟ گورسل تو ڈیڑھ بجے آئے گی تب تک یہیں بیٹھتے ہیں۔'' وہ ایک کونے سے دو پلاسٹک کی کرسیاں اٹھا لائی اور کمرے کے وسط میں فرش پہ آمنے سامنے رکھیں۔

''ویسے اب میں سوچ رہی ہوں کہ تم نے ٹھیک ہی کیا، استقلال جدیسی میں اکثر ایسے ڈرنک لوگوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے جو عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔''

''تب ہی میں نے کافی الٹی، تاکہ وہ فوراً ہمارے پیچھے نہ آ سکے۔''

وہ کرسی پہ نہیں بیٹھی، بلکہ دروازے کے قریب چلی آئی تھی۔ دروازے کے ساتھ ایک چوکور کھڑکی نما روشن دان تھا۔ وہ بہت اونچا نہیں تھا، بلکہ حیا کے چہرے کے بالکل برابر آتا تھا۔ اس نے روشن دان کی شیشے کی سلائیڈ ایک طرف کی تو ٹھنڈی ہوا اور پچھلی گلی کی آوازیں

Downloaded From http://paksociety.com

اندر آنے لگیں۔

وہ استقلال اسٹریٹ کی بغلی گلی تھی۔ استقلال اسٹریٹ کی دونوں جانب ایسی ہی گلیاں تھیں جو ذرا تنگ اور چھوٹی مگر دونوں اطراف سے عمارتوں سے گھری تھیں۔

''اب تم مجھے بتاؤ، یہ منگنی کا کیا قصہ ہے؟'' ذرا سکون کا سانس ملا تو ہالے کو ادھوری بات یاد آ گئی۔ وہ پرجوش سی کرسی پہ آگے ہو کر بیٹھی۔

حیا نے پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ جو تناؤ اور پریشانی وہ تھوڑی دیر قبل محسوس کر رہی تھیں، وہ پینٹری کی فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔

''بتاتی ہوں۔'' وہ کرسی پہ آ بیٹھی اور گورسل شٹل آتے تک وہ سارا قصہ سنا چکی تھی۔ بس میں بھی سارا راستہ وہ دونوں یہی باتیں کرتی رہیں۔

''اگر وہ جانتا تھا تو اس نے پہلے اظہار کیوں نہیں کیا؟''

''اب کر دیا، یہی بات ہے۔ وہ بہت پریکٹیکل اور کم گو سا آدمی ہے۔ اس سے وابستہ توقعات میں نے اب کم کر دی ہیں۔'' اس نے شانے اچکا کر کہا تھا۔

کمرے میں آ کر ہالے تو سونے چلی گئی۔ ٹالی اور چیری بھی تب تک سو چکی تھیں۔ جبکہ اس نے پہلے تو اپنی میز کی دراز میں اس ڈبیا کی تصدیق کی جس میں موبائل شاپ کے لڑکے نے جی پی ایس ٹریسر ڈال کر دیا تھا۔ وہ دراز میں ہی رکھی تھی، جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی، پھر پاشا کو کیسے پتا چلا کہ وہ کہاں ہے؟ ہو سکتا ہے اس کی کسی اور شے میں بھی ٹریسر ہو، یا پھر وہ محض اتفاق ہو، لیکن اس کے اتفاقات تو کم ہی ہوتے تھے، اتنا تو اسے یقین تھا۔

جو بھی ہے، وہ ہر شے کو ذہن سے جھٹک کر اپنا پزل باکس نکال کر دبے قدموں باہر آ گئی۔ بالکونی کی بتی اسے دیکھتے ہی جل اٹھی۔ وہ وہیں پہلے زینے پہ بیٹھ گئی اور پزل باکس چہرے کے سامنے گیا۔

چاروں پہیلیاں ایک چوکور کی صورت میں باکس کی چاروں اطراف پہ لکھی تھیں۔ چوکور اسکوائر، ناقص اسکوائر۔

دھڑکتے دل اور نم ہتھیلیوں کے ساتھ وہ سلائیڈز اوپر نیچے کرنے لگی۔ Taksim کا آخری حرف ایم جیسے ہی جگہ پہ آیا۔ کلک کی آواز کے ساتھ باکس کی دراز اسپرنگ کی طرح باہر نکلی۔

وہ بنا پلک جھپکے بے یقینی سے باکس کے اندر دیکھ رہی تھی۔ اس نے میجر احمد کا پزل حل کر لیا تھا۔ وہ باکس کھول چکی تھی۔

دراز میں ایک سفید مستطیل کاغذ رکھا تھا۔ وہ کاغذ پوری دراز پہ فٹ آ رہا تھا۔ اس نے دو انگلیوں سے پکڑ کر کاغذ باہر نکالا۔ بالکونی کی مدھم روشنی میں وہ کاغذ پہ لکھی تحریر بنا کسی دقت کے پڑھ سکتی تھی۔

Two full stops under the key

(چابی کے نیچے دو فل اسٹاپس)

اس نے بے یقینی سے وہ سطر پڑھی جو کاغذ کے اوپری حصے پہ لکھی تھی۔ کیا یہ کوئی مذاق تھا۔ اپریل فول؟ اس کاغذ کے ٹکڑے کے لیے اس نے اتنی محنت کی؟

کاغذ کے چاروں کونوں میں چھوٹا چھوٹا ساچھ (6) کا ہندسہ بھی لکھا تھا۔ اس نے کاغذ پلٹا۔ اس کی پشت پہ بالکل وسط میں ایک بارکوڈ چھپا تھا۔ موٹی پتلی ایک انچ کی لکڑیں اور ان کے نیچے ایک سیریل نمبر، شیمپوز، لوشن اور ان گنت دوسری اشیا کے لفافوں اور ڈبوں کے کونوں میں اکثر ایسے ہی بارکوڈ چھپے ہوتے تھے۔ اس بارکوڈ کا وہ کیا کرے گی؟

مگر نہیں، باکس میں کچھ اور بھی تھا۔

دراز کی زمین سے ایک لوہے کی لمبی اور عجیب وضع کی چابی چپکی تھی۔ اس نے دو انگلیوں سے چابی کو کھینچا تو وہ جو گوند کے محض ایک قطرے سے چپکائی گئی تھی، اکھڑ کر حیا کے ہاتھ میں آ گئی۔ حیا نے دیکھا، چابی کے نیچے موجود لکڑی پہ دو موٹے موٹے نقطے لگے تھے اور ان کے درمیان لکھا تھا۔ "Emanet"

Downloaded From http://paksociety.com

پھر کوئی پزل؟ پھر پہیلیاں؟ چابی تلے دو فل اسٹاپ؟

وہ دونوں نقطے اسے مل گئے مگر اب وہ ان کا کیا کرے؟ کاش! وہ یہ سب اٹھا کر میجر احمد کے منہ پہ دے مار سکتی۔

یہ چابی کس شے کی تھی؟

کسی کمرے، کسی گاڑی، کسی گھر کی؟ اگر پہاڑ کھودنے پہ یہ مرا ہوا چوہا ہی نکلنا تھا تو بہتر تھا وہ اسے توڑ کر ہی نکال لیتی، اچھا مذاق تھا۔

اس نے خفگی سے دراز بند کی تو وہ پھر باہر نکل آئی۔ اس نے دوبارہ دراز کو اندر دھکیلا اور اسے پکڑے پکڑے سلائیڈز اوپر نیچے کیں۔ کوڈ بار کا سہ حرفی الفظ بگڑ گیا۔ باکس پھر سے لاک ہو گیا۔ اس نے ہاتھ ہٹایا تو دراز باہر نہیں آئی۔

واپس بستر پہ لیٹتے ہوئے وہ بے حد کڑھ رہی تھی۔ ایک چابی سے کوئی اور پزل باکس کھلے گا، اس سے کوئی اور، اس سے کوئی اور.....

کیا وہ ساری زندگی مقفل تالے ہی کھولتی رہے گی؟

اچھا مذاق تھا۔

پھر وہ ذہن سے یہ سوچیں جھٹک کر پاشا کے بارے میں سوچنے لگی۔ ایک مطمئن مسکراہٹ خود بخود اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

بہت اچھا کیا اس نے کافی الٹ کر۔ وہ اسی قابل تھا۔

حقیقت میں اپنے روبرو پاشا کو دیکھتے ہوئے اسے تصاویر سے بہتر لگا تھا۔ اس کا قد کافی اونچا تھا۔ چھ فٹ سے بھی اوپر اور لباس بھی مناسب تھا۔ آنکھوں پہ بغیر فریم کی گلاسز لگائے اور ذرا، ذرا سی بڑھی شیو۔

وہ روبرو دیکھنے میں بس ایسا تھا کہ مقابل اس کی عزت کرے۔ مگر اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ہینڈسم تو وہ اسے کبھی نہیں لگا تھا، نہ ہی اس کی شخصیت میں کوئی سحر تھا۔ (جس کی باتیں بہارے کرتی تھی) وہ دیکھنے میں بس ایک درمیانے درجے کا آدمی لگتا تھا یا شاید استقلال اسٹریٹ میں چہل قدمی کرنے کے لیے اس نے خود کو ایک عام آدمی کی طرح ڈریس اپ کر کے کیموفلاج کر رکھا تھا۔ شاید یہی بات ہو۔

وہ ان ہی سوچوں میں گھری کب نیند کے سمندر میں ڈوب گئی، اسے علم ہی نہ ہو سکا۔

☆ ☆ ☆

اس نے چابی کی ہول میں گھمائی اور پھر الماری کا پٹ کھولا۔ سامنے والے خانے میں جہاں چند کاغذات کے اوپر اس نے جلی ہوئی اطراف والا پزل باکس رکھا تھا۔ اب وہ وہاں نہیں تھا۔ اس کے ذہن نے لمحوں میں کڑیوں سے کڑیاں ملائیں، اگلے ہی پل وہ پٹ بند کر کے باہر آیا تھا۔

''بہارے گل!'' سیڑھیوں کے دہانے پہ کھڑے ہو کر اس نے آواز دی۔

بہارے کافی دنوں سے اس آواز کی منتظر تھی، مگر عبدالرحمٰن کو اپنی مصروفیت میں الماری کھولنے کا موقع شاید آج ملا تھا۔ اس لیے اب آواز سن کر وہ جوٹی دی کے سامنے بیٹھی تھی، تابعداری سے اٹھی اور سر جھکائے مؤدب انداز میں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

تیسری منزل کے دہانے پہ پہنچ کر اس نے جھکا سر اٹھایا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی ہوٹل سے آیا تھا، سوٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے، کوٹ کے بغیر تھا۔ اسے متوجہ پا کر عبدالرحمٰن نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

''کیا بہارے گل مجھے بتانا پسند کریں گی کہ وہ پزل باکس کہاں ہے؟''

''میں پسند کروں گی۔'' بہارے نے سادگی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں نے وہ حیا کو واپس کر دیا۔''

وہ چند لمحے کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ مگر بہارے جانتی تھی کہ اسے دھچکا لگا ہے۔

''کس کی اجازت سے؟''

''وہ تمہاری چیز نہیں تھی عبدالرحمٰن! جس کی تھی، میں نے اسے دے دی۔''

وہ چند ثانیے اسے دیکھتا رہا، پھر اس کے سامنے ایک پنجے کے بل فرش پہ بیٹھا اور سیدھا بہارے کی آنکھوں میں دیکھا۔

''کیا تم نے مجھ سے رازداری کا وعدہ نہیں کیا تھا؟''

Downloaded From http://paksociety.com

''میں رحمٰن کے بندے کو خوش کرنے کے لیے رحمٰن کو ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔'' اس کی بڑی بڑی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''جو جتنا اچھا جھوٹ بولتا ہے بہارے! یہ دنیا اسی کی ہوتی ہے۔''

''لیکن پھر اس کی آخرت نہیں ہوتی، یہ عائشے گل کہتی ہے۔''

وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔

''پھر تو مجھے تمہارے دوسرے وعدے کا بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔''

''نہیں! ہم واقعی جزیرے پہ کسی سے تمہارے بارے میں بات نہیں کرتے۔''

''وہ نہیں، ایک اور وعدہ بھی تھا ہمارے درمیان، ہمارا لٹل سیکرٹ۔''

بہارے کے کندھوں پہ ایک دم بہت بھاری بوجھ سا آ گرا۔ اس نے اداسی سے عبدالرحمٰن کو دیکھا جو منتظر سا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بہت پہلے عبدالرحمٰن نے اس سے عہد لیا تھا کہ اگر وہ مر گیا تو وہ اسے جنازہ بھی دے گی اور اس کی میت کو اون بھی کرے گی۔

''تم سچ بولنے والی بہارے گل پہ اعتبار کر سکتے ہو۔ پورا ادالار، بلکہ پورا ترکی تمہیں چھوڑ دے، مگر بہارے گل تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گی۔''

''اور ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے، جب تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو۔ تم کہو، کون عبدالرحمٰن، کہاں کا عبدالرحمٰن؟''

''تم ایسی باتیں مت کیا کرو، مجھے دکھ ہوتا ہے۔''

''اور اس بارے میں بھی عائشے گل کی کوئی کہاوت ضرور ہو گی۔'' وہ ذرا سا مسکرایا۔

''اس کو چھوڑو، وہ تو بہت کچھ کہتی رہتی ہے۔ میں دوسرے کان سے نکال دیتی ہوں۔'' اس نے ناک پہ سے مکھی اڑا کر گویا عبدالرحمٰن کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ ''وہ تو مجھ سے اتنی خفا ہوئی تھی کہ میں نے تم سے شادی کی بات کیوں کی۔'' لحظہ بھر کو رک کر بہارے ذرا تشویش سے بولی۔ ''تم مجھ سے شادی کرو گے نا عبدالرحمٰن؟'' ساتھ ہی اس نے گردن موڑ کر ارد گرد دیکھ بھی لیا۔ عائشے قریب میں کہیں نہیں تھی۔

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

''مگر میں تمہاری نئی دوست میں دلچسپی رکھتا ہوں۔''

''وہ تم سے شادی کیوں کرے گی؟ وہ اپنے کزن کو پسند کرتی ہے اور اس کا کزن بہت ہینڈسم ہے۔'' بہارے کو جیسے بہت غصہ آیا تھا۔

''اور تمہاری دوست کو عبدالرحمٰن جیسا کوئی بدصورت نہیں لگتا ہو گا، ہے نا؟''

''یہ سچ ہے۔ اسے تم بالکل پسند نہیں ہو، مگر مجھے تم سے زیادہ کوئی ہینڈسم نہیں لگتا۔''

وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ بہارے نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

''سنو! وہ حیا کے پزل باکس پہ جو پہیلی کھدی تھی، وہ کس نے لکھی تھی؟'' وہ جاتے جاتے ذرا چونک کر واپس پلٹا۔

''مجھے کیسے علم ہو سکتا ہے؟ میں نے تو ابھی تک اس باکس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔''

''نہیں! دراصل میرے باکس کی پہیلی اور حیا کی پہیلی بالکل ایک سی لکھی تھیں، تب ہی حیا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میری پہیلی کس نے لکھی ہے؟''

وہ واقعتاً چونکا تھا۔ اس نے یہ محسوس کیوں نہیں کیا؟ وہ یہ بات نظر انداز کیوں کر گیا؟

''پھر تم نے کیا کہا؟ بلکہ ٹھہرو! تم نے کہا ہو گا کہ عبدالرحمٰن کے پاس ہر کام کے لیے بہت سے بندے ہوتے ہیں۔''

بہارے کا منہ کھل گیا۔ ''تمہیں کیسے پتا؟''

''بہارے گل! میں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے تمہیں جانتا ہوں۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں۔ بہارے نے آزردگی سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ اس سے خفا تھا، وہ جانتی تھی مگر عائشے کہتی تھی، بندہ خفا ہو جائے، خیر ہے، بس رحمٰن خفا نہ ہو۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اف!'' اس نے سر جھٹکا۔ ''عائشے گل کی کہاوتیں!!''

☆ ☆ ☆

آڈیٹوریم اسٹوڈنٹس سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ باسکٹ بال کا میچ جاری تھا۔ کورٹ میں لڑکے نارنجی گیند اچھالتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ تماشائیوں کی نگاہیں بھی گیند پہ لگی تھیں۔ مخصوص شور، ہنگامہ اور رش۔

حیا ان سب سے بے نیاز، اپنا بیگ تھامے کرسیوں کی قطاروں کے درمیان..... رستہ بناتی آگے بڑھ رہی تھی۔ امتحان قریب تھے اور ان دنوں وہ اتنی مصروف رہی تھی کہ معتصم سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ابھی لطیف نے بتایا کہ وہ آڈیٹوریم میں ہے تو وہ یہاں آ گئی۔ ویسے بھی اب وہ فلسطینی لڑکوں سے بات چیت میں ذرا احتیاط کرتی تھی۔

نہیں، وہ تو ویسے ہی ڈیسنٹ اور بھائیوں جیسے تھے، مگر وہ وہی نہیں رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ اسکارف لیتی ہے، سو اس کے نام کے ساتھ کوئی غلط بات جڑی تو بدنام اس کا اسکارف ہوگا۔ اس لیے اس کی کوشش ہوتی کہ وہ معتصم یا حسین وغیرہ سے تنہائی میں نہ ملے بلکہ کسی ایسی جگہ پہ ملے، جہاں سب سامنے ہی ہوں۔

وہ تیسری قطار میں بیٹھا تھا۔ نگاہیں کھیل پہ مرکوز کیے، کرسی پر آگے ہو کر بیٹھا وہ میچ کی طرف متوجہ تھا۔ اس کے بائیں طرف دو کرسیاں خالی تھیں۔ وہ ایک کرسی اپنے اور اس کے درمیان چھوڑ کر بیٹھ گئی اور بیگ سے پزل باکس نکال کر اس کے سامنے کیا۔ وہ چونکا۔

''میں نے اسے کھول لیا۔ اس کا کوڈ ''ناقسم'' تھا۔ کیا تم آگے میری مدد کر سکتے ہو؟''

''اوہ سلام! ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔'' معتصم نے دراز کھولی اور کاغذ پہ لکھی تحریر پڑھی، پھر اسے پلٹا۔

''بارکوڈ؟ بارکوڈ تو اشیاء کے پیکٹس پہ لگا ہوتا ہے، اسے کوئی مشین ہی ڈی ٹیکٹ کرتی ہے۔ یہ بارکوڈ بھی کسی مشین کے لیے ہے تاکہ وہ اسے پہچانے، مگر کدھر؟ ہوں..... شاید اس سطر سے کوئی مدد ملے۔'' وہ پھر سے کاغذ پلٹ کر سطر پڑھنے لگا، پھر نفی میں سر ہلا کر دراز سے چابی اٹھالی۔

''بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ یہ سطر اس چابی تلے لکھے دو نقطوں اور اس لفظ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔''

''اور یہ لفظ کسی تالے کی طرف اشارہ کر رہا ہے، ویسے emanet کہتے کسے ہیں؟'' اس نے ذرا الجھن سے پوچھا۔

''یہ امانت ہے نا، ہمارا والا امانت، ترک میں بھی اس کو یہی کہتے ہیں۔ اس نے بے اختیار گہری سانس اندر کھینچی۔

ایک تو ترک اور اردو کی مماثلت!

''مجھے یہ لگتا ہے حیا! کہ اس نے تمہاری کوئی امانت کہیں لاک لگا کر رکھی ہے اور اس کی چابی تمہیں دی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ کوئی عظیم الشان ساحل ہو یا کوئی برانڈ نیو گاڑی۔'' وہ اپنی بات پہ خود ہی دھیرے سے ہنسا۔

''مجھے ایسا کچھ بھی نہیں لگتا۔''

''ہوسکتا ہے اس باکس میں کوئی نادیدہ لکھائی ہو اور آنچ دکھانے سے.....''

''میں کوشش کر چکی ہوں۔ اس ایک لفظ امانت کے سوا اس میں کچھ نہیں لکھا ہے۔'' اس نے باکس میں ساری چیزیں واپس ڈالیں اور اسے بند کر کے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ معتصم مزید اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا، اب جو بھی کرنا تھا، اسے خود کرنا تھا۔

''امتحانوں کے بعد کچھ سوچوں گی۔ ابھی تو اس قصے کو بند ہی کر دیتے ہیں۔'' جواباً معتصم نے مسکرا کر شانے اچکا دیے۔

وہ آڈیٹوریم سے نکل رہی تھی جب اس کا موبائل بجا۔ اماں اس وقت تو فون نہیں کرتی تھیں، پھر؟ اس نے بیگ سے موبائل نکال کر دیکھا۔ یہ وہی پاکستان کا نمبر تھا جس سے پہلے بھی میجر احمد نے فون کیا تھا۔

''ہیلو!'' کرسیوں کی قطار سے راستہ بناتے وہ ذرا اونچا بولی تھی۔ اردگرد کے شور میں میجر احمد کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔

''السلام علیکم! کیسی ہیں آپ حیا؟'' وہی نرم، خوبصورت، ٹھہرا ہوا انداز۔ اب وہ اس سے چڑتی نہیں تھی بلکہ ذرا احتیاط سے بات کر ہی لیتی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''وعلیکم السلام! میری خیریت تو آپ کو پتا لگتی ہی رہتی ہوگی۔'' وہ باہر کاریڈور میں تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ جواباً وہ دھیرے سے ہنسا۔

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔ آپ کو لگتا ہے، مجھے آپ کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے؟''

''مجھے لگتا تو خیر یہی ہے کہ آپ کو اور پاشا کو میرے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔''

''غصے میں ہیں، خیریت؟''

''کوئی مذاق کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ؟ میں کتنی پہیلیاں بوجھوں؟'' اس نے زچ سے انداز میں کہتے ہوئے اپنا بیگ اتار کر سبانجی کی عمارت کی بیرونی سیڑھیوں پہ رکھا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ بعض چیزیں اتنی حساس ہوتی ہیں کہ انہیں بہت رازداری سے کسی کے حوالے کرنا پڑتا ہے، تاکہ وہ غلط شخص کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ویسے ایک گھنٹے کا کام تھا، آپ نے ہی اتنے دن لگا دیے۔''

خیر! آپ کا پزل تو میں حل کر ہی لوں گی، مگر کیا گارنٹی ہے کہ آخر میں مجھے ''اپریل فول'' کے الفاظ نہیں ملیں گے؟'' وہ وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی تھی۔ استنبول کی دھوپ اردگرد سبزہ زار کو سنہری پن عطا کر رہی تھی۔

اتنا غیر سنجیدہ سمجھتی ہیں آپ مجھے؟

''کیوں؟ کیا آپ ہی نہیں ہیں جو خواجہ سرا بن کر مجھ سے ملے تھے؟ کبھی شرمندگی نہیں ہوئی آپ کو اس بات پہ؟''

''شرمندگی کیسی؟ میں خواجہ سرا بن کر آپ سے ملا ہی تھا، خواجہ سرا بن کر کوئی محفل تو نہیں لگائی تھی۔'' وہ شاید برا مان گیا تھا۔

''مگر خواجہ سرا بننا بذات خود بہت عجیب ہے۔''

''کیوں؟ کیا خواجہ سرا انسان نہیں ہوتے؟ کیا وہ جانور ہوتے ہیں؟ میں نے ان کا حلیہ اپنایا تھا، مگر آپ کے لیے نہیں۔ میں تو اپنے کام سے وہ سب بنا تھا۔ بس اسی دوران..... آپ مل گئیں۔''

''آپ اپنے کام خواجہ سرا بن کر نکلواتے ہیں؟'' وہ دم بخود رہ گئی۔ پہلی دفعہ کوئی سوال اس نے بچوں کی سی دلچسپی سے پوچھا تھا۔

''کبھی میرے آفس آیئے گا۔ میں آپ کو اپنے کام کی تفصیل بتاؤں گا۔''

''آپ کے آفس میں کبھی نہیں آ رہی، مگر وہ امانت، وہ کیسے ڈھونڈوں میں؟''

''جو لکھا ہے، اس پہ غور کریں۔ وہ ڈولی کی امانت ہے اور وہ اسی کو ملنی چاہیے، جو اپنی صلاحیتوں سے خود کو اس کے قابل ثابت کر سکے۔ کیا آپ اتنی باصلاحیت ہیں؟''

''ٹرائی می!'' اس نے جتا کر کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ سبانجی کی دھوپ ابھی تک سیڑھیوں پہ اس کے قدموں میں گر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کلینک کی انتظار گاہ میں ٹھنڈی سی خنکی چھائی تھی۔ وہ کاؤچ پہ خاموش سی بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ ہالے کے توسط سے اس نے ایک ڈرماٹولوجسٹ سے وقت لیا تھا، اس کے بال بظاہر ٹھیک نظر آتے تھے، اور عائشے کے دیے گئے لوشن کام کر رہے تھے مگر ہاتھ لگانے پہ وہ پہلے سے ذرا روکھے لگتے اور سر کی جلد جو خراب ہوئی، وہ الگ۔

حیا نے اپنا پرس ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ ٹریسر والی ڈیبا ڈورم میں ہی تھی، اب وہ اسے استنبول میں اپنے ساتھ لے کر نہیں جاتی تھی۔

تب ہی اس کے ساتھ والی نشست پہ ایک سیاہ عبایا والی لڑکی آ بیٹھی۔ بیٹھتے ہی اس نے چند گہرے سانس لے کر تنفس بحال کیا، پھر ٹشو سے نقاب کے اندر چہرہ تھپتھپانے لگی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پیدل آئی ہے اور بہت تھک گئی ہے۔

حیا لاشعوری طور پر نگاہوں کا زاویہ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ جانے کیوں آج کل وہ عبایا اور حجاب والی لڑکیوں کو بہت غور سے دیکھا کرتی تھی۔ استنبول میں ایسی لڑکیاں بہت کم ہی نظر آتی تھیں، البتہ اسکارف اور لانگ اسکرٹس والی مل جاتی۔ اکثریت ایسی لڑکیوں کی ہوتی جن میں سے ایک اس کے سامنے کاؤچ پہ بیٹھی تھی۔ مختصر اسکرٹ بنا آستین کے بلاؤز اور خوب صورت بال۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی گھٹنے پہ پھیلا میگزین پڑھنے میں مگن تھی۔ استنبول کی علامتی لڑکی۔ اس کے اسکرٹ کا رنگ نارنجی تھا، بالکل ان دو کراؤن فش جیسا جوان دونوں کاؤچز

Downloaded From http://paksociety.com

کے درمیان رکھی میز پہ سجے ایکوریم میں تیر رہی تھیں۔ ننھی ننھی سی نارنجی مچھلیاں، جن کی زندگی، جن کی سانس اور جن کی آواز سب پانی تھا۔

عبایا والی لڑکی اب پرس کھول کر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ حیا ابھی تک اسے یوں ہی دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً اس نے پرس سے ایک اورنج جوس کی بوتل نکالی اور اس کا ڈھکن اتارا، پھر ذرا رکی اور حیا کی طرف بڑھائی۔

''نو تھینک یو۔'' وہ ذرا سنبھل کر سیدھی ہوئی۔

وہ لڑکی مسکرا کر بوتل میں اسٹرا ڈالنے لگی۔ سیاہ نقاب میں اس کی سرمئی آنکھیں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔

''آپ ہمیشہ یہ عبایا کرتی ہیں؟'' وہ رہ نہیں سکی اور پوچھ ہی بیٹھی۔

''ہوں۔'' نقاب تلے ایک گھونٹ لیتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ کو گھٹن نہیں ہوتی اس میں؟''

''میرا دل اللہ نے اس کے لیے کھول دیا ہے، سو گھٹن کیسی..... اور ویسے بھی مسلمان لڑکی تو بہت مضبوط ہوتی ہے۔'' اس نے بوتل کا ڈھکن بند کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر مجھے تو نقاب کا سوچ کر ہی گھٹن ہوتی ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔ یہ سب صرف آپ کے ذہن میں ہو۔''

''آپ کے ذہن میں بھی ایسی باتیں آتی ہوں گی نا۔'' وہ اس کی طرف رخ موڑے غیر ارادی طور پہ بحث کرنے لگی تھی۔

''کیا بہت پڑھے لکھے، ماڈرن قسم کے لوگوں کے درمیان بیٹھے آپ کو احساس کمتری نہیں ہوتا؟'' ساتھ ہی ایک نگاہ اس نے ایکوریم کے پار بیٹھی ترک لڑکی پہ ڈالی جو ابھی تک اپنے میگزین میں گم تھی۔

''بہت ماڈرن قسم کے لوگ تو میرے جیسے ہی ہوتے ہیں نا۔ میری شریعت تو دنیا کی سب سے ماڈرن (جدید) شریعت ہے۔ احساس کمتری تو انہیں ہونا چاہیے، جو جاہلیت کے زمانے کا تبرج کرتے ہیں۔ تبرج سمجھتی ہو؟''

اسے اندازہ تھا، پھر بھی اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''تبرج..... اوہ..... کیسے سمجھاؤں؟'' اس لڑکی نے لمحے بھر کو سوچا۔ ''تم نے دبئی کے وہ اونچے اونچے ٹاورز تو دیکھے ہوں گے۔ برج العرب، برج الخلیفہ؟''

''ہاں تصاویر میں۔''

''بس! اسی برج سے یہ تبرج نکلا ہے۔ کسی شے کو اتنا نمایاں اور خوبصورت بنانا کہ دور سے نظر آئے۔ وہ صدیوں پہلے یوسف علیہ السلام کے مصر کی عورتیں تھیں، جو تبرج کرتی تھیں۔ وہ ابوجہل کے عرب کی عورتیں تھیں، جو زیب و زینت کر کے مردوں کے درمیان سے گزرتی تھیں۔ اگر استنبول کی لڑکیاں ان زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی پیروی کرتی ہیں تو وہ ماڈرن تو نہ ہوئیں نا۔ ماڈرن تو میں ہوں، تم ہو، پھر کیسی شرمندگی۔'' اس نے رسان سے کہتے ہوئے شانے اچکائے۔

''اللہ، اللہ، یہ اعتماد؟'' وہ دم بخود رہ گئی (ترکوں کا اثر تھا۔ وہ بھی اللہ، اللہ کہنے لگی تھی۔)

''تمہیں لگتا ہے، تم کبھی نقاب نہیں پہن سکتیں؟'' وہ اب ٹشو سے پیشانی پہ آئے پسینے کے قطرے تھپتھپا رہی تھی۔

''شاید نہیں، میری دوستوں اور فرسٹ کزنز میں سے کوئی نقاب نہیں لیتا۔'' اسے شہلا یاد تھی، مگر وہ اس کے سیکنڈ کزن کی بیوی تھی۔

''تو تم یہ رواج ڈالنے والی پہلی لڑکی بن جاؤ۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' جواب میں اس لڑکی نے مسکرا کر ذرا سے شانے اچکائے۔

''جو غار ثور کے آخری سوراخ پہ اپنا پاؤں رکھ دیتا ہے اور ساری رات سانپ سے ڈسے جانے کے باوجود اف نہیں کرتا، اس کی اس ایک رات کی نیکیاں عمر بن خطابؓ کی زندگی بھر کی نیکیاں کے برابر ہوتی ہیں۔ مگر ہر شخص ابوبکر نہیں بن سکتا۔ ابوبکر صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ پہلوں میں پہل کرنے والا۔''

اس کی باری پکاری گئی تو وہ چونکی۔ پھر سلام کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اب اس لڑکی سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ اس کا ذہن صاف تھا،

Downloaded From http://paksociety.com

اس کراؤن فش کے نارنجی پن کی طرح، شفاف اور صاف، مگر وہ جانتی تھی کہ وہ کبھی اپنا چہرہ نہیں لپیٹ سکتی۔ اس تصور سے ہی اس کا دم گھٹتا تھا۔

ایکوریم کے پانی میں اسی طرح بلبلے بن اور مٹ رہے تھے۔ دونوں مچھلیاں بنا تھکے ایک دوسرے سے پیچھے دائرہ میں دوڑ رہی تھیں۔ دائرہ..... جس میں آغاز اور اختتام کی تفریق مٹ جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

استقلال جدیسی میں معمول کی چہل پہل تھی۔ ٹھنڈی سی دھوپ گلی کی دونوں اطراف میں اٹھی قدیم عمارتوں پہ گر رہی تھی، گویا سنہری برف ہو۔

وہ جہان کے ساتھ ساتھ چلتی گلی میں آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر اتفاق ہوا تھا کہ اس نے سیاہ اسکارف اور سیاہ اسکرٹ کے ساتھ گرے بلاؤز پہن رکھا تھا اور جہان نے سیاہ جینز پہ گرے آدھی آستین والی ٹی شرٹ۔ آج جب وہ ادھر آئی تھی تو اس نے خواہش کی تھی کہ وہ استقلال اسٹریٹ کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اسے اس گلی کا انت دیکھنا تھا۔ اب وہ اسی لیے چلتے جا رہے تھے۔

''کچھ پیو گی؟'' جہان نے رک کر پوچھا، پھر جواب کا انتظار کیے بنا ایک کیفے میں چلا گیا۔ جب باہر آیا تو اس کے ہاتھوں میں دو ڈسپوزیبل گلاس تھے اور بغل میں رول شدہ اخبار۔

''شکریہ.....'' اس نے مسکراتے ہوئے گلاس تھاما۔ جھاگ سے بھرا پینا کولاڈا۔ ناریل اور انناس کی رسیلی خوشبو اور دور ناقسم اسکوائر سے اٹھتی ٹیولپس کی مہک۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سانس اندر کھینچی۔ جہان سکندر کا استنبول بہت خوب صورت تھا۔

''ہوں، اچھا ہے۔'' وہ خود ہی تبصرہ کرتا گھونٹ بھر رہا تھا۔ حیا نے اس کے گلاس پکڑے ہاتھ کو دیکھا۔ اس نے وہ پلاٹینم بینڈ نہیں پہن رکھا تھا۔ یہ ان کی منگنی کے بعد پہلی ملاقات تھی اور اس میں اتنی انا تو تھی کہ اسے خود سے کبھی اس موضوع کو نہیں چھیڑنا تھا۔

''تم اس روز دو دفعہ آئی تھیں؟ بیک ڈور کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟'' وہ سرسری انداز میں پوچھ رہا تھا۔ یقیناً اس کے ورکر نے اسے پوری رپورٹ دی ہوگی، مگر جواب اس کے پاس تیار تھا۔ عائشے گل نے بے شک کہا تھا کہ سچ سے بہتر جواب کوئی نہیں ہوتا، مگر اس وقت عائشے کون سا دیکھ رہی تھی۔

''کوئی جاننے والا نظر آ گیا تھا۔ ہالے اور میں نے اس سے ٹکرانے سے بہتر سمجھا کہ دوسری گلی میں چلے جائیں، ویسے بھی شٹل کے آنے تک ہمیں انتظار تو کرنا تھا نا۔''

''اگر کبھی پچھلی گلی میں کوئی جاننے والا ملے اور تمہیں استقلال میں آنا پڑے تو بے شک برگر کنگ کے اسی دروازے کو استعمال کر لینا۔ اس کے پچھلی طرف گھنٹی لگی ہے۔'' گلاس خالی کر کے جہان نے کچرے دان میں اچھال دیا۔ حیا کا ابھی آدھا گلاس باقی تھا۔

''تم بتاؤ! تمہیں لندن کب جانا ہے۔'' وہ کافی بلند آواز میں بول رہی تھی۔ قریب سے گزرتے تاریخی، سرخ ٹرام میں سوار سیاحوں کا گروہ اونچی اونچی سیٹیاں بجا رہا تھا۔ جس کے باعث کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

''اگلے ماہ کا سوچ رہے ہیں۔ تب تک تم بھی فارغ ہوگی۔ باقی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کہاں جا رہے ہیں؟''

''کچھ ترکی میں ہی گھومیں پھریں گے، اور کچھ قطر، پیرس، دبئی وغیرہ جا رہے ہیں۔''

''تو تم ہمارے ساتھ لندن چلو نا۔ پھر جولائی میں واپس آ کر کلیئرنس کروانا اور پاکستان چلی جانا۔''

''میں اپنی دوستوں کے ساتھ بیوک ادا میں رہنا چاہتی ہوں۔'' گو کہ جہان کے ساتھ لندن جانے کا خیال کافی پرکشش تھا، مگر اس نے فوراً ہامی بھرنا مناسب نہ سمجھا۔

''اوہ! ڈونٹ ٹیل می کہ تم ابھی تک وہی رپورٹ لکھ رہی ہو۔''

جہان نے ہاتھ ہلا کر گویا ناک سے مکھی اڑائی۔ حیا نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ ہالے کی دوست چھاپنے کے لیے تیار تھی، مگر جہان کے منع کرنے پہ اس نے وہ رپورٹ بند کر دی تھی۔ آج صبح ہی جب وہ اس بارے میں سوچ رہی تھی تو اسے لگا اسے یہ سب کسی بااعتماد شخص سے شیئر کرنا چاہیے اور میجر احمد سے بڑھ کر کسی پہ اعتبار نہیں تھا۔ تب ہی صبح اس نے میجر احمد کو ٹیکسٹ کیا تھا کہ وہ بات کرنا چاہتی ہے، مگر

Downloaded From http://paksociety.com

کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

"نہیں! میں نے اسے ذہن سے نکال دیا ہے۔"

"گڈ گرل!" وہ ایک دم اس کے بالکل مقابل آ کھڑا ہوا، یوں کہ حیا کے سامنے کا منظر چھپ گیا۔ وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"بعض دفعہ جو ہم دیکھتے ہیں، وہ ہو نہیں رہا ہوتا اور جو ہو رہا ہوتا ہے، وہ ہم دیکھ نہیں رہے ہوتے۔"

کہتے ہوئے اس نے رول شدہ اخبار کھولا اور پھر سے لپیٹنے لگا، یہاں تک کہ کون آئس کریم کی سنہری کون کی طرح اس نے اخبار کو رول کر دیا۔ پھر اس نے حیا کا گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ حیا نے ناسمجھی سے گلاس اسے پکڑایا۔

"ایک چیز ہوتی ہے، نظر کا دھوکا، لوگ وہ نہیں ہوتے، جو وہ نظر آتے ہیں اور جو وہ ہوتے ہیں، اسے وہ چھپا کر رکھتے ہیں۔" اس نے گلاس کون کے منہ میں انڈیل دیا۔ جوس دھار کی صورت اخبار کی کون میں گرنے لگا۔ جہان نے خالی گلاس حیا کو تھمایا اور اخبار کی کون کو مزید لپیٹنا شروع کیا۔ پھر اس کا منہ بند کر دیا اور مخالف سمت سے اخبار کھولنے لگا۔ تہیں کھلتی گئیں اور پورا اخبار سیدھا کھل کر سامنے آ گیا۔ صفحے سوکھے تھے اور جوس غائب۔

"زبردست!" وہ مسکراتے ہوئے تالی بجانے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی ٹرک تھی۔ اس نے یقیناً کمال مہارت سے جوس کہیں آس پاس گرا دیا تھا یا پھر کچھ اور کیا ہوگا، بہرحال اس کا انداز متاثر کن تھا۔

وہ دونوں پھر سے ساتھ چلنے لگے تھے۔ جہان نے اخبار اب دور دبہ تہہ کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

دفعتاً حیا کا فون بجا۔ اس نے پرس سے موبائل نکال کر دیکھا۔ میجر احمد کی کال آ رہی تھی۔ اس نے کال کاٹ دی اور فون رکھ دیا۔ جہان اتنا مہذب تو تھا کہ کوئی سوال نہ کرتا، مگر وہ خود بتانا چاہتی تھی۔

"میجر احمد کی کال تھی، کچھ کام تھا ان سے۔" وہ چلتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔ یہ سراسر جواز تھا۔ جہان کے موڈ کا کچھ بھروسا نہ تھا، مگر وہ اس پہ بھروسا کرنا چاہتی تھی۔

"میجر احمد کون؟" اس نے ناسمجھی سے حیا کو دیکھا۔

"پاکستان میں ہوتے ہیں، سائبر کرائم سیل میں انٹیلی جنس آفیسر ہیں۔ تمہارے ابا کو بھی جانتے ہیں۔" وہ ذرا رکی۔ "میں ان سے بات کروں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا نا؟"

"آف کورس نہیں!" اس نے شانے اچکا دیے۔ "کون کتنا قابل اعتبار ہے، یہ فیصلہ تم خود کر سکتی ہو، کیونکہ میرے نزدیک تو سب لوگ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اتنی بے یقینی بھی اچھی نہیں ہوتی جہان!"

"رئیلی؟ جیسے تمہیں یقین ہے کہ تمہارا جوس میں نے کہیں گرا دیا تھا؟ وہ پھر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا اور گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو جانے کیوں ابھی تک وہ پکڑے کھڑی تھی۔

"یقیناً تم نے ایسا کیا ہوگا۔" اس نے گلاس جہان کو تھما دیا۔ تب تک وہ اخبار کو دوبارہ کون کی شکل میں لپیٹ چکا تھا۔ گلاس لے کر اس نے اخبار کی کون کا کھلا منہ گلاس میں الٹا۔ پینا کولاڈا ایک دھار کی صورت گلاس میں گرنے لگا۔

وہ بے یقینی سے ساکت کھڑی دیکھ رہی تھی۔

"یہ تم نے کیسے کیا؟ میں نے..... میں نے خود دیکھا تھا کہ اخبار سوکھا تھا۔ پھر یہ جوس کہاں سے آیا؟"

"اگر جادوگر اپنی ٹرک کے فوراً بعد ہی راز بتا دے تو کیا فائدہ؟ کبھی فرصت میں بتاؤں گا کہ یہ کیسے ہوا۔ البتہ اگر تم میری جگہ پہ کھڑی ہو کر دیکھتیں تو جان پاتیں کہ میں نے یہ کیسے کیا ہے جب تک انسان دوسرے کی جگہ پہ کھڑا ہو کر نہیں دیکھتا، اسے پوری بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"تم عجیب ہو جہان!" اس نے تحیر سے سر جھٹکا۔ "ان دونوں چیزوں کو ٹریش میں پھینک دو، میری پیاس مر گئی ہے۔"

Downloaded From http://paksociety.com

وہ ہنس پڑا۔ ''نہیں! تمہاری پیاس ڈر گئی ہے۔'' پھر شعبدہ باز نے دونوں چیزیں ایک قریبی کچرے دان میں اچھال دیں۔

دور سامنے گلی کے اختتام پہ ایک اونچا ٹاور تھا۔ جس نے گلی کا دہانہ بالکل بلاک کر رکھا تھا، جیسے زمین سے اگ آیا ہو۔ وہ یوں تھا جیسے پاکستان میں اونچی گول سی اینٹوں کی بھٹی ہوتی ہے، ویسا ہی سلنڈر نما ٹاور جس کا گنبد کون کی شکل کا تھا۔

''یہ رہا وہ انت..... Galata ٹاور (غلطہ ٹاور) جسے جاننے کا تمہیں تجسس تھا۔'' اس نے ٹاور کی طرف اشارہ کیا۔

''اور انت جاننے کا سب سے بڑا نقصان پتا ہے کیا ہوتا ہے جہان؟''

جہان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''انسان کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔'' اس نے گہری سانس لی اور پلٹ گئی۔ وہ شانے اچکا کر اس کے پیچھے ہو لیا۔

☆ ☆ ☆

''ترکی والوں کو سلام۔'' واپسی پہ گورسل میں بیٹھے جب اس نے میجر احمد کو کال کی اور جواباً احمد نے کال کاٹ کر خود سے فون کیا تو اس کا ہیلو سنتے ہی وہ جیسے کسی خوشگوار حیرت کے زیر اثر بولا تھا۔

''زندگی میں پہلی دفعہ آپ نے میجر احمد کو خود یاد کیا ہے، مگر جب آپ نے کال نہیں اٹھائی تو میں سمجھا کہ وہ ٹیکسٹ آپ نے غلطی سے کیا ہوگا۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ میں اس وقت جہان کے ساتھ تھی۔ سوچا بعد میں تفصیلی بات کروں گی۔''

''اچھا۔'' وہ جیسے چپ ہو گیا۔ شاید اسے جہان کا ذکر ناگوار گزرا تھا۔

''میں نے جہان کو آپ کے بارے میں بتایا، مگر وہ آپ کو نہیں جانتا تھا۔''

''کیوں؟ آپ نے کیوں بتایا؟'' وہ بہت حیران ہوا۔

''شوہر کو علم ہونا چاہیے کہ اس کی بیوی کس سے بات کرتی ہے۔'' وہ ذرا جتا کر بولی۔ جانتی تھی کہ اس کا استحقاق سے شوہر کی بات کرنا احمد کو کتنا برا لگتا تھا۔

''شوہروں کا بھروسا نہیں ہوتا۔ احتیاط کیجیے گا، آپ پھنس ہی نہ جائیں۔''

''غلط کام تو نہیں کر رہی کہ پھنسوں۔ بہر حال! ہم کام کی بات کریں؟'' اس کا لہجہ بے لچک ہو گیا۔ ساتھ ہی جو کچھ بیوک ادا میں وہ جان پائی تھی، اس نے وہ احمد کو بتا دیا۔

''میں وہ رپورٹ شائع کرانا چاہتی تھی، مگر جہان نے منع کر دیا۔'' روانی میں وہ کہہ گئی، پھر ایک دم خاموش ہو گئی۔

''وہ تو منع کرے گا، اس کا بہت کچھ داؤ پہ جو لگے گا۔ خیر! آپ بالکل وہ رپورٹ شائع کروائیں، مگر حیا! اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ جہان والی بات نظر انداز کر گئی۔ وہ ذاتی عناد کے باعث کہہ رہا تھا یقیناً۔

''ایک رپورٹ سے اے آر پی جیسے بندے کا کیا بگڑے گا؟ مافیا کے ایک ایک آدمی کے پیچھے پوری کی پوری نیٹ ورکنگ ہوتی ہے۔ عبدالرحمٰن جیسے ''شہرت زدہ'' مہرے تو صرف پل کا کام کرتے ہیں۔ ایسے کہ اپنے دامن پہ کوئی چھینٹا نہ پڑے۔ سو ان کے خلاف نہ ثبوت ہوتے ہیں، نہ کبھی فائلز کھلتی ہیں۔''

''مگر میں نے سنا ہے کہ اس کے عالمی دہشت گرد تنظیموں سے بھی.....''

''کس سے سنا ہے؟'' وہ بات کاٹ کر بولا۔

''لیڈی کبریٰ سے۔ ادالار میں۔''

''بہر حال! یہ دوسری دنیا کے لوگ ہیں۔ آپ ان معاملوں میں مت پڑیں۔''

''تو پھر یہ پاشا میرے پیچھے کیوں پڑا ہے آخر؟'' وہ زچ ہو کر بولی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''مجھے تو لگتا ہے حیا! کہ اس نے آپ کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ اب صرف آپ اس کے پیچھے پڑی ہیں۔''

وہ ایک دم چپ ہوگئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''ویسے ضروری نہیں تھا کہ آپ جہان سکندر کو میرے بارے میں بتائیں۔ انسان کو کچھ باتیں اپنے تک بھی رکھنی چاہئیں۔''

بس باسفورس برج سے گزر رہی تھی اور وہ کھڑکی سے باہر پل تلے بہتا سمندر دیکھ سکتی تھی۔ وہاں حسب معمول ایک فیری تیر رہا تھا۔

''میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میرے اور آپ کے اس رابطے کو کبھی بھی غلط طریقے سے استعمال کرے مجھے رسوا کر سکے۔''

''اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا حیا! جنت کے پتے تھامنے والوں کو اللہ رسوا نہیں کرتا۔''

اسی لمحے دور نیچے سمندر کے کناروں پر بگلوں کا ایک غول پھڑ پھڑاتا ہوا اڑا تھا۔ وہ نگاہیں ان کے بھورے سفید پروں پہ مرکوز کیے، بالکل ٹھہر سی گئی تھی۔

''آپ جنت کے پتے کسے کہتے ہیں۔''

احمد نے گہری سانس لی اور کہنے لگا۔

''آپ جانتی ہیں، جب آدم علیہ السلام اور حوا جنت میں رہا کرتے تھے، اس جنت میں، جہاں نہ بھوک تھی، نہ پیاس، نہ دھوپ اور نہ ہی برہنگی۔ تب اللہ نے انہیں ایک ترغیب دلاتے درخت کے قریب جانے سے روکا تھا، تاکہ وہ دونوں مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔

بس اب پل کے آخری حصے پہ تھی۔ بگلوں کا غول فیری کے اوپر سے پھڑ پھڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ سمندر پیچھے کو جا رہا تھا۔

''اس وقت شیطان نے ان دونوں کو ترغیب دلائی کہ اگر وہ اس ہمیشگی کے درخت کو چھو لیں تو فرشتے بن جائیں گے یا پھر ہمیشہ رہیں گے۔ انہیں کبھی نہ پرانی ہونے والی بادشاہت ملے گی۔''

پل پیچھے رہ گیا۔ گورسل اب پرانے شہر (اناطولیہ یا ایشیائی حصے) میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ ہر شے سے بے نیاز یکسوئی سے سن رہی تھی۔

''سو انہوں نے درخت کو چکھ لیا۔ حد پار کر لی..... تو ان کو فوراً بے لباس کر دیا گیا۔ اس پہلی رسوائی میں جو سب سے پہلی شے جس سے انسان نے خود کو ڈھکا تھا، وہ جنت کے پتے تھے، ورق الجنتہ۔''

پرانے شہر کی سڑک پہ کوئی ٹریفک جام تھا۔ گورسل بہت سست روی سے چل رہی تھی۔ سڑک کنارے چلتے لوگ اور دکانوں پہ لگا رش، اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بس سن رہی تھی۔

''آپ جانتی ہیں، ابلیس نے انسان کو کس شے کی ترغیب دلا کر اللہ کی حد پار کروائی تھی؟'' فرشتہ بننے کی اور ہمیشہ رہنے کی۔ جانتی ہیں حیا! فرشتے کیسے ہوتے ہیں؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی، گو کہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے نہیں دیکھ سکتا۔

''فرشتے خوب صورت ہوتے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو رکا۔ ''اور ہمیشہ کی بادشاہت کسے ملتی ہے؟ کون ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے؟ وہ جسے لوگ بھول نہ سکیں، جو انہیں مسحور کر دے، ان کے دلوں پہ قبضہ کر لے۔ خوب صورتی اور امر ہونے کی چاہ، یہ دونوں چیزیں انسان کو دھوکے میں ڈال کر ممنوعہ حد پار کراتی ہیں اور پھل کھانے کا وقت نہیں ملتا۔ انسان چکھتے ہی بھری دنیا میں رسوا ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر وہ خود کو ڈھکے تو اسے ڈھکنے والے جنت کے پتے ہوتے ہیں۔ لوگ اسے کپڑے کا ٹکڑا کہیں یا کچھ اور، میرے نزدیک یہ ورق الجنتہ ہیں۔''

پرانے شہر کی قدیم اونچی عمارتوں پر سے دھوپ رینگ گئی تھی اور اب چھاؤں کی نیلاہٹ ان پر چھا رہی تھی۔ وہ سانس روکے موبائل کان سے لگائے دم سادھے بیٹھی سن رہی تھی۔

''جنت کے پتے صرف اسی کو ملتے ہیں، جس نے ترغیب کو چکھنے کی کوشش کی ہوتی ہے اور ان کا سفر ان کو خود پہ لگا لینے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا، کیونکہ ان کو تھامنے سے پہلے انسان جنت میں ہوتا ہے۔ تھامنے کے بعد وہ دنیا میں اتار دیا جاتا ہے، بخشش مل جاتی ہے، مگر دنیا

Downloaded From http://paksociety.com

شروع ہو جاتی ہے اور پھر.....''

وہ جیسے دھیرے سے مسکرایا۔

''دنیا والوں نے جنت تو نہیں دیکھی ہوتی نا! سو ان کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ جنت کے پتے کیسے دکھتے ہیں۔ سو وہ ان کے ساتھ سلوک بھی وہی کرتے ہیں، جو کسی شے کی اصل جانے بغیر اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آپ دنیا میں اترنے کے بعد دنیا والوں کے رویے سے پریشان مت ہوئیے گا۔''

وہ خاموش ہوا تو کوئی طلسم ٹوٹا۔ سحر کا ایک بلبلہ جو اس کے گرد تن چکا تھا، پھٹ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

''تھینکس میجر احمد!'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔ اس وقت کچھ زیادہ کہنے کے قابل نہیں تھی۔

''آپ اچھے انسان ہیں، اچھی باتیں کرتے ہیں۔''

''شکریہ! میں اب فون رکھتا ہوں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔'' اس نے فون کان سے ہٹایا۔ اس کا کان سن ہو چکا تھا۔

قدیم شہر کی عمارتوں میں اس کو ابھی تک میجر احمد کی باتوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

''انا طولین سٹی میں ایک سیمینار ہے، چلو گی؟'' ہالے نے ڈورم کے دروازے سے جھانک کر اسے مخاطب کیا۔ وہ جو اپنی کرسی پہ بیٹھی میز پہ پھیلی کتابوں میں منہمک تھی، چونک کر پلٹی۔

''ابھی تو ممکن نہیں ہے، میرے پورے دو چیپٹر زرہ گئے ہیں۔'' حیا نے صفحے آگے پلٹ کر دیکھا اور پھر نفی میں گردن ہلائی۔

''کار میں پڑھ لینا۔ کتاب ساتھ لے چلو۔''

''اتنا ضروری کیا ہے؟''

''تم پچھتاؤ گی نہیں۔ لکھ کر رکھ لو۔'' ہالے مصر تھی، سو اس نے کتاب ساتھ رکھ لی۔ پزل باکس بھی بیگ میں ڈال لیا اور بھنی مونگ پھلی کا پیکٹ جو کل ہی دیا اسٹور سے لائی تھی، ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''کپڑے ٹھیک ہیں؟'' اس نے گردن جھکا کر صبح کے پہنے لباس کو دیکھا۔ گرے اسکرٹ کے ساتھ لائم گرین بلاؤز اور اوپر گرے اسکارف جو ابھی ابھی پن اپ کیا تھا۔

''ہاں! ٹھیک ہیں، چلو۔'' ہالے نے پرس اور چابی سنبھالی۔ یہ اس کا خوش قسمت دن تھا کہ آج اس کے پاس کار تھی۔

وہ سیمینار ہوٹل کے جس ہال میں تھا، وہ ہال سب سے اوپر والے فلور پہ تھا۔ اس کی دو متوازی دیواریں گلاس کی بنی تھیں.....

ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ لڑکیاں، عورتیں اور بے حد معمر خواتین، خالص نسوانی ماحول تھا۔

ان دونوں کو شیشے کی دیوار کے ساتھ جگہ ملی۔ حیا کی کرسی قطار کی پہلی کرسی تھی، سو اب اس کے دائیں طرف گلاس وال تھی اور بائیں جانب ہالے۔ درمیان میں اس نے مونگ پھلی کا پیکٹ کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہی ڈی جے کے ساتھ بیچ کلاس میں کھانے کی عادت۔

روسٹرم کے عقب میں دیوار اس خوب صورت بینر سے ڈھکی تھی، جس پہ انگریزی میں چھپا تھا۔

Face Veil Mandatory or Recommended

(چہرے کا حجاب، واجب یا مستحب؟)

اس نے دو انگلیوں اور انگوٹھے کو پیکٹ میں ڈال کر چند دانے نکالے اور منہ میں رکھے۔ وہ اسکارف کر لے، یہ اس کے تقویٰ کی انتہا تھی۔ سو اب چہرے کا نقاب واجب تھا یا مستحب، کیا فرق پڑتا تھا؟

سیمینار انگریزی میں تھا۔ سو ڈائس سنبھالے کھڑی میرون اسکارف والی عربی خاتون انگریزی میں ہی کہہ رہی تھیں۔

''واجب وہ چیز ہوتی جو کریں تو ثواب، نہ کریں تو گناہ ہے، جبکہ مستحب وہ کام ہے جو کریں تو ثواب، مگر نہ کرنے پہ گناہ نہیں ہے۔ اب اس بات پہ تو سب راضی ہیں کہ لڑکیوں کا سر اور جسم ڈھکنا واجب، لیکن کیا چہرہ بھی ڈھکنا لازمی ہے؟''

حیا کے دائیں جانب گلاس وال پہ ایک دم سے کوئی پرندہ آ ٹکرایا تھا۔ وہ پھونکی۔ وہ ننھی سی چڑیا تھی جو شیشے سے ٹکرا کر نیچے گر گئی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

''جب میں کہتی ہوں کہ چہرہ ڈھکنا واجب نہیں، صرف مستحب ہے تو اس کی وجہ وہ حدیث ہے کہ جب حضرت اسماؓ بنت ابوبکر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور ان کا لباس ذرا باریک تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اسما! جب لڑکی جوان ہو جاتی ہے تو سوائے اس اور اس کے (چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے) کچھ نظر نہیں آنا چاہیے۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چہرہ کھلا رہنے پہ گناہ نہیں ہوتا۔''

گری ہوئی چڑیا اب سنبھل کر فرش پہ پھدک رہی تھی۔ چند ایک بار اس نے شیشے کی دیوار پر پنجے مار کر چڑھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی۔

''اور پھر جب حج کے موقع پہ ایک لڑکی جو اونٹ پہ بیٹھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بچے کے حج کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے فضلؓ لاشعوری طور پہ اس لڑکی کے چہرے کو دیکھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے ہاتھ پیچھے کر کے فضلؓ کا چہرہ دوسری جانب پھیر دیا، جبکہ اس لڑکی کو چہرہ ڈھکنے کا نہیں کہا۔ دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ازواج مطہرات اور صحابیات جو حجاب اوڑھتی تھیں، وہ مستحب کے درجے کا تھا۔ واجب کا نہیں۔ سو جو آیت سورۂ نور میں ہے کہ وہ اپنی زینتیں چھپائیں، سوائے اس کے کہ جو خود ظاہر ہو جائے تو اس ''وہ جو خود ظاہر ہو جائے'' میں سرمہ، انگوٹھی وغیرہ کے ساتھ چہرہ بھی شامل ہے۔''

چڑیا پھڑ پھڑاتی ہوئی کب کی اڑ چکی تھی۔ وہ مونگ پھلی چباتے ہوئے سر اثبات میں ہلاتی مقررہ کو سن رہی تھی۔ وہ مزید چند دلائل دے کر اپنی کرسی پہ واپس جا چکی تھیں اور تب تک وہ مطمئن ہو چکی تھی۔ اسے ان کی ساری بات ٹھیک لگی تھی۔

''میں ڈاکٹر فریحہ سے اختلاف کی جسارت کروں گی۔'' ڈائس پہ آنے والی گرے اسکارف والی مقررہ اپنی بات شروع کر چکی تھیں۔ وہ دراصل بحث تھی۔ حیا اور ہالے باری باری پیکٹ میں انگلیاں ڈال کر مونگ پھلی نکالتے ہوئے، پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھیں۔

''رہی اسما بنت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث، اس کی تشریح تو محرم رشتوں کے لحاظ سے بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی تھیں اور اسی حدیث سے ہم دلیل لیتے ہیں کہ بہنوئی سے چہرے کا پردہ نہیں ہوتا اور حضرت فضلؓ والا واقعہ حج کے موقع کا تھا اور حج پہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے نقاب یا دستانے پہننے سے منع فرمایا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نقاب کرنا اس زمانے میں ایک کامن پریکٹس تھی۔''

دو فاختائیں تیزی سے اڑتی آئیں اور شیشے کی دیوار سے ٹکرائیں۔ حیا نے ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ اب ٹکرا کر نیچے جا گری تھیں اور اگلے ہی پل اٹھ کر اڑ گئیں۔

''عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب گریبانوں کو ڈھانپ لینے کا حکم نازل ہوا تھا تو مدینے کی عورتوں نے وہ حکم سنتے ہی اپنی اوڑھنیاں حصوں میں پھاڑیں اور سر سے پاؤں تک خود کو اس سے ڈھانپ لیا۔ یہاں ڈھانپنے سے مراد چہرہ ڈھانپنا بھی ہے۔ سو ''وہ جو خود ظاہر ہو جائے۔'' میں انگوٹھی، سرمہ، جوتی تو آتی ہے، مگر چہرہ نہیں۔ پھر جب ابن عباسؓ سے آیت حجاب کی تفسیر پوچھی گئی تھی تو آپؓ نے اپنی چادر سر پہ لپیٹ کر بکل مار کے دکھائی، یوں کہ بس ایک آنکھ واضح تھی۔ آیت حجاب میں اللہ نے ''اے ایمان والو!'' کہہ کر حکم دیا ہے اور جب اللہ تعالیٰ مومن کو اس کے ایمان کا واسطہ دے کر حکم دیتا ہے تو وہ حکم بے حد اہم ہوتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ صرف سر اور جسم ڈھکنا واجب نہیں، بلکہ چہرہ ڈھکنا بھی واجب ہے۔''

وہ گردن ذرا سی پھیرے شیشے کی دیوار کو دیکھ رہی تھی، جہاں تھوڑی سی دیر میں بہت سے پرندے ٹکرائے تھے۔ تایا فرقان کہتے تھے کہ پرندے یوں اس لیے کرتے ہیں، کیونکہ وہ پچھلے سال جب یہاں سے گزرے تھے تو وہ عمارت وہاں نہیں تھی۔ اب وہ راستے پہ اپنی رو میں اڑتے جا رہے ہوتے ہیں تو ٹکر لگنے پہ معلوم ہوتا ہے کہ راستہ بلاک ہے۔ معلوم نہیں، تایا کی فلاسفی کتنی درست تھی، مگر وہ ہوٹل نیا تعمیر شدہ ہی تھا۔ شاید وہ واقعی پرندوں کی گزرگاہ کے درمیان بن گیا تھا۔

''مستحب اور واجب، بحث بہت پرانی ہے۔'' ڈائس پہ اب ایک سیاہ عبایا اور سیاہ اسکارف والی دراز قد، شہد رنگ آنکھوں والی خاتون آ چکی تھیں۔ خوب صورت، شفاف چہرہ، نرم سی مسکراہٹ، سب بہت توجہ سے انہیں سن رہے تھے۔

Downloaded From http://paksociety.com

''آپ نے مستحب والوں کے دلائل سنے، آپ کو لگا ہوگا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ نے پھر واجب والوں کا بیان سنا، تو لگا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ دونوں ٹھیک کہہ سکتے ہیں؟ تو وہی لطیفہ ہو جائے گا کہ آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔''

ہال میں بے اختیار قہقہہ بلند ہوا۔ شیشے کی دیواریں بھی مسکرا اٹھیں۔

''ایسا ہے کہ میں ان دنوں میں سے کسی گروہ کی حمایت یا مخالفت کرنے کے لیے نہیں آئی۔ میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں۔''

وہ لمحے بھر کو رُکیں۔ پورا ہال بہت دلچسپی سے سن رہا تھا۔

''ہم عموماً دنیا اور آخرت کی مثال کسی کالج ایگزام سے دیتے ہیں، رائٹ؟ تو وہی مثال لے لیتے ہیں۔ دنیا اور آخرت کے کسی بھی اسکول یا کالج کا جب پیپر سیٹ کیا جاتا ہے تو اس میں چند سوال بہت آسان رکھے جاتے ہیں۔ جو کوئی اوسط درجے کا طالب علم بھی حل کر کے 33% سے زیادہ نمبر لے کر پاس ہو سکتا ہے۔ پھر چند سوال ذرا مشکل ہوتے ہیں جو صرف اچھے طلبہ حل کر کے ستر، اسی فیصد نمبر لے جاتے ہی اور آخر میں ہر پیپر میں کچھ سوال بہت پیچ دار.....اور مشکل رکھے جاتے ہیں۔ وہ سوال پوزیشن ہولڈرز کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اسی لیے عموماً پوزیشن ہولڈرز کے آپس میں چند نمبرز یا پرسنٹیج کے ذرا سے تناسب کا فرق ہوتا ہے۔ یہ سوال ''مستحب'' ہوتے ہیں۔ ہم عموماً سمجھتے ہیں کہ مستحب وہ ہوتا ہے کہ جب پانچ میں سے چار سوال حل کرنے ہوں، تو چاروں میں سے کوئی غلط ہونے کے ڈر سے پانچواں بھی اٹیمپٹ کر دیا جائے، ایکسٹرا سوال جبکہ وہ مستحب نہیں ہوتا۔''

وہ اب کرسی پہ ذرا آگے ہو کر بیٹھی غور سے سن رہی تھی۔ استنبول کی خوب صورت عورتوں کی خوب صورت باتوں کا بھی ایک اپنا سحر تھا۔

''اب ہوتا یہ ہے کہ.....'' شفاف چہرے والی ڈاکٹر شائستہ کہہ رہی تھیں۔ ''کہ اس مسئلے پہ واجب والے، مستحب والوں پہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ اپنی مرضی کا دین چاہتے ہیں اور خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔ جبکہ مستحب والے انہیں کہتے ہیں کہ آپ شدت پسند ہو رہے ہیں۔ الزامات کی اس جنگ میں لڑکیوں کے پاس بہانہ آ جاتا ہے کہ انہیں حجاب کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایسے ہی ٹھیک ہیں، کیونکہ یہ تو ثابت ہی نہیں ہے کہ اسلام میں چہرے کا پردہ ہے بھی یا نہیں۔ جبکہ یہ غلط تاثر ہے۔ بحث نقاب کے ''ہونے'' یا ''نہ ہونے'' کی نہیں ہے، بلکہ بحث اس کے واجب یا مستحب ہونے کی ہے۔ آسان الفاظ میں کہتی ہوں، اس پہ سب راضی ہیں کہ نقاب کرنے پہ ثواب ہے، جبکہ اختلافی نقطہ یہ ہے کہ کیا نقاب نہ کرنے پہ گناہ بھی ہے یا نہیں؟''

اس نے اسکالر کے چہرے کو دیکھتے انگلیاں پیکٹ میں ڈالیں تو پوروں نے خالی پلاسٹک کو چھوا۔ مونگ پھلی کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے انگلیاں نہیں نکالیں، وہ ویسے ہی پوری یکسوئی سے اسٹیج کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں سوچتی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے ہم اختلافی نقطہ یعنی گناہ ہے یا نہیں۔'' چھوڑ دیں اور صرف ''متفق نقطے'' پہ غور کریں تو اس مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ ''گناہ کو چھوڑ دیں۔'' کامن پوائنٹ دیکھیں کہ نقاب کرنا ایک نیکی ہے۔ بہت بڑی نیکی۔ تو کیا جو چیز مستحب ہوتی ہے، اسے فالتو سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے؟ جیسے مستحب والے کرتے ہیں۔ وہ نقاب کو غیر واجب قرار دے کر اس کی ترویج و تبلیغ کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف 33 فیصد والے جواب دے کر کسی فالتو سوال کے بغیر ہی ہم پاس ہو جائیں گے؟ کیا ہمیں یقین ہے کہ ہمارا 33 فیصد کا جواب نامہ بھی درست لکھا گیا ہے؟''

ان کے سوال پہ ہال میں خاموشی چھائی رہی مرعوب سی خاموشی۔

''ادھر ہم سب عورتیں اور لڑکیاں ہی موجود ہیں۔ ایک بات کہوں آپ سے؟ ہم میں یہ چند باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ ساری نہیں تو کچھ تو ضرور ہی۔ ہم جلد جیلس ہو جاتی ہیں، کسی کے پیچھے اس کی برائی بھی کر لیتی ہیں۔ منہ سے جھوٹ بھی پھسل جاتا ہے۔ نمازیں ہم پوری پڑھتی نہیں۔ جو پڑھیں، ان میں بھی دھیاں کہیں اور ہوتا ہے۔ ان کا بھی پتا نہیں کتنا، پانچواں، نواں یا دسواں حصہ لکھا جاتا ہوگا۔ رمضان کے روزے رکھ لیں تو چھوٹے روزوں کی قضا دینا بھول جاتے ہیں۔ یہ تھا وہ 33 فیصد پرچہ۔ یہ کتنا اچھا ہم حل کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں لگتا ہے کہ ہمیں کسی ایکسٹرا عمل کی ضرورت نہیں؟ مائی ڈیئر لیڈیز! جنت صرف خواہش کرنے سے نہیں مل جاتی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آدم کی اولاد میں ہر ایک ہزار میں سے 999 جہنم میں ڈالے جائیں گے اور صرف ایک جنت میں داخل کیا جائے گا؟ یہ میں نہیں کہہ رہی،

Downloaded From http://paksociety.com

یہ بخاری کی حدیث ہے۔ کیا ہم اس اعمال نامے کے ساتھ اس ''ایک'' میں شامل ہو سکتے ہیں؟''

وہ بالکل ساکت بیٹھی، بنا پلک جھپکے مقررہ کو دیکھ رہی تھی۔ ''جہنم'' کے لفظ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم چلا دی تھی۔ ہر اقلیطس کی دائمی آگ، بھڑکتا آتش دان، دہکتے انگارے۔

''آج ہم بحث کرتے ہیں کہ نقاب واجب ہے یا نہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ کل کو قیامت کے دن جب ہم ایک ایک نیکی کی تلاش میں ہوں گے تب ہم شاید رو رو کر کہیں کہ آخر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ حجاب واجب تھا یا مستحب، تھا تو نیک عمل..... تھا تو ثواب ہی نا، تو ہم نے کیوں نہیں کیا؟'' انہوں نے رک کر ایک گہری سانس پر کو کھینچی۔ ''یقین کریں! میں واجب والوں اور مستحب والوں، کسی کی حمایت یا مخالفت نہیں کر رہی۔ میں بس ایک بات کہہ رہی ہوں کہ حجاب کرنا نیکی ہے، سوچا ہے آپ اسے واجب سمجھ کر کریں یا مستحب سمجھ کر..... اسے کریں ضرور اور اسے پھیلائیں بھی ضرور۔ ہمارے جھوٹ، خیانتیں اور دھوکے ہمارے لیے جو آگ تیار کر رہے ہیں، اس سے دور ہونے کے لیے جو کرنا پڑے کریں اور ایک آخری بات.....'' وہ پھر سانس لینے کو رکیں۔ ہال میں اسی طرح مکمل خاموشی تھی۔

''آپ حجاب کے جس بھی درجے پہ ہوں، صرف اسکارف لیں یا عبایا بھی لیں یا ساتھ میں نقاب بھی کریں، جو بھی کریں، اس پہ قائم ہو جائیں۔ اس سے نیچے کبھی نہ جائیں اور پھر اس کے لیے لڑنا پڑے تو لڑیں۔ مرنا پڑے تو مریں، مگر اس پہ سمجھوتا کبھی نہ کریں۔ مجھے نہیں معلوم کہ حجاب واجب ہے یا مستحب، میں بس یہ جانتی ہوں کہ یہ اللہ کو پسند ہے تو پھر یہ مجھے بھی پسند ہونا چاہیے۔''

وہ اسٹیج سے اتریں تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ گرے اسکارف والی اور میرون اسکارف والی دونوں خواتین متفق انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلا کر تالی بجا رہی تھیں۔

وہ بالکل چپ، خاموش سی بیٹھی تھی۔ دل و دماغ جیسے بالکل خالی ہو گئے تھے۔ جیسے ہی وہ سیاہ عبایا والی ڈاکٹر شائستہ ہمدانی دروازے کی طرف بڑھیں۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور ان کی جانب لپکی۔

''میم!'' وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے ان تک آئی۔

''یس؟'' وہ پلٹیں۔ ساتھ ہی وہ ایک ہاتھ میں اپنا فون پکڑے تیز تیز کچھ ٹائپ کر رہی تھیں۔

''وہ..... میں بھی..... میں بھی کرنا چاہتی ہوں نقاب..... مگر.....'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنی بات سمجھائے۔

''مگر..... میں کیسے کروں؟''

''بہت آسان!'' ڈاکٹر شائستہ نے موبائل بیگ میں ڈالا اور پھر آگے بڑھ کر اس کے اسکارف کا سامنے کو گرا دایاں تکونا پلو اٹھایا۔ اسے پہلے بائیں گال کے ساتھ اسکارف کے ہالے میں اڑسا، پھر کچھ حصہ دائیں گال کے اس طرف اڑسا، یوں کہ اس کے چہرے کو ایک نفیس سے نقاب نے ڈھانپ دیا۔

''بس..... اتنی سی بات تھی!'' مسکرا کر کندھوں کو ذرا سی جنبش دے کر وہ موبائل نکالنے کے لیے پرس کھنگالتے ہوئے پلٹ گئیں۔

اتنی سی بات تھی؟ وہ اپنی جگہ منجمد سی کھڑی رہ گئی۔

بس؟ اتنی سی بات تھی؟ اس کا سانس گھٹا، نہ دل تنگ ہوا، نہ ہی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھایا۔ سب ویسا ہی تھا۔ بس اتنی سی بات تھی؟

انا طولیہ کے بازار میں چہل قدمی کرتے، گورسل کی نشست سے کھڑکی کے باہر دیکھتے، سبانجی کے کیمپس میں واپس بس سے اترتے، ہر جگہ اس نے لوگوں کو، دیواروں کو، مناظر کو کھوجنے کی سعی کی۔ کیا کوئی فرق پڑا تھا؟ مگر اسے احساس ہوا کہ سب ویسا ہی تھا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ ڈاکٹر شائستہ کا پہنایا گیا نقاب اتار سکتی، سو وہ استنبول میں اسی نقاب کے ساتھ لمحے بتاتی رہی۔ پر کہیں کوئی گھٹن، کوئی تنگی نہ تھی۔ انسان دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، نہ کہ رخسار، ناک، ٹھوڑی یا پیشانی سے، سو ان کے ڈھکے ہونے کے باوجود منظر وہی رہتی ہے، پھر کیسی پریشانی؟

Downloaded From http://paksociety.com

لیکن پھر بھی اسے عجیب سی خفت ہو رہی تھی۔ باوجود اس کے ہالے کا انداز ویسا ہی تھا، جیسا پہلے تھا۔ ڈورم کی سڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے حسین اور معتصم اترتے دکھائی دیے۔ حسین بس لمحے بھر کو ٹھٹکا تھا، پھر دونوں مسکرا کر سلام کرتے نیچے اتر گئے۔ سب پہلے جیسا تھا۔

''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کہہ دیں اپنی بیویوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں، تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور وہ ستائی نہ جائیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

وہ اپنی کرسی پہ بیٹھی، کتاب پہ جھکی، ذہنی طور پہ ابھی تک اسی ہال میں تھی، جہاں شیشے کی دیواروں سے پرندے ٹکرا جایا کرتے تھے۔ جب واپسی کے وقت پس منظر میں کسی نے یہ آیت چلا دی تھی تو وہ اس کے ٹرانس سے باہر ہی نہ آ سکی۔ اسے لگا، وہ کبھی اس کے اثر سے نہیں نکل سکے گی۔ لمحے بھر میں اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ آج تک حجاب یا نقاب کیوں نہیں پہن سکی تھی۔ باوجود اس کے کہ تایا، ابا اور وحید بھی اسے بہت تاکید کرتے تھے۔ وہ یہ نہیں کر سکی۔ اس لیے کیونکہ انہوں نے ہمیشہ اپنی کہی۔ کبھی اللہ کی بات سنائی ہی نہیں۔ جبکہ طرح اپنی بات مسلط کرنی چاہی اور اکثر باپ، بھائی یہی تو کرتے ہیں۔ اپنی ہی کہتے رہتے ہیں۔ پھر شکایت کرتے ہیں کہ بچیاں مانتی کیوں نہیں ہیں؟ کبھی اللہ کی سنوا کر تو دیکھتے، پھر علم ہوتا کہ مسلمان لڑکی چھوٹی ہو یا بڑی، نرم خو ہو یا سخت کانچ، دل اس کا ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ دل جو اللہ کی سن کر جھک ہی جاتا ہے۔ پھر کسی وعظ، تقریر یا درس کی ضرورت نہیں رہتی۔

ایک آیت..... ایک آیت زندگی بدل دیتی ہے۔ بس ایک آیت۔

☆ ☆ ☆

بیوک ادا کے ساحل پہ لہریں پتھروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ ان کا شور اس اونچے، سفید قصر عثمانی کے اندر تک سنائی دے رہا تھا۔ محل اندھیرے میں ڈوبا تھا، راہداریاں تاریک تھیں۔ صرف دوسری منزل کی اسٹڈی میں نیم روشنی سی چھائی تھی۔ اندر ایک مدھم سا بلب جل رہا تھا یا پھر میز پہ کھلا پڑا عبدالرحمن کا لیپ ٹاپ۔ البتہ وہ اسکرین کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ ریوالونگ چیئر کی پشت پہ سر گرائے، سوچتی نگاہوں سے چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی دونوں سونے کی انگوٹھیاں اور موٹے فریم کے گلاسز میز پہ لیپ ٹاپ کے ساتھ رکھے تھے۔

بے خیالی میں اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی۔ اسے دیکھا اور پھر ذرا کوفت سے واپس میز پہ پھینک دیا۔ اس سگریٹ نوشی سے اسے چھٹکارا لے لینا چاہیے تھا اب تک۔ بلکہ اور بھی بہت چیزوں سے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور انگلیوں سے کنپٹیوں کو دھیرے دھیرے مسلنے لگا۔ اس کے سر میں کافی دیر سے درد تھا، شاید بہت سوچنے کے باعث اعصابی دباؤ۔

''اوں ہوں!'' اس نے نفی میں سر جھٹکا۔ اس کے اعصاب بہت مضبوط تھے اور وہ کبھی بھی اس قسم کے دباؤ سے نہیں ہار سکتا۔ اس نے خود کو یقین دلایا۔ ویسے بھی سب کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ ہر شے حسب منشا جا رہی تھی۔ جو تاش کے پتوں کا گھر اس نے بنا رکھا تھا۔ وہ اپنے آخری مرحلے میں تھا۔ کامیابی بہت نزدیک تھی۔ جو وہ چاہتا تھا، سب ویسے ہی ہو رہا تھا۔ مگر اب اسے زیادہ توانائی اور زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ پچھلی دفعہ کھیل آخری مرحلے میں بگڑ گیا تھا۔ ہر شے دھپ سے اس پہ آ گری تھی اور وہ بھی اس دوست کے طفیل ''دوست'' دھوکا دے، اس سے بڑھ کر تکلیف دہ شے کوئی نہیں ہوتی۔ کچھ پل کے لیے وہ اذیت ناک دن اس کی نگاہوں کے سامنے لہرائے تھے۔ اپنے قابل سے قابل دوستوں اور جاننے والوں کو چھوڑ کر، وہ اس قابل نفرت آدمی کے پاس گیا تھا مدد کے لیے اور اس نے جو کیا، وہ بہت برا تھا۔

عبدالرحمن نے تلخی سے سر جھٹکا۔ اس وقت کم از کم وہ اس واقعے اور اس شخص کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔ اللہ ضرور اسے موقع دے گا کہ وہ اس سے اپنا انتقام لے اور وہ کبھی وہ موقع ضائع نہیں کرے گا۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی، مگر اس وقت اسے وہ سب بھلا کر ان مواقع پہ توجہ مرکوز رکھنی تھی جو اس کے سامنے تھے۔ عبدالرحمن نے کبھی موقعوں کا انتظار نہیں کیا تھا۔ اس نے موقعے ہمیشہ خود پیدا کیے تھے اور پھر اپنے کام نکلوائے تھے۔ اب بھی وہ یہی کر رہا تھا۔

مگر اس سب سے پہلے اسے اس چھوٹے سے مسئلے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا جو چار، پانچ ماہ قبل اس نے خود کھڑا کیا تھا۔ گو کہ ہر چیز ویسے نہیں ہوئی تھی جیسے اس نے سوچا تھا۔ بڑی غلطی ہوئی اس سے ہاشم پہ اعتبار کر کے، مگر پھر بھی اس سب کا اختتام ویسے ہی ہوگا، جیسے اس

Downloaded From http://paksociety.com

نے سوچا تھا۔ جیسے اس نے پلان کیا تھا، جیسے دیمت فردوس نے مشورہ دیا تھا۔

ایک اتفاقیہ موقع اسے مزید پیدا کرنا تھا۔

اس نے میز پہ رکھا اپنا فون اٹھایا اور فون بک کھولی۔ وہ نمبرز کبھی لوگوں کے اصل نام سے محفوظ نہیں کرتا تھا۔ یہ نمبر بھی اس نے ایکسچینج اسٹوڈنٹ کے نام سے محفوظ کر رکھا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے وہ اس نمبر پہ میسج لکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

چھبیس مئی سے سبانجی میں امتحانات کا موسم چھا گیا۔ اس کٹھن موسم کو نو جون تک جاری رہنا تھا۔ ٹاقسم کا مجسمہ.....استقلال جدیسی کے چکر، جواہر کی شاپنگ اور پزل باکس کی پہیلیاں، اسے سب بھول گیا تھا۔ ادالار میں رکنے کے باعث ہونے والا نقصان تو وہ پورا کر چکی تھی، مگر یہاں صرف پاس نہیں ہونا تھا، بلکہ ڈسٹنکشن لینی تھی۔ اس کا رزلٹ برا ہوا تو پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کی ناکامی ہوگی اور رزلٹ اچھا آیا تو پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ کی کامیابی ہوگی۔ وہ حیا سلیمان کو بھلا کر صرف اور صرف ''پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس'' رہ گئی تھی۔

اکتیس مئی کی صبح استنبول پہ کسی قہر کی طرح نازل ہوئی تھی۔ وہ رات دیر تک پڑھنے کے بعد فجر کے قریب سوئی تھی کہ آج چھٹی تھی، مگر صبح ہی صبح ہالے کسی آندھی طوفان کی طرح ڈورم میں بھاگتی آئی تھی۔

''حیا.....حیا.....اٹھو!'' وہ ہالے کے زور، زور سے پکارنے پہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''کیا ہوا؟'' نیچے اپنے بینک کی سیڑھی کے ساتھ کھڑی ہالے کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ لحاف پھینک کر تیزی سے نیچے اتری۔

''حیا.....'' ہالے کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔ حیا نے بے اختیار اس کے ہاتھ پکڑے، جو سرد ہو رہے تھے۔

''ہالے؟''

''حیا.....فریڈم فلوٹیلا.....جو غزہ جا رہا تھا.....اسے روک دیا گیا ہے، اسرائیل نے اس پہ اٹیک کر دیا ہے۔ پتا نہیں، کتنے فلسطینی اور ترک مارے جا چکے ہیں۔''

''اللہ!'' اس نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔.....''مگر.....مگر وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ ان بحری جہازوں میں تو خوراک تھی، دوائیاں تھیں۔''

''وہ کہتے ہیں کہ ان میں اسلحہ تھا اور دہشت گرد بھی۔ پھر انہیں پوچھنے والا کون ہے؟''

''خدایا! معتصم وغیرہ کتنے پریشان ہوں گے۔ ان کے تو دوست بھی تھے مسافر بردار جہاز میں۔'' اسے بے اختیار یاد آیا۔

ہمیں ان کے پاس جانا چاہیے چلو، جلدی کرو۔'' اس نے جلدی جلدی بال جوڑے میں لپیٹے اور پھر لباس بدل کر، اسکارف لپیٹ کر اور نقاب نفاست سے سیٹ کر کے وہ ہالے کے ساتھ باہر آ گئی۔ کامن روم کے راستے میں اس نے موبائل چیک کیا تو ادھر رات کے کسی ایک پہر ترک موبائل نمبر سے پیغام آیا ہوا تھا۔

''میرے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے، اے آر پی۔''

''جہنم میں جائے اے آر پی۔'' وہ اس وقت اس پریشانی میں اے آر پی کے سرپرائز کے بارے میں کہاں سوچتی۔

کامن روم میں پانچوں فلسطینی لڑکے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میز پہ لیپ ٹاپس کھلے پڑے تھے اور موبائل ہاتھوں میں لیے وہ سب اپ ڈیٹس کے منتظر تھے۔ ان کے چہرے دیکھے تو وہ افسوس کے سارے الفاظ بھول گئی۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کہے۔ وہ اور ہالے خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔

''آئی ایم سو سوری معتصم'' اس کے کہنے پہ معتصم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ہلکی سی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جنبش دی اور دوبارہ اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ وہ اس کی تکلیف محسوس کر سکتی تھی، بلکہ نہیں وہ کیسے محسوس کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ وہ خود کو ان کی جگہ پہ

Downloaded From http://paksociety.com

رکھے۔ وہ تصور کرے کہ (اس نے لمحے بھر کو آنکھیں میچ کر سوچا) اگر خدانخواستہ اسلام آباد میں جنگ جاری ہو، پورا شہر اپنے گھروں میں محصور ہو، اس کے گھر والے بیمار اور زخمی ہوں اور پھر وہ ادھر ترکی سے ایک فلوٹیلا پہ انہیں دوائیاں اور خوراک بھیجے، مگر وہ فلوٹیلا کراچی کے ساحل پہ روک لیا جائے، اس میں سوار کچھ لوگوں کو مار دیا جائے اور اس کے گھر والے تڑپتے رہیں۔ ہاں! (اس نے تکلیف سے آنکھیں کھولیں۔) اب وہ محسوس کر سکتی تھی۔ جب تک اپنے ملک اور اپنے گھر پہ بات نہ آئے، کسی دوسرے کا درد محسوس ہی نہیں ہوتا۔

کامن روم کا دروازہ کھول کر ٹالی اندر داخل ہوئی۔ حیا اور ہالے نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو۔ ٹالی چلتی ہوئی سامنے آئی۔ وہ لڑکوں کو دیکھ رہی تھی، مگر ان میں سے کسی نے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔

''معتصم! کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟''

معتصم اپنے جوتوں کو دیکھتا رہا، اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

''حسین.....!'' وہ حسین کے قریب صوفے پہ بیٹھی، اس کا بیٹھنا گویا کسی کرنٹ کا جھٹکا تھا۔ حسین تیزی سے اٹھا۔ ساتھ ہی چاروں لڑکے اٹھے اور وہ سب اکٹھے باہر نکل گئے۔

ٹالی لب کاٹتے ہوئے انہیں جاتے دیکھتی رہی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ دن اس کی اور فلسطینیوں کی مثالی دوستی کا آخری دن تھا۔

ان کے نکلتے ہی دوسری طرف سے لطیف کمرے میں داخل ہوا۔ آہٹ پہ ٹالی اور ان دونوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ لطیف نے جینز پہ سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی، جس پہ کالے مارکر سے نمایاں کر کے لکھا تھا۔

''شیم آن یو اسرائیل!''

ٹالی نے وہ تحریر پڑھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ہالے زیر لب مسکرائی اور حیا کو دیکھا۔ وہ بھی جواباً مسکرائی۔

''ٹالی.....ٹرسٹ می، یہ صرف.....'' لطیف ہاتھ اٹھا کر بہت دھیمے انداز میں اب ٹالی کو سمجھا رہا تھا کہ اس کی یہ تحریر صرف اسرائیلی حکومت اور اسرائیلی فوج کے لیے تھی۔ اسے ٹالی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس سے ناراض تھا۔ ٹالی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے سمجھنے والے انداز میں سنتی رہی۔ لطیف کیتھولک تھا، ڈچ تھا۔ وہ یہ سب کہہ سکتا تھا، مگر فلسطینیوں کی بات اور تھی۔ جو انہوں نے کیا، ہالے اور حیا کو وہ بالکل درست لگا تھا۔

وہ ماتم کا دن تھا۔ گو کہ یونیورسٹی میں سارے کام معمول کے مطابق ہو رہے تھے، مگر در و دیوار پہ چھایا سوگ اور اذیت دل کو کاٹتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں، کس سے انصاف مانگیں۔

''ہٹلر کہتا تھا، میں چاہتا تو تمام یہودیوں کو مار دیتا، مگر میں نے بہت سوں کو چھوڑ دیا، تاکہ دنیا جان سکے کہ میں نے ان کے بھائی بندوں کو کیوں مارا تھا۔''

اور اس جیسی دوسری بہت سی ''کہاوتیں'' اسٹوڈنٹس اپنی اپنی شرٹس پہ لکھ کر پہنے گھوم رہے تھے۔ وہ اور ہالے بھی سارا دن سناٹے میں ڈوبی راہداریوں میں بے مقصد چلتی رہی تھیں۔

پاکستان میں اپنے لاؤنج میں بیٹھے ریموٹ پکڑے ٹی وی پہ فریڈم فلوٹیلا کی خبر دیکھنا اور افسوس کر کے چینل بدل دینا اور بات تھی، مگر ترکی میں رہ کر اس ساری اذیت و تکلیف کا حصہ بننا دوسری بات تھی۔

وہ اینکر پرسن طلعت حسین کا شو کبھی بھی نہیں دیکھتی تھی، مگر یہ بات کہ وہ بھی ان سیکڑوں لوگوں کے ساتھ قید تھے، بہت دل دکھانے والا تھا۔ وہ چھ جہاز تھے، تین کارگو اور تین مسافر بردار۔ یہ سب مختلف جگہوں سے آ کر مرمرا میں ایک مقام پہ اکٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے یہ پورا فلوٹیلا غزہ کی جانب گامزن ہوا تھا، تاکہ غزہ کے محصورین کو امداد پہنچا سکے۔ جب فلوٹیلا غزہ کے قریب پہنچا تو اسرائیلی فوج نے جہازوں پر حملہ کر دیا۔ کتنے ہی لوگ شہید کر دیے اور باقی سب قید۔

دوپہر میں وہ اور ہالے باہر سبانجی کے کیفے کے فوارے کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھی، چارٹس اور پلے کارڈز بنا رہی تھیں۔

انہوں نے سنا تھا کہ پورا استنبول سڑکوں پر نکل آیا ہے۔ (سبانجی شہر میں نہیں، بلکہ دور مضافات میں واقع تھی) سو ان کا ارادہ بھی

Downloaded From http://paksociety.com

آج جا کر اس احتجاج میں شامل ہونے کا تھا۔

مئی کے آخر کی دھوپ فوارے کے پانی سے ابل رہی تھی۔ وہ کہنیاں میز پہ ٹکائے سر جھکائے پوسٹر میں رنگ کر رہی تھی۔ اسکارف کے ایک پلو سے نقاست سے کیا گیا نقاب اس کے چہرے کا حصہ بن گیا تھا۔ صرف بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نظر آتیں جو پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہوگئی تھیں۔ انسان ایک ہی دریا میں دو مرتبہ نہیں اتر سکتا۔ وہ بھی اب وہ والی حیا سلیمان نہیں رہی تھی جو چار ماہ قبل ترکی آئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نامحسوس طریقے سے بدلتی جا رہی تھی۔

ایک ٹائپ کو اس کا ذہن صبح آئے پیغام کی جانب بھٹک گیا۔

''کون سا سرپرائز؟'' کیسا سرپرائز؟ خیر! عبدالرحمٰن کی ہر بات ہی سرپرائز ہوتی تھی۔ اب تو اس نے حیران ہونا بھی ترک کر دیا تھا۔

پلے کارڈز اور پوسٹرز لپیٹ کر جب وہ کامن روم میں آئی تو سینڈرا، چیری اور سارہ کتابیں گود میں رکھے ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ ہالے میز پہ رکھے اپنے بیگ میں کچھ چیزیں ڈال رہی تھیں اور فلسطینی لڑکے بھی افراتفری کے عالم میں آ جا رہے تھے۔ سب کو احتجاج کے لیے استنبول جانا تھا۔

''کیا تم لوگ آؤ گے سارہ؟'' اس نے ٹی وی میں مگن تینوں لڑکیوں کو مخاطب کیا۔

''نہیں.....'' سارہ نے اسکرین پہ نگاہیں جمائے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ چیری اور سینڈرا نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ وہ اسی طرح کھڑی ٹکر ٹکر ان کے چہرے دیکھے گئی۔

ہالے اور فلسطینیوں کے ساتھ سامان پیک کروانے اور احتجاجی شرٹس پہن کر اس کارواں میں شامل ہونے کے لیے بہت سے ترک اسٹوڈنٹس بھی آ گئے تھے۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو گرمی، سردی، ہر موسم میں منی اسکرٹس میں ملبوس ہوتی تھیں۔ وہ لڑکے جن کا دین، مذہب سے کوئی دور، دور کا واسطہ بھی نہ تھا، کانوں میں بالی اور قابل اعتراض تصاویر والی ٹی شرٹس اور جینز پہننے والے لڑکے اب سب ایک ہو گئے تھے۔ مگر وہ لڑکیاں چیری، سارہ، سینڈرا، نالی، وہ جن کے ساتھ حیا اور ڈی جے رات کو گھنٹوں باتیں کرتی تھیں، جو ساتھ کھاتی پیتی، سوتی جاگتی، ہنستی بولتی تھیں، اب وہی لڑکیاں اجنبی بنی بیٹھی تھیں۔

''یہ لوگ کیوں نہیں چل رہے؟'' سب واضح تھا، پھر بھی اس نے الجھن بھرے انداز میں ہالے سے دھیرے سے پوچھا۔ ہالے نے سارہ والی بے نیازی سے شانے اچکائے۔

''کیونکہ وہ مسلمان نہیں ہیں حیا!''

وہ بالکل چپ کھڑی رہ گئی۔ ان چار ماہ میں انہیں ترک، پاکستانی، فلسطینی، نارویجن، ڈچ، چائنیز، اسرائیل اور ایسی ہی درجنوں تفریقات میں بانٹا گیا تھا، مگر آج قومیت کے سارے فرق مٹ گئے تھے۔ یہودی، عیسائی، بدھسٹ، سب ایک طرف ہو گئے تھے اور مسلمان اسٹوڈنٹس ایک طرف۔

اور وہ بھی کن سرابوں کے پیچھے دوڑا کرتی تھی؟ اسے بھی کن لوگوں کا لباس، کن کا رہن سہن اچھا لگتا تھا؟

انجم باجی اور جاوید بھائی سمیت وہ سب جب ٹاقسم پہ پہنچے تو وہ پانچ منٹ کے لیے معذرت کر کے تیزی سے استقلال اسٹریٹ کی طرف چلی آئی۔ اسے جہان کو بھی اپنے ساتھ لینا تھا۔ جتنے زیادہ مسلمان ہوں، اتنا بہتر تھا۔ برگر کنگ پہ معمول کی گہما گہمی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ کی میزوں سے ہٹ کر اندر جانے والے دروازے میں داخل ہو گئی۔ کچن میں ایک ترک لڑکی اور ایک نیا لڑکا کام کر رہے تھے۔ دونوں شیف تھے۔

''سلام! جہان کہاں ہے؟'' اس نے اردگرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے لڑکے کو مخاطب کیا۔

''وہ ابھی تو یہیں تھا۔ گوشت کاٹ رہا تھا۔ اب شاید.....'' لڑکے نے مڑ کر ایک دوسرے دروازے کی طرف دیکھا۔ ''شاید ڈریسنگ روم میں ہو یا پھر باتھ روم میں۔''

اسی پل ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا۔ حیا نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا۔ جہان اندر داخل ہو رہا تھا، یوں کہ سر جھکائے وہ

Downloaded From http://paksociety.com

آنکھوں کو انگلیوں سے رگڑ رہا تھا۔

''جہان!'' اس نے پکارا تو جہان نے چونک کر گردن اٹھائی۔ اس کی آنکھیں بھیگی اور سرخ سی ہو رہی تھیں۔ وہ بمشکل مسکرایا اور سلیب کی طرف آیا۔

''السلام علیکم! تم کب آئیں؟'' وہ اس سے نظر ملائے بغیر گردن جھکا کر ٹرے سے گوشت کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔

''ابھی..... تم..... تم ٹھیک ہو؟'' وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''ہاں! بس پیاز کاٹنے سے آنکھوں میں تھوڑی جلن ہو رہی تھی، تو ابھی منہ دھونے گیا تھا۔'' اتنی لمبی وضاحت؟ وہ بھی جہان دے؟ اور پیاز..... اس نے اردگرد دیکھا، پیاز تو کہیں نہیں تھی۔

''تم بتاؤ! کیسے آئیں؟''

''وہ..... ہم اسٹریٹ پروٹیسٹ کے لیے جا رہے ہیں، فریڈم فلوٹیلا پہ حملے کے خلاف۔ تم چلو گے؟''

''پروٹیسٹ کیوں؟ ان بحری جہازوں میں اسلحہ نہیں تھا؟''

''اسلحہ؟ نہیں جہان! ان میں دوا اور خوراک تھی۔'' اس نے اچنبھے سے جہان کو دیکھا۔ کیا وہ اتنا بے خبر تھا؟

''یہ تو تم کہہ رہی ہو..... اسلحہ نہ ہوتا تو اسرائیلی کیوں روکتے اسے؟'' وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے گوشت کے قتلے کھٹا کھٹ کاٹ رہا تھا۔

''جہان! کیا تمہیں لگتا ہے کہ ان کو کسی وجہ کی ضرورت ہے؟''

''یہ ان کی آپس کی جنگ ہے حیا! یہ فلسطینی بھی اتنے سیدھے نہیں ہوتے۔ یہ جہاد وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ سب دہشت گردی کی قسمیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ فلوٹیلا کو واقعی ناجائز روکا گیا ہو، مگر ہمیں فلسطینیوں سے زیادہ فلسطینی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔''

''جہان! یہ کیسے ہمارا مسئلہ نہیں ہے، ہمارے ریجن کو ہماری ضرورت ہے۔''

''ہمارا ریجن ہمارے پیدا ہونے سے پہلے بھی تھا اور ہمارے مرنے کے بعد بھی رہے گا۔ اسے ہماری قطعاً ضرورت نہیں ہے اور پلیز! تم اس محمد بن قاسم ایرا کے رومانس سے نکل آؤ۔''

وہ بہت بے زاری سے گردن جھکائے کام کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

یہ کیسا جہاد ہے کہ بوڑھے ماں، باپ کو چھوڑ کر بندوق اٹھائے نکل پڑو۔ جہاد تو وہ ہوتا ہے جو ایک آدمی اپنے گھر والوں کے لیے مشقت کر کے روزی کماتا ہے، جو میں کرتا ہوں، جو اس ریسٹورنٹ میں میرے ورکرز کرتے ہیں۔''

''جہنم میں گیا تمہارا ریسٹورنٹ..... بہرحال میں تم سے متفق نہیں ہوں..... اور اگر تم غلط ہو کر اتنے پراعتماد ہو سکتے ہو تو میں صحیح ہو کر پراعتماد کیوں نہ ہوؤں؟'' وہ تلخی سے کہہ کر پلٹ گئی۔

جہان نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا، پھر سر جھٹک کر کام کرنے لگا۔

مسلمان اسٹوڈنٹس کا دوسرے ترک باسیوں کے ساتھ اسٹریٹ پروٹیسٹ جاری تھا۔ پلے کارڈز اور بینرز اٹھائے وہ نعرے بلند کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک شخص زور سے پکارتا تھا ''ڈاؤن ود؟'' تو باقی لوگ ہم آواز ہو کر ''اسرائیل'' چلاتے۔ ہر طرف "Down with Israel" کے نعروں کی گونج تھی۔ پاکستان میں ایسے مظاہروں میں عموماً مردوں، عورتوں کے درمیان تفریق سی ہوتی تھی، مگر ترکی میں دونوں صنف اکٹھے ہی ریلی میں چل رہے تھے۔ یوں بہت بچ بچ کر چلنا پڑتا، لیکن اس کا ذہن ابھی تک جہان میں اٹکا تھا۔

ہر ایک کے سیاسی تجزیات الگ ہوتے ہیں سب کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے، پھر اسے کیوں بار بار رونا..... آ رہا تھا اور وہ کیوں بار بار اپنے آنسو بمشکل روک رہی ہے؟

وہ اسرائیلی ایمبیسی کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے۔ معتصم کا وعدہ پورا نہ ہو سکا، مگر ان کا احتجاج شان دار رہا۔ اگلے روز اس کا پیپر تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ بے دلی سے تھوڑا بہت پڑھ کر جلدی سوگئی اور پھر صبح منہ اندھیرے اٹھ کر کتابیں لیے جھیل پہ آ گئی۔

ہر سو نیلا سا اندھیرا چھایا تھا۔ جون شروع ہو چکا تھا۔ مگر اس وقت بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گرمی صرف دن میں ہوا کرتی تھی۔ وہ پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ گئی اور گھٹنوں پہ کتاب رکھ لی۔ ہوا کے باعث شال سر سے پھسل کر گردن کی پشت پہ جا ٹھہری۔ دور، دور تک کوئی نہ تھا، وہ وہاں اکیلی تھی۔

رونا تو اسے رات سے ہی آ رہا تھا، مگر اب اس میں شدت آ گئی تھی۔ وہ سر جھکائے بے آواز آنسو بہاتی رہی۔ گھر، ابا، اماں، رومیل سب بہت یاد آ رہے تھے۔

دفعتاً اس کا فون بجا۔ اس نے کھاس پہ رکھا موبائل اٹھایا۔

''جہان کالنگ'' اس وقت؟ خیریت! وہ حیران ہوئی۔

''جہان! کیا ہوا؟'' وہ رکا رکا سا زدہ آواز میں ذرا پریشانی سے بولی۔

''تم جاگ رہی ہو؟ آج تمہارا پیپر ہے نا۔''

''ہاں! میں جھیل پہ ہوں، تم کہاں ہو؟''

''ایک کام سے قریب میں آیا تھا، بس تم رکو! میں آ رہا ہوں۔''

حیا نے موبائل بند کیا اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑے۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اتنا غیر متوقع رویے رکھنے والا شخص نہیں دیکھا تھا۔

''ہیلو!'' چند ہی منٹ بعد وہ اس کے ساتھ آ بیٹھا تھا۔ اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ جینز اور چاکلیٹ کلر ٹی شرٹ میں وہ بہت تر و تازہ لگ رہا تھا۔

''تم اتنی صبح کیسے؟''

''یہاں مجھے قریب میں پہنچنا تھا، سات بجے تک۔ سوچا جلدی آ جاؤں تاکہ پہلے تم سے مل لوں۔ مجھے لگا، تم کل ذرا ناراض ہو گئی تھیں۔'' وہ اسی کے انداز میں اکڑوں بیٹھا اب جھیل کے پانی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی پانی کو ہی دیکھ رہی تھی۔

''نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

''حیا! ایک بات کہوں؟ کبھی بھی اپنے قرابت داروں سے ان کی پولیٹیکل ویوز کے باعث ناراض نہیں ہوتے۔'' وہ بہت نرمی سے دھیمے انداز میں سمجھا رہا تھا۔ وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔

''ہر شخص کے رویے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ جب تک آپ کسی دوسرے کی جگہ پہ کھڑے ہو کر نہیں دیکھتے، آپ کی سمجھ میں پوری بات نہیں آ سکتی۔ ہر کہانی کی ایک دوسری سائیڈ ضرور ہوتی ہے۔'' اس نے چہرہ موڑ کر حیا کو دیکھا۔ ''اب بتاؤ کیوں رو رہی تھیں؟''

''یوں ہی۔'' وہ فوراً نگاہ چرا کر پانی کو دیکھنے لگی۔ ''بس گھر یاد آ رہا تھا۔''

''صبر کر لو، انسان کو ہمیشہ اتنی ہی تکلیف ملتی ہے جتنی وہ سہ سکے۔''

''اور اگر وہ نہ سہنا چاہے؟ آخر کیوں انسان کو سہنا پڑتا ہے سب کچھ؟ زندگی آسان کیوں نہیں ہوتی جہان؟'' اس کی آنکھیں پھر سے بھیگ گئیں۔ وہ ابھی تک پانی کو دیکھ رہی تھی جو چمک رہا تھا۔ جیسے نیلے آسمان پہ چاندی کے تھال کی طرح کے چاند سے قطرہ قطرہ چاندی پگھل کر جھیل کی سطح پہ گر رہی تھی۔

''ابھی تمہاری اسٹوڈنٹ لائف ہے، اسے جتنا انجوائے کر سکتی ہو، کرو۔ کیونکہ اس کے بعد زندگی اپنا نقاب اتار پھینکتی ہے اور چیزیں بہت مشکل ہو جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی تمہاری زندگی مشکل ہو جائے گی۔ تم کرو گی مجھ سے شادی؟''

لمحے بھر کو چاندی کی تہہ جھیل کی سطح سے پھیل کر سارے سبزہ زار پہ چڑھتی گئی۔ وہ ہر شے کو چاندی بنا گئی اور وہ دونوں بھی چاندی

Downloaded From http://paksociety.com

کے مجسمے بنے رہ گئے، چمکتے ہوئے سلور مجسمے۔

''ہماری شادی ہو نہیں چکی؟''

''وہ تو ہمارے بڑوں نے کی تھی۔ اب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ تم مجھے جانتی ہو۔ میں کوئی ہر وقت ہنستا مسکراتا آدمی نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں، میں بعض دفعہ بہت سخت ہو جاتا ہوں اور تب تمہیں میں بہت برا لگتا ہوں۔ مجھے پتا ہے، مگر میں ایسا ہی ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ ساری زندگی رہ لوگی؟'' وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ حیا نے دھیرے سے شانے اچکائے۔

''استنبول میں ہر حالات میں رہنے کے لیے تیار ہوں میں۔''

''اللہ نہ کرے، جو ہم یہاں رہیں۔'' وہ ایک بالکل غیر ارادی طور پہ چونک کر بولا۔ چاندی کے دوسرے مجسمے نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیوں؟''

''یوں ہی کہہ رہا تھا۔'' پہلے مجسمے نے گردن موڑ لی۔

''تمہیں پھپھو نے کب بتایا کہ ہم.....؟'' وہ بات ادھوری چھوڑ گئی۔

''وہ کیوں بتاتیں؟ میں اس وقت آٹھ سال کا تھا اور آٹھ سال کے بچے کا حافظہ اچھا خاصا ہوتا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے پتا تھا۔''

''میں سمجھی تھی کہ تمہیں نہیں پتا۔'' بے اختیار اس نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ زبان بھی چاندی بن چکی تھی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے، میں ہر کسی سے معذرت کرنے آجاتا ہوں یا..... ہر لڑکی کو ڈنر کے لیے لے جاتا ہوں؟'' وہ ذرا خفگی سے اس معذرت کا حوالہ دینے لگا، جب اس نے اس کا جنجر بریڈ ہاؤس توڑا تھا۔

''تم میری بیوی ہو اور میرے لیے بہت خاص ہو۔ بس میرے کچھ مسئلے ہیں۔ وہ ٹھیک ہو جائیں تو ہم اپنی زندگی شروع کریں گے۔''

چاندی کی تہ اب سبزہ کے دہانوں سے پھیلتی ڈورم بلاکس پہ چھاتی جا رہی تھی۔ پوری دنیا، زمین، آسمان، سب چاندی بنتا جا رہا تھا۔

''حیا! ہمارے بہت مسئلے رہے ہیں، مگر میری ماں..... ہم انہیں ٹھیک کر لیں گے۔'' وہ زخمی انداز سے مسکرایا۔ ''ہم ہمیشہ سے ساتھ مل کر اپنے مسئلے ٹھیک کرتے آئے ہیں۔ ہم نے بہت اذیتیں کاٹی ہیں۔ بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ مگر میری ماں بہت مضبوط عورت ہے، بہت نڈر، بہت بہادر۔ انہوں نے ساری زندگی بوتیکس کے لیے کپڑے سی کر مجھے کسی قابل بنایا ہے وہ اب بھی یہ کام کرتی ہیں، مگر انہوں نے تمہیں نہیں بتایا ہوگا۔ وہ اپنے مسئلے کسی سے بیان نہیں کرتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اتنی ہی مضبوط اور بہادر بن جاؤ۔'' وجیہہ مجسمہ اٹھ کھڑا ہوا تو چاندی کا خول چٹخا۔ سبزہ زار پہ چڑھے ورق میں دراڑیں پڑ گئیں۔

''میں چاہتا ہوں، تم اچھا سا ایگزام دو اور اگر لندن چلنے کا موڈ ہو تو بتانا۔'' ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا، وہ جانے کے لیے مڑ گیا۔

وہ بھیگی آنکھوں اور نیم مسکان کے ساتھ اسے جاتے دیکھتی رہی۔

چاندی کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر جھیل کے پانی میں گم ہو رہے تھے۔ چاند اب سرخ نارنجی روشنی کے نقطوں میں ڈر کر بالوں کی اوٹ میں تیرنے لگا تھا۔ فسوں ختم ہو چکا تھا، حقیقی دن کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

چھ جون کو جب تک اسرائیل نے سارے قیدی رہا کر دیے تب تک سبانجی اور استنبول میں غم و غصے کی فضا چھائی رہی۔ قیدیوں کی رہائی کے لیے مظاہرے، طیب اردگان کے سخت بیانات اور فلسطینی اسٹوڈنٹس کا تناؤ اور بھی بہت کچھ ہوا جو ہماری کہانی کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ بہر حال، ماوی مرمرا اور فریڈم فلوٹیلا کی پریشانی ختم ہوئی تو سب ایگزامز کی طرف متوجہ ہو گئے۔

وہ امتحان بھی اسی لمبے اسکرٹ، فل سلیو بلاؤز اور اسکارف سے کیے گئے نقاب میں دیتی گئی اور اب اسے اپنے چہرے کی عادت ہوتی جا رہی تھی۔ کندھے پہ بیگ لٹکائے اور سینے سے فائل لگا کر بازو لپیٹے وہ سر اٹھا کر بہت اعتماد سے جب سبانجی کی راہداری میں چلتی تو اسے ٹالی اور اس کی دوستوں کی آوازوں کی پروا نہ ہوتی۔

Downloaded From http://paksociety.com

ٹالی ابھی بھی اسے استہزائیہ انداز میں Arap baci کہتی تھی۔ (عرب باجی، یہ اردو والا باجی ہی تھا کہ ترکوں کا "C" جیم کی آواز سے پڑھا جاتا تھا۔) البتہ ٹالی اور فلسطینی لڑکوں کے درمیان فریڈم فلوٹیلا کی کھینچی گئی لکیر ہنوز قائم تھی گو کہ ڈی جے اپنی دلی خواہش کی تکمیل دیکھنے کے لیے زندہ نہیں تھی۔

نو جون کو امتحان ختم ہوئے تو الوداعی دعوتوں کا آغاز ہوگیا۔ پچاس ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس میں سے کچھ آخری مہینے میں دوسرے ممالک جارہے تھے، جبکہ کچھ ترکی میں ہی رہ رہے تھے۔ وہ عائشے کے پاس بیوک اداجانا چاہتی تھی، مگر وہاں عبدالرحمٰن تھا اور ابھی کافی تو اسے یاد ہوگی۔ وہ بدلہ بھی لے گا، مگر اسے پروا نہیں تھی۔ بس چند دن ہیں، پھر وہ پاکستان چلی جائے گی تو نہ وہاں عبدالرحمٰن ہوگا، نہ آواز سے گھبرانے والی ٹالی۔ وہاں اس کے حجاب کی عزت ہوگی۔ پہلی دفعہ اسے تایا فرقان کے نظریات برے نہیں لگے تھے۔ وہ ٹھیک ہی ارم پہ روک ٹوک کرتے تھے۔ ابا اور تایا کتنے خوش ہوں گے اس کے حجاب پہ۔ مگر نہیں اسے ان کی خوشی سے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ کسی کی ستائش کے لیے تو یہ سب نہیں کررہی۔

''ستائش کے لیے اگر کوئی حجاب لے تو جلد ہی چھوڑ دے، کیونکہ یہ وہ کام ہے، جس میں رہا ہو ہی نہیں سکتی۔'' عائشے نے اس کی بات پہ ہنس کر کہا تھا۔ وہ اتنے دنوں بعد آج بیوک اداآئی تھی اور اب وہ تینوں ساحل کے کنارے ایک اوپن ایر کیفے میں بیٹھی تھیں۔

اس سے قبل وہ ان دونوں بہنوں کے ساتھ حلیمہ آنٹی کی طرف بھی ہوآئی تھی۔ آنٹی، عثمان انکل اور سفیر کے ساتھ کہیں نکل رہی تھیں۔ بس دروازے پہ ہی کھڑے کھڑے سلام دعا ہوسکی۔ عثمان انکل ویسے ہی تھے، بھاری بھرکم اور خوش مزاج۔ ڈی جے کا افسوس کرنے لگے تو عادتاً بولتے ہی چلے گئے اور بہارے گل برے برے منہ بنا کر سنتے گئی۔ ایک وہی تھی جو اپنے تاثرات نہیں چھپایا کرتی تھی سفیر سے البتہ بہارے اور عائشے دونوں بور نہیں ہوتی تھیں۔ وہ اکثر اس کا ذکر کرتی تھیں اور اب حیا کی سفیر سے سرسری سی ملاقات بھی ہوگئی تھی۔ وہ تئیس، چوبیس برس کا خوش مزاج سا لڑکا تھا جیسا کہ یورپ میں مقیم پاکستانی لڑکے ہوتے ہیں۔

اس کی شادی اس کے والدین پاکستان میں زبردستی کرنے کے خواہاں تھے اور یہ قصہ بہارے اتنی دفعہ دہرا چکی تھی کہ وہ حیا کے لیے اہمیت کھو چکا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا ہوٹل گرینڈ میں کام کرتے تھے اور اس دس منٹ کی ملاقات میں بھی چند ایک بار سفیر کے لبوں سے ''عبدالرحمٰن بھائی'' ضرور نکلا تھا۔ وہی ستائش، فخر سے نام لینے کا انداز جو ان دونوں بہنوں کا بھی خاصہ تھا۔ پتا نہیں، ان سب کو عبدالرحمٰن میں کیا نظر آتا تھا۔

جانے سے قبل اس نے ایک دفعہ سوچا کہ عثمان شبیر سے پوچھ لے کہ جہاز میں انہوں نے اگلی نشست پہ بیٹھی ترک عورت کو کیا کہا تھا کہ وہ خفگی سے واپس مڑ گئی تھی، مگر پھر اس نے جانے دیا۔ بعض باتیں ادھوری ہی رہیں تو بہتر ہوتا ہے۔

''اور ریاکاری کی ایک پہچان ہوتی ہے حیا!'' عائشے کہہ رہی تھی۔ ''بعض دفعہ بندے کو خود بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ دکھاوا کررہا ہے، مگر ایسے کام کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اللہ اس پہ کبھی ثابت قدمی عطا نہیں کرتا۔'' ساحل کے کنارے پر سیاحوں کا خاصا رش تھا۔ بیوک ادا، استنبول والوں کا ''مری'' تھا۔ موسم گرما شروع ہوتے ہی سیاحوں کا رش لگ جاتا تھا۔

بھورے، سرمئی پروں والے سمندری بگلے بھی ساحل کی پٹی کے ساتھ ساتھ اڑ رہے تھے۔

بہارے کے ہاتھ میں روٹی تھی اور وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بگلوں کی طرف اچھال رہی تھی۔ ایک ٹکڑا بھی زمین پہ نہ گرتا، بگلے فضا میں ہی اسے چونچ میں دبا لیتے۔

''ثابت قدمی واقعی مشکل ہوتی ہے عائشے! میری ساتھی اسٹوڈنٹس اکثر مجھ پہ آوازیں کس کر پوچھتی ہیں کہ میں نے اس بڑے سے اسکارف کے اندر کیا چھپا رکھا ہے؟''

''تم آگے سے کہا کرو، خودکش بم چھپا رکھا ہے۔'' بہارے نے اس کی طرف گردن جھکا کر رازداری سے کہا تھا، مگر اس کی بہن نے سن لیا۔

''بری بات، بہارے!'' عائشے نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ''جب اچھی لڑکیاں کوئی فضول بات سنتی ہیں تو اسے بہت باوقار طریقے

Downloaded From http://paksociety.com

سے نظر انداز کر دیتی ہیں۔'' بہارے نے اتنی ہی خفگی سے سر جھٹکا اور روٹی کے ٹکڑے توڑنے لگی۔

''خیر ہے بہارے! بس جولائی میں، میں واپس چلی جاؤں گی اور وہاں نہ ترک حکومت کی سختی ہوگی، نہ اسرائیلی طعنے، میں ادھر پوری آزادی کے ساتھ حجاب لے سکوں گی۔''

''ضرور، مگر خندق کی جنگ میں ایک بنو قریظہ مل ہی جاتا ہے حیا!''

''مطلب؟'' اس نے نا سمجھی سے ابرو اٹھائی۔ جواباً عائشے اپنے خاص انداز میں مسکرائی، جیسے اس کے پاس دکھانے کے لیے کوئی خاص جواہر ہو۔

''تم نے کبھی سوچا ہے حیا کہ آیت حجاب سورہ احزاب میں ہی کیوں آئی ہے؟'' اس نے جواب دینے کے بجائے ایک نیا سوال کیا۔

اس نے ذہن پر زور دیا، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''شاید اس لیے کہ یہ حکم غزوہ احزاب کے قریب ہی اترا تھا۔''

''یہ تو سب کو نظر آتا ہے حیا!'' میں تمہیں وہ سمجھاؤں جو سب کو نظر نہیں آتا؟ یقین کرو، یہ گتھی تمہارے پزل باکس کی پہیلیوں سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوگی۔''

حیا لاشعوری طور پر کرسی پہ ذرا آگے ہوئی۔ بہارے برے برے منہ بناتی روٹی کے ٹکڑے اچھال رہی تھی۔ وہ بول نہیں سکتی تھی کہ عائشے سن لیتی اور سب کے سامنے وہ ہمیشہ عائشے کی وفادار رہتی تھی، لیکن اس نے ایک قدیم لوک کہانی میں پڑھا تھا کہ مرمرا کے بگلے ان کہی باتیں بھی سن لیتے ہیں، سو اس نے دل ہی دل میں ان پھڑ پھڑاتے بگلوں کو مخاطب کیا تھا۔

(عبدالرحمٰن ٹھیک کہتا ہے، میری بہن کو لیکچر دینے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ کیا تم نے سنا، میں نے کیا کہا؟)

''اللہ چاہتا تو کسی اور سورہ میں یہ حکم نازل کر دیتا، یا اس سورہ احزاب کا نام کچھ اور رکھ دیتا، مگر یہی نام کیوں؟''

ایک چھوٹے بگلے نے فضا میں ہی بہارے کا پھینکا ٹکڑا اچکا اور پر پھڑ پھڑاتے ہوئے اڑ گیا۔ بہارے نے گردن اٹھا کر اسے اوپر اڑتے دیکھا۔ کیا اس نے سنا تھا جو وہ اس سے کہہ رہی تھی؟

''تمہیں پتا ہے، احزاب کہتے ہیں گروہوں کو اور ''غزوہ احزاب'' دراصل غزوہ خندق کا دوسرا نام ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم یہ سارا واقعہ جانتی ہو کہ کس طرح مسلمانوں نے خندق کھودی، مگر پھر بھی میں تمہیں یہ دوبارہ سنانا چاہتی ہوں۔''

(میری بہن حیا کو بور کر رہی ہے، اگر عبدالرحمٰن ادھر ہوتا تو یہی کہتا، کیا تم نے اب سنا؟) مگر بگلے بس روٹی چونچوں میں دبا کر اڑ جاتے۔

''تمہیں پتا ہے مدینہ میں یہود کے ساتھ مومنین کا معاہدہ تھا کہ مدینہ پر حملہ ہوا تو مل کر دفاع کریں گے، مگر یہود تو پھر یہود ہوتے ہیں۔ بنو قریظہ، یہود کے گروہ نے اہل مکہ سمیت کئی گروہوں کو جا جا کر اکسایا کہ مدینہ پہ حملہ کر دیں، وہ ان کے ساتھ ہیں۔ یوں جب سارے گروہوں نے لشکر کی صورت مدینہ کے باہر پڑاؤ ڈال دیا تو بنو قریظہ، آپ کا اعتماد توڑ کر ''گروہوں'' کے ساتھ جا ملا۔'' عائشے سانس لینے کو رکی۔ بہارے بگلوں کو بھول کر، روٹی توڑنا چھوڑ کر عائشے کو دیکھ رہی تھی۔

''تب مسلمانوں نے اپنے دشمن کے ''گروہوں'' کے درمیان ایک بہت لمبی، بہت گہری خندق کھودی تھی۔ سردی اور بھوک کی تکلیف واحد تکلیف نہیں تھی۔ اصل اذیت کسی حلیف کے دھوکا دینے کی ہوتی ہے۔ باہر والے تو دشمن ہوتے ہیں، مگر جب کوئی اپنا بیچ جنگ میں چھوڑ کر چلا جائے، وہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی لیے جب یہ ''گروہ'' محاصرے سے تنگ آ کر ایک عرصے بعد واپس چلے گئے اور بنو قریظہ خوف کے مارے اپنے قلعوں میں چھپ گئے، تو ان کو سزا یہ ملی کہ بنو قریظہ کے ایک ایک مرد کو چن چن کر مارا گیا کہ یہ اللہ کا حکم تھا۔ جانتی ہو، میں نے تمہیں اتنی لمبی کہانی کیوں سنائی؟''

''کیوں؟'' حیا کے بجائے، بہارے کے لبوں سے پھسلا۔ وہ اب ساری خفگی بھلائے عائشے کی طرف پوری گھومی بیٹھی تھی۔

''کیونکہ حجاب پہننا، جنگ خندق کو دعوت دینا ہے۔ گروہوں کی جنگ میں حجابی لڑکی کو دل پہ پتھر باندھ کر اپنے گرد خندق کھودنی پڑتی ہے، اتنی گہری کہ کوئی پاٹنے کی جرات نہ کر سکے۔ اور پھر اسے اس خندق کے پار محصور رہنا پڑتا ہے۔ اس جنگ میں اصل دشمن اہل مکہ نہیں

Downloaded From http://paksociety.com

ہوتے، بلکہ اصل تکلیف بنو قریظہ سے ملتی ہے۔ یہ جنگ ہوتی ہی بنو قریظہ سے ہے اور خندق کی جنگ کبھی بھی بنو قریظہ کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔"

عائشے خاموش ہوئی تو کوئی سر ساٹوٹا۔ حیا نے سمجھ کر سر ہلایا۔ قرآن کی پہیلی زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو، مگر شکر ہے میری فیملی حجاب کی بہت بڑی حامی ہے۔ میرا ان سے ساری زندگی نقطۂ اختلاف ہی یہ رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے تمہاری اس جنگ میں کوئی بنو قریظہ نہ ہو۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" عائشے نے مسکرا کر دعا دی تھی۔

"مگر عائشے.....!" بہارے کچھ کہتے کہتے الجھ کر رک گئی، ان دونوں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ قدرے مبہم سے تاثرات کے ساتھ کچھ سوچ رہی تھی۔

"کیا ہوا بہارے؟"

"کچھ نہیں۔" بہارے سنبھل کر مسکرائی۔ اسے حیا کے سامنے عائشے کا ہمیشہ وفادار رہنا تھا، لیکن بعد میں تنہائی میں وہ اسے بتائے گی کہ اس نے ابھی پوری پہیلی حل نہیں کی، وہ احزاب کی پزل میں کچھ مس کر گئی تھی۔ وہ اصل نتیجہ نہیں جان سکی تھی اور وہ تو کتنے سامنے کی بات تھی۔ بہارے نے ذرا سا غور کیا تو اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں وہ بات بگلوں سے دہرائی۔

(کیا تم نے اب سنا؟ کیا تم نے سنا؟)

قریب ہی ساحل پہ پھدکتے بگلے نے ریت میں کچھ ڈھونڈنے کے لیے گردن جھکائی تھی۔ کیا یہ اثبات کا اشارہ تھا؟ بہارے کل سمجھ نہیں سکی۔

☆ ☆ ☆

امتحانات کا موسم ختم ہوا تو الوداعی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسٹوڈنٹس نے اب آخری مہینے کی سیاحت کے لیے روانہ ہونا تھا، سو بانجی میں ایک دفعہ پھر سے وہی ماحول چھا گیا جو اسپرنگ بریک سے پہلے چھایا تھا۔ روانگی کی تیاریاں، پیکنگ، آخری شاپنگز، نقشے، گائیڈ بکس، صرف وہی تھی جس نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

اس رات ان کے ڈورم میں پوٹ لک Potluck ڈنر تھا۔ سب ایکسچینج اسٹوڈنٹس اپنے ممالک کی ڈشز تیار کر کے لا رہے تھے۔ دیسی کھانوں میں بریانی کے علاوہ اسے صرف چکن کڑاہی بنانی آتی تھی، سو انجم باجی کے اپارٹمنٹ پہ ان کے ساتھ مل کر اس نے وہی بنائی۔ نمک مرچ البتہ ذرا تیز ہو گیا تھا۔

"چلو خیر ہے، کم بنی ہے تو کم ہی کھائیں گے سب۔" انجم باجی نے اسے تسلی دی۔ ابھی وہ دونوں ان کے کمرے میں بڑے آئینے کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھیں۔ حیا اپنا سیاہ اسکارف ٹھوڑی تلے پن اپ کر رہی تھی، جبکہ انجم باجی آئی شیڈ لگا رہی تھیں۔ انہوں نے سلک کا نارمل سا جوڑا پہن رکھا تھا۔ جوڑا اچھا تھا، مگر قمیص کافی چھوٹی اور شلوار کھلی تھی یا تو انجم باجی ذرا آؤٹ ڈیٹڈ تھیں یا انڈیا میں ابھی تک پٹیالہ شلوار اور چھوٹی قمیص کا فیشن چل رہا تھا (پاکستان سے تو وہ عرصہ ہوا غائب ہو چکا تھا) اس نے سوچا مگر کہا نہیں۔

"تم آج تو نقاب مت کرو، آج تو پارٹی ہے۔" اسے نقاب اڑستے دیکھ کر انجم باجی ذرا بے چینی سے بولی تھیں۔ وہ ذرا چونکی، پھر دھیرے سے مسکرائی۔

"پارٹی تو ہے انجو باجی! مگر لوگ تو وہی ہیں جن سے سارا دن نقاب کرتی ہوں۔ اب اتارا تو کتنا برا لگے گا۔"

اس نے بے حد رسان سے سمجھایا۔ تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔"

"اپنے دیسی لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں نا، حجاب پہ آپ کو ویسے اذیت نہیں دیتے جیسے ٹالی جیسے لوگ دیتے ہیں۔"

شکر ہے انجم باجی نے دوبارہ اعتراض نہیں کیا۔ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ وہ بھی تو ان کے پرانے فیشن پہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے پیشانی سے اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے سوچا تھا۔

آج اس نے سیاہ سلک بلاوز اور اسکرٹ کے ساتھ سیاہ اسکارف لیا تھا۔ پورا لباس سیاہ تھا، بس آستین پہ کلائیوں کے گرد سفید

Downloaded From http://paksociety.com

موتیوں کی دھری لڑی لگی تھی۔ جو مدھم سی چمکتی تھی۔

ڈورم بلاک کے کامن روم میں روشنیوں کا سا سماں تھا۔ کرسیوں کے پھول ویسے ہی بنے تھے جیسے حسین کی سالگرہ کے دن بنائے گئے تھے۔ (آہ، اس کا جنجر بریڈ ہاؤس اور ڈی جے!) یورپین لڑکیاں بہت دل سے تیار ہوئی تھیں۔ شولڈر لیس ملبوسات جو گھٹنوں پر سے اوپر آتے تھے۔ جیسے وہ کوئی ہروم نائٹ ہو۔ ایسے میں وہ سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں خاموش سی بیٹھی تھی۔ فلسطینی لڑکے اور ہالے، اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے سو نہیں آ سکے تھے۔ وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ دل میں عجیب سی ویرانی چھائی تھی، جیسے وہ کسی غلط جگہ پہ آ گئی ہو۔

اگر وہ پہلے والی حیا ہوتی تو ایسے تیار ہوتی کہ کوئی اسے نظر انداز نہ کر پاتا۔ وہ موقع کی مناسبت سے ساڑھی، اونچا جوڑا اور ہائی ہیلز پہنتی اور۔ اس نے سر جھٹکا زمانہ جاہلیت کی کشش ثقل آخر مرتی کیوں نہیں ہے؟ وہ کیوں بار بار کھینچتی رہتی ہے؟ حالانکہ وہ قطعاً واپس اس دور میں نہیں لوٹنا چاہتی تھی، وہ تو اس پہاڑی پہ قدم بہ قدم اوپر چڑھنا چاہتی تھی، پھر اب وہ نیچے کیوں دیکھ رہی تھی؟ نیچے تو کھائی تھی۔

کھانا شروع ہو چکا تھا۔ اسٹوڈنٹس ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے پلیٹیں لیے ادھر ادھر گھوم رہے تھے ٹالی اپنی ڈش اٹھائے لے آئی تھی۔ پتا نہیں گوشت اور گاجر کا کیا ملغوبہ تھا جس کا وہ ایک بہت مشکل سا عبرانی نام لے رہی تھی۔ اس نے بہت خوش دلی سے حیا کے آگے ڈش کی تو حیا نے شکریہ کہتے ذرا سا پلیٹ میں ڈالا۔ ٹالی مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ حیا نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے کانٹے میں گوشت کا ٹکڑا پھنسایا، پھر ایک دم ٹھہر گئی۔

وہ تو نقاب میں بیٹھی تھی۔ نقاب کے ساتھ وہ کیسے کھا سکتی تھی، اسے کیوں بھول گیا کہ وہ نقاب کے ساتھ نہیں کھا سکتی؟

اس نے بے بسی سے اردگرد دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا مگر وہاں بہت سے لڑکے تھے۔ وہ نقاب نہیں اتار سکتی تھی، کم از کم ٹالی کے اس ملغوبے کے لیے تو نہیں۔

اس نے بے دلی سے کانٹا پلیٹ میں گرا دیا۔ دل کی ویرانی بڑھ گئی تھی۔ اتنے سارے ایک جیسے لوگوں میں ایک ہی مختلف سی لڑکی پتا نہیں کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ ان سب میں بالکل مس فٹ تھی۔ اجنبی، ایلین کسی اور دنیا سے تعلق رکھنے والی۔ یہ اس کی دنیا نہیں تھی۔ آگے پاکستان میں بھی تو دعوتیں اور تقریبات ہوں گی۔ وہ تو ادھر بھی مس فٹ لگے گی۔ یوں اس لبادے میں خود کو لپیٹے، الگ تھلگ، خاموش سی، لوگ تو اسے پاگل کہیں گے۔ اسے اجنبی کہیں گے۔ اسے لوگوں کی باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا، مگر خود اس کو سارا منظر بہت اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ وہ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں "اوڈ ون آؤٹ" وہ وہی بن چکی تھی۔

گھٹن بڑھ گئی تھی۔ اسے لگا اگر وہ کچھ دیر مزید بیٹھی تو رو دے گی۔ اسے یہاں سے کہیں بہت دور چلے جانا چاہیے، کسی جنگل میں، جہاں وہ اجنبی نہ ہو۔ وہ تیزی سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ راستے میں ٹالی، دو لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی، اسے آتے دیکھ کر وہ شرارت سے مسکرائی۔

"حیا! تم نے اپنے اسکارف میں کیا چھپا رکھا ہے؟"

ڈورناب گھماتے ہوئے حیا نے پلٹ کر دیکھا اور سنجیدگی سے بولی۔

"خودکش بم! کیا دکھاؤں؟" اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

ٹالی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ اس کے سنبھلنے کا انتظار کیے بغیر باہر نکل آئی۔

اپنے ڈورم میں آ کر اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور پھر دروازے سے کمر ٹکائے آنکھیں بند کیے، تیز تیز سانس لینے لگی۔ چند ثانیے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ کمرہ خالی تھا۔ چاروں ڈبل اسٹوری ہینکس نفاست سے بنے پڑے تھے۔

وہ اسی طرح دروازے سے لگی زمین پہ بیٹھتی گئی۔ اسکارف کی پن نوچ کر اتاری اور اسے اپنی میز کی طرف اچھالا۔ وہ کرسی پہ جا گرا، ایک پلو لٹکتا ہوا زمین کو چھونے لگا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے نہیں اٹھی۔ بس نم آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔

وہ تو کبھی محفلوں کی جان ہوتی تھی۔ اتنی سحر انگیز کہ اسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اب؟ اب وہ کیسے ایک دم سے اجنبی بن

Downloaded From http://paksociety.com

گئی تھی؟

بپ کی آواز کے ساتھ پاکٹ میں رکھا فون بجا۔ اس نے فون نکال کر ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ میجر احمد کا میسج آیا تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' بس تین الفاظ۔ شاید اس کے دل نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ بہت ٹوٹی ہوئی، بکھری ہوئی سی ہے اس وقت یہ کوئی جی پی ایس ٹریکنگ نہیں تھی، وہ وجدان کا تعلق تھا۔ خیال کا رشتہ۔

وہ جواباً ٹائپ کرنے لگی۔

''مجھے جنت کے ان پتوں نے دنیا والوں کے لیے اجنبی بنا دیا ہے۔ میجر احمد!''

پیغام چلا گیا۔ آنسو اسی طرح اس کے چہرے پہ لڑھکتے رہے۔ اسے پرانی زندگی یاد نہیں آ رہی تھی۔ اسے نئی زندگی مشکل لگ رہی تھی۔ احزاب کی جنگ کی یہ خندق تو بہت گہری، بہت تاریک تھی۔ اس میں تو دم گھٹتا تھا۔ وہ کیسے اس پہ قائم رہ پائے گی؟

احمد کا جواب آیا تو اسکرین جگمگا اٹھی۔ اس نے پیغام کھولا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

اسلام شروع میں اجنبی تھا۔

عنقریب یہ پھر اجنبی ہو جائے گا۔

اور

سلام ہو ان اجنبیوں پہ!''

اسکرین پہ ٹپ ٹپ اس کے آنسو گرنے لگے۔ اوہ اللہ! اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں میں سر گرا لیا۔

وہ کیوں نہیں سمجھ سکی کہ یہی اجنبی پن تو اسلام تھا۔

ایسی ہی تو ہوتی ہیں اچھی لڑکیاں۔ عام لڑکیوں سے الگ، منفرد، مختلف۔ وہ دنیا میں گم، بے فکری سے قہقہے لگاتی، کپڑوں، جوتوں اور ڈراموں میں مگن لڑکیوں جیسی تو نہیں ہوتیں۔ اجنبیت ہی ان کی شناخت ہوتی ہے۔ وہ ساحل کی کیچڑ پہ چمکنے والا الگ سا موتی ہوتی ہیں۔ اجنبی موتی۔

وہ دھیرے سے مسکرائی اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑے۔ وہ ایک مضبوط لڑکی ہے، اسے اتنی جلدی ہار نہیں ماننی۔ وہ اسی اجنبی طریقے سے اس دنیا میں سر اٹھا کر سب کے درمیان جیے گی اور وہ دنیا والوں کو یہ کر کے دکھائے گی۔ آئندہ..... وہ کوئی پارٹی چھوڑ کر نہیں آئے گی، وہ پورے اعتماد سے ان میں بیٹھے گی۔

وہ اٹھی اور اپنا اسکارف اٹھایا۔ پھر فون پہ عائشے کا نمبر ملانے لگی۔ اجنبی لڑکیوں کو اپنے جیسی ایلینز سے زیادہ سے زیادہ ان ٹچ رہنا چاہیے تاکہ جب خندق کھودتے کوئی اپنے دل پہ رکھا ایک پتھر دکھائے تو آپ اسے اپنے دو پتھر دکھا سکیں۔

''اسلام علیکم حیا!'' دوسری جانب بہارے چہکی تھی۔ ''میں ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔''

''اچھا تم کیا سوچ رہی تھیں؟'' وہ آئینے کے سامنے کھڑی بالوں کا جوڑا کھولنے لگی۔ نرم، ریشمی بال کھل کر کمر پہ گرتے چلے گئے۔ وہ اب بھی اتنی ہی خوب صورت تھی جتنی پہلے تھی۔

''میں سوچ رہی تھی کہ میں نے تم سے پوچھا ہی نہیں کہ تمہارا باکس کھلا یا نہیں؟''

''ارے ہاں، وہ کھل گیا۔ مگر اس میں صرف ایک چابی تھی۔''

''کھل گیا؟ تم نے پہیلی بوجھ لی؟'' بہارے ایک دم سے بہت پرجوش ہو گئی۔

''ہاں میں نے بوجھ لی۔''

''تو اس باکس کی ''کی'' کیا تھی؟ کون سا لفظ تھا؟'' بہارے کو بہت بے چینی تھی۔ اس نے بھی حیا کے باکس پہ زور آزمائی کی تھی مگر سب اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

''اس کی Key ثاقسم ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ عائشے اور بہارے باکس کے کوڈ کو عموماً ''کی'' کہا کرتی تھیں۔ مقفل باکس کی چابی۔ بالوں میں برش چلاتی، وہ ایک دم بالکل ٹھہر گئی۔ اس کے ذہن میں روشنی کا کوندا سا لپکا تھا۔

''کی؟'' اس نے بے یقینی سے دہرایا۔ ''بہارے! میں تمہیں بعد میں کال کرتی ہوں۔ ابھی کچھ کام آن پڑا ہے۔'' اس نے جلدی سے فون بند کیا، اور اپنے دراز سے پزل باکس نکالا۔ بہت تیزی سے اس نے سلائیڈز اوپر نیچے کیں ثاقسم کا لفظ سامنے آیا تو مقفل باکس کھل پڑا۔ مقفل باکس کی کنجی ثاقسم تھی۔

اندر رکھے کاغذ پہ لکھی تحریر واضح تھی۔

چابی کے نیچے دو فل اسٹاپس۔

چابی! اوہ خدایا۔ اسے پہلے کیوں سمجھ میں نہیں آیا۔ پنکی نے کہا تھا، توڑ کر کھولنے پہ یہ کسی کام کا نہیں رہے گا۔ اس نے وہ تحریر توڑ کر کھولنے والے کے لیے لکھی تھی تاکہ وہ سمجھے کہ ''چابی'' سے مراد وہ لوہے کی چابی ہے جبکہ پہیلی بوجھ کر کھولنے والے کو علم ہوگا کہ چابی سے مراد ''ثاقسم'' ہے۔

ثاقسم کے نیچے ڈو فل اسٹاپس لگانے سے کیا بنتا تھا؟ وہ سوچنا چاہتی تھی، مگر لڑکیاں واپس آ گئیں تو اس کی یکسوئی متاثر ہونے لگی۔ اس نے باکس لیا، اسکارف لپیٹا اور اسٹڈی روم میں آ گئی۔ وہاں ان کے ڈورم بلاک کی دو ترک اسٹوڈنٹس بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ وہ بھی ایک کرسی پر آ بیٹھی اور ایک کاغذ پہ لکھا ''ثاقسم'' پھر اس کے نیچے کئی جگہوں پہ نقطے لگا کر دیکھے، مگر کچھ نہیں بن رہا تھا۔ انگریزی حروف میں لکھا تب بھی کچھ نہیں بنا۔

''سنو۔'' اس نے ان دونوں لڑکیوں کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔

''ثاقسم کے نیچے آئی مین، ثاقسم اسکوائر کے نیچے اگر ہم فل اسٹاپس لگائیں تو ہمیں کیا ملے گا؟''

ایک لڑکی الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔ جبکہ دوسری نے بہت بے نیازی سے شانے اچکائے۔ ''لگانے سے اگر تمہارا مطلب ٹریول کرنا ہے تو پھر سسلی!''

''کیا؟'' حیا کو سمجھ نہیں آیا۔

''ثاقسم کے نیچے اگر تم میٹرو لائن پہ دو پورے اسٹاپ ٹریول کرو تو سسلی کا اسٹاپ آئے گا نا.....!''

وہ بالکل سناٹے میں رہ گئی۔

''اوہو، وہ ثاقسم لفظ کی بات کر رہی ہے، اصلی والے اسکوائر کی نہیں۔'' دوسری لڑکی نے اپنی ساتھی کو ٹوکا تھا۔ جواباً اس لڑکی نے سوالیہ نگاہوں سے حیا کو دیکھا۔ وہ بدقت مسکرائی۔

''نہیں میں اصلی والے ثاقسم اسکوائر کی ہی بات کر رہی تھی۔'' وہ کرسی پہ واپس گھوم گئی اور وہ تحریر پڑھی۔

چابی تلے دو فل اسٹاپس۔ یعنی ثاقسم کے نیچے دو (پورے اسٹاپس) فل اسٹاپس سے مراد نقطے نہیں، بلکہ میٹرو کے اسٹاپ تھے اور لوہے کی چابی تلے وہ نقطے اس نے توڑ کر کھولنے والے کے لیے بطور دھوکے لگائے تھے۔

''سسلی!'' اس نے زیر لب دہرایا۔ سسلی میں اس کی امانت تھی۔ ڈولی کی امانت، جسے میجر احمد نے چھپایا تھا۔ اسے اب کل صبح ثاقسم کے نیچے پورے دو اسٹاپس تک سفر کرنا تھا۔

میجر احمد کا پزل آہستہ آہستہ کھلتا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ صبح بہت سنہری، نرم گرم سی طلوع ہوئی تھی۔ وہ ثاقسم جانے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑی گیلے بال ڈرائر سے سکھا رہی تھی۔ وہ کبھی بھی نم بالوں کو اسکارف میں نہیں باندھتی تھی۔ اسکارف پہننے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ گندا میلا رہا جائے۔ وہ اب بھی اپنے بالوں کی خوب صورتی کا اتنا ہی خیال رکھتی تھی جتنا کہ پہلے۔ جب تک بال خشک ہوئے، ہالے ایک پیکٹ اٹھائے اندر چلی آئی۔

''فلسطینی اسٹوڈنٹس صبح سویرے قطر جانے کے لیے نکل گئے تھے۔ وہ مجھے یہ تمہارا گفٹ دے گئے تھے۔ تب تم سو رہی تھیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

انہوں نے سب کو گفٹس دیے ہیں۔''

''اچھا، دکھاؤ۔'' وہ برش رکھ کر بہت اشتیاق سے پیکٹ کھولنے لگی۔ اندر اس کے تحفے پہ ایک سادہ موٹے کارڈ پہ لکھا تھا۔

''لطیف نے بتایا تھا کہ کل ہماری پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ اپنے نقاب کی وجہ سے کھانا نہیں کھا سکی تھیں۔ اس لیے ہم یہ لے آئے۔ اس میں آپ کو کبھی بھوکا نہیں رہنا پڑے گا۔ منجانب فلسطینی ایکسچینج اسٹوڈنٹس!''

اس کے نیچے ایک سیاہ سلک کا لبادہ رکھا تھا۔ اس نے وہ اٹھایا تو وہ نرم، ریشمی سا کپڑا انگلیوں سے پھسلنے لگا۔ سیاہ، لمبا، عبایا، جو ''حریر'' کا بنا تھا۔ وہ عام ریشم نہیں تھا بلکہ ذرا مختلف تھا۔ اس میں بہت ہلکی سی چمک تھی جتنی چائنا سلک کے ڈوپٹے میں ہوتی ہے۔ آستین پہ کلائیوں کے گرد موٹے موٹے سبز پتھر لگے تھے کسی لیس کی طرح وہ بادام کے سائز کے تھے اور بالکل زمرد کی طرح لگے تھے۔ سوائے سبز اسٹونز کی لیس کے سارا عبایا سادہ تھا۔ اس کی اسٹول البتہ ریشم کے بجائے کسی نرم کپڑے کی تھی اور ساتھ میں ایک علیحدہ نقاب بھی تھا۔ اسے کارڈ پہ لکھی تحریر کا مطلب سمجھ آ گیا۔ اس علیحدہ نقاب کو (جس میں آنکھوں کا خلا بنا تھا) پیشانی پر رکھ کر سر کے پیچھے پن اپ کرنا تھا۔ یوں نقاب کی سائیڈ کھلی ہوتیں اور وہ اس سے کھا سکتی۔

''یہ تو بہت مہنگا لگ رہا ہے، تمہیں پتا ہے یہ انہوں نے ضرور جواہر سے لیا ہوگا۔ وہاں ایک شاپ سے سعودیہ کے امپورٹڈ عبایا ملتے ہیں، یہ وہی ہے اور تمہارے پاکستانی روپوں میں یہ دس، پندرہ ہزار سے کم کا نہیں ہوگا۔'' ہالے ستائش سے اس خوب صورت عبایا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''اور ان کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں گرمی نہیں لگتی۔ پتا نہیں کیا میکانزم ہے، مگر اس کو تم گرم سے گرم ماحول میں بھی پہنو تو تمہیں گھٹن یا گرمی نہیں لگے گی۔''

''واقعی!'' وہ بہت متاثر سی عبایا کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنا خوب صورت اور باوقار تھا کہ نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔ اس نے اپنے لباس پہ ہی اس کو پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بٹن بند کرنے لگی۔ عبایا اس کے قدموں تک گرتا تھا۔ جیسے کسی رائل پرنس کا ریشمی لبادہ ہو۔ ایک بہت شاہانہ سی جھلک تھی اس میں۔

''بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔ کہیں جا رہی ہو تم؟'' ہالے کو کچھ یاد آیا۔ ''اگر مارکیٹ جا رہی ہو تو مجھے کچھ منگوانا تھا۔'' وہ جلدی سے ایک کاغذ پہ کچھ چیزیں لکھنے لگی۔

''ہاں، ٹھیک ہے لے آؤں گی۔'' اس نے عبایا کی اسٹول چہرے کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''بس مجھے سسلی سے ایک امانت اٹھانی ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

ہالے نے جو میز پہ کاغذ رکھے لکھ رہی تھی نا سمجھی سے سر اٹھایا۔

''امانت؟ کیا کسی نے تمہارے لیے رکھوائی ہے؟''

''یہی سمجھ لو۔'' اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

''چابی ہے تمہارے پاس؟'' ہالے نے عادتاً پوچھا وہ ہمیشہ باہر جانے سے قبل پوچھ لیا کرتی تھی کہ کون سی شے رکھی اور کون سی نہیں، مگر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

''کس چیز کی چابی؟''

''امانت کی چابی۔ اس کے بغیر تو نہیں کھلے گی نا۔''

''ہالے!'' اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''تم..... تم امانت کسے کہتی ہو؟''

''امانت لاکرز کو۔ تم ان ہی کی بات کر رہی ہو نا؟ ہم لیفٹ لگیج Left Luggage لاکرز کو لگیج امانت بولتے ہیں نا۔''

''اوہ..... لیفٹ لگیج لاکرز!'' اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ ''وہ لاکرز جہاں لوگ سامان محفوظ کر کے چلے جاتے ہیں کہ بعد میں اٹھا لیں گے؟'' اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ چابی کسی لیفٹ لگیج لاکر کی بھی ہو سکتی ہے۔

''ہالے..... ہالے۔'' وہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔ ''تمہیں پتا ہے سسلی میں امانت لاکرز کہاں ہوں گے؟'' اس کی بات پہ

Downloaded From http://paksociety.com

ہالے متذبذب سی سوچنے لگی۔

''سچ کہوں تو میں نے کبھی استنبول میں کوئی پبلک لاکر ٹرائی نہیں کیا، عموماً ریلوے اسٹیشنز پہ لاکرز ہوتے ہیں۔'' تم سسلی کے اسٹاپ پہ دیکھنا، وہاں شاید کوئی مل جائے۔

ٹاقسم کے نیچے دو پورے میٹرو اسٹاپس۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کوئی امانت لاکر تھا۔ اس نے ذہن میں اس پہیلی کو ڈی کوڈ کیا۔

☆ ☆ ☆

سسلی کے میٹرو اسٹاپ پہ معمول کی گہما گہمی تھی۔ وہ پرس کندھے پہ لٹکائے بہت پراعتماد طریقے سے چلتی ٹکٹ کاؤنٹر تک آئی۔

''اسلام علیکم۔ مجھے کچھ سامان ڈمپ کرنا ہے بیج امانت کس طرف ہے؟'' اس نے سرسری سے انداز میں لاکرز کا پوچھا۔ اس لیے کہ وہ مشتبہ نہ لگے، اس نے یہ نہ بتانا ہی بہتر سمجھا کہ کسی نے اس کے لیے امانت رکھوائی ہے۔

''میڈم! یہاں اس اسٹاپ میں تو کوئی لاکر نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟ یہاں کوئی لاکر نہیں ہے؟'' اس نے اچنبھے سے اردگرد نگاہ دوڑائی۔

''جب سے میں یہاں کام کر رہا ہوں، تب سے تو اس اسٹاپ پہ کوئی لاکر نہیں ہے۔ شاید پہلے ہوتے ہوں۔ آپ کو پتا ہے نائن الیون کے بعد یورپ کے بہت سے ریلوے اسٹیشن سے لاکرز ختم کر دیے گئے تھے۔'' معمر ترک کلرک نے تفصیلاً بتایا۔

''اچھا!'' اس کا دل مایوسی میں ڈوب گیا۔ ٹاقسم سے میٹرو میں سوار ہونے کے بعد وہ پہلے اسٹیشن پہ نہیں اتری پھر دوسرے، یعنی سسلی پہ اتر گئی۔ ٹاقسم سے میٹرو لائن کا آغاز ہوتا تھا، میٹرو ایک ہی سمت میں جاتی تھی، سو دو پورے اسٹاپس کا اختتام سسلی پہ ہی ہوتا تھا۔

''آپ کو سامان رکھوانا ہے تو میرے پاس رکھوا دیں پھر بعد میں لے لیجیے گا۔'' وہ جانے لگی تو کلرک نے بہت خلوص سے پیش کش کی۔

''نہیں خیر ہے۔ میں اٹھا لوں گی۔'' اس نے شعوری طور پہ پرس کو ذرا مضبوط پکڑ لیا۔ ''بس مجھے جواہر سے ذرا سی شاپنگ کرنی ہے، میں مینج کر لوں گی۔'' اس کی آواز میں واضح مایوسی تھی۔

''اچھا آپ جواہر جا رہی ہیں؟ تو پھر آپ سامان وہیں رکھوا دیجیے گا۔ بلکہ.....'' وہ ذرا سا رکا۔ ''جواہر میں امانت لاکرز ہوتے ہیں۔ وہ انٹرنس کے قریب ہی بنے ہیں۔''

''واقعی؟'' وہ جھٹکے سے واپس پلٹی تھی۔ ''امانت لاکرز؟ جو چابی سے کھلتے ہیں؟''

''ارے میم! وہ زمانے گئے، جب لاکرز چابی سے کھلا کرتے تھے۔ سلطنت ترکیہ اب ترقی کر چکا ہے۔'' ترک بوڑھے نے فخر سے گردن اٹھا کر کہا۔ ''ہمارے امانت لاکر بارکوڈ سے کھلتے ہیں۔''

''آف کورس!'' حیا نے گہری سانس لی اور مسکرائی۔ ''اللہ ترقی یافتہ سلطنت ترکیہ کو سلامت رکھے! بارکوڈ!'' اس نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

بالآخر اسے سارے بریڈ کرمبز ملتے جا رہے تھے۔

سسلی کے اسٹاپ سے ایک ڈائریکٹ ایگزٹ تھی جو جواہر مال میں کھلتی تھی۔ وہ مال میں آئی اور تیزی سے ان لاکرز کی طرف لپکی جو داخلی حصے کے قریب ہی بنے تھے۔ ایک دیوار پہ پھیلے نارنجی لاکرز، جیسے کچن کیبنٹس ہوں۔ سب پہ ایک ایک نمبر لکھا تھا۔ اس نے پرس سے چابی اور بارکوڈ سلپ نکالی، اور پورے اعتماد سے چلتی لاکرز کے قریب آئی۔ وہاں کھڑا گارڈ بے اختیار اسے دیکھنے لگا۔

حیا نے وہاں لاکرز کی مشین کا طریقہ دیکھا۔ اسے پہلے لاکر نمبر ٹائپ کرنا تھا۔ وہاں بنے کی پیڈ پہ اس نے 6 ہندسہ دبایا۔ یہی ہندسہ اس کی بارکوڈ کی رسید کے چار کونوں میں لکھا تھا۔ یہی لاکر نمبر ہو سکتا تھا۔

مشین کی سیاہ اسکرین پہ چھ لکھا آیا، پھر اس نے بارکوڈ مانگا۔ حیا نے بارکوڈ والی طرف سے کاغذ شناخت کے لیے مشین کے سامنے کیا۔ ٹوں ٹوں کی آواز آئی اور اسکرین پہ سرخ عبارت ابھری۔ بارکوڈ غلط تھا۔

اس نے بے یقینی سے رسید کو دیکھا اور پھر مشین کو، شاید کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ گارڈ اب پوری گردن موڑ کر مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حیا نے جلدی سے مشین ری سیٹ کی اور 6 پہ انگلی رکھی، پھر بارکوڈ سامنے کیا سرخ عبارت پھر سے ابھری۔ کچھ غلط تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

گارڈ کی نظریں اور بے بسی بھری پریشانی۔ وہ کپکپاتی انگلیوں سے تیسری دفعہ مشین ری سیٹ کرنے لگی تو رسید ہاتھ سے پھسل کر فرش پہ جا گری۔ وہ تیزی سے اسے اٹھانے کے لیے جھکی۔

رسید کا کاغذ الٹا گرا تھا۔ یوں کہ الفاظ سر کے بل الٹے نظر آ رہے تھے۔ چاروں کونوں میں لکھا 6 اب الٹا ہو کر 9 لگ رہا تھا۔ کاغذ اٹھا کر اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ 9 نمبر لاکر اوپر والی قطار میں سب سے آخری تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے مشین کے کی پیڈ پہ 9 پر انگلی رکھی، پھر بارکوڈ سامنے کیا۔ بپ کی آواز آئی اور سبز رنگ کی عبارت ابھری۔ 9 نمبر لاکر کھل گیا تھا۔

وہ جلدی سے آگے بڑھی اور 9 نمبر لاکر کا دروازہ کھولا (جیسے کچن کیبنیٹ کو کھولتے ہیں) اندر ایک چوکور سی تجوری رکھی تھی جو پیچھے کہیں سے چپکی تھی۔ (یہ وہ تجوری تھی جس کی دھات کی تہوں میں شیشے کی تہہ ہوتی ہے، اور اگر اسے غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش کی جائے تو اندرونی شیشہ ٹوٹ کر تجوری کو جام کر دیتا ہے۔) اس نے تجوری کے کی ہول میں وہ چابی ڈال کر گھمائی۔ تجوری کھل گئی۔ حیا نے جلدی سے اسے کھولا۔ اندر ایک چھوٹی سی سیاہ مخملیں ڈبی رکھی تھی جیسے انگوٹھی کی ڈبی ہوتی ہے۔ اس نے وہ ڈبی مٹھی میں دبائی اور اس احتیاط سے اپنے کھلے بیگ کے اندر گرا دیا کہ پیچھے کھڑا گارڈ نہ دیکھ سکے۔

دو منٹ بعد وہ مال کے باہر کھڑی تھی۔ اس نے بیگ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ترکی اور ترکی ایڈونچرز۔ کبھی وہ ان پہ ایک کتاب ضرور لکھے گی، اس نے مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔ فی الحال اسے ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں بیٹھ کر وہ آرام سے وہ ڈبی کھول سکے۔۔

دفعتاً اس کا موبائل بجا۔

''آپ کا سرپرائز برگر کنگ کی پینٹری میں آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ اے آر پی۔'' دوسطور کا وہ مختصر سا پیغام اس کو سن کر گیا۔ کہیں عبدالرحمٰن، جہان کے پاس تو نہیں چلا گیا؟ اس کی نگاہوں کے سامنے جہان کا ٹوٹا پھوٹا ریسٹورنٹ گھوما تھا۔ اوہ نہیں۔

وہ واپس زیریں میٹرو کی طرف بھاگی تھی۔

برگر کنگ میں معمول کا شور اور رش تھا۔ وہ قریباً دوڑتی ہوئی کچن میں آئی تھی۔

''جہان کہاں ہے؟'' اس کے حواس باختہ انداز پہ وہاں شیف لڑکے نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔ ''وہ..... پینٹری میں ہے، مگر ٹھہریں، آپ ادھر نہ جائیں۔'' وہ پینٹری کی طرف بڑھی تو وہ لڑکا سامنے آ گیا۔

''مگر.....''

''میم پلیز، اس کا کوئی مہمان آیا ہے، وہ اندر ہے، اس نے کہا ہے..... کسی کو اندر نہ آنے دوں، ورنہ میری نوکری چلی جائے گی۔''

''کچھ نہیں ہوگا، مجھے دیکھنے دو۔''

''پلیز مجھے سمسٹر کی فیس دینی ہے، آپ ادھر مت جائیں، وہ مجھے واقعی جان سے مار دے گا۔ اگر..... اگر آپ کو اندر جانا ہی ہے تو آپ پچھلی گلی سے چلی جائیں پچھلے دروازے کی گھنٹی بجا دیجئے گا اور.....'' اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ باہر نکل چکی تھی۔

دس منٹ بھی نہیں لگے تھے اسے پچھلی گلی سے پینٹری کے دروازے تک پہنچتے۔ اگر عبدالرحمٰن ادھر آیا تو وہ اسے جان سے مار دے گی، اس نے سوچ لیا تھا۔

پینٹری کا روشن دان کھلا تھا۔ وہ حیا کے چہرے برابر آتا تھا۔ اس سے اندر کا منظر اور آوازیں صاف سنائی دے رہا تھا۔ وہ جو گھنٹی بجانے ہی لگی تھی، بے اختیار رک گئی۔

جہان، جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، حیا کی طرف پشت کیے کھڑا کہہ رہا تھا۔

''آواز نیچی رکھو۔ یہ تمہارا ادارا نہیں ہے جہاں میں تمہاری ساری بکواس چپ کر کے سنتا رہوں گا۔ یہ میری جگہ ہے!''

''اس کے مخاطب نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ سرمئی برساتی، آنکھوں پہ عینک اور نا قابل فراموش چہرہ جس پہ چند روز قبل اس نے کافی الٹی تھی۔ وہ پاشا کا چہرہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

''ہا! تمہاری جگہ! مت بھولو کہ یہ جگہ میں نے تمہیں دی تھی جب تمہیں بیوک ادا سے فرار ہو کر چھپنے کی جگہ چاہیے تھی، مگر تم دنیا کے

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From http://paksociety.com

سب سے بڑے احسان فراموش ہو جہان!''

وہ دیوار سے لگی، پتھر کا مجسمہ بنی رہ گئی۔ استقلال اسٹریٹ کا شور غائب ہو گیا۔

''میرا بھی اپنے بارے میں یہی خیال ہے۔'' وہ جواباً کمال بے نیازی سے شانے اچکا کر بولا تھا۔

''اور میرے کام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ اڑتالیس گھنٹے میں ہو جائے گا؟''

''نہیں۔'' جہان اسی رکھائی سے بولا تھا۔ ''کیوں پہلی بات تو یہ ہے کہ میں تمہارے باپ کا ملازم نہیں ہوں اور دوسری یہ کہ تم اپنے لالچ کے ہاتھوں بے صبرے ہونے کی بجائے تھوڑا انتظار کرو تو بہتر ہوگا۔''

''لالچ؟'' پاشا نے بے یقینی سے دہرایا۔ ''میرا سب کچھ داؤ پہ لگا ہے تم کہتے ہو کہ میں لالچی ہوں۔''

جہان نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

''تمہارے اپنے جرائم کی سزا ہے، میرا کیا قصور؟''

''اور تمہیں تمہارے جرائم کی سزا کب ملے گی جہان سکندر؟'' وہ لب بھینچے اتنی سختی سے بول رہا تھا کہ جبڑے کی رگیں تن گئی تھیں۔ ''یاد رکھنا، جس دن میں نے زبان کھولی، اس دن تم سیدھے پھانسی چڑھو گے۔''

جہان بے اختیار ہنس پڑا۔

''اور تمہیں لگتا ہے کہ میں پھانسی چڑھ کر تمہیں اداالار میں عیش کرنے کے لیے چھوڑ جاؤں گا؟ ایسی فیری ٹیل تم ہی گھڑ سکتے ہو، پاشا بے!''

بے ترک میں صاحب یا مسٹر کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

پاشا بہت تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم ایک دفعہ پہلے بھی مجھے دھوکا دے چکے ہو، میں اس دفعہ تمہارا اعتبار نہیں کروں گا۔''

''تو نہ کرو!'' اس نے بے نیازی سے کندھوں کو جنبش دی۔ ''جہنم میں جاؤ میری طرف سے۔''

پاشا چند لمحے بہت ضبط کیے اسے دیکھتا رہا، پھر کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ نگاہ روشن دان سے جھانکتے چہرے پہ پڑی۔ سیاہ لبادے میں سے صرف اس کی بڑی بڑی آنکھیں نظر آ رہی تھیں، جن میں سارے زمانے کی بے یقینی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''تمہاری بیوی باہر کھڑی ہے جہان! اسے اندر نہیں بلاؤ گے؟''

وہ جو چہرے پہ ڈھیروں بے زاری لیے کھڑا تھا، کرنٹ کھا کر پلٹا۔ حیا اسی طرح ساکت سی روشن دان کے پار کھڑی تھی۔

''کیا؟'' جہان نے بے یقینی سے دہرایا، اسے شاید لگ رہا تھا کہ اس نے غلط سنا ہے۔ پاشا زیر لب مسکرایا۔

''تمہاری بیوی، سبانجی یونیورسٹی کی ایکسچینج اسٹوڈنٹ، ڈورم نمبر بھی بتاؤں؟ حیران مت ہو جہان! تم نے پاشا بے کو انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے۔ میں تمہاری بیوی کو اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ کچھ دن پہلے ہی ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ کیوں مادام؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' اس نے آگے بڑھ کر پینٹری کا دروازہ کھولا اور اسے جیسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

''ملاقات؟'' جہان کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ اس نے ششدر نگاہوں سے حیا کو دیکھا۔ وہ اتنی ہی بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بے یقینی، بے اعتبار، فریب، جھوٹ۔

''حیا..... یہ۔ تم اس کو جانتی ہو؟'' وہ متحیر سا تھا، جیسے اسے یقین ہی نہ آیا وہ اس سب سے بے خبر تھا۔ ''یہ..... یہ سچ کہہ رہا ہے؟''

اس نے بمشکل اثبات میں گردن ہلائی، وہ ان ہی بے اعتبار نگاہوں سے پلک جھپکے بنا جہان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کون تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔

''اب بتاؤ، جہان! میرا کام اڑتالیس گھنٹوں میں ہو جائے گا یا نہیں؟ وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ جہان نے اسے دیکھا، پھر اسکی پیشانی کی رگیں تن گئیں۔ وہ آگے بڑھا اور اپنے ساتھی کو گریبان سے پکڑ لیا۔

''میری بات کان کھول کر سن لو۔ میں تمہارا کام کر دوں گا، اڑتالیس گھنٹوں سے پہلے، لیکن اگر تم نے میری بیوی کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا، تو استنبول کے کتوں کو کھانے کے لیے تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔''

Downloaded From http://paksociety.com

ایک جھٹکے سے اس نے پاشا کا گریبان چھوڑا۔ اس کی آنکھوں میں وہ خون اترا تھا کہ حیا دو قدم پیچھے ہٹی، اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ پاشا کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔

''مجھے تمہاری بیوی سے کوئی مسئلہ نہیں ہے، نہ میں نے پہلے اسے کچھ کہا، نہ اب کہوں گا۔ مجھے صرف اپنے کام سے غرض ہے۔''

''ہو جائے گا۔ ناؤ گیٹ لاسٹ!'' وہ بہت ضبط سے بولا تھا۔

پاشا نے اپنی برساتی کا کالر ٹھیک کیا اور پھر بنا کسی کو دیکھے باہر نکل گیا۔ حیا ابھی تک بغیر پلک جھپکے جہان کو دیکھتی دروازے میں کھڑی تھی۔

''تم اسے کیسے جانتی ہو، میں سمجھ نہیں پا رہا۔'' وہ اس کے قریب آیا تو وہ بے اختیار دو قدم مزید پیچھے ہٹی۔ وہ رک گیا۔

''میں نہیں جانتا کہ تم نے کیا سنا، مگر تم نے ادھوری باتیں سنی ہیں۔ میرا اس آدمی سے کوئی تعلق نہیں ہے حیا..... تم، تمہیں مجھ پہ اعتبار ہے نا، میری بات سنو!'' وہ بے بسی سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا، مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسے اب جہان سکندر کی کسی بات کا اعتبار نہیں رہا تھا۔

وہ ایک دم عزی اور اسکوائر کی جانب واپس بھاگی۔ وہ اسے پکار رہا تھا، پریشانی سے، بے بسی سے، مگر وہ کچھ بھی سنے بغیر دوڑتی جا رہی تھی۔

''میری لینڈ لیڈی نے خوب ہنگامہ کیا..... میں آج کل اس سے چھپتا پھر رہا ہوں..... یہاں کوئی عبدالرحمٰن پاشا نہیں ہے۔ یونہی کسی نے اپنے بارے میں افواہیں پھیلائی ہوں گی۔''

''جھوٹ..... جھوٹ تھا۔ سب فریب تھا۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے گرتے حجاب کو بھگو رہے تھے۔ ایک لمحہ بس، ایک لمحہ لگتا ہے اعتبار ٹوٹنے میں اور سب ختم ہو جاتا ہے۔

وہ اسے مسلسل فون کر رہا تھا۔ مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ سبا جی واپس پہنچنے تک وہ فیصلہ کر چکی تھی اسے معلوم تھا کہ اسے جہان کی بات سن لینی چاہیے ایک دفعہ اسے وضاحت دینے کا موقع دینا چاہیے، مگر وہ خوف، بے اعتباری کے دکھ سے بڑا تھا جو اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ پاشا نے اسے مہرے کے طور پہ استعمال کیا۔ ایک بلیک میلنگ ہتھیار کے طور پہ۔ یہ سب جرم کی دنیا کے ساتھی تھے۔ کرمنلز۔ اسے ان کے درمیان نہیں رہنا تھا اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ پہلی دفعہ اسے استنبول سے بہت ڈر لگا تھا۔ اسے جلد از جلد واپس پاکستان پہنچنا تھا۔ اس کا گھر دنیا میں ان کی واحد محفوظ پناہ گاہ تھی۔

ہالے اس سے پوچھ رہی تھی، مگر وہ کچھ بھی بتائے بغیر مسلسل بے آواز روتی، سامان پیک کر رہی تھی، نہ بیوک ادا، نہ لندن، اسے اپنا آخری مہینہ پاکستان میں گزارنا تھا۔ پھر جولائی میں دو دن کے لیے وہ آ کر کلیئرنس کروا لے گی۔

فلائٹ رات کو ملی، اور تب تک ہر مرحلے پہ ہالے نے اس کی بہت مدد کی۔ سبا جی کو وہ ایسے چھوڑے گی، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ سب کچھ ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ لڑکا بھی کبھی نہیں ملا جو ڈی جے کے گڈ مارننگ کا جواب دیا کرتا تھا۔ ادھوری یادیں۔ پورے دکھ۔

اس نے ابا کو مختصر سا بتا کر فون آف کر دیا تھا۔ وہ واقعی بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔ اسے بس جلد از جلد وہاں سے نکلنا تھا۔ ایر پورٹ پہ بھی وہ بہت پریشان اور چڑچڑی سی ہو رہی تھی۔ جب آفیسر نے اسے لیپ ٹاپ ہینڈ کیری میں رکھنے کو کہا تو وہ اڑ گئی۔

''مجھے اتنا بھاری ہینڈ کیری نہیں اٹھانا بس۔'' یہ اس کا ڈی جے کو ایک آخری خراج تھا۔

جب فلائٹ نے استنبول سے ٹیک آف کر لیا اور مرمران کے قدموں تلے آ گیا تو اس کے دل کو ذرا سکون ملا۔ بالآخر۔ وہ اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔ بس، بہت ہو گیا ایڈونچر، بہت ہو گئے پزل۔

''پزل؟'' وہ چونکی اور پھر جلدی سے پرس کھولا۔ مخملیں، سیاہ ڈبی اندر محفوظ پڑی تھی۔ وہ سارا دن اتنی پریشان رہی کہ اسے بھول ہی گئی۔ جانے اس میں کیا تھا؟

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ایک ہاتھ میں ڈبی پکڑ کر، دوسرے ہاتھ سے اس کا ڈھکن کھولا۔

Downloaded From http://paksociety.com

باب 9

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ایک ہاتھ میں ڈبی پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کا ڈھکن کھولا۔ اندر سیاہ مخمل پہ ایک چھوٹی سی فلیش ڈرائیو رکھی تھی۔ اس نے فلیش ڈرائیو اٹھا کر کھولی۔ ڈرائیو کا سلور، یو ایس بی پلگ چمک رہا تھا۔ حیا نے ڈھکن بند کیا، اور اچنبھے سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ انگلی کے دو پوروں برابر ننھی سی ڈرائیو کا کور سیاہ تھا وہاں کہیں کچھ نہیں لکھا تھا۔

اس میں کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ تصاویر؟ ڈاکومنٹس؟ کتابیں؟ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی میموری کتنی ہے کیونکہ اس کے اوپر لکھا نہیں تھا، مگر یہ تو واضح تھا کہ اس میں دنیا جہاں کی چیزیں سما سکتی تھیں۔ اندر جو بھی تھا، وہ تب ہی کھلتا، جب وہ اسے کمپیوٹر سے جوڑتی اور کمپیوٹر.....اوہ۔! ڈی جے کو خراج دیتے ہوئے وہ لیپ ٹاپ اپنے پاس نہیں رکھ سکی تھی۔ اب اس میں جو بھی تھا، وہ اسے گھر پہنچ کر ہی دیکھ سکتی تھی۔

اس نے فلیش ڈرائیو واپس ڈبیا میں ڈالی اور احتیاط سے پرس کے اندرونی خانے میں رکھ دی یہ قیمتی چیز تھی اور اسے اس کی حفاظت کرنی تھی۔

حیا نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا اور جلتی آنکھیں موند لیں۔ صبح کے واقعات اور اس ہنگامہ خیز فیصلے و تیاری نے اسے تھکا دیا تھا۔ بخار، سر درد اور تکان، ان سب کی تکلیف اس تکلیف سے کہیں چھوٹی تھی، جو آج جہان نے اسے دی تھی۔ وہ کچھ بھی یاد نہیں کرنا چاہتی تھی، مگر تمام واقعات اُمڈ اُمڈ کر آنکھوں کے سامنے چلتے نظر آ رہے تھے۔

بے اعتباری کا دکھ زیادہ بڑا تھا یا خود کو جہان کے لیے بلیک میلنگ کا ہتھیار بنائے جانے کا خوف، وہ فیصلہ نہیں کر سکی۔ البتہ ایک بات طے تھی۔ اگر ان پچھلے پانچ ماہ میں اس نے کچھ فیصلے صحیح کیے تھے تو پاکستان واپس جانے کا فیصلہ ان میں سے ایک تھا۔ اپنے گھر، باپ اور بھائی کے تحفظ سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ اسے ترکی اب بھی اتنا ہی پسند تھا، مگر ترکی کے کچھ لوگوں سے اب اسے خوف آنے لگا تھا۔ بس بہت ہو گئے ایڈونچرز، اس نے ہار مان لی تھی۔ وہ جہان کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر ہی چلی آئی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ یہی صحیح تھا۔ اس کو سنبھلنے اور سوچنے کے لیے وقت چاہیے تھا۔

جہان کے لیے بھی شاید یہ درست تھا۔ اب کم از کم پاشا اسے حیا کی وجہ سے بلیک میل نہیں کر سکے گا۔ جہان سکندر سے شدید ناراضی کے باوجود لاشعوری طور پر بھی اس نے اس کا اچھا ہی سوچا تھا۔

فجر کے قریب وہ اسلام آباد پہنچی۔ ابا کو آنے سے منع کر دیا تھا، سو اس کی تاکید کے مطابق انہوں نے ڈرائیور بھیج دیا تھا۔

سر درد، بخار اور بوجھل دل.....وہ گولی لے کر سوئی تو ظہر کے قریب اٹھی۔

''اتنا بڑا سر پرائز!'' اسے ہاتھوں سے بال لپیٹتے ہوئے لاؤنج میں آتے دیکھ کر فاطمہ نے مسکرا کر کہا۔ صبح وہ سو رہی تھیں اور ان کی ملاقات اب ہو رہی تھی۔

''اماں!'' وہ آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گئی۔ گھر، تحفظ، امان۔ اس کے آنسو اُمڈ کر آ رہے تھے۔

''سین پریشان ہو رہی تھی کہ اتنی اچانک حیا کیوں چلی گئی؟''

اپنے بیٹے سے پوچھنا تھا نا!

''جہان کو بتایا تھا، وہ شاید بتانا بھول گیا ہو.....کچھ کھانے کو ہے؟'' وہ نگاہیں چرا کر کچن کی طرف جانے لگی۔ وہی سبانجی سے پڑی ہر کام خود کرنے کی عادت۔ فاطمہ نے ہاتھ سے پکڑ کر واپس بٹھایا۔

''آرام سے بیٹھو۔ نور بانو کھانا لگا ہی رہی ہے۔'' پھر ذرا چونکیں ''تمہیں بخار ہے۔'' جب وہ گلے لگی تھی تو اس وقت اتنے عرصے بعد ملنے کے جوش میں انہیں محسوس نہیں ہوا تھا شاید۔

''نہیں، سفر کی وجہ سے۔'' اس نے دھیرے سے ہاتھ چھڑایا۔

Downloaded From http://paksociety.com

پچھلی دفعہ جب وہ پاکستان آئی تھی، تب بھی اسے بخار تھا۔ تب اس نے استقلال اسٹریٹ میں ڈی جے کو کھویا تھا۔ اب بھی اسے بخار تھا..... اور اس دفعہ شاید اس نے جہان کو کھویا تھا۔ اسی جگہ استقلال اسٹریٹ میں۔ آزادی کی گلی..... جس سے وہ کبھی اپنی زندگی آزاد نہیں کر سکتی تھی۔

شام میں جب وہ عصر پڑھ کر جائے نماز تہہ کر رہی تھی تو لاؤنج کی چوکھٹ پر تایا فرقان نے ہولے سے دستک دی۔ وہ چونک کر مڑی، پھر مسکرا دی۔

''تایا ابا!'' وہ آگے بڑھ کر ان سے ملی۔

''ارے یہ ترکی والے کہاں سے آ گئے؟'' انہیں جیسے اس کا نماز کے انداز میں لیا دوپٹا بہت اچھا لگا تھا۔

''بس ایگزامز ختم ہو گئے تھے۔ آخری مہینہ ترکی گھومنے کے لیے تھا۔ میں نے سوچا اس میں پاکستان آ جاتی ہوں، پھر جولائی میں کلیرنس کروانے چلی جاؤں گی۔'' اس نے رسان سے وضاحت دی جواب اسے بہت سی جگہوں پہ دینی تھی۔

''یہ تو بہت اچھا کیا۔ ابا کدھر ہیں تمہارے؟ کچھ کام تھا۔''

''پتا نہیں! آفس میں ہوں گے۔ گھر پہ تو نہیں ہیں۔''

''اچھا! میں کال کر لیتا ہوں۔'' وہ کہہ کر مڑنے لگے تو وہ جائے نماز رکھ کر ان کے ساتھ ہی چلی آئی تاکہ سب سے مل لے۔''

صائمہ تائی اپنے مخصوص ''مسکراتے'' انداز سے ملیں۔ ارم کمرے میں تھی۔ اسے دیکھ کر ذرا حیران ہوئی۔

''خیر! اچھا کیا، اب کم از کم تم میری ''منگنی'' تو اٹینڈ کر ہی لو گی۔'' تلخ مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی مگر اسے خوش گوار سی حیرت ہوئی۔

''تمہاری منگنی، کب؟''

''ایک ڈیڑھ ہفتے تک ہے۔ ان کے کچھ رشتے دار باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کی روانگی سے پہلے پہلے ہی فنکشن ہو گا۔'' ارم بہت ناخوش لگ رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر اس کے پاس بیٹھ نہیں سکی اور باہر آ گئی۔

سونیا کچن میں تھی۔ اس سے اپنے فطری خوش خلق انداز میں ملی۔ بیٹھنے کو کہا، مگر وہ بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ پاکستان اور خاندان والے۔ وہی پرانی زندگی لوٹ آئی تھی، ترکی اور ترکی کے وہ چار ماہ کسی ست رنگے بلبلے کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

اسٹڈی روم کی کھڑکی کے سامنے کھڑا وہ نیچے نظر آتی گلی کو دیکھ رہا تھا۔ پتھریلی سڑک پہ بکھی سیاحوں کو لیے جا رہی تھی۔ ادالار کی سب سے شاہانہ سواری۔ مگر اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کھلے دروازے سے عائشے اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں پرچ پیالی تھی۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ اس نے اسٹڈی ٹیبل پہ پیالی رکھی۔

''عبدالرحمٰن! تمہاری کافی۔''

عبدالرحمٰن نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ عائشے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ روئی روئی سبز آنکھیں، اس کے دیکھنے پہ اس نے نگاہیں جھکا دیں۔ اس کا مطلب تھا آنے اسے مطلع کر چکی تھیں اور وہ دکھی تھی۔

''میں امید کرتا ہوں، تم میرے ساتھ تعاون کرو گی۔''

وہ اپنے ازلی خشک انداز میں کہتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ''آنے کو ان کا بیٹا واپس مل رہا ہے، اس سے زیادہ بڑی خوشی ان کو کبھی نہیں مل سکتی۔ تم ان ماں بیٹے کے فیصلے میں ان کا ساتھ نہ دے کر ان کی خوشی ختم کر دو گی، مگر میں جانتا ہوں کہ تم ایسا نہیں کرو گی۔''

عائشے نے بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں جانتی ہوں کہ مجھے اور بہارے کو وہیں رہنا ہے، جہاں آنے کو رہنا ہے۔ اگر وہ ادالار نہیں آ سکتا..... اور یہ ضروری ہے کہ ہم سب یہاں سے چلے جائیں تو میں رکاوٹ نہیں ہوں گی۔ میں نے پیکنگ شروع کر دی ہے۔'' وہ لمحے بھر کو رکی۔ ''کیا واقعی سب ایسا ہی ہو گا، جیسا تم کہہ رہے تھے؟ کیا واقعی باہر جا کر وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا؟''

''ہاں! اور تم جانتی ہو، میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتا۔'' وہ اب بھی کھڑکی سے باہر ہی دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے! میں بہارے کو سمجھا دوں گی۔ وہ کوئی مسئلہ نہیں کرے گی۔ ہم اتنی ہی خاموشی سے ترکی سے چلے جائیں گے۔ جتنی خاموشی سے تم چاہتے ہو۔''

Downloaded From http://paksociety.com

''شیور! کیا اب تم مجھے اکیلا چھوڑ سکتی ہو؟''

''عائشے سر ہلا کر پلٹ گئی۔ عبدالرحمٰن نے گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھا.....اور پھر دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ کاریڈور کے سرے کے آگے غائب ہوگئی۔ پھر اس نے گہری سانس لی اور بولا۔

''بہارے گل! کیا تم میز کے نیچے سے نکلنا پسند کرو گی؟''

اور اسٹڈی ٹیبل تلے بیٹھی، کان لگا کر باتیں سنتی بہارے گل نے بے اختیار زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔ اللہ، اللہ، وہ ہر بار کیوں پکڑی جاتی تھی؟ جب وہ دونوں باتیں کر رہے تھے، تب وہ اتنی خاموشی سے دبے قدموں آئی تھی اور میز تلے چھپ گئی تھی۔ زمین تک لٹکتے میز پوش نے چاروں اطرف سے اسے ڈھانپ دیا تھا، مگر عبدالرحمٰن پھر بھی جان گیا تھا۔

''بہارے گل!'' وہ ذرا سختی سے بولا تو وہ رینگتی ہوئی باہر نکلی۔ اسے اپنے طرف دیکھتے پا کر وہ معصومیت سے مسکراتے ہوئے کپڑے جھاڑتی اٹھی۔

''کیا کر رہی تھیں تم؟''

وہ شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ باندھے خاموشی سے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''کچھ بولو گی نہیں؟''

بہارے نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ بہارے گل چپ زیادہ اچھی لگتی ہے۔''

عبدالرحمٰن سر جھٹک کر واپس کھڑکی کی طرف مڑ گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ وہ جیسے کچھ سوچ رہا تھا یا شاید پریشان تھا۔

''میں ادھر بیٹھ جاؤں؟'' بہارے نے اسٹڈی ٹیبل کی ریوالونگ چیئر جس کے ساتھ ہی عبدالرحمٰن کھڑا تھا کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے دھیرے سے گردن اثبات میں ہلائی۔ وہ بڑی سی کرسی پہ بیٹھ گئی اور میز کی سطح پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھے۔

''جب حیا ادھر تھی تو وہ یہیں بیٹھ کر اپنے پزل باکس پہ غور کیا کرتی تھی۔'' وہ چونکا۔

''وہ چلی گئی ہے۔''

بہارے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں حیرت پنہاں تھی۔

''کہاں؟''

''اپنے ملک، واپس۔''

''مگر کیوں؟ اس نے بتایا بھی نہیں۔ میرا نیکلس بھی نہیں خریدا۔ میں اسے فون کروں؟''

''نہیں! بالکل نہیں۔'' وہ سختی سے بولا تو بہارے کرسی سے اٹھتے اٹھتے ٹھہر گئی۔

''اور اب تم اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گی۔ سمجھیں؟''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' اس کے چہرے پر اداسی اتر آئی۔ وہ ان ہی سخت تنبیہہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''بس! کہہ دیا تو کہہ دیا۔''

چند لمحے دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ جیسے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے بولی۔

''کیا ہم کہیں جا رہے ہیں؟ نہیں! میں نے کچھ نہیں سنا۔ میں تو بس دیکھ رہی تھی کہ تمہاری میز نیچے سے کیسی لگتی ہے۔ بس! تھوڑا سا خود بخود سنائی دیا تھا۔'' وہ جلدی سے وضاحت کرنے لگی۔

''تمہارا ''خود بخود'' سمجھتا ہوں میں اچھی طرح۔'' اسے گھور کر واپس باہر دیکھنے لگا۔ بہارے کی سمجھ میں نہیں آیا، اس کا موڈ کس بات پہ خراب تھا۔

''عبدالرحمٰن!''

''بہارے! میری بات غور سے سنو۔ بعض دفعہ انسان کو اپنا گھر، شہر، ملک، سب چھوڑنا پڑتا ہے۔ قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں تم سے

Downloaded From http://paksociety.com

ایک قربانی مانگ رہا ہوں۔ میں تمہارے انکل کو واپس لے آیا ہوں۔ وہ اب تمہارے ساتھ رہے گا، مگر اس کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ادالار میں نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس نے ایک دوسرے ملک میں تم سب کے رہنے کا انتظام کیا ہے۔ وہ ادھر ہی ہے اور تمہارے، عائشے اور آنے کے لیے گھر سیٹ کروا رہا ہے۔ اسی ہفتے تم لوگ ادھر چلے جاؤ گے۔ اور پلیز! نہ روؤ گی، نہ ہی شور ڈالو گی، نہ تم مجھے تنگ کرو گی۔ تم ادالار چھوڑ دو گی اور میرے خلاف جانے کی ضد نہیں کرو گی، سمجھیں؟'' وہ باہر دیکھتے ہوئے بے لچک، سرد انداز میں کہتا گیا۔ بہارے کا چہرہ بجھتا چلا گیا۔

''یہ رہا تمہارا پاسپورٹ۔'' اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک ننھی سی کتاب نکال کر بہارے کو تھمائی۔ بہارے نے بے دلی سے اسے کھولا۔ اندر اس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

''ہم یہاں کیوں نہیں رہ سکتے؟''

''سوال نہیں کرو گی تم، سنا تم نے؟''

بہارے کا سر مزید جھک گیا۔ وہ پژمردگی سے پاسپورٹ کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ ایک جگہ وہ ٹھہر سی گئی۔ وہ نہ پاسپورٹ کے رنگ کو دیکھ رہی تھی، نہ ہی دوسری تفصیلات کو۔ وہ صرف ان دو حروف کو پڑھ رہی تھی، جو وہاں نمایاں کر کے لکھے تھے۔

"Hannah Kareem"

''عبدالرحمٰن! غلطی ہوگئی ہے۔ میرا نام غلط لکھ دیا ہے۔ حنہ کریم..... یہ تو میرا نام نہیں ہے۔'' وہ حیرت اور الجھن سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''اب یہی تمہارا نام ہے۔''

بہارے حیرت زدہ رہ گئی۔ کبھی وہ اس پاسپورٹ کو دیکھتی تو کبھی عبدالرحمٰن کے بے تاثر چہرے کو۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''اور ایک آخری بات۔'' وہ اس کی طرف مڑا اور سابقہ انداز میں بولا۔ ''میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔''

سفید محل، ادالار، ترکی، اپنا نام، شناخت، بہارے گل ہر چیز چھوڑ سکتی تھی، مگر اس آخری بات نے تو اس کی سانس ہی روک دی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر عبدالرحمٰن کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''تم..... تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گے؟''

''نہیں! اور تم کوئی رونا نہیں ڈالو گی۔''

''مگر تم ہمیں ایسے نہیں چھوڑ سکتے۔ تمہیں..... تمہیں میری ضرورت ہے۔'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''اوہ کم آن! مجھے تمہاری بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ برہمی سے کہتے ہوئے مڑا اور باہر نکل گیا۔

بہارے کو اپنے اندر سے ایک آواز آئی تھی۔ جیسی مرمرا کے پانی میں پتھر پھینکنے کی ہوتی ہے۔ جیسی دل ٹوٹنے کی ہوتی ہے۔

آنسو لڑیوں کی صورت اس کے رخساروں پہ گرنے لگے۔ عبدالرحمٰن کو اس کی ضرورت تھی، تب ہی تو اس نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ اگر وہ مر گیا تو بہارے اسے جنازہ دے گی اور اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی۔ چاہے پورا ترکی اسے چھوڑ دے، بہارے گل اسے کبھی نہیں چھوڑے گی۔

اس نے اپنی کمر سے بندھے گلابی پرس کو کھولا اور پاسپورٹ اس میں ڈال دیا۔ پھر وہ کرسی سے اتری اور دبے قدموں میز کے نیچے چلی آئی۔ چاروں طرف سے گرتے میز پوش نے پھر اسے ڈھک دیا۔

وہ لکڑی کی ٹانگ سے سر ٹکائے بیٹھی ہولے ہولے سسکنے لگی۔ وہ سب کچھ چھوڑ سکتی تھی، مگر عبدالرحمٰن کو نہیں۔ پھر اب کیوں.....

آنسو اس کی گردن سے پھسلتے ہوئے فراک کے کالر میں جذب ہو رہے تھے۔ اس نے دیکھنا چاہا کہ نیچے سے میز کیسی لگتی ہے، مگر وہ اسے دھندلی ہی دکھائی دی۔

بھیگی، آنسوؤں سے لدی۔

عبدالرحمٰن نے باہر نکلتے ہوئے جب آخری دفعہ گردن موڑ کر دیکھا تو بہارے اسے کرسی پہ سن سی بیٹھی، بے آواز روتی دکھائی دی تھی۔ وہ اس سے زیادہ نہیں دیکھ سکتا تھا، سو تیزی سے باہر آ گیا۔

(جاری ہے)

www.paksociety.com

خوف کے پنجے

نمرہ احمد

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور۔

فون: 37352332'37232336 فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY